فہرست مضامین

مخزن بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۲۱ء

نمبر ۱ — جلد ۲۱

قیمت قسم اول کلعہ — قیمت قسم دوم ۸

پبلشر مولوی ظہور الدین — پرنٹر منشی محمد کرم خاں

ایڈیٹر — ابوالبیان بیدل

Checked 1965
۸۹۱۶۱۳۰۵
تنقیح
Checked 1965
CHECKED 1956
1952

اعتذار

غروب شمس نوید طلوع صبح دگر

زمانہ کے بعض نامساعد حالات کی بنا پر مخزن چند ماہ تک اپنے ناظرین کی سعادت حضوری سے معذور و محروم رہا لیکن یہ درماندگی خدمت کسی ایسے مہلکہ کے تحت میں نہ تھی۔ جو اُسے دنیا سے قطعی ناپید کر دیتا۔ بلکہ اس پردہ میں اس کی حیات مستقبلہ کا نیک فال دیبا چہ روپوش تھا۔ ہم اپنے قارئین عظام سے معذرت خواہ ہیں۔ اور مطلع کرتے ہیں کہ مخزن کا دور جدید ایک نئی آب و تاب سے نکلیگا کتابت طباعت کی صفائی۔ اور کاغذ کی عمدگی کے ساتھ پابندی اوقات اپنی قدیمی خدمت کا بھی نصب العین جانیگا۔

چونکہ مخزن کے سائز اور کاغذ وغیرہ بدل جانے سے ضرورتیں ہمیں قیمت کے اضافہ پر بھی مجبور کر رہی ہیں۔ اسلئے قیمت قسم اول للعہ اور قسم دوم سے رہوگی۔

جن حضرات کی رقوم مخزن کی پہلی زندگی میں موصول ہو چکی ہے۔ ان کا بقیہ اس دور کے قیمت میں منہا کر کے باقی کا وی پی پیش خدمت ہوگا۔ اور آئندہ سے اس کا شروع سال ماہ مئی سے سمجھا جائیگا۔ جو ہر مہینہ کے پہلے ہفتہ میں شایع ہو کر حاضر خدمت ہوا کریگا۔ امید ہے کہ خریداران مخزن ہمیں ان تغیرات اور ازدیاد قیمت پر معذور سمجھ کر معاف فرمائیں گے۔ اور ہمارے حوصلہ افزا ہونگے۔

ظہور الدین منیجنگ پروپرائٹر و پبلشر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مخزن

قیمت قسم اول للعہ ر	مخزن بابت ماہ مئی سنہ ۱۹۲۱ء	نمبر ۱
" " دوم سے ر		جلد ۲۱

مخزن کا دورِ جدید

اور

میں

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے
پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیٔ داماں کئے ہوئے

دنیائے اردو کے دورِ ماضیہ میں جو خصوصیت صحیفۂ "مخزن" کو حاصل ہو چکی ہے۔ وہ آج تک کسی اور جریدۂ ادبیہ کو حاصل نہیں ہوئی۔ اور یہ خصوصیت نہ صرف اسلئے ہے۔ کہ اسے اور اپنے ہمزمانہ معاصرین یا مابعد ہم نواؤں پر فخرِ سبق ہے۔ بلکہ اسلئے کہ "مخزن" موجودہ ادب اردو کی اشاعت کا سب سے پہلا مظہر ہو چکا ہے۔

کیونکہ جس دور میں اس کی صبحِ حیات رونمائے عالم ہوئی۔ اسوقت جہاں انشاپردازانِ مغرب کی سحر طرازیاں بلند پروازیاں منتہائے کمال اور معراجِ عروج پر پہنچکر ہر ذی حیات متنفس کو مرعوب و معترف کر رہی تھیں۔ وہیں اردو کی سعیٔ حیات کبھی اپنی روپوشِ مستقبل زندگی کو ادب لطیف کی ایسی شاہراہ پر ڈال چکی تھی۔ جو پیشِ نظرِ منازل کیلئے موصل الی المطلوب متصور تھی۔

ملک کا گوشہ گوشہ بزم آرائے لطف ادب تھا۔ اور فرد فرد ذوقِ خامہ فرسائی کا ستم زدہ۔

مگر کوئی اسوقت تک ایسا ذریعۂ اشاعت بہم نہ تھا۔ جو ان گلچینانِ ادب کی مساعی کا سبدِ گل بنتا یا خوش نگارانِ اردو کے تدوینِ ذوق و شوق کا حوصلہ افزا ہوتا۔ اسلئے ادب اردو کی ترقیاں معذورِ اشاعت تھیں۔ ایسے وقت میں اس صحیفۂ ادبی کا ظہور ملک کی ضروریات کی اقتضا کو دیکھتے اردو کی بقائے حیات کا

پیش خیمہ ہے۔

جناب شیخ عبدالقادر صاحب بی۔اے کی حساس ضرورت دانشمندیاں اور وقت شناس تدابیر جہاں اس معنے کر مستحق تحسین ہیں کہ مخزن کی تاسیس کا سہرا انکے سر ہے۔ وہیں سب سے زیادہ قابل تعریف و اعتراف امر یہ ہے کہ انکی نگاہ مردم شناس نے اس فراست اور روشن ضمیری سے ملک کے گوشہ گوشہ میں سے اپنے مفید مقصد باکمالوں کا سراغ لگایا۔ اور انہیں جس شان کے ساتھ "مخزن" میں رونق افروز کیا۔ اس کی یاد اب تک ادب پرست حلقے کے لئے فردوس تصور ہے۔

گو "مخزن" کے عہد شباب اور دوران اختلاط میں اور بھی متعدد ادبی رسالے اسی مقصد کی تکمیل کیلئے اشاعت پذیر ہوئے۔ کافی سے زیادہ اردو کی خدمتیں بھی انجام دیں۔ ملک میں بہترین لٹریچر بھی پیش کیا۔ مگر "مخزن" نے گذشتہ چوتھائی صدی میں جو ادبی نگہت بیزیاں کیں۔ وہ نہ صرف اسی وقت تک ذوق ادب سے آشنا دل و دماغ کے لئے تفریح روحانی کا خوان کرم تھیں بلکہ اس وقت بھی ارباب بصیرت کا ذوق نظر ہیں۔

اس کی سرسبز کوششوں نے جہاں ادب اردو کے بے برگ و بار نخل زندگی کو پروان چڑھایا۔ اس کے حسن شباب کی خوش آب سادگی میں ملاحت اور رنگینی پیدا کی۔ وہیں اردو کو ان سرمایوں سے بھی مالا مال اور دولتمند کر دیا۔ جو علوم و فنون کی بالیدگی اور حیات ارتقائی کے نشو و نما کیلئے سرچشمہ آبیاری متصور ہیں۔

لیکن افسوس اس کی بہار بھی خزاں کی دستبرد سے مامون و محفوظ نہ رہ سکی۔ اور یہ طبیعت انسانی کا حسن عمل پوری انسانی عمر طبعی بھی نہ حاصل کرنے پایا تھا۔ کہ حوادث زمانہ کا محسود و مستحق ہو کر ایسا فریش بستر علالت ہوا کہ آج تک پڑا نزاعی سسکیاں لے رہا ہے۔ اور صحت عود نہیں کرتی۔

وہی مخزن جو کبھی مردہ دلوں کیلئے معجزہ جاں بخشی تھا۔ وہ اب نامساعدت زمانہ کے ہاتھوں سے تو ایک جسم بے جسم مردہ ہے۔ جس کی شکل و ہیولے تو وہی ہے مگر روح نہیں۔ ایک خوشرنگ پھول ہے لیکن بو کا نام و نشان نہیں۔ گویا وہ ایک سراب ہے کہ جو خراماں امواج کی شوخی نقش پا نظر فریب آب حیات تو ہے۔ مگر درحقیقت پانی نہیں۔

"مخزن" کے زوال و انحطاط کا ظاہری باعث تو یہ سمجھے اور کہا جا سکتا ہے کہ ادھر تو شیخ صاحب مرحوم نے بعض دیگر مصروفیات کی وجہ سے اس کے سر سے اپنا سایۂ عاطفت اٹھا لیا ادھر شیخ صاحب کے علیحدہ ہو جانے سے "مخزن سہا" ایسی اجڑی کہ پھر آباد نہ ہو سکی۔ مگر درحقیقت اسکے اسباب

افتادگی بیشتر بڑی وجہ یہ ہے کہ مخزن اپنے قدیمی عناصر زندگی کے مضمحل ہو جانیکے بعد اہل قلم کی پھر کوئی ایسی نئی جماعت اپنے لئے پیدا نہ کرسکا جن کی مضامین نگاریوں سے اس کا دور آئندہ بھی عہد ماضی کی قائم مقامی کرتا رہتا۔ اور نہ پھر کوئی اُسے ایسا ذی ہمت مخلص سرپرست دستیاب ہوا جس کا دست تربیت اس کے حسن ظاہری و باطنی کی مشاطگی کو ملک کی خدمت تصور کرتا۔

قدیم ارباب ادب تھک گئے۔ اور نسل جدید کے ذوق تحریر و شوق انشا کی حوصلہ افزائی نہ ہوئی اس لئے وہ بادہ پیمائیاں کیف ماضی کی طرح دقف خمار ہو کر رہ گئیں یہی وجہ ہے کہ شیخ صاحب کے بعد گو متعدد ہاتھ اس کی عنان ادارت سے سرفراز ہوئے مگر انہیں سنگ راہ مشکلات سے ان کی جانکاہ سختیاں درماندہ ترقی رہیں۔

مولانا تاجور سے فاضل ادیب ا جنکے جوہر قابلیت میری بے مائگی مرعوب ہونے کے ساتھ یہ کہنا بھی حق بجانب جانتی ہے کہ ان کی ذات مخزن کیلئے آیۂ رحمت اور مایۂ دولت تھی) کی سعی بلیغ کو بھی باوجود انتہائی تعلق خاطر کے اس کی خدمات سے بے نیاز ہونا پڑا۔

اب اس کے دور جدید کا میری جیسی بضاعت ہیچ میرزی سے تعلق ہونا گو میری محدود وسعت نقاط نیاں رنظر کے سامنے ایک خوفناک پہاڑ حائل ہو جاتا ہے۔ جسے لب راست ہٹا دینے سے میری علمی نااہلیت اور ادبی لاعلمی قطعاً عاجز ہے۔ مگر چونکہ بعض مخلصین کا یہ ادعا غلط خیال ہے۔ اس لئے میں ان کے حسن ظن کو مجروح کرنے سے بھی معذور ہوں۔

میں جہاں اس کی ادارت کو اپنے لئے مایۂ فخر سمجھتا ہوں وہاں پر ان ذمہ داریوں کو جو فرائض ادارت کی طرف سے مجھ پر عائد ہو رہی ہیں محسوس کرتے ہوئے یہ بھی دیکھ رہا ہوں۔ کہ زمانہ کے حالات اور ملک کی سیاسیات میں جس سرعت کے ساتھ تغیر پیدا ہو رہا ہے۔ یا موجودہ اہل قلم کو ادبی مشاغل سے آئے دن عجیب بے تعلقی ہوتی جاتی ہے۔ اسے پیش نظر رکھتے ہوئے میں کیا اب کسی شخص میں اتنی فوق الادراک طاقت نہیں کہ مخزن بیچارہ کی اس اجڑی ہوئی محفل کو پھر گرم کرسکے۔ اور شیخ عبدالقادر۔ سید سجاد حیدر علامہ اقبال۔ ناظر۔ نیرنگ۔ میرزا محمد سعید۔ اعجاز۔ وغیرہ کو یکجا اکٹھا کرکے اسی جوش و سرگرمی سے پھر آمادہ تحریر و انشا کردے۔

کیونکہ اوّل تو ان حضرات کو اس سے دست کش ہوئے اتنا زمانہ گذر چکا ہے۔ کہ پھر ان کا ادھر

متوجہ کرنا سوائے توفیق فطرت کے انسانی قدرت کا کام نہیں۔
دوسرے جس ادب کی بنیاد تعمیر محض ہنگامۂ شباب کے کیف و تخیل پر مبنی ہوتی ہے اس کی عمر بھی ولولۂ ہنگامی کی طرح کم اور ناپائدار ہوتی ہے عمر کے امتداد و انقلاب کے ساتھ شبابی جذبات کی شوخیاں بھی متانت و سنجیدگی بن جاتی ہیں۔ اور یہ ادب طرز بیان بازیچہ اطفال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔
انہیں حالات نواحی کو مد نظر رکھتے ہوئے مجھے بہت کم توقع تھی۔ کہ میں مخزن کی خدمات کیلئے مفید ثابت ہوسکونگا اسی لئے مجھے اس مفوضہ خدمت کے قبول کرنے میں عذر تھا۔
باری شکر ہے۔ کہ میرا شوق ادب اور خلوص بار آوری مقصد کا سفارشی ہوا مخزن کے پرانے کرم فرماؤں میں سے اکثر ممتاز ہستیوں نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے میرے یقین کو ممنون وثوق بنا یا ہے۔ کہ وہ پھر اس کی طرف گوشۂ چشم مبذول فرمائینگے۔ اور اس تجدید التفات سے انشاء اللہ یہ بزم پھر ایکدفعہ بھری ہوئی نظر آئیگی۔
ان حضرات کے علاوہ مخزن کا دور حاضر عہد متوسط کے وہ انشا پرداز جن کی تحریر آج لاکھوں با مذاق اصحاب کی ذوق نظر ہے۔ اور جن کی ادبی حسن باریوں کی درخشانی آسمان انشا و ادب پر مہر و ماہ کی ہم ضو ہے۔ مثلاً نیاز۔ پریم چند۔ سالک وغیرہ کی قلمی تصاویر کے مرقعے بھی نذر کرتا رہیگا۔ نیز بہت سے ایسے ادیبوں سے بھی متعارف کرائیگا۔ جن کی جدت نگاریوں سے گو دنیا ابھی روشناس نہیں مگر انکی طبع موزون کی جودتیں۔ مت ثاقت ستارۂ بلندی۔ کی علم برداری کیلئے مساعدت کے منتظر ہیں۔
مخزن ادب لطیف اور شعر و سخن کے نایاب اور منفرد موتی پیش کرنیکے علاوہ ایسے مضامین علمیہ اور علم اللسان کے مباحث تنقیدات عالیہ کی گلباریاں بھی اپنا نصب العین سمجھیگا جنہیں قیام عالم کے ساتھ دوامی نسبت ہے زبان و ادب کی مناسب و موزون خدمتوں کے ساتھ قوم کی تعلیم و تربیت کا حق بھی ادا کریگا۔ جو قوم کی حریت و آزادی میں ہم سفر منزل ہے۔
لیکن یہ تمام فوائد جبھی مترتب ہوسکتے ہیں۔ کہ وہ احباب اصحاب جنہیں ادب اردو سے محبت اور شغف ہے۔ وہ بھی حسب وعدہ ہاتھ بٹائیں۔ اور قلمی سخنی۔ دامی درمی۔ مخزن کے امداد و اعانت بھی اپنی ضروریات معاشرت میں محسوب کرلیں۔
کیونکہ میری خواہشوں اور حسرتوں کے راستہ میں اب بھی بے شمار نیش زن کانٹے ہیں۔ جو قدم قدم پر موجب خلش ہیں کہیں میری کم استعدادی سد راہ ہوتی ہے کہیں مخزن کی موجودہ مالی حالت

اس کی ترقی کی عنانگیر ہے۔ کہیں واقعات وحالات حاضرہ کی پریشان کن صورت میرے حوصلہ کو پست کردیتی ہے۔ بہرحال اگر ملک واحباب کی طرف سے مخزن کی قدردانی اور میری حوصلہ افزائی ہوتی رہی تو میں یقین دلاتا ہوں۔ کہ مخزن کی ظاہری و باطنی حسن نے جواب صوری ومعنوی تبدیلی اختیار کی ہے اس میں کبھی کوئی تخفیف خلل انداز نہ ہوگی۔ بلکہ اس کی کوشش ہمیشہ اسی مقصد کی جبہ سا رہیگی۔ کہ ہر پرچہ پہلے پرچہ کے آب وتاب سے نسبتاً زیادہ آراستہ ہوکر نکلتا رہے ؎

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گذری ہے خطرے پہ گہر ہونے تک

سید حامد حسین بیدل شاہجہانپوری

شذرات

یہ مسلم امر ہے کہ جب کوئی گام ارادت اپنے شاہ راہ عمل سے پیچھے پڑجاتا ہے تو اس کا وقت کی پابندی کے ساتھ اپنی جگہ پر آنا بہت مشکل ہوجاتا ہے۔ یہی طرح مخزن کا قطع تسلسل نہ صرف اس کی پہلی زندگی کے لئے مضر ہوا۔ بلکہ اس کا دور جدید بھی ان مشکلات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

ہم نے ہرچند چاہا۔ کہ مخزن کے دور جدید کا پہلا نمبر اپریل کے اواخر ماہ میں نکل جائے۔ مگر انقلابی دقتیں حاجب ارادت ہوہی گئیں۔ تاہم ہم یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ سے مخزن ہر مہینہ کے اوّل ہفتہ میں شایع ہوکر نذر ناظرین ہوجایا کریگا۔

ہمیں کئی کتابیں بغرض ریویو وصول ہوئی ہیں۔ جن پر علاوہ فرض ادارت یوں بھی ہمارا کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر بوجوہ ابھی ہم قاصر خدمت ہیں۔ مثلاً چتر آمز ترجمہ عبدالمجید خاں سالک روح آدب مصنفہ شبیر علی خانصاحب جوش سمرنا میں یونانی مظالم ترجمہ حضرت ابوالعلا مودودی۔ اسلئے بھی بایجاب دعوت شکریہ اور رسید پیش خدمت ہے۔

باوجود سخت کوشش کے بھی اس دفعہ رسالہ کی لکھائی دیدہ زیب نہ ہوسکی۔ اُمید ہے کہ ناظرین اور قارئین ہم کو معذور جانکر معاف فرمائینگے انشاءاللہ تعالے آئندہ ماہ سے یہ شکایت مخل تعلقات ہوگی

سبدِ گل

گویائی۔ شیخ عبدالقادر صاحب کی ذات کسی معرفی کی محتاج نہیں ہے۔ انہیں مخزن کے ساتھ، اور مخزن کو اُن کی ذات کے ساتھ چولی دامن کی نسبت ہے۔ باوجود مدت تک کی بے تعلقی کے بھی مخزن کا ناصیۂ نیاز آپ کے سجدۂ عبودیت خصوصیت سے اپنے آپ کو بے نیاز نہ کرسکا۔ یہ ایک مختصر سا مضمون آپ کی رشحات قلمیہ کا نتیجہ ہے۔ جو ہمارے مقاصد پر بھی بہت کافی روشنی ڈال رہا ہے۔ ہم آپ کے بہت ممنون ہیں۔ کہ کثرت مشاغل کے باوجود آپ نے مخزن کی طرف اپنی توجہ کو پھر مبذول فرماتے ہوئے اس کے دورِ جدید پر اظہار مسرت کیا ہے۔

حسن کی خودبینی۔ جنگ بہادر لال نگم اُن ادب طراز اہل قلم میں سے ہیں جن کا تعارف اب محتاج سعی نہیں ہے۔ دنیا اُن کی خدمات ادبی سے واقف ہے۔ اور ان کے مضامین کا بہت دلچسپی کے ساتھ خیر مقدم کرتی ہے

خیالات پریشان۔ ہم سید محمد محمود مخمور اکبرآبادی کے مرہون منت ہیں کہ آپ نے ڈاکٹر ٹیگور کے رنگ میں ادب لطیف کے چند دلفریب نمونے مخزن کو عنایت فرمائے ہیں۔ آپکی تحریر میں رنگینی جذبات خاص طور پر نمایاں ہے۔ اور بعض جگہ تو ٹیگور کی خصوصیات کے علاوہ بھی حسن تخیل کے حسین مناظر نظر آتے ہیں۔

ماجرائے عقل و ہوش۔ امیر خسرو اور فیضی کے بعد غالب تک ہی یہ توقع دلشاد رہی۔ کہ جو سرمۂ صفاہان کی سیاہی۔ اور شراب شیراز کے سرخ ڈورے ایران کیلئے مایۂ ناز تھے۔ ان سے بحمداللہ ہندوستان کی آنکھیں بھی محتاج بصارت نہیں ہیں۔ مگر کچھ دنوں سے ایران کے ساتھ ہندوستان بھی اس قحط الرجال کا معمول سحر ہے۔

لکھنؤ میں خواجہ عزیزالدین صاحب مغفور کی ذات والاصفات دور موجودہ کے لئے مایۂ ناز تھی اور پنجاب میں مولٰنا شیخ عبدالقادر گرامی مدظلہ العالی کی گرامی ہستی ہندوستان کے بزم برہم شدہ کی عظمت و شان کا اندازہ کرانیکے لئے زندہ ہے۔ یہ نظم مولانا گرامی کی ادبی لہر ریزیوں کا منظوم سلک جواہر ہے۔ جسے شیخ صاحب نے تو ہمیں مرحمت فرماکر شکریہ کا موقع دیا۔ مگر ہمعصر زمیندار ہمروزہ سبقت اشاعت نے اس تفاخر کو ہم سے چھین لیا۔

اقوال زرّیں۔ مرزا محمد سعید صاحب ایم۔ اے مخزن کے اس قدیم بزم ادب کے صدر نشینوں میں سے ہیں جن پر مخزن کو ہمیشہ ناز رہیگا آپنے فی الحال اپنے اقوال زرّیں کا ترجمہ بالواسطہ ہم کو بھیجکر ممنون کیا ہے۔ اور آئندہ حتمی وعدہ فرمایا ہے۔ کہ اپنی گہرباریوں سے مخزن کو پھر مثل سابق مرہون منت فرماتے رہینگے چنانچہ اگلے پرچہ میں یقیناً انکا کوئی مستقل مضمون ہوگا

گویائی

ایک عرصے سے احباب مصر تھے۔ کہ میدان تحریر و تقریر میں دوبارہ اُترنا لازم ہے۔ مگر یہاں مہر خاموشی دہن سخن اور زبان قلم پر لگی ہوئی تھی۔ بقول مولٰنا حالی مرحوم ؎

کر دیا چُپ واقعات دہر نے ۔۔۔ ورنہ ہم میں بھی تھی گویائی بہت

واقعات دہر کچھ ایسے گذر رہے ہیں کہ اُن کے ہوتے ہوئے سکوت سے بہتر کوئی مضمون ہو نہیں سکتا۔ گویائی انسان کے لئے خاص احسانات خداوندی سے ہے۔ اور اس احسان کا شکر یہی ہے۔ کہ اس سے کام لیا جائے۔ کام لینے سے مراد فقط یہ نہیں کہ روزمرّہ کی ضروریات کیلئے جس قدر بولنا لازم ہے وہ کافی ہے۔ ضروریات تو حیوان بھی پوری کر لیتے ہیں۔ باوجودیکہ اُن کو قوت نُطق حاصل نہیں۔ بلکہ مقصود یہ ہے۔ کہ زبان خدمت خلق کا ذریعہ بنے۔ قلم جو دل کے خیالات کے اظہار میں زبان کی قائم مقامی کرتا ہے۔ اس کا بھی یہی فرض ہے کہ دُنیا کو نفع پہنچائے۔ ہمارا علم ادب کیا ہے ہماری قوم کی گویائی کا مجموعہ۔ جو خیالات بہترین دماغوں میں موجزن ہوتے ہیں۔ اور بہترین دلوں سے اُٹھتے ہیں۔ وہ نظم کی شکل میں یا نثر کی صورت میں صفحۂ کاغذ پر جلوہ گر ہو کر دستبرد زمانہ سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اور دوسروں کے خیالات میں وہی تموج پیدا کرتے ہیں۔ اور اُن کی ذہنی اور دماغی ترقّی کا باعث ہوتے ہیں۔ شائقین کتب کتابوں سے اس قدر محبّت کیوں رکھتے ہیں۔ اور ان کو پڑھ کر اس قدر محظوظ کیوں ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ کتابوں کے ذریعہ اُنہیں ماضی و حال کے بہترین لوگوں کی صحبت گھر بیٹھے نصیب ہو جاتی ہے۔ جو کام ایک اچھّا کتب خانہ بڑے پیمانے پر کرتا ہے۔ وہی کام ایک چھوٹے پیمانے پر علمی اور ادبی رسالے جو مہینے بھر میں ایک دفعہ نکلتے ہیں۔ وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں وہ قوم کی مجموعی قوت گویائی کے جمع خرچ کی گویا ماہوار رپوٹ ہیں۔ ان کو دیکھ کر آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ قوم کس حالت میں ہے۔ اگر وہ محض خیالات پریشان کا مجموعہ ہیں تو سمجھ لو۔ کہ قوم بھی پریشان ہے اور وہ اس کی پریشانی کی تصویر۔ اگر ان کے خیالات منضبط ہیں اور یہ نظر آرہا ہے کہ جو کوئی کچھ لکھ

رہا ہے کسی منزل مقصود کو سامنے رکھکر لکھ رہا ہے تو جان لو کہ قوم شاہراہ ترقی پر چل رہی ہے - اور کوئی دن میں منزل مقصود تک رسائی پالیگی +

پہلی چیز جو ہمارے اکثر رسالوں میں ناپید ہے وہ یہ ہے - کہ اکثر کسی خاص مقصد کو پیش نظر نہیں رکھتے - ممکن ہے کہ یہ کہا جائے - کہ ادبی رسالوں کیلئے ترقی علم ادب خود ایک مقصود ہے - یہ ایک حد تک درست ہے - مگر غور سے دیکھو تو یہ جواب تسلی بخش نہیں - اگر مان لیا جائے - کہ ادب کی ترقی مقصود بالذات ہونے کا درجہ رکھتی ہے - تو بھی یہ لازم ہوگا - کہ جو رسالے ادب کی ترقی چاہیں - وہ کسی مستقل تدبیر کے مطابق کام کریں - ان کے سامنے ایک تخیل ادب کی ترقی کا موجود ہو جس کو پیش نظر رکھکر وہ اپنی روش قائم کریں بسا اوقات جو ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جو مضمون رطب و یابس نظم و نثر میں مختلف اطراف سے آجائیں اُن میں کچھ کاٹ چھانٹ کر کے ایک مجموعہ تیار کر لیا جاتا ہے اور کوئی بہت ہوشیار اڈیٹر ہوا تو وہ یہ بھی مدنظر رکھ لیتا ہے کہ اکثر ناظرین کس مضمون سے زیادہ خوش ہونگے - اس رنگ کے مضامین وہ زیادہ جمع کرنے شروع کرتا ہے - اور اس سے رسالے کی ہر دلعزیزی بڑھتا ہے - بہت کم لوگ ایسے ہونگے جو اس کا خیال رکھتے ہوں - کہ ان مضامین کا جو شائع کئے جاتے ہیں نتیجہ کیا ہے؟ اوّل یہ کہ کوئی نتیجہ ہے یا نہیں؟ دوم یہ کہ ہے تو اچھا ہے یا بُرا؟ میرے خیال میں اڈیٹروں کے ذمہ یہ فرض ہے - کہ وہ مضامین پر اس نظر سے نگاہ ڈالیں - اور خود لکھنے والوں پر بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنی ذمہ واری کو محسوس کر کے لکھیں جیسے بولتے ہیں ہر متنفس کیلئے لازم ہے - کہ وہ پہلے تولے - پھر بولے - اور گویائی سے کام لیتے وقت گویائی کی علت غائی کو ملحوظ رکھے - اور ایسی بات نہ کہے جس سے دوسرے کا دل بے وجہ دُکھے - یا دوسرے کے دل میں خیالات فاسدہ جاگزین ہوں - اسی طرح اس خاموش گویائی کے استعمال کے لئے جو تحریر کے ذریعے سے وجود میں آتی ہے - اس ذمہ واری کے احساس کی ضرورت ہے - اب تک اکثر بولنے والے اس پر قانع ہیں کہ بھرے مجمع میں کسی طرح واہ واہ ہو جائے - اور لکھنے والے اس سے خوش ہیں - کہ ان کی کوئی غزل یا نظم یا اُن کا کوئی مضمون نثر کسی رسالے میں چھپ جائے - مگر بہت کم ہیں جنہیں اس کے اصلی حسن و قبح کی طرف توجہ ہو - جو اسی کوشش میں مصروف ہوں - کہ اصلی محاسن کلام روز بروز بڑھتے جائیں - اور عیوب کم ہوتے جائیں - یہ شیوۂ اہل کمال ہے - مگر آج کل طلب کمال کہاں ہے شہرت طلبی کا مرض ایسا عام ہوا ہے - کہ ہر شخص چاہتا ہے - کہ قلیل مشق کے باوجود مشہور ہو جائے - اور جب ذرا مشہور ہو جائے - تو فوراً اُستادوں

میں شمار کا خواستگار ہوتا ہے۔ اور اُسے آئندہ کچھ سیکھنے یا ترقی کرنے کا شوق ہی نہیں رہتا۔
جہاں خالص ادبی رسالوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ کوئی خاص مقصد مدِ نظر رکھیں۔ کیونکہ وہ مقصد ان کو ترقی کی راہ میں رہنما کا کام دیگا۔ وہاں اس امر کی بیحد ضرورت ہے۔ کہ صاحبان رسائل اپنی قوت فکر کو ذرا تکلیف دیں۔ اور ایک پامال ڈگر سے علیحدہ ہوکر اپنے لئے نئی نئی راہیں نکالیں۔
جب میں نے رسالہ مخزن جاری کیا تھا اور یہ ارادہ کیا تھا کہ اس سے فقط زبان اردو کو زیادہ ہر دل عزیز بنانا اور اُس کے ادبی ذخائر میں کچھ اضافہ کرنا مقصود ہوگا۔ تو میرے دماغ میں کئی اور رسالوں کی تجویز موجود تھی۔ جن میں سے ہر ایک کا رنگ دوسرے سے جُدا ہوتا۔ اور ہر رسالہ ایک جداگانہ ضرورت کو پُورا کرتا۔ علمی اور ادبی رسالے جتنے شایع ہوں۔ باعث خوشی اور ذریعۂ ترقی ہیں۔ مگر بہت سے رسالوں کا بالکل ایک ہی رنگ میں نکلنا اور ایک ہی لکیر پر چلنا۔ شوق گویائی کا صحیح استعمال نہیں۔ ملک میں بہت سے رسالوں کی گنجائش بھی ہے۔ اور مانگ بھی +
مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی ہے۔ کہ میرے دوست جناب سید حامد حسین صاحب بیدل کا ارادہ ہے کہ رسالہ مخزن میں کچھ نئی روح پھونکیں۔ اور اسے اردو داں دنیا کی قوتِ گویائی کا قابل تقلید نمونہ بنائیں۔ خدا کرے انہیں اس مقصد میں کامیابی ہو۔ اور اگر وہ استقلال سے اپنے اس ارادے پر قائم رہے تو میں اُمید کرتا ہوں۔ کہ وہ مجھے بھی اپنے گاہے ماہے کے مضمون نگاروں میں دیکھتے رہیں گے۔ اور میں یہ کوشش کرونگا۔ کہ مخزن کے بعض قدیم معاونین پھر اُس کی طرف متوجہ ہوں۔ اُنہوں نے ایک عنایت نامہ کے ذریعے مجھے مخزن کے اس نئے خوان کرم سے زلّہ رُبا ہونے کی دعوت دی تھی۔ یہ مختصر سا مضمون فقط اس دعوت کا ایجاب ہے +

عبدالقادر

حُسنِ تکلّم

تصویر میں جو جو تری - رعنائی ہے،	خواہانِ دل و صبر و شکیبائی ہے،
ہر حُسن غرض حُسن طلب ہے گویا	خاموشی بھی ہم صورتِ گویائی ہے

بیدل

حُسن کی خُود بینی اَور پَروانہ

ملکۂ عالم، اپنے شاہانہ ملبوس اور تُزک و احتشام کے ساتھ مختلف النوع فانوسوں اور روشنیوں میں، اُس وقت کہ اُس کا آستانۂ ناز ایک عالم کے پروانوں کے شوق بے خودی کی ہنگامہ آرائیوں سے معمور تھا، آئی اور اُسی جلوہ گاہِ عام میں ایک شعاع بنکر روشنیوں میں جذب ہوگئی، یہ کسے خبر تھی۔ کہ زمین والوں میں وینس کے حُسن خدا داد کا نمونہ بھی ہوگا، مگر اس وقت کی مرعوب نگاہیں جانتی ہیں، کہ سیاہ نقاب، وہ نقاب، جو چمنوں چمنوں آوارہ پھرنے والی ہَوا کی ایک خفیف سی جنبش میں متحرک ہوجاتا تھا۔ اپنی ہر حرکت میں کتنی قُربانیوں کا بار لئے ہوئے معروف پذیرائی ہے،

دُنیائے عشق و محبّت کے اِس ہیبتناک ہنگامے میں، متجسس نگاہیں اپنے اپنے مستقبل کو ڈھونڈتی تھیں، مگر ملکہ کا دامن اُن کی رسائیوں سے اُسی قدر دور رہتا جسقدر چکور کی پرواز صباحی سے چاند، لیکن ان مایوسیوں میں اُمید تھی، اور امید کے ساتھ اُن کی زندگیاں وابستہ، بالآخر ایک خوبصورت کبوتر بیلے اور چمپا کے تازہ تازہ ہاروں میں محبوس ملکہ کے سامنے لایا گیا اور گردن کے معمولی سے خم پر یہ اعلان کیا گیا

"شاہنشاہ، ملکہ عالم کے دامن کو ایک ایسے سخت گیر ہاتھ سے وابستہ کرنا چاہتا ہے جو اُس کا اہل بھی ہو، اور یہ کبوتر اپنی مختصر پرواز کے بعد جس شانہ کو انتخاب کرلے، وہی اس لڑکی کا حقدار ہوگا"

اعلان کے اختتام پر دلوں کی کپکپیاں اور روح میں بے چینی کے آثار پیدا ہونا، ایک فطرت تھی، چنانچہ شہزادوں نے مغرور نگاہوں سے اپنے اپنے شانوں کو دیکھا۔ اور فضائے ہوَا میں وہ خوبصورت کبوتر آزاد کردیا گیا، ہر نگاہ اُس کی پرواز کے ساتھ رقص کرتی تھی اور ہر ہاتھ بے تابانہ اُسے قبول کرنیکے لئے دراز تھا کہ یہ حسین جانور ایک شاہزادہ کو انتخاب کرتے ہوئے اُس کی دوش پر بیٹھ گیا ملکہ عالم کھڑی ہوگئی اور چہرے کو بے نقاب کردیا مگر اسکے بعد وہ عالم تھا جو موسٰی نے طور پر نہ دیکھا اور پھر کچھ بھی نہ تھا * جنگ بہادر لال نگم۔

نہنگِ امواج

رات کے آخری حصے میں چاروں طرف اندھیرا چھا رہا تھا۔ اور سمندر کی غضبناک اور پُرشور لہریں ایک دوسری کو پیچھے ہٹاتی ہوئی جدوجہد میں مصروف تھیں۔ آسمان پر کالا بھنورا سا بادل اُمڈ اُمڈ کر چھا رہا تھا۔ اور اس ویران و مہیب منظر کے درمیان سمندر کے کنارے نامرادِ محبت "زہرہ" کھڑی ہوئی طوفان کے جوش و خروش کو سن رہی تھی۔

اس کی محبت بھری نگاہیں سطح بحر پر آوارہ ہو رہی تھیں۔ کہ اسے اپنے فیروز کا پیارا چہرہ دکھائی دیا زہرہ چلائی۔ پورے زور سے چلائی۔ دیوانہ وار چلائی لیکن فیروز اُس کی آواز نہ سُن سکا۔ تیز و تند ہوا کے فراٹے سیٹیاں بجا رہے تھے۔ ایک شور رستخیز برپا تھا۔ اور ہر ملاح کا دل خوف اور گھبراہٹ سے دھڑک رہا تھا!

دور حد نگاہ تک سفید اور کف انگیز لہریں سمندر کی سطح پر لوٹ رہی تھیں۔ آسمان پر سیاہ بادلوں کے دَل کے دَل جھکے پڑتے تھے۔ اتنے میں بحری پرندوں کی ایک قطار چیختی ہوئی گزر گئی۔ اور لہروں میں دور تک ان کا سایۂ پرّان ایک دُھندلی سی لکیر کھینچتا گیا۔ لیکن زہرہ ناکام آرزو زہرہ، دیوانہ وار "فیروز فیروز" کے نعرے لگاتی رہی۔

زہرہ چلائی "اے بے رحم طوفانی سمندر تھم جا۔ اور بہادروں کے وجود سے دنیا کو محروم نہ کر" لیکن اس آواز کے جواب میں رعد کی زہرہ گداز گرج سنائی دی ہوا کے تند اور خروش انگیز جھونکے اور بھی شور مچانے لگے۔ اور لہریں بلند ہو ہو کر ایک "کہسار غلطان" کا نظارہ پیش کرنے لگیں۔

اتنے میں زہرہ نے کیا دیکھا کہ آفت و مصیبت کے چند طوفان زدہ فرزند عرشۂ جہاز پر سے کُود پڑے۔ اور مایوسی کے عالم میں سمندر کی بے درد موجوں کے ساتھ گتھم گتھا ہو گئے۔

زہرہ نے انتہائے اضطراب کی حالت میں اپنے دونوں متناسب و خوشنما بازو سمندر کی طرف پھیلائے۔ اور پکار اُٹھی "اے وحشیانہ طاقت کے دیوتا۔ اے ظالم و بیرحم تقدیر! کیا آسمان

والے کا یہی منشا ہے کہ کچھ انسان تو شاہی محلوں کی فلک نما عمارتوں میں گدیلوں پر استراحت فرمائیں۔ اور کچھ اُن کے ہم جنس گرجتے اور گونجتے ہوئے سمندر کی تہ میں آرام پائیں؟ شان و شوکت میں پرورش پانے والے تو ظلم و جبر کو اپنا شیوہ بنائیں۔ اور فیروز جیسے دلاور غلامی و محکومی کے بوجھ سے دب کر کراہیں!

"اس جہاز نے بارہا سمندر کے چکر کاٹے ہیں۔ اور دنیا کے مغرور شہنشاہوں نے اپنے جذبۂ سفلگی کی تسکین کے لئے بارہا میرے وطن کے مائۂ ناز بہادروں کو سمندر پار پہنچایا ہے۔ اے تقدیر! اے خدائے تقدیر! ہم غریبوں نے کیا سنگین گناہ کیا تھا؟ ہمارا کیا قصور ہے۔ کہ تیری وہ مخلوق جو حسن نمائشی سے بہرہ ور نہ ہو سکی۔ جسے تیری قسامِ قسمت قدرت نے دولتمند نہیں بنایا۔ وہ نفرت اور حقارت غلامی اور محکومی کی شکار ہو رہی ہے +

تو نے تمام انسانوں کو رُوح کا آبدار موتی عطا فرمایا تھا۔ بلور کی ڈبیا کسی موتی کی آب و تاب اور قدر و قیمت کو بڑھا نہیں سکتی۔ اور دُرجِ آبنوس موتی کی اصلیت و حقیقت پر سیاہی کا پردہ نہیں ڈال سکتی۔ پھر یہ کیا اندھیر ہے۔ کہ حسن و دولت کے پُتلے اپنے آپ کو تیرے برابر خیال کرتے ہیں۔ اور ہمیں اپنے برابر بھی نہیں سمجھتے۔ کیا یہ جھوٹ ہے۔ کہ گورے گورے رخساروں پر اکثر ایسے ایسے جرائم سے رنگ انفعال جھلکتا ہے۔ جن کے تصور سے بھی ہم سیاہ رنگ لوگ ناآشنا ہیں +

میں دیکھ رہی ہوں۔ کہ اس زبردست سمندر کی لہریں سازش کر رہی ہیں۔ تا کہ اس وحشیانہ اور ظالمانہ فرق و تفاوت کا سدِّباب کر دیں۔ فطرت ایک زخمی شیرنی کی طرح جوش انتقام میں بپھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور میرے کانوں میں برابر اُس کی یہ صدا گونج رہی ہے۔ کہ خدا نے انسان کو اس لئے پیدا نہ کیا تھا۔ کہ اپنے ہم جنسوں کو پامال کرے +

"آہ! تجھ کو سمندر پار لے گئے۔ مجھے نامراد چھوڑ گئے۔ آج برسوں کی تمنّائیں نکلنے کے لئے تڑپ رہی تھیں کہ قسمت نے کلیجہ توڑ دیا۔ پیارے فیروز۔ یہ نہ سمجھنا۔ کہ میں بے وفا نکلی۔ نہیں۔ اگر اس ذلیل و سفلیہ دنیا میں مجھے تیری رفاقت نصیب نہ ہوئی۔ تو میں اُس فردوسِ آسمانی میں تیری رفیق جاودانی بن کر رہوں گی۔ جہاں کوئی کسی کو غلام نہیں بنا سکتا!"

اتنے میں ایک دو دفعہ بجلی چمکی۔ زہرہ نے کیا دیکھا۔ کہ موجوں نے جہاز کو گھیر رکھا ہے۔

آفت زدہ لوگ جان بچانے کی فکر میں مجنونوں کی طرح دنیا و مافیہا سے غافل ہو رہے ہیں فیروز جہاز کے ٹوٹے ہوئے رسے کے ساتھ لٹک رہا ہے۔ اور جہاز کے اگلے حصے پر لہریں سنسناتی وار چڑھی چلی آ رہی ہیں۔ اتنے میں جہاز بالکل ٹوٹ گیا۔ دس آدمی مستول پر لٹک رہے تھے۔ جو گرتے ہی لقمۂ نہنگِ امواج ہو گئے۔ پھر بجلی چمکی۔ فیروز سمندر کی لہروں سے لڑتا بھڑتا دکھائی دے رہا تھا۔

جہاز پارہ پارہ ہو گیا۔ اس کے مختلف ٹکڑے سطحِ آب پر مطلق العنانی سے اِدھر اُدھر تیرنے لگے۔ عظیم الشان عرشہ اپنی عظمت و استحکام کے باوجود پانی پر تنکے کی طرح تھپیڑے کھا رہا تھا۔ فیروز زہرہ کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ زہرہ کے شباب آلود رخساروں کا خون خوف اور ہیبت کے مارے واپس لوٹ گیا۔ چہرے پر مردنی چھا گئی۔ خوب صورت اور چمکیلی آنکھوں سے آخری قطرۂ اشک نکل کر تیزی سے بہنے لگا!

زہرہ کی چیخ پکار بند ہو گئی۔ وہ ریگ زارِ ساحل پر ادھر اُدھر دیوانوں کی طرح بیخودانہ ٹہلنے لگی۔ دل دھڑک دھڑک کر ہمیشہ کیلئے تھمتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ سمندر کی سطح پر ایک "رفیق و سیال سلسلۂ کہسار" کف اُڑا تھا۔ جہاز اور جہاز والوں کا نام و نشان سطحِ بحر سے اس طرح مفقود ہو رہا تھا۔ جیسے زہرہ کے دل سے اُمید کی جھلک!

تھوڑی دیر بعد تھوڑے سے فاصلے پر فیروز پھر نظر آیا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ وہ اپنی جدوجہد میں خاموش تھا۔ زہرہ جذبات کی ہچکیوں کے باعث خاموش تھی۔ بہادر فیروز ساحل تک پہنچنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ لیکن آہ! ایک تازہ لہر دندناتی ہوئی آئی۔ ان دونوں کے درمیان حائل ہو گئی۔ اور فیروز کو کئی فرلانگ پیچھے کی طرف دھکیل کر گزر گئی +

زہرہ نے اپنی آنکھوں کے سامنے فیروز کو غرق ہوتے دیکھا۔ فیروز حسرت مند نگاہوں سے زہرہ کو دیکھتا ہوا اپنے سر کے اوپر ہاتھ باندھے ہوئے ڈوب رہا تھا!

زہرہ کو تابِ ضبط نہ رہی۔ نسوانی فطرت بر روئے کار آئی۔ ایک لمحہ میں عزمِ مصمم کر لیا۔ بلند آواز سے فیروز کا نام لیکر سمندر میں کود پڑی۔ اور موجوں کے آبی مزار میں ہمیشہ کیلئے دفن ہو گئی!!

طوفان تھم گیا۔ لہریں تھکان سے چور ہو کر سو گئیں۔ سمندر پر کامل سکون و سکوت طاری ہو گیا۔ صبح نمودار ہوئی۔ پرندے چہچہانے لگے۔ بادل ایک ایک کر کے غائب ہو گئے۔ اور صاف نیلا آسمان سمندر کی خاموش سطح کے مقابل میں بہار ہمرنگی کا تماشا دکھانے لگا۔

آہ! کہاں ہیں وہ لوگ۔ جو کہتے ہیں کہ فطرت کو انسان سے ہمدردی ہے۔ اور کائناتِ عالم انسان کی ہمنوا و ہم آہنگ ہے۔ قطعاً نہیں۔ ذرّہ برابر نہیں۔ طوفان محض اس لئے آیا تھا۔ لہریں محض اس لئے برسرِ پیکار تھیں۔ جہاز محض اس لئے غرق ہوا۔ کہ دو انسانوں کو جو محبّت کے تمام منازل طے کر چکے تھے۔ دنیا میں ناکام و نامراد رکھیں!

آہ! تمام کائنات فطرت میں انسان کا کوئی ہمدرد نہیں۔ ہزاروں نامراد مر گئے۔ لاکھوں کو زمانے کے سنسار نے نگل لیا۔ لیکن دیکھ لو۔ کہ دریاؤں کی روانی۔ پہاڑوں کی بلندی۔ سورج کی تابش۔ چاند کی چمک۔ ستاروں کی جھلک۔ اور صبح و شام کے تسلسل میں کوئی فرق نہیں آیا ——— کارخانہ فطرت انسان کا محتاج نہیں ہے۔

سالک

حقیقت شراب

دیکھ کر بزمِ مغاں میں شیشۂ و ساغر دہرے
کیوں نہ کوئی عاشق بنتِ عنب خوش خوش مرے
جب لب اعجاز سے خود جام شئے دعوے کرے
چیست۔ دانی بادۂ گلگوں ہمصفا جوہرے
حسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

کر رہے تھے میکدہ والے یہ باہم مشورے
کل اگر رندوں کے آگے ہو سے زاہد کرے
کوئی اُس نادان سے یہ تو ذرا پوچھا کرے
چیست دانی۔ بادۂ گلگوں مصفا جوہرے؟
حسن را پروردگارے۔ عشق را پیغمبرے

بیدل

۴۸۶

خیالات پریشان

صبح کی معصوم سپیدیوں میں، شفق کی خونچکاں رنگینیوں میں، چاند کی مُسکر ضیا پاشیوں میں میری نگاہیں تجھے ڈھونڈتی ہیں ــ میں لستی سے دُور، اس بے خبر کنارے پر پڑا فطرت کی گوناگونیوں میں ڈوبتا چلا جارہا ہوں، چشمہ کا سیّال ترنّم، رباب کی مسرتوں میں اپنی ہستی کو گم کئے ہوئے ہے ــ

سامنے والی چراگاہ میں تنہا گھومنے والی دہقانی دوشیزہ۔ غالباً کسی سادی بے لوث محبت میں مست اپنے منتشر گلّے کو اکٹھا کر رہی ہے ــ شفّاف بلّورین سطحِ آب پر پھیلنے والی نظر، دبار کی مرتعش روانی کے ساتھ ہی چلی جا رہی ہے، کہاں ......؟

"اے میری حیات، مضطرب کی آرزوئے تنہا میری محبت صرف تیرے اعتراف کی منتظر ہے ــ ہاں، کیا تو اس اعتراف سے مجھے مسرور نہ کریگی؟

"کیا تو اپنی روح کے عمیق ترین حجاب میں چھپی ہوئی چیز (میری محبت) کے متعلق کچھ ظاہر کریگی؟ ــ کیا تو یہ نہ بتادیگی، کہ تیرا دل میرے لئے ایسی ہی مترنم کیفیات ایسے ہی رقیق تاثرات سے لبریز ہے؟

میرا سینہ تیری امانت تیری ہی طرح محفوظ رکھ سکیگا؟

بڑھتے ہوئے جھٹ پٹے میں، دور سے آنے والے بھٹکے ہوئے شکاری کے آخری نشانے کی آواز نے میرا دل دھک سے کر دیا۔

ہیں!! کیا یہ سب کچھ میرے ہی خیال کا مجسمہ تھا؟

میں ایک طویل جد و جہد اس لئے خوشی کر رہا ہوں کہ کسی دن تیرے اعتراف سے دادِ مسرت حاصل کروں۔ میں اپنا درد صرف اس لئے چھپائے بیٹھا ہوں کہ کسی تنہائی میں تیرے سپرد کر دوں۔ میرا دل اس لئے جلدی جلدی دھڑکا کرتا ہے کہ کسی شب تو اس اضطراب کو چھو لے۔ بہت سے آنسو میری نمناک آنکھوں میں صرف اس لئے تھمے ہوئے ہیں۔ کہ کسی ابھی آنے والی شام کو تیرے دامن میں ڈھلک پڑیں۔ میرا بربطِ روح ہزاروں نغمے محض اس لئے بند کئے ہوئے ہے۔ کہ تیری مضراب خلوت کسی چاندنی میں اُنہیں گدگدا نکالے۔

اے دنیا کے سب سے پوشیدہ راز کو سب سے بہتر جاننے والی میں تجھ ہی سے پوچھتا ہوں۔ "کیا تیرے نزدیک کبھی ایسا ممکن ہوگا"؟

اُس وقت جب رات کی ملکہ خاموشی کی دیوی پر نذریں چڑھا رہی ہے، ہاں، عین اُس وقت جب سکونِ مطلق کائنات کے ذرّہ ذرّہ کو غفلت کی نیند سو جانے پر مجبور کر رہا ہے۔ میں جھیل کے کنارے، سب سے قریب کی جھاڑی میں خاموش چھپا بیٹھا کانپ رہا ہوں۔ نہیں!! میں چونک کیوں پڑا؟ یہ تو میرے ہی سانس کی آواز تھی۔ جو اتنی جلدی جلدی میرے کانوں میں آ رہی تھی۔

اُفق بعید میں گاؤں کی یک ڈنڈیلی پر رہنے والے کاشتکار کے جھونپڑے میں ٹمٹمانے والے دیئے کی دھیمی روشنی کہیں مجھے جھانک نہ رہی ہو۔ نہیں یہ تو میرا ہی وہم ہے جو یوں سنسنی سی پیدا کر رہا ہے۔

ہاں ہاں، یہ کچھ آہٹ سی کیسی ہوئی، کہیں کوئی اِدھر آ تو نہیں رہا۔ نہیں نہیں یہ تو میرے ہی دل کی دھڑک ہے۔ جو میرے سارے بدن میں دہشت کی سی ایک لہر پیدا کر رہی ہے،

تو اس کو سب سے زیادہ یہی کیوں پسند ہیں؟ شائد یہی اُس کی سب سے بڑی زینت ہیں۔ مگر مجھے یہ دوسرا موقعہ دیا گیا ہے۔ لیکن اگر میں اب بھی نہ لے جا سکا؟ پھر
کیا یہ بات اُسے مُلول نہ کریگی؟ ضرور کریگی۔ کیا اس کا نازک ننھا سا دل.......
... آہ نہیں۔

میں اس مرتبہ بالکل مستقل ہوں۔ مگر اب مجھے ہوشیار ہو جانا چاہئے، ہاں وہ وقت اب بہت قریب ہے،

کنول کی کلیوں میں یکایک ایک خفیف سی جنبش پیدا ہوئی۔ میں نے جلدی سے اس تبسّم شگفتگی کو نشانی کے لئے دل میں چھپالیا۔ تھرتھراتا ہُوا پانی میں کود پڑا۔ اور سب سے پہلے کھلنے والے پھول کو توڑ کر خوشی خوشی چلدیا۔
چلتے چلتے۔ اُو کنج میں چھپ جانیوالی۔ انجان نربن۔

میری حسّیات خود اپنی سراسیمگی میں مبتلا ہیں، آہ، تیری مشتعل نگا ہوں

کی تاب نہیں لاسکتیں ۔ لیکن تیرا وہ اضطراب شناسائی جو یکسر بیگانگی میں تبدیل ہو جانا چاہتا تھا ۔ کیا بہترین اعتراف یگانگت نہ تھا ۔ ؟

میں نے اُسے تیری شرمائی ہوئی آنکھوں کے حجاب میں دیکھا، سمجھا، اور صرف اپنے لئے مخصوص کرلیا ۔ ہاں اُس سے بے چین ہو جانے کا میں ضرور گنہگار ہوں ۔ مگر میری متحیر حرکتوں کی وارفتگی کو پُر تقصیر نہ ٹھیرا ۔ اپنی برہمی کا سبب اپنی ہی لرزشِ پا سے پوچھ ۔

ساون کی اندھیری رات میں، بادلوں کی مہیب تاریکی کے درمیان، تنہا جھلملانے والے تارے کی دھیمی روشنی کی طرح میرے دل میں امید کی صرف ایک جھلک باقی ہے ۔ لیکن یہ نوید مسرت، یہ لمئہ حیات، یہ نور الوہیت، میں خوب جانتا ہوں میرا زائیدہ فطرت نہیں ۔ میں آلام کے مدّ و جزر میں مبتلا ہوں ۔ اُوداسی میری شگفتگی حیات پر غالب آچکی ہے ۔ لیکن میرا حوصلہ اب بھی تمام کائنات میں نشر مسرّت پر آمادہ ہے ۔

یہ حوصلہ ضرور تیری اس سب سے پیاری آرزو کی ضو ہے ۔ جو تو اپنے دل کے عمیق ترین حجاب میں چھپائے ہوئے ہے ۔

میری کشتی ناکامیوں کی منجدھار میں ڈگمگا رہی ہے، میرے حواس انتشار سے ہمکنار ہو چکے ہیں ۔ مگر میرا استقلال اب بھی طوفان کے سب سے بڑے سمندر کو عبور کرنے پر کمربستہ ہے،

یہ استقلال ضرور تیرے اُس سب سے پیارے خیال کا پرتو ہے جو تو اپنے دل کے عمیق ترین حجاب میں چھپائے ہوئے ہے ۔

میں پستی کے گہرے غار میں پڑا ہوا ہوں، میری قوّت قریب قریب سلب ہو چکی ہے ۔ تاہم میری ہمت اب بھی اُونچی سے اُونچی بلندی پر چڑھ جانے کے لئے تیار ہے ۔

یہ ہمت ضرور تیرے اُس سب سے پیارے جذبے کا عکس ہے جو تو اپنے دل کے عمیق ترین حجاب میں چھپائے ہوئے ہے۔

مجھے تیرے دل کے بہت سے راز نہیں معلوم مگر یہ بات اچھی طرح جانتا ہوں کہ محبّت ہر مشکل سے مشکل کام کو آسان کرسکتی ہے۔

مخمور

شعر - اور - تصویر

یہ دونوں آرٹ ہیں جس طرح تصویر ایک قادر فن مصور کی دست صنعت کا حسن عمل ہے۔ اسی طرح شعر بھی ایک موزون طبع شاعر کی صورت گر طبیعت کا نتیجۂ فکر ہے۔

فرق یہ ہے۔ کہ مصور اپنے مفہوم خیالی کو عملی جامہ پہنا کر جب عالم ظہور میں لاتا ہے تو اُسکی تہ نشین کیفیات کو رنگ روغن۔ کاغذ۔ پتھر۔ مٹی کی مادی صورتوں میں ڈھالکر ان کا ایک مجسمۂ مثالی گھڑتا ہے۔ حسن باطن کی باریکیاں اس ہیولے کے ظاہری نقش و نگار میں ہم شکل فطرت ملبوس ہو جاتی ہیں۔ چشم مشاہدہ اُسے تصویر کہتی ہے۔

اور شاعر کی فطرت مصورہ اپنی تحریکات دماغی ۔ اور واردات قلبی کے ڈھانچے کی تعبیر کے لئے ایسے الفاظ مناسب کی تلاش سے اپنی سعی کو مشکور بناتی ہے۔ جن کے حسن معانی کی دل آویزیاں جذبات انسانی کی روحانی بالیدگی کے لیئے آغوش پرورش متصور ہوں۔ ذوق سلیم کے نزدیک اس مشکلہ کا نام شعر ہے۔

بعض احباب کہتے ہیں۔ کہ اس حقیقت ثانیہ کا انکشاف محققین مغرب کی تلاش کا نتیجہ ہے۔ مگر شاید ان کی وسعت مطالعہ مشرق کی مجتہدانہ صورت آفرینیوں سے محدود بینائی ہے۔

شیراز کا مصور خیال۔ حافظ۔ اب سے پونے چار سو سال پیشتر اس گتھی کو سلجھا چکا ہے۔ حالانکہ اُسوقت تک علوم مغربیہ کی برق بارجدتیں ایشیا تو درکنار خود اپنے ہی گھر آنگن کے اجالے میں ناکام حسن شباب تھیں ؎

اگر باور نداری رواز صورت گر چیں پرس — کہ مانی نسخہ می آرد ز نوک کلک مشکینم

بیدل

آئینۂ کائنات

(۱)

وہ اپنی سیدھی سادی زندگی کے تسلسل سے تنگ آگیا تھا۔ زندگی جس میں نہ کوئی شعریت تھی۔ نہ تنوع اس کو زہر معلوم ہونے لگی تھی +

رات کو جب وہ سوچتا۔ کہ وہ سو کر اُٹھے گا۔ تو اس وقت صبح ہو گی۔ وہی روز کی سی صبح۔ جو صرف ایک دوسری رات پیدا کرنے کے لئے طلوع ہوتی ہے۔ تو وہ جزبز ہو کر رہ جاتا۔ کیا کیا یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ کہ رات کے بعد صبح کے علاوہ کچھ اور چیز برآمد ہو؟ دن کے بعد رات کے سوا کوئی اور کیفیت پیدا ہو جائے +

وہ پھول دار پودوں کو ایسی بے فکری سے پامال کرتا ہوا گزر جاتا تھا۔ کہ سوائے اُس کے طریق رفتار کے اور کوئی چیز اُس کی بے بصارتی کے متعلق دیکھنے والوں کو اطمینان نہ بخش سکتی۔ یہ پودے ہیں۔ سوائے پھولوں کے یہ اور کیا چیز پیدا کر سکتے ہیں پھول ویسے ہی پھول، اسی رنگ کے پھول دوبارہ پیدا کر دینا ان کا کام ہے۔ اگر کسی کو ان پودوں سے اس کے سوا کچھ اور امید ہوتی۔ تو میں اپنی زندگی ان کی غور پرداخت میں صرف کرسکتا تھا +

دنیا صرف ایک مشین ہے گھڑی کی طرح اس کو کوک دیا گیا ہے۔ اس کے پرزے مقررہ رفتار پر اپنا کام کرتے ہیں۔ ان میں زیادہ سے زیادہ جو تبدیلی کبھی ظاہر ہوسکتی ہے وہ کوئی مجھ سے لکھوا لے۔ یہاں کبھی بادلوں سے پھول نہ برسیں گے۔ ہوا روشنی پیدا نہ کریگی۔ موسیقی شکل اختیار نہیں کر سکتی۔ پھول نغمہ ریز نہیں ہوسکتے۔ دنیا کے سست تسلسل میں کوئی چیز ایسی دلچسپی پیدا نہیں کر سکتی۔ جن پر کوئی متحیر ہو جائے۔ اس کی فرسودگی ایسی کوئی حیرت نہیں جن سکتی۔ جس کو دیکھ کر کوئی دنگ رہ جائے +

(۲)

رفتہ رفتہ مادی اشیاء کو چھوڑ کر اس کا غور و فکر دنیائے خیال کی طرف متوجہ ہوا۔ یہاں

اس کے جزبہ حیرت کی تکمیل کو کئی معمے دعوت انکشاف دے رہے تھے۔ مگر اُس کے مضمحل تخیل کو اُس تاریک اور پر اسرار معمے کے حل کا جنون ہُوا۔ جسے موت کہتے ہیں!

موت کی دزدیدہ آمد۔ اُس کے آنے کی مشکوک ساعت۔ اس کی عالمگیر حکومت۔ عجیب و پراسرار قوت۔ اس کے پرلی طرف کی نامعلوم کیفیت جسے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کرجانے والے کے سوا اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اُس کے تخیل کو ہر وقت اپنی مہیب اُلجھنوں میں مصروف رکھے گی۔

(۳)

اُس نے فیصلہ کرلیا۔ کہ موت اور زندگی کے درمیان جو اسرار کا سیاہ پردہ حائل ہے وہ اُس کو چاک چاک کر دیگا۔ آخر ایک رات کی تاریکی میں جب کہ اُس کی محو تصور آنکھیں دوسری دنیا کی حیرتوں کا اندازہ لگا رہی تھیں۔ اور اس کا دل اس نئے عالم کی عجائبات کے خیال سے دھڑک رہا تھا۔ اُس کے سُست ہاتھوں نے پستول کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لیا۔ پستول پیشانی تک آیا۔ گرفت مضبوط تر ہوتی گئی۔ انگشت شہادت میں ایک فوری حرکت پیدا ہوئی۔ ایک کرخت آواز نے رات کے سکوت کو جھنجھوڑ کر پہلے سے بھی زیادہ سنسان بنادیا۔

اُس نے پستول کو حیرت سے دور پھینکدیا۔ جب اُسے محسوس ہُوا۔ کہ وہ اسی کرسی پر بیٹھا ہے۔ کرسی قدیم دنیا میں موجود ہے۔ جس کا بے مزہ تسلسل اس کے لئے سوہان روح ہے پردے کے پیچھے حمید کی آنکھوں میں ایک کم بقا سی خوشی چمک اُٹھی۔ صرف اس لئے کہ آنسو اسے چھپا دیں۔

(۴)

اس کے عزیزوں اور دوستوں میں مدت تک مشورہ ہوتا رہا۔ کہ آخر کس طرح اُس کے دل و دماغ پر سے یہ عجیب و غریب تاریک سائے اُٹھا دئے جائیں۔ مگر وہ کسی سے بحث کرنی پسند نہ کرتا تھا۔ ہر ایک کی دلیلوں اور مباحث کا جواب اس کے پاس صرف ایک خاموشی تھی۔ آخر حمید کا خلوص محبت جو دن رات اُس کا نگران رہتا تھا اسے اس بات پر رضامند کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ وہ شادی کرلے۔

شادی کے بعد جب حمید نے اُس کی بے نور آنکھوں میں جو سوائے تھکن اور دل برداشتگی کے اور کسی چیز سے آشنا نہ تھیں۔ ایک چمک تاروں کی سی روشن دیکھی۔ تو اُس کا پُرمعنی تبسّم اُس کی زبان کھلوائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ بولا "عورت فطرت کی اختراع فائقہ ہے۔ عورت کی آنکھوں کے تحیرافروز عمق۔ اُس کے گیسوؤں کے نکھار اور انتشار۔ اس کے متناسب جسم کی خمار انگیز دلکشی میں کیا کیا ہے۔ آہ میں کس طرح اس کے سحر سے علیحدہ ہو کر اُسے دیکھوں اور بتاؤں۔ وہ صبح بن کر کائنات کو روشن کر سکتی ہے۔ اور زُلفیں بکھیر کر دن رات بنا سکتی ہے۔ اس کی نگاہ پھولوں کی تروتازگی ہے۔ اس کی رفتار موسیقی کی جان ہے۔ ارے عورت ہی تو وہ آئینہ ہے جس کے اندر کائنات منعکس نظر آتی ہے۔ کوئی اُسے ظاہر نہیں کر سکتا۔ ایک زندگی تو کیا۔ کئی زندگیاں پا کر بھی کوئی اُسے بیان نہیں کر سکتا۔ ممکن نہیں کہ شاعر اُس کو لکھ دے۔ مصوّر اس کو نقش کر دے۔ مغنّی اُس کو گا دے۔ اور زندہ رہ جائے۔ فنونِ لطیفہ میں وہ محض دوسروں کی نگاہوں میں ہے۔ خود نہیں ہے +

(۶)

اور پھر جب وہ ایک روز زنان خانے میں بلایا گیا۔ اور اُس نے دیکھا۔ کہ اس کی بیوی نقاہت سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہے۔ اور اس کے پہلو میں ایک ننھّی سی جان پڑی ہے۔ اس کی ان تمام امیدوں۔ آرزوؤں۔ اور خواہشوں نے جو مجبورِ اظہار تھیں اس کی روح کے اس کے تمام انتظار اور بےقراری نے جو وہ نہ سمجھ سکتا تھا۔ کہ کیا ہے زندگی پالی ہے۔ تو یک لخت اسے کائنات عالم طفلی میں معلوم ہونے لگی +

وہ جھکا اور اُس نے اُس ننھّی جان کو کانپتے ہوئے ہاتھوں میں اُٹھا لیا +

اس مسرت کے ساتھ جو صناع کو اپنی تمام کوششوں میں کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ اُس نے بچّے کا منہ چُوم لیا۔ اور رو پڑا +

سید امتیاز علی تاج

یہ کس کا جذبِ محبت ہے اس طرح طاری۔ کہ ایک ذرہ بھی عالم میں ذی قرار نہیں

ماجرائے عقل وعشق

عشق در کار و کار در نیرنگ فتنہ در صلح و امتحان در جنگ

عشق یک جذبۂ و ہزار سلوک عشق یک نغمۂ و ہزار آہنگ

عشق را دار و عقل را منبر عقل در رنگ و عشق خود بیرنگ

مسندِ عقل بر لب ساحل عشق را تختگاہ کام نہنگ

عقل را دست بوس مور و ملخ عشق را سُفتہ گوش شیر و پلنگ

عقل در پردہ گفت ہاں خاموش عشق مستانہ برکشد آہنگ

عقل در رنگ اختلاف آورد عشق صد رنگ را کند یکرنگ

بی ادب این سخن چہ می فہمد ابلہ نشناخت ماہی از خرچنگ

عقل با عشق نسبتے دارد جام بلّور و بادۂ گلرنگ

چیست این امتیاز موت و حیات سنگ بر شیشہ شیشہ ہا بر سنگ

داغ بر داغ چیده است فراق | سینہ آرزوست پشت پلنگ

گفت ملائے خاکِ نیشا پور | آں ادا فہم دانش و فرہنگ

کفر از عشق و عشق از ایماں | چیست ایں فتنہ ہا و ایں نیرنگ

ہاں گرامی ز پردہ باخبر ست

گر نظیری غلط کند آہنگ

گرامی

اقوال زرّیں

(۱) سچّی خوشی صرف عملی زندگی میں حاصل ہوسکتی ہے۔

(۲) آدمی کو چاہیئے۔ کہ اپنے فرائض حتی المقدور دیانتداری کے ساتھ ادا کرے۔ پھر ممکن نہیں کہ طبیعت افسردہ ہو،

(۳) انسان کے ناقابل اظہار خیالات کی مثال بالکل اُن منہ بند کلیوں کی ہے۔ جو کھلنے سے پہلے مرجھا جاتی ہیں۔ اور جن کے نازک ہونٹ شبنم کے معجز نما قطروں کی لذّت سے ہمیشہ کے لئے محروم رہ جاتے ہیں،

(۴) آپ نے کبھی اس امر پر بھی غور کیا۔ کہ اگر کوئی شخص آپ سے کسی معاملے میں اختلاف رائے کرلے۔ تو آپ کے دل میں اس کی طرف سے کس قدر کدورت پیدا ہوجاتی ہے لیکن والدین کی مامتا اس قدر زبردست ہے۔ کہ وہ اختلاف رائے پر بھی غالب آجاتی

ہے۔ اور ان کو اس بات پر مجبور کرتی ہے۔ کہ وہ اپنی اولاد کے لئے ان امور کو بھی جائز تصور کریں جنہیں وہ دراصل ناجائز خیال کرتے ہیں،

(۵) انسانی خلقت میں اچھی چیز کو جلدی قبول کرنے کا مادہ قدرت سے ودیعت کیا گیا ہے۔ اور اگر خود پسندی اور تعصبات کی زنجیروں سے انسان اپنے آپ کو آزاد کرلے تو اُس کا انتخاب موجودہ صورت کی نسبت دُگنا قابل تحسین اور قابل اعتبار ہوجائے،

(۶) شاید تبسّم بھی متعدّی امراض کی طرح ایک دوسرے تک اثر رکھتا ہے۔

(۷) انسان کے دل کے بہت سے ایسے کونے ہیں جن کو دوستوں کی متجسس نگاہوں سے بھی پوشیدہ رکھنا داخل مصلحت ہے،

(۸) شباب کے عالم میں دماغ کی نسبت دل زیادہ قوی ہوتا ہے،

(۹) ہر ایک شخص کو کم و بیش دلی تعلقات کے ٹوٹ جانے کا صدمہ ہوتا ہے،

(۱۰) جس طرح موسیقی کے ترانے کو خوشنما بنانے کے لئے کرخت سُر بھی ضروری ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان کی زندگی کو مکمل بنانے کے لئے غم کا ہونا بھی ضروری ہے،

(۱۱) کونسا شخص ہے جو کسی ناممکن یا بظاہر ناممکن شئے کی نسبت ہوائی قصر تعمیر نہیں کرتا۔ بالخصوص محال کی تلاش تو فطرت انسانی کا خاصہ ہے،

(۱۲) رات کی تاریکی میں انسان جس خوبی کے ساتھ اپنے خیالات مجتمع کرسکتا ہے دن کو ممکن نہیں کہ وہی بات نصیب ہوسکے۔ تا تاکہ شور نہ ہو، فرض کیا کہ تنہائی بھی نصیب ہوگئی۔ لیکن خود سورج کی شدید روشنی خیالات کے اجتماع میں حارج ہوتی ہے بیرونی اشیاء کا مشاہدہ غیر ارادی طور پر توجہ کو اپنی طرف منعطف کرلیتا ہے اور اندرونی خیالات پر پوری توجہ صرف کرنا یا پیچیدہ تخیلات کی گتھی کو سلجھانا محال بلکہ ناممکن ہوجاتا ہے،

(مترجمہ عبدالوحید) مرزا محمد سعید ایم اے

لب گزیدی و من از ذوق فتادم مدہوش ۔ بانو ایں کیفیت بادہ ندانم چوں کرد

۷۸۶

شاہ عباس صفوی

(بعض دلچسپ واقعات)

صنادیدعجم میں شاہ عباس صفوی کا نام نامی صفحہ تاریخ پر جلی حرفوں میں نظر آتا ہے۔ یہ بادشاہ جہاں فقط تلوار ہی کا دھنی نہ تھا۔ بلکہ آئین سیاست و رعایا پروری میں بھی مشہور آفاق تھا۔ دودمان رسالت و ولایت کے ساتھ اس کا حسن عقیدت درجہ کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ اپنی خاص املاک جنہیں سلطنت سے سروکار نہ تھا۔ چہاردہ معصومین علیہم السلام کیلئے وقف کر دی تھیں۔ عتبات عالیات کی زیارت کو پاپیادہ جاتا تھا۔ اولیا و مشائخ، علما و فضلا سے دلی عقیدت رکھتا تھا۔ ملک کے نظم و نسق میں ہمیشہ مستعدی سے کام لیتا تھا۔

شاہ عباس کی عمر کا بیشتر حصہ معرکہ آرائی وصف شکنی و تسخیر قلعہ جات و سرکوبی اشرار میں گزرا۔ سلاطین عصر سے (خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم) رشتۂ اتحاد پیدا کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ اس کے دربار میں فرنگستان و روس و ہندوستان و کاشغر و تبت اور دیگر ممالک کے ایلچی برابر آتے رہتے تھے۔ تحف و ہدایائے گوناگوں پیش کرتے رہتے تھے۔

سلاطین مسیحیہ مثلاً فرانسہ و انگلیس و لندیس و پرتگال و ہسپانیہ نے اس شاہنشاہ عدالت پناہ کے آوازۂ جلال و عظمت کو سن سن کر سلسلہ نامہ و پیام جاری کیا۔ مقتدائے طوائف مسیحیہ یعنی پاپائے رومۃ الکبریٰ نے بھی اس کی بارگاہ عالی میں ایک عقیدت نامہ ارسال کیا تھا کیونکہ شاہ عباس کا برتاؤ مسیحیوں کے ساتھ بھی جو اس کی قلمرو میں رہتے تھے۔ نہایت پسندیدہ تھا۔ اصفہان میں جو عیسائی اس وقت سکونت پذیر تھے۔ انہوں نے پاپائے روم کے نامہ کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا تھا۔ اور جسے مصنف تاریخ عالم آرائے عباسیؒ نے اپنی تصنیف میں نقل کیا ہے جس کی عبارت حسب ذیل ہے :-

(پاپائے روم کا نامہ)

"اعلیٰ حضرت نواب معزالدولہ بادشاہ والاجاہ تحیۃ وسلام از ما بر بندگان شما کہ پرتو عنایت بے غایت الٰہی و ملجا جمیع عالم و خلاصہ اولاد بنی آدمی۔ آنچناں پادشاہی کہ مقتدا و مهتدائے جمیع عالمیان خصوصاً نزد جانشین حضرت مسیح خداوند کہ پادشاہان عظیم الشان ما بہ بزرگی قدر و منزلت ملتجی بادمیشوند۔ حال آنکہ شما در بزرگی و عظمت و جبروت برتری بسیں واجب است۔ بر ہر فردے از بنی آدم دعائے دوام دولت قاہرہ خصوصاً بر دعاگویاں اینجانب کہ فرض دانستیم کہ در کلیساہائے خویشتن استغاثہ و استدعاء از دیاد عمر ایشاں نمائیم۔ امید کہ سایۂ عنایت الٰہی کم مباد از سرت۔ چونکہ شفقت بندگان ایشاں در نہایتیست۔ بعضے از مردمان شما کہ دریں حدود اندو ر عزت و حرمت نزد عیسویان مثل بزرگان آسمان اند۔ آوازہ بزرگی و عدالت شما بر طرف ساختہ آوازۂ حیز و بادشاہ فرس راچراکہ بندگان شما قانون کتاب غیر و بادشاہ فرس اند و بالجملہ در رومۃ الکبریٰ کہ محل دانایان است جمیع را اقتدا بہ عقل و اندیشہ بندگان ایشان است و ہمیشہ آوازہ بزرگواری آن عالی جناب را بگوش جان قبول نمودہ ایم۔ و بداں خوش حال و مسروریم و مارا شکے دریں باب بہ ہیچ وجہ نیست بلکہ در قدیم الزمان جمیع فرنگیاں را ایں اعتقاد است۔ زیراکہ مدت مدید است کہ بندگان ایشان طائفہ از پادریان را کہ عبارت از علمائے فرنگ اند۔ جائے بایشاں دادہ و نہایت عزت و حرمت داشتہ اند۔ جمیع امامان رومۃ کبریٰ را کہ جانشین حضرت عیسیٰؑ اند نہایت محبت با ایشان است۔ از جہتہ فرستادن ایلچیان عظام کرام ذوی الاحترام خجستہ پیام بایشاں چراکہ یاد از یگانگی و اتحاد می دہد سیما کہ رہبانان و پادریان پابرہنہ از کوہ کرمیلو کہ در پائے تخت شما جائے داشتند لبریز اند از خوشحالی وخرمی و ہمیشہ آوازہ بزرگی و رفعت و جلال بندگان ایشان باینجانب میرسانند چراکہ ایشان حق شناسند و فراموش کار نیستند فلہذا التسخیر جمیع بلاد ما بطنطنہ و بزرگی تام کردہ آیندہ بشمشیر خصوصاً آنکہ پادریان کوہ کرمیلو را جائے دادہ۔ ایشان بحال خود در کلیساہا عبادت بطریقہ خود بجا می آورند بے آنکہ احدے مزاحمت بحال ایشان برساند۔ بنائً علیہ ما جانشینان حضرت عیسیٰ ہدیۂ باطن از بادشاہ بادشاہان کہ غنی است در رحمت خویش پاداش جزائے نیک

ودر فتح و فیروزی بواسطۂ ایشان می طلبیم۔ وچنانچہ روشنائی دولت ایشان مانند ماہ تمام عالم را روشن ساختہ۔ در احکام الٰہی راسخ کروند امانذر بزرگی حضرت عیسٰےخداوند ما باسلطنت باشند۔ ہمیشہ مقصود حاصل آید وپارسال مکاتبات ورسولاں بجانب عیسوی رومہ کبری ملازمان رامر نماید تا اثر محبت ودوستی ظاہر گردد۔ بدیں وسیلہ اُمتان وخدمتگاران حضرت عیسٰے از روئے اخلاص درحضوردل دعا ازجہت بندگان شاہے نمائید ودائم الاوقات ازجہت تفقدات ونوازشہا کہ نسبت بہ پادریان کوہ کرمیلو می نماید آن طائفہ ممتاز عالم اند۔ ازیں جہت بلند میگردانند آوازۂ بزرگیہائے ایشان را در رومہ کبری کہ پائے تخت حضرت عیسٰے است۔ اما میل محبت ما از قدیم الایام است از جہت محبت حضرت ایم تا پاکہ باآں عالیجناب مظفری دارد۔ امید کہ آفتاب حقیقت الٰہی برسر آں عالی مقدار تابندہ وپایندہ باد"

ایلچی ہندوستان کی آمد

شاہ عباس صفوی کے عہد حکومت کے بتیسویں[۳۲] سال یعنی ۱۰۲۸ھ میں بادشاہ جہانگیر کا ایلچی بارگاہ صفوی میں حاضر ہُوا۔ جہانگیر نے میرزا برخوردار ملقب بہ خان عالم کو ایلچیگری کی خدمت پر مامور کرکے شاہ عباس کے دربار میں بھیجا۔ خان عالم قبیلہ برلاس چغتائی سے اور عہد جہانگیری کے امرائے بزرگ میں تھا۔ جہانگیر اُسے بھائی کہہ کر پکارتا تھا۔ شاہ عباس صفوی نے یادگار علی سلطان کو اپنا ایلچی بناکر جہانگیر کے پاس بھیجا تھا۔ جہانگیر نے خان عالم کو اُسی یادگار علی سلطان کے ہمراہ ایران بھیجا۔ یادگار علی سلطان اور خان عالم دونوں چند دنوں تک ہرات میں ٹھیرے رہے۔ اور جب شاہ عباس کی بارگاہ کو روانہ ہونے کا قصد کیا۔ تو اتفاقاً بادشاہ کو سپاہ روم کی سرکوبی کے لئے آذربائجان کی سمت کوچ کرنا پڑا۔ لہٰذا شاہ عباس نے اپنے مقربان بارگاہ میں سے کلب علی بیگ کو خان عالم کے استقبال کو روانہ کیا۔ کہ اُسے ہرات سے دار المومنین قم میں لیجائے۔ تاکہ جب تک آذربائجان سے واپس آئیں اُس وقت تک خان عالم وہیں قیام کرے۔ مگر خان عالم ہرات سے روانہ ہوکر بجائے قم دار السلطنت قزوین میں ٹھیر گیا۔ اور پھر وہاں سے قم کی طرف روانہ ہُوا۔ مصنف عالم

آرائے عباسی کا بیان ہے کہ جس دن خان عالم قزوین میں داخل ہوا ہے میں وہاں موجود تھا۔ اور اس ایلچی کی شان وشوکت وتجملات ظاہری کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا اور جتنے دیرینہ سال لوگ اُس وقت قزوین میں موجود تھے۔ ان سب کو یہ کہتے سُنا کہ خاندان صفویہ کے آغاز ظہور سے آج تک ہندوستان سے بلکہ روم سے بھی کوئی ایلچی اس شوکت واسباب وجاہ وحشمت کے ساتھ ولایت ایران میں نہیں آیا۔ اکاسرہ وکیان سابقہ کے عہدہ میں کوئی ایلچی اس تزک واحتشام کے ساتھ آیا ہو تو اور بات ہے خان عالم نے جس وقت ملک ایران میں قدم رکھا تھا۔ اُس وقت ایک ہزار ملازمان معتبر بادشاہی اور ملازمان خاصہ نوکر وخدمتگار اُس کے ہمراہ تھے۔ ان میں قوشچیوں اور میر شکاروں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی۔ بہتوں کو خان عالم نے ہرات سے واپس کر دیا تھا۔ جس دن دارالسلطنت قزوین میں داخل ہوا۔ ملازمان سرکار صفوی۔ اور اُس کے ملازمان خاصہ ملازموں کے ملازم خدمتگاران ومحافظان جانوران سب ملا کر کوئی سات آٹھ سو نفر اُس کے ہمراہ تھے۔ ملازمین کے علاوہ دس زنجیر فیل قوی ہیکل پر تکلف جھولوں سے اور زیوروں سے آراستہ اور طرح طرح کے جانور مثلاً ببر وپلنگ۔ یوز وکرگدن۔ مرغان سخنگو وگاو ہائے بحری جو پالکی اور سکاسن (؟) کھینچتے جاتے تھے۔ اس کے ہمراہ تھے۔ جب شاہ عباس آذربائجان کی طرف سے دارالسلطنت قزوین میں واپس آیا۔ تو خان عالم کی طلبی ہوئی۔ اور وہ اپنی فرودگاہ سے بادشاہ کے دربار کو چلا۔ جب حوالی شہر میں پہنچا۔ تو امرائے جلیل القدر نے اس کی پیشوائی کی۔ اور نہایت اعزاز واحترام کے ساتھ اُسے باغ سعادت آباد میں ٹھیرایا۔ دوسرے دن جب شاہ عباس صفوی چوگان بازی وقیق اندازی میں مشغول تھا خان عالم نے شرف باریابی حاصل کیا۔ بادشاہ نے حد سے زیادہ اعزاز واحترام کیا اور فرمایا کہ ہمارے اور تمہارے بادشاہ والاجاہ کے درمیان طریقۂ اخوت وبرادری قائم ہے۔ اور آنحضرت تمہیں بھائی کہہ کر پکارتے ہیں۔ اور بھائی کا بھائی بھی بھائی ہوتا ہے۔ خان عالم اس عزت افزائی پر پھر کورنش بجالایا۔ اور شاہ عباس نے اُسے گلے سے لگایا۔ تعظیم وتکریم شاہانہ ونوازشہائے بے تکلفانہ سے سرفراز فرمایا۔ خان عالم جتنے دنوں تک دارالسلطنت

قزوین میں رہا۔ بادشاہ نے ہرطرح خاطر و تواضع کی۔ خان عالم کا ارادہ یہ تھا کہ جہانگیر کی طرف سے جسقدر تحفے لایا تھا۔ ایک ایک کرکے تمام اہالیان دربار کے سامنے بادشاہ کی نظر سے گزرانے یعنی تمام تحفے ایک ہی دن پیش نہ کردے بلکہ ہر روز ایک ایک قسم کے مختلف نمونے ملاحظہ میں پیش کرے۔ تاکہ پیشکس کا سلسلہ کچھ دنوں تک جاری رہے۔ مگر چونکہ شاہ عباس مازندران میں زنگول کا شکار کھیلنے کے لئے جانے والا تھا۔ اور پروگرام مقرر ہوچکا تھا۔ اور وقت تنگ تھا۔ اس وجہ سے خان عالم کا جو مطلب تھا وہ بر نہ آیا۔ شاہ عباس کی سیر چشمی کا مقتضا یہ نہ تھا۔ کہ فقط تحف و ہدایائے جہانگیری کے معائنہ کے۔ لئے اپنا پروگرام بدل دیتا۔ لہذا حکم ہُوا کہ خلاصۂ تحف یعنی ہر جنس کے دو دو تین تین عدد مرتب کرکے ایک دن اُس کے سامنے پیش کئے جائیں۔ اور باقی تحفے بیوتات میں داخل کئے جائیں۔ جو اپنے وقت پر رفتہ رفتہ ملاحظہ سے گذرتے رہینگے۔ اگرچہ خان عالم کی مرضی یہ نہ تھی مگر کیا کرتا بادشاہ کی رضاجوئی لازم تھی۔ لہذا نفیس ترین تحفے موازی تین سو عدد انتخاب کرکے بادشاہ کے ملاحظہ میں گذرانے۔ بادشاہ نے بعد ملاحظہ کوچ کا حکم دیا۔ اور مازندران کی جانب شکار کھیلنے کو روانہ ہوگیا۔

ایک واقعہ غریب

۱۰۳۰ھ میں جب عباس نے مشہد مقدس کی زیارت سے فارغ ہوکر رادکان و جتونشان کی راہ سے استرآباد کا رُخ کیا۔ تو شکار کھیلنے کی غرض سے چند دن کے لئے رادکان میں پڑاؤ ڈال دیا۔ اہالیان رکاب۔ مقامات دور و دراز سے شکاروں کو گھیر کر ایک جنگل میں لائے۔ جرگہ میں شکاروں کی یہ کثرت تھی۔ کہ محاسب وہم بھی اُن کی تعداد کا اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ ایک فرسخ کے حلقہ میں شکار ہی شکار نظر آتا تھا۔ بادشاہ گھوڑے پر پہلے گورخروں کی جانب متوجہ ہُوا۔ اور بہت دیر تک شکار میں منہمک رہا۔ آخرکار سب کو نشانہ تیر بنا کر ہرنوں کی طرف گھوڑا اڑا ڈالا۔ مقربان رکاب میں بس دو ایک نفر ہمراہ تھے۔ کمان بہرامی بادشاہ کے ہاتھ میں تھی۔ اور جلودار تیروں کے دستے حاضر کرتے جاتے تھے۔ جانور تیروں کا نشانہ بن بن کر

گرتے جاتے تھے۔ یہانتک کہ ایک سو ساٹھ شکار ضرب تیر سے ہلاک ہوئے۔ جانوروں پر عرصہ شکار اس قدر تنگ ہوگیا۔ کہ آہوان تیز رفتار تگ و تاز سے عاجز آگئے۔ اور پیادوں نے آہوؤں کو ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ صاحب عالم آرائے عباسی لکھتے ہیں۔ کہ اُس وقت تک دو تین ہزار آہو باقی تھے۔ جنہیں یارائے گریز نہ تھا۔ اس موقع پر ایک امر غریب مشاہدہ میں آیا۔ یعنی اُن آہوان پابستہ کو جب کوئی چارہ کار نظر نہ آیا۔ تو گویا بالہام ملہم غیب بادشاہ کے گرد جمع ہوگئے اور دو تین بار اس طرح صدقے ہوئے۔ جیسے کوئی طواف کرتا ہے اور طواف کرچکنے کے بعد جتنے آہو تھے۔ سب بادشاہ کے گرد زانو کے بل بیٹھ گئے۔ اور بیٹھتے ہی اُن پر نیند کا غلبہ ہوا۔ بادشاہ نے یہ واقعہ عجیب و غریب مشاہدہ کرنے کے بعد حکم دیا۔ کہ اب ان جانوروں سے کوئی تعرض نہ کرے۔ غروب آفتاب کا وقت قریب آگیا۔ مگر وہ آہو سوتے ہی رہے۔ آخر کار بادشاہ نے حکم دیا۔ کہ ان سب کو جنگل کی طرف جانے دو۔ کوئی ان کی راہ نہ روکے۔ تقریباً دو تین ہزار آہو و ام مصیبت سے نجات پاکر جانب صحرا روانہ ہوئے۔ (ریاض عظیم آبادی)

غزل

میں جس خیال سے فرقت میں بیقرار رہا
اسی کا ذکر شب وصل تا بہ یار رہا

خوشی کے نام سے دکھتا ہے رنج کا کیا ذکر
وہ دل جو مشق ستمہائے روزگار رہا

ذلیل ہوگئی ہر دلعزیز ہو کے یہ رسم
نہ چاہ چاہ رہی اب نہ پیار پیار رہا

اُمید آکے بندھا گئی آس اب کس کی
نہ جی میں صبر نہ آنکھوں میں انتظار رہا

پس فنا بھی نہ مٹی لگی ٹھکانہ سے
گلی گلی یوں ہی اُڑتا میرا غبار رہا

تمہارا درد تو تم سے بھی دلنشیں نکلا
ہزار بار اُٹھا پھر ہزار بار رہا

رہا کیا بھی قفس سے تو کن دنوں صیاد
خزاں رہی نہ کہیں موسم بہار رہا

خلش مٹا دے گریباں کی کاش دست جنوں
یہ ایک تار ہی باقی گلے کا ہار رہا

خودی و بیخودی عشق جوش و ہوش سے تہی
نہ وہ چڑھاؤ نشے کا نہ وہ اتار رہا

بیدل

زردشت کا مقبرہ

آتش پرستوں کا مشہور و معروف پیغمبر حکیم زردشت منوچہر بن ایرج بن فریدوں کی نسل سے تھا، اس کا وطن آذربائیجان اور اصلی نام سپنتمان تھا۔ حکیم مذکور نہایت قابل اور بلا مبالغہ حکیم تھا۔ وہ جملہ علوم مروجہ کا فاضل اور ہر فن میں کامل تھا۔ جس طرح اور قابل لوگ صراط مستقیم سے الگ ہو گئے ایسے ہی یہ بھی پیغمبری کا دعویدار تھا۔ اور کتاب اوستا کو الہامی صحیفہ بتلاتا تھا۔ یہ کتاب قدیمی پہلوی زبان میں ہے۔ اور حکیم نے اس کا سلیس ترجمہ کر کے پاژند نام رکھا، دوسری الہامی کتاب ژند تھی، انہی کتابوں کو وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرتا تھا۔ حکیم کی وفات کے بعد موبدان زردشتی نے پاژند کی شرح لکھی، جس کا نام پارده ہے۔ دوسرے موبدین نے پاژند اور ژند سے اخذ کر کے مضامین مع شرح مرتب کئے۔ اور مدتوں تک وہ عجم میں متداول رہے۔ لوگ اس تمام سلسلہ کو الہامی خیال کرتے تھے۔ سکندر اعظم کے دار وگیر میں یہ کل مضامین فنا ہو گئے۔ لیکن اوستا ژند اور پاژند بچی ہوئی رہ گئیں۔ اور سلسلہ بہ سلسلہ مسلمان منزجمین تک پہنچیں۔ چنانچہ چوتھی صدی میں ان سب کتابوں کا ترجمہ ایمانداری کے ساتھ عربی میں ہوا۔ اوستا میں کل ۲۱ سورتیں تھیں۔ اور ہر سورۃ چار سو صفحہ پر لکھی جاتی تھی۔ آغاز و انجام عالم حشر و نشر وغیرہ کل مضامین پر مفصل بحث ہے۔ ان کتابوں کا جرمن اور انگریزی زبانوں میں ترجمہ جرمن علماء نے کیا ہے۔ اور یہ "مشرق کی مقدس کتب" کے سلسلہ میں شامل ہیں۔

حکیم زردشت ۵۴۹ق م گشتاسپ کے دربار میں حاضر ہے۔ اور شاہ مذکور حکیم کے شعبدات اور علوم کا امتحان کرنے کے بعد کامل ایمان لے آیا۔ چنانچہ گورنمنٹ ایران کی حمایت سے مذہب زردشتی کل مملکت میں رائج ہو گیا۔ گشتاسپ کا بیٹا اسفندیار بھی اس مذہب میں نہایت راسخ تھا۔ اس کے زمانہ میں آذربائیجان

بلخ - ارض آرمن - ہندوستان - روم - چین وغیرہ میں آتشکدے طیار کئے گئے،

حکیم زردشت کا انتقال ۷۷ برس کی عمر میں ارجاسب کے ہنگامے میں ہُوا۔ ایک تورانی بہادر تور براتور کا نیزہ لگا، اور وہی تیر قضا ثابت ہُوا،

زردشت کے معنی نفس کل اور نفس ناطقہ ہیں، اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے زمانہ کا بے نظیر حکیم تھا۔ اس کے متبعین بھی بڑے قابل اور یگانہ گذرے ہیں چنانچہ اس کا شاگرد حکیم جاماسپ مصنف جاماسپ نامہ تاریخ میں خاص مرتبہ رکھتا ہے۔

حکیم کا مقبرہ باکو (روس) کے علاقہ میں جھیل کاسپین کے کنارے جہاں تیل کی بے شمار کانیں ہیں، واقع ہے۔ ڈہائی ہزار برس تک یہ مزار بوسہ گاہ موبدان رہا، لیکن اب وہاں کوئی نہیں جاتا۔ اور گورنمنٹ روس (جب کبھی دنیا میں تھی) نے اس مقبرہ اور آتشکدہ کو بطور صنادید قدیمہ محفوظ رکھا تھا، یہ مقبرہ بہت بڑا ہے۔ اور چار دانگ طرف چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے ہیں۔ ان میں پوجاری رہا کرتے تھے، بڑا وسیع صحن ہے، وسط میں مقبرہ اور قریب ہی وہ آتشکدہ ہے۔ جس میں ڈہائی ہزار سال تک مقدس آگ روشن رہی، اور ایک لمحہ کو بھی نہیں بجھی،

اب تک اکثر مقامات میں آتشکدے موجود ہیں۔ اور موبدان مجوس جابجا زرشتی مذہب کی اشاعت میں مشغول ہیں۔ لیکن ان کی کوشش نہایت ہی محدود ہے اور عام طور پر حال معلوم نہیں ہوسکتا،

(محمد شفیع الدین خاں)

بقائے حیات

جو دم ہے یہاں مثل سحر گاہی ہے	جو شخص ہے یاں سوئے عدم راہی ہے
رہتا کبھی قافلہ کے پیچھے نہ انیس	اے عمر دراز تری کوتاہی ہے

(انیس)

بچے کی گلابی مسکراہٹ

جناب منشی مہاراج بہادر برق دہلوی بی۔اے منشی فاضل

خندۂ گل میں یہ رنگینی کہاں یہ لطافت یہ شیرینی کہاں
اس صباحت پر یہ نمکینی کہاں اس میں ہے جائے سخن چینی کہاں

ختم ہے تیرے لبوں پہ واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

غنچۂ نو کا تبسم زیر لب دلفریبی کی ادائیں ہے غضب
اس میں پر اتنا کہاں جوشِ طرب شان ہے تیرے تبسم کی عجب

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

دلکشا ہے خندۂ جامِ بلور اس میں ہے اک خاص کیفیت ضرور
تازگی کا پر نہیں اتنا وفور جس سے نور آنکھوں کو ہو دل کو سرور

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

خوشنما ہے سلکِ گوہر کی دمک راحت افزا ہے ستاروں کی چمک
دلربا ہے جلوۂ برقِ فلک پر کہاں ان میں یہ نورانی جھلک

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

نیم وا کلیوں میں بانکی آن ہے خندۂ ناز آفرین کی شان ہے
حسن ان کا تازگی کی جان ہے تجھ سے رو کش ہوں یہ کب امکان ہے

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

مسکراہٹ شمع کی ہے دلگداز — اس کے شعلے میں ہے رنگِ سوز و ساز
ہے طراوت کے اثر سے بے نیاز — اس میں کب ہے یہ ادائے جاں نواز

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

خندہ زن ہوتے ہیں جب غنچہ دہاں — دل جلوں پر ٹوٹتی ہیں بجلیاں
ان کا ہنسنا سو تکلف کا نشاں — جلوۂ معصومیت اس میں کہاں

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

کوئی حسرت کش ہے یا مہجور ہے — شادمانی جس سے کوسوں دور ہے
لاکھ جوشِ غم سے دل معمور ہے — تجھ سے ملتے ہی نظر مسرور ہے

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

ہلکی ہلکی تیرے ہونٹوں پر ہنسی — مایۂ فرحت ہے جان زندگی
موجِ رقصاں ہے صفائے قلب کی — اس میں قدرت نے بھری ہے دلکشی

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

جانفزائی اس کی اک تاثیر ہے — غمزدوں کے حق میں یہ اکسیر ہے
مرہمِ زخمِ دلِ دلگیر ہے — جس سے دل روشن ہوں وہ تنویر ہے

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

جلوۂ انجم میں نُور اتنا کہاں — حسن و خوبی کا ظہور اتنا کہاں
جامِ صہبا میں سرور اتنا کہاں — شادمانی کا وفور اتنا کہاں

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گلابی مُسکراہٹ کی ادا

آئینہ ہے قلب نورانی تیرا — پرتوافگن جس میں ہیں صدق و صفا
جلوۂ حسن آفریں ہے رونما — ہے تبسّم اس کا عکسِ پرضیا

ختم ہے تیرے لبوں پر واہ وا
یہ گلابی مسکراہٹ کی ادا

(از برقی دہلوی بی۔ اے منشی فاضل)

خمارِ غربت اور کیفِ وطن

الفت وطن انسان کی روحانی مسرتوں کا جز ہے مگر بعض مناظر غربت بھی انسان کیلئے وطن فراموشی کا باعث ہیں۔ چنانچہ دنیائے زندگی اگرچہ عالم غربت ہے مگر اسکے دلچسپ مشاغل مظاہر پرست طبائع کیلئے کھلم کھلا عقبیٰ فراموشی ہیں۔

اڈیٹر

ایں چہ می بینم بہ بیداری۔ نہ بیند کس بخواب — زانکہ دریک حال ہم در راحتم ہم در عذاب
گاہ گریم چوں صراحی۔ گاہ خندم چوں قدح — گاہ بالم چوں صنوبر۔ گاہ بالم چوں رباب
گریم و در گریۂ من خندہا بینی عیاں، — خندم و در خندۂ من گریہا یابی حجاب
زاں ہمی گریم کہ حالا کام دل شد نا امید — زاں ہمی خندم کہ دل برکام جان شد کامیاب
زاں ہمی زارم خمار غربتم بنمود زار — زاں ہمی بالم کہ در کیف وطن بالد شباب
شادم از دل شادیش جان از غمش دلشاد نیست — فرخم از یاد او۔ واز دوریش حالم خراب

در جگر از فرقت.... ہزاراں نیشتر
در دلم از وصل یاراں موجزن جوئے شراب

—— نکہت شاہجہان پوری

بادۂ دوشیں

غالب کے میخانے سے

دودِ سودائے تتق بست آسماں نامیدمش
خندہ برخواب پریشان زد جہاں نامیدمش

وہم خاکے ریخت در چشم بیاباں دیدمش
قطرۂ بگداخت بحرِ بےکراں نامیدمش

باد دامن زد بر آتش نوبہاراں خواندمش
داغ گشت آں شعلہ از مستی خزاں نامیدمش

قطرۂ خونے گرہ گردید دل دانستمش
موجِ زہرابے بطوفاں زد زباں نامیدمش

غربتم ناسازگار آمد وطن فہمیدمش
کرد تنگی حلقۂ دام آشیاں نامیدمش

بود در پہلو بہ تمکینے کہ دل می گفتمش
رفت از شوخی بہ آئینے کہ جاں نامیدمش

ہرچہ از جاں کاست در مستی بود افزودمش
ہرچہ با من ماند از ہستی زیاں نامیدمش

تا ز من بگسست عمرے خوش شد لبش پنداشتم
چوں بمن پیوست لختے بدگماں نامیدمش

او بہ فکرِ کشتنِ من بود آہ از من کہ من
لاابالی خواندمش نامہرباں نامیدمش

تا نہم بر وے سپاسِ خدمتے از خویشتن
بود صاحب خانہ اما میہماں نامیدمش

دل زباں را رازدان آشنائی ہا نخواست
گاہ بہماں گفتمش گاہے فلاں نامیدمش

ہم نگہ جاں می ستاند ہم تغافل می کشد
آں دمِ شمشیر وایں پشتِ کماں نامیدمش

در سلوک از ہرچہ پیش آمد گزشتن داشتم
کعبہ دیدم نقشِ پائے رہرواں نامیدمش

برامیدِ شیوۂ صبر آزمائے زیستم
تو بریدی از من و من امتحاں نامیدمش

بود غالب عندلیبے از گلستانِ عجم
من ز غفلت طوطیِ ہندوستاں نامیدمش

موجے از شرابِ ہستم لختے از کبابِ ہستم
شورِ من ہم از من و سوزِ من ہم از من بس

جانِ جان

ہاپوڑ کے ساتویں عظیم الشّان سالانہ مشاعرہ منعقدہ ۲۰ و ۲۱ ستمبر ۱۹۱۹ء کا انتخاب جناب حکیم شاہ ابوالمحاسن صاحب شفیق حیدرآبادی نے ۸۴ صفحوں پر ایک خوشنما رسالہ کی صورت میں شایع کیا ہے (حشر برپا کردیا ہے نالۂ شبگیر نے) اس مشاعرہ کا مصرعہ طرح قرار دیا گیا تھا یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہ ہاپوڑ کا عظیم الشان مشاعرہ اپنی تمامی خصوصیّات مسلمہ کے لحاظ سے تمام ہندوستان میں بے نظیر و لاجواب مان لیا گیا ہے یہ مشاعرہ فی الواقع اہل سخن و اہل کمال کے اظہار مرتبت کے لئے ایک حد تک معیار قرار دیا جاچکا ہے۔ دور دور اطراف و جوانب سے مشاہیر شعرا کا جسقدر اجتماع اس ایک بزم سخن میں ہوتا ہے کسی اور انجمن میں ایسا نہیں دیکھا گیا رسالہ کے چار ابتدائی صفحے سالانہ رپورٹ کے نذر ہوئے ہیں جو مرزا غالب مرحوم کے اس شعر سے شروع ہوتی ہے، ؎

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو　　عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

اس رپورٹ میں سالگذشتہ میں مشاعرہ نہ ہونے کے وجوہ، سال رواں میں مشاعرہ کے انعقاد کی تحریک۔ تقرر تاریخ۔ تشریف آوری شعرا۔ انتظام قیام و طعام شکریۂ چندہ دہندگان اور روسائے ہاپوڑ کا درج ہیں۔ عطاء بدایونی کا یہ قطعہ بھی اسی رپورٹ میں ہے۔

مانا کہ ہم اسیر ولائے رفیق ہیں　　گرویدۂ عنایت و لطف شفیق ہیں
لیکن ہر ایک محو مدارات ہے عطا　　ہاپڑ کے سب رئیس نہایت خلیق ہیں

مولوی سید انوار الحسن صاحب بسمل جے پوری کے متعلق لکھا ہے بسمل جے پوری نے مصرع پر چند شعر فارسی زبان میں پڑھے۔ جن میں (نے) ردیف سے حرف نفی فارسی (نے) کے معنے اسطرح لئے گئے تھے۔

عاجزم درماندہ ام رائے نے و تدبیر نے　　عمر بگذشت و کشودے از سوئے تقدیر نے
دوش بسمل را ز تیغ ناز آں سفاک کشت　　آہ ایں بیچارہ را جرمے نے تقصیر نے

جس وقت یہ غزل مشاعرہ میں پڑھی جارہی تھی، اُس وقت ہمارے کان میں کسی طرف سے یہ آواز آئی

تھی کہ حرف نفی نے بالکسر نہیں ہے بالفتح ہے۔ اور نے علامت فاعل اردو بالکسر ہے اُس وقت
توہم بلحاظ مصلحت موقع خاموش ہو رہے، اب ہم کہتے ہیں۔ کہ یہ ایک تلفظ کی غلطی ہے، جو اکثر
ناواقفان مکتب کے تلفظ سے عام ہو گئی ہے۔ ورنہ صحیح لفظ (نے) بالکسر ہی ہے۔ تمام کتب لغات میں
بالکسر ہی لکھا ہے۔ نیز برہان العجم۔ لسان الملک۔ سپہر کاشانی میں ہے نے بکسر اوّل و یائے
مجہول افادہ لائے نفی کند۔ انوری کے قصیدہ میں جس کا مطلع ہے ؎

صبا بسبزہ بیاراست باغ دنیی را　　نمونہ گشت زمین مرغزار عقبی را

اس قصیدہ کے سب قافیہ نالہ ہو کر بالکسر آئے ہیں۔ اسی قصیدہ کا ایک شعر ہے ؎

بہیچ لفظ تو نون ہم بیانہ پیوندد　　وجود نیست مگر در ضمیر تو نے را

انہیں قوافی میں حکیم ناصر خسرو کا قطعہ ہے ؎

چہ چیز بہر تو نیکو تر ست در دنیا　　سپاہ نے ملکے نے ضیاع نے رمہ نے

نیست جو نے اور است سے مرکب ہے بالکسر ہے اس کو کوئی نیست بالفتح نہیں کہتا۔ بہر حال یہ
ایک تلفظ کی غلطی ہے، جس میں اکثر عوام اور بعض خواص بھی مبتلا ہیں،

اس رسالہ میں چیدہ چیدہ شعرا کے کلام کا انتخاب ہے انتخاب مجموعی حیثیت سے عمدہ کیا
گیا ہے تاہم کہیں کہیں فروگذاشت یا مسامحت بھی پائی جاتی ہے اور یہ مقتضائے بشریت ہے مثلاً ؎

اس سے زیادہ کیا ہے میری بیگناہی کا ثبوت
کی دعائے مغفرت قاتل تری شمشیر نے

قطع نظر اس کے کہ دعائے مغفرت زبانی شمشیر ایک ادعائے غیر متحقق ہے مصرع اولی
میں زیادہ کی (ی) تقطیع سے ساقط ہے، شاعر کو اس کا خیال نہیں رہا۔ اور نہ اس طرح کہہ سکتا
تھا ؎　اور کیا ہوگا ہماری بے گناہی کا ثبوت۔　یا ؎ اس سے بڑھ کے کیا ہے میری
بیگناہی کا ثبوت۔ ایسی لغزشیں اس قدر کم ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں، لیکن انتخاب میں ضرورت
سے زیادہ رعایت کی گئی ہے۔ اور یہ شاید کسی مصلحت پر مبنی ہے، بعض مشہور شعراء کے پندرہ
شعر پورا کرنے کے لئے کمزور شعر انتخاب کر لئے گئے ہیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ رسالہ
انتخابی حیثیت سے بہت دلچسپ اور قابل قدر ہے،

قوافی ہیں تین قافئے شمشیر۔ بے پیر۔ دلگیر ایسے ہیں جن کے متعلق محققین میں نزاع تحقیق ہے۔ انہیں قوافی کے متعلق خاکسار راقم کا ایک مختصر نوٹ آخر رسالہ میں حسب مندرجۂ ذیل درج ہے جس کا اندراج یہاں بھی افادہ سے خالی نہیں ہے،

مضمون

دیدہ چوں تحقیق بیں شد میتواں نظارہ کرد
جوہر شمشیر را از سایۂ شمشیر ہا (شوکت بخاری)

شمشیر

فارسی و اردو کے تمام شعرا لفظ شمشیر کو تدبیر و تقدیر کے قافیہ میں کہتے چلے آئے ہیں۔ جلال مرحوم نے اس لئے کہ شمشیر شم (بمعنی ناخن) اور شیر (اسد) سے مرکب ہے۔ اور شیر بیائے مجہول ہے مجہول و معروف کو ہم قافیہ کرنے میں اختلاف ردف ہوتا ہے۔ اور اختلاف ردف عیب ہے اس کو تدبیر و تقدیر کے قافیہ میں متروک کیا ہے۔ مرحوم نے اپنی تائید میں کچھ تو فن قافیہ سے مدد لی ہے جس میں ردف کا اختلاف ایک عیب فاحش ہے۔ اور کچھ لسان الملک سپہر ملک الشعراء ایران کی کتاب براہین العجم فی قوانین المعجم سے استناد کیا ہے،

تمام اساتذہ امیر و داغ و تسلیم و شمشاد ظہیر سالک مجروح نے شمشیر بیائے معروف کہا ہے میرے نزدیک اگرچہ اصلاً لفظ شمشیر بیائے مجہول ہی صحیح ہے مگر ہر کلیہ میں استثنا بھی ضرور ہوتا ہے۔ چونکہ شمشیر بیائے معروف میں تمام شعرائے فارس و ہند کو اتفاق ہے اور کثرت استعمال نے مجہول سے معروف کر دیا ہے۔ اس لئے داخل استثنا ہے اور اس کے ترک سے ایک جاندار قافیہ غزل سے کم ہو جاتا ہے میں تقدیر و تدبیر کے قافیہ میں شمشیر کا استعمال بروے فن صحیح سمجھتا ہوں،

کتاب براہین العجم میں مجہولات یائی و وادی کا بیان بلحاظ پابندی ردف کیا گیا ہے لیکن اکثر مقامات پر مصنف کے اجتہاد نے تمام متقدمین کے کلام پر خط نسخ کھینچ دیا ہے میرے رسالہ تحقیق الاتم کی طباعت کا انتظار کرنا چاہیئے جس میں اس ملک الشعراء کی تردید بوجہ اتم

کی گئی ہے،

بے پیر

اساتذۂ اردو آغاز دورِ اوّل سے انشاء مصحفی و ناسخ و آتش ذوق مومن وغیرہ تک بت بے پیر اور کافر بے پیر صفت محبوب میں نظم کرتے رہے اور دور آخر میں بھی تلامذہ آتش و ناسخ اور اسیر و تسلیم لکھنوی نے بھی بت بے پیر نظم کیا ہے ؎

ہے تمنّا ہوں میں کشتہ اس بت بے پیر کا | گل کرے میرا چراغ عمر دم شمشیر کا
(اسیر)

ہائے مرنے بھی نہ دیگی خوبیٔ قسمت مجھے | نزع میں سنتا ہوں آنا اس بت بے پیر کا
(تسلیم)

سب سے پہلے مرزا غالب نے اپنی تحقیق زبان فارسی سے صفت محبوب میں بے پیر کا استعمال ناجائز ٹھیرایا۔ کہ یہ لفظ ایک قسم کی گالی ہے۔ اہل زبان اس کا استعمال صرف صفت محبوب میں نہیں کرتے۔ چنانچہ رقعات غالب میں ہے،

لفظ بے پیر نورانی بچہ ہائے نژاد کا تراشا ہوا ہے۔ جب میں اشعار اردو میں اپنے شاگردوں کو باندھنے نہیں دیتا۔ تو پھر تم کو فارسی میں کیونکر اجازت دونگا۔ بے پیر ایک لفظ ٹکسال باہر ہے،

اس آواز پر محقق شعرا نے اعتنا کی اور مستند شعرا۔ امیر و داغ و جلال و شمشاد نے اور ان کے تلامذہ و متبعین نے بے پیر کا استعمال جائز نہیں رکھا۔ چنانچہ ان بزرگوں کے کلام میں یہ لفظ نہیں آیا۔ افسوس ہے کہ نصف صدی گذرنے پر بھی غیر محقق شعرا کو اسکی خبر نہیں اور بت بے پیر اور کافر بے پیر نظم کر جاتے ہیں،

فارسی میں جلال اسیر اور شیخ علی حزین کے کلام میں بے پیر ملتا ہے لیکن محبوب کی صفت میں نہیں بلکہ دشنام کے معنی میں،

مرزا جلال اسیر | طفل محبوب فزا کرد است تسخیر آئینہ | بے مروت سنگدل بے رحم بے پیر آئینہ
شیخ علی حزین | کجا پاس حجاب از زاہد بے پیر می آید | کہ تا میخانہ ہم با خرقہ و ندو بری آید

از اللغۃ الاغلاط میں لکھا ہے۔ کہ ایں لفظ شم از دشنام دارد و در فارس شایع است۔

دل دلگیر

نواب فصیح الملک دہلوی کی متروکات میں ہے، مرحوم کے باخبر تلامذہ تو اس کا استعمال جائز نہیں رکھتے، لیکن جن کے علم میں (اور ایسے بہت ہیں) اس کا ترک نہیں ہے وہ لکھتے ہیں ہم نے وجہ ترک مغفور کے اکثر تلامذہ سے دریافت کی۔ لیکن وجہ ترک کسی کو معلوم نہیں۔ اس قسم کی ترکیبیں اساتذہ فارس کے کلام میں بہت پائی جاتی ہیں۔ جن میں دل کی صفت میں ایسا لفظ آتا ہے جس کا ایک جزو دل بھی ہوتا ہے۔ بہارِ عجم میں صفات دل میں لفظ دلگیر لکھا ہے اور خواجہ حافظ شیرازی نے دل کی صفت بیدل نظم فرمائی ہے ؎

از سر کوئے تو رفتن نتوانم گامے | ورنہ اندر دل بیدل سفرے نیست کہ نیست

مولانا شوکت بخاری ؎ | بسکہ بے زلفش بگلشن خاطرم دلگیر بود
نالۂ بلبل بگوشم نالہ زنجیر بود

منشی امیر اللہ تسلیم۔ | دیکھ کر گیسوئے سنبل کو چمن میں تسلیم
یاد آجاتے ہیں دو دل دلگیر کے پیچ

ایضاً | رہنے دو سینہ میں پیکاں کہ یہی ٹھیک ہے دو | آرزو آپ کی تنہا دل دلگیر میں ہے

اگر اضافت توصیفی نہ ہو۔ تو بیدل و دلگیر بمعنی عاشق ہوگا۔ مولانا جامی فتوح الحرمین میں فرماتے ہیں ؎

از پئے تسکین دلِ بیدلاں | یک دو سہ بیتے ز فراقم بخواں

میرے نزدیک دل دلگیر فارسی ترکیب ہے اہل ہند اس کے رد قبول کے مجاز نہیں ہیں،

(سید معشوق حسین اطہر ثنائی)

(ہاپوڑی۔ وکیل جے پور)

بُلبُل اور شاعر

اے بلبلِ خوش الحان اے مطربِ گلستان اے نغمہ ریزِ الفت، اے طائرِ غزل خواں
پھولے پھلے ہیں ہر سو شمشاد و رُوح ریحاں تو کس لئے ہے نالاں کس فکر میں ہے غلطاں
صیّاد کا لگا ہے کھٹکا تجھے چمن میں
یا دل اُلجھ گیا ہے نرگس کی بانکپن میں
شاید گلوں کا ہنسنا تجھ کو رُلا رہا ہے یا کلیوں کا تبسّم کچھ دِل جلا رہا ہے
شورش کو زخم دل کی نالہ بنا رہا ہے ہاں - اب میں راز سمجھا دِل چوٹ کھا رہا ہے
بس صاف یہ عیاں ہے ان شکوہائے غم سے
نالاں ہے تو گلوں کے طرفہ ترین ستم سے
بیشک بجا ہے - جو تو شکوہ کرے گلوں کا آزار ایک ہی سا کچھ ہے بلاکشوں کا
مجھ سے ہی مِلتا جُلتا شیون ہے بلبلوں کا آشفتہ تو گلوں کی مشتاق گل رخوں کا
مارا ہے آسماں نے سینوں میں تیرِ الفت
دونو کا جل چکا ہے سامانِ خوابِ راحت
تو جان باختہ ہے - آفت نصیب میں ہوں تو دِل گداختہ ہے کلفت نصیب میں ہوں
تو غم نواختہ ہے ظلمت نصیب میں ہوں تو دردیافتہ ہے فرقت نصیب میں ہوں
گو مختلف بہت ہے دونو کی نوعِ خلقت
لیکن ہے اک قلم کی تحریر لوحِ قسمت
کیا خوب ہو یہ بلبل - دونو جو ایک جا ہوں غربت میں رہ کے دونو آپس میں غم رُبا ہوں
دخل اور کا نہ ہو واں بس ہم ہی بے نوا ہوں فریاد میں، فغاں میں، شیون میں ہمنوا ہوں
گرم فغاں ہوں دونو - محوِ بکا ہوں دونو

دُکھ ایک کو جو پہنچے، درد آشنا ہوں دونو

موزوں سا ایک صحرا۔ آ چل کوئی بسائیں غربت میں دونو ملکر اک غمکدہ بنائیں
رو رو کے ایک دریا صحرا میں پھر بہائیں اپنے وطن پہ آنسو جی کھول کر گرائیں

معمور ہوں سروں میں رنگِ وفائے ملّت
ہر ساز ہو ہمارا سوز آشنائے ملّت

بالائے کوہ میرا چھوٹا سا جھونپڑا ہو اور پاس اُس کے تیرا تنکوں کا گھونسلا ہو
سامانِ مختصر بھی دونو کا ایک سا ہو تیرا پروں کا بستر اور میرا بوریا ہو

اُٹھ دیکھ کوئے گوشہ اب بہرِ آشیانہ
میں بھی لگاؤں اپنا چل کر وہیں ٹھکانہ

پھر واں نہ ہم کو آخر خویش و قریب چھیڑیں اک سوز و ساز دونو حرماں نصیب چھیڑیں
پُردرد کوئی قصّہ اے عندلیب چھیڑیں آزاد فکر ہو کر ذکرِ حبیب چھیڑیں؛

آجائے پھر نظر میں نورِ ضیائے وحدت
دِل کی بجھائیں آتش ہم تشنۂ حقیقت

محمد مشتاق علیخانؔ

سرورِ خودی

منم کہ چارہ گرِ درد آشنائے خودم
منم کہ دردِ خدا دادم و دوائے خودم
منم کہ سر نہ آرم بہ سجدۂ ناحق
منم کہ در رہِ حق محو نقش پائے خودم
منم کہ منزلِ مقصود زیرِ پا دارم
شکستہ پایم و تاہم بہ مدعائے خودم

(یاس عظیم آبادی)

۷۸۶

ضبط آرزو

اسیر دل نہ ہو کیوں حرف آرزو میرا
گلا دباتی ہے کمبخت آبرو میرا
(آتی)

(۱)

عام معتقدات زندگی اس اعتراف کے آگے سربسجود ہیں۔ کہ دنیا ایک تماشا گاہ حوادث ہے۔ آئے دن اس میں تنوع عالم کی وہ وہ گوناگوں نیرنگیاں ظہور پذیر تلوّن ہوتی رہتی ہیں۔ جن کے ایک ایک برق وشر روش کرشمہ سے لطف اندوز ہونے کے لئے انسان کی عمر طبعی ناکافی ہے۔

انقلاب زمانہ کی قدرت مصورہ دن رات اس کے صفحات پر ایسے نت نئے مرقعے پیش کرتے رہنے کی عادی ہے۔ جس کی ہر صورت چشم مشاہدہ کو عمر بھر محو تماشا اور مسحور نظارہ رکھنے پر قادر ہے۔ مگر انسان کی فطرت چونکہ طبعاً زود سیر۔ جدت پسند۔ اور ماضی فراموش واقع ہوئی ہے۔ اس لئے اس کا حافظہ بہت کمزور ہے

وہ آج ایک چیز کو بڑے ذوق شوق سے دیکھتا ہے اور کل اُسے یوں دل سے بھلا دیتا ہے۔ کہ کبھی خواب۔ وافسانہ بن کر بھی اُس کے پہنائے یاد وخیال میں موجزن نہیں ہوتی +

وہ روز اپنی صبح حیات کو نسیم بہار کے گلباریوں اور شعلہ ریزیوں سے تجلّے گاہ برق ایمن بناتا ہے بیضائے سحر کی زریں شعاعوں سے اپنے تنگنائے وطن اور جہان آرزو کے گوشہ گوشہ کو بقعہ نور کر لیتا ہے۔ مگر جہاں دن ڈھلا شام پڑی۔ اور تغییر فطرت کی بے نیازیوں نے پھر اُس کی دنیا بدل دی۔ اب نہ وہ آتش گل کے ملتہب شعلے اور خاموش چنگاریاں اس کے دل وجگر کی ٹھنڈی چوٹیں سینکنے گرم کردینے کی قدرت رکھتی ہیں۔ اور نہ

بضائے وطن کی دلسوزیاں سواد غربت کی تاریکی نصیب راتوں کی چراغ بتی میں ہاتھ بٹاتی ہیں۔

وہ اپنے شباب زندگی کے ہر رات کو مینائے آب حیات کے رستے اُبلتے نشوں اور صہبائے وصل کے لچکتے چھلکتے جام سبو سے مسرور و سرشار کرکے میٹھی نیند سوتا ہے مگر جب کروٹ لیتا ہے۔ آنکھ کھولتا ہے۔ تو اس کی شبستان عشرت کی مخمور صبح بجائے بادہ شبانہ کی سرمستیوں کے شراب صبوحی کی اور اور لذتوں میں مست کیفیت نظر آتی ہے۔ غرض اس کا ہر حال ماضی سے بے تعلق اور مستقبل سے بے پروا ہے۔

۲

نسیان انسان کا خاصہ لازمی ہے۔ مگر میری فطرت انسانیہ شاید اس کلیہ سے مستثنےٰ ہے۔ میں باوجود متواتر کوششوں کے بھی ایک خیال کو بھی یاد سے بھلا دینے پر مطلقاً قادر نہیں ہوں۔

دسمبر ۲۰ء سے لیکر اس وقت تک کئی مہینے گذر گئے۔ مگر میرے ممنون احسان جذبات آجتک اس شعر کی صہبائے شعریت اور کیف موثریت سے مسرور ہیں۔ جو اس مقالہ کا طراز عنوان ہے۔

امتداد زمانہ کے بیسیوں انقلاب صورت پذیر ہوئے۔ باد حوادثات کی سینکڑوں آندھیاں آئیں۔ اور گذر گئیں۔ مگر میرے غربت کدۂ زندگی کی ویرانیاں اس وقت تک انہیں نغمات سے معمور ہیں ؎

اسیر دل نہیں کیوں حرف آرزو میرا
گلا دباتی ہے کمبخت آبرو میرا

اس میں شک نہیں بظاہر تو یہ ایک معمولی سا شعر صرف دو موزون مصرعوں کا منظوم شیرازہ ہے، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو اس میں وہ غیر معمولی خوبیاں روپوش الفاظ و معانی ہیں جو در حقیقت عشق و محبت کے زریں اصولوں کی ادب آموز کہی جانے کی مستحق ہیں۔

اللہ اللہ کیا ضبط آرزو ہے اور کیا پاس آبرو۔ جبر عشق۔ اور اخفائے راز اگرچہ یہ مرد افگن اور منشئی فطرت کیفیات ساغر الفت کی تہ نشین تلچھٹیں ہیں۔ مگر پھر بھی دردی کشان خودی و خودداری

کے لئے موجب سرور و سرخوشی ہیں۔

۳

عارفان ذوق و کیف کے نزدیک شعر اور شراب دونوں ایک ہی چیز کے مرادف نام ہیں۔ اور جب ان خوش جوش موجوں کا سرچشمہ نوع انسانی کی صنف لطیف عورت کے جذبات لطیفہ ہوں۔ تو ان نشوں کی گراں کیفی مرد کے لئے ناقابل برداشت ہے۔

مگر میری حسیات طبعی اور ذوق شعری اس جام شراب کے نہ اس لئے ممنون سکر ہیں کہ یہ سرور و خمار ایک ایسے ساقی کی بادہ پیمائیوں۔ اور ایک ایسے مطرب سامعہ نواز کی نے نوائیوں کا عمل کیف اور حسن فکر ہے "جو محض عورت ہے" بلکہ اس لئے موجب استعجاب و حیرت ہے کہ یہ شعر اس صنف نازک کے ایسے طائفہ کی عورت کا تخیل زادہ ہے جس کے طبقہ کے ہر فرد کے ساتھ مذہب۔ اخلاق۔ سوسائٹی اور دنیا کے تمام شعبے (جو فطرت انسانی کے صیغہ عشق و عاشقی کے ساتھ نہایت بیدردانہ تغافل برتنے کے عادی ہیں) نسبت معاشرت تک کھلم کھلا ناجائز جانتے ہیں۔ اور جو اپنے ارتکاب عصمت فروشی کی بدولت باوجود عورت ہونے اور نسوانی جنسیت رکھنے کے بھی اخلاقاً عورت کے اطلاق کی بھی صحیح مستحق نہیں ؎

صنم آں نیست بہ بیعانہ فروشد صنمی

ممکن ہے کہ بعض سطحی نظریں میری اس جرأت کو بھی مجرم اخلاق سمجھ کر شکوہ سنج ہوں کہ میں نے اس شعر کو ایک شاہد حسن فروش کا طبعزاد بتا کر اس کی تمام شعریت کو ملیا میٹ کر دیا۔ لیکن اس شعر کا ایک بازاری عورت کے قلب و دماغ سے پیدا ہونا ہی سلیم المذاق حضرات کے نزدیک سب سے زیادہ قابل وقعت اور لائق تحسین ہے۔

مضمون شعر جہاں عورت کی فطرت صحیحہ اور غیرت منفعلہ کا پرزور مظہر ہے۔ وہیں اس حقیقت باطنہ کا بھی منکشف اسرار ہے۔ اللہ اکبر "عورت" تصانیف قدرت کی بہترین تدوین ہونے کے ساتھ کتنی بلند اور رفیع ہستی ہے۔ کہ باوجود ایسے ذلت آمیز اور کراہت انگیز نواحی حالات کے بھی جو شاہدان بازاری کے ہر وقت شامل حال رہتے ہیں نفس عورت ہونے کی بنا پر نسائیت کے آبگینہ کو ذرا بھی ٹھیس نہیں لگنے دیتی۔ اور حیا

پاسِ ناموس جو عورت کے اخلاقی زیور ہیں۔ بدستور اپنی مخصوص شوکت و عظمت کے ساتھ اپنی جگہ جلوہ گر ہیں مجسمہ زندگی نشۂ شباب سے سرتاپا مخمور ہے۔ عشق و محبّت کے طاقت گداز جذبوں سے دل و دماغ چور ہیں۔ طرزِ معاشرت بھی ایسا نہیں جو تکمیل آرزو میں مانع آئے۔ یا اظہارِ عشق اور بیانِ شوق کو عفتِ نسوانی کی شرم و حیا بے حجابی جانے۔ پھر بھی ایک عورت کی طرح فطرت کے تقاضائے صحیحہ کا دامن ہاتھ سے نہیں دیتی۔ اور اپنی ساری دلی تمناؤں کو سینے سے لگائے اُنہیں عصمت کی دیویوں کی طبیعت ثانیہ کی نقل کو حسن عمل جان رہی ہے۔ جن کے ملبوس ظاہری کا روپ بہرے بھیس بدلے جی رہی ہے۔ یہ کیوں۔ اس لئے کہ عورت ہے۔

۴

فطرت انسانی کی گہرائیاں ابتدائے ازمنۂ علم و فضل سے آج تک بڑے بڑے علمائے نفسیات کے غور و خوض کی جولانگاہ رہی ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ثانیہ سب کے نزدیک مسلّم ہو چکی ہے کہ مرد کے جذبات الفت میں وہ عمق اور وہ ضبط راز کی صلاحیت جو حیات عاشقی کی روح ہے۔ قریب قریب مفقود ہے۔ ہاں عورت جو کائنات عالم کے چہرے کا آب و رنگ ہے۔ اس نعمت عظمےٰ اور دولت بے زوال سے اتنی مالا مال ہے کہ ادراک اُس کی فطرت کی گہرائیوں کے فہم سے قاصر ہے۔ اور تصور اس کے جذبات و احساسات کی پہنائیوں کا احاطہ کرنے سے خاسر ہے۔

"شرم و حیا" "پاسِ ناموس" اور "ضبط راز" یہ ایسے الفاظ ہیں جو مردوں کی دنیا میں شاذ و نادر ہی شرمندۂ معنی ہوتے ہیں لیکن عورت کے نزدیک یہ اس کی حیات الفت کا جزو لاینفک ہیں۔

مرد عالم مجبوری میں ان تمام بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ مگر عورت نفسیات کے اس راز سے بخوبی واقف ہے۔ کہ عشق کی دلآویزی اس کی "پراسراری" میں ہے۔ جب راز ہی نہ رہا۔ تو محبّت کی شعریت کہاں رہ گئی۔

نفسیات کے فلسفی کہتے ہیں کہ مرد کی فطرت میں فاعلیت غلبہ ہے اور عورت کے جذبات میں انفعالیت اور مغلوبیت ودیعت کیگئی ہے مرد کی فطرت کا منتہائے کمال یہ ہے کہ وہ فاعل و غالب رہے۔ اور

عورت کے احساسات و تمنیات کی معراج یہ ہے کہ منفعل و مغلوب ہو۔ معاشقہ کی دار و گیر میں طرفین جس قدر اپنے نقاط کے قریب آتے جاتے ہیں۔ اتنا ہی عشق کامیاب و کامران ہوتا چلا جاتا ہے۔

مرد محبت کرتا ہے مگر "پاس آبرو" "حفظ ناموس" "ضبط راز" ان سب مدارجی رکاوٹوں سے بے پروا ہوکر منزل مقصود کی طرف راہی ہوتا جاتا ہے کیونکہ اس کی فطرت میں غلبہ و دیعت کیا گیا ہے۔ اس لئے وہ مغلوب ہونا نہیں جانتا۔ اور اگر ان میں سے کسی قید کا مغلوب ہو جائے تو وہ نہ صرف محبت کی خامی ہے۔ بلکہ سمجھنا چاہئیے۔کہ اس کی فطرت کا کمال نامکمل ہے۔ اور اس میں کامرانی کی صلاحیت نہیں۔

لیکن عورت غلبہ و فاعلیت سے بیگانہ ہے۔ انفعال و مغلوبی مرد کے لئے ناموزوں لیکن عورت کے لئے کمال فطرت کا باعث ہیں۔ چنانچہ ضبطِ راز۔ حفظ ناموس۔ پاس آبرو کا خیال جب اس کے سامنے آتا ہے۔ تو یہ اپنی فطرت منفعل سے مجبور ہوکر مغلوب ہو جاتی ہے۔ یہی وہ مغلوبی ہے۔ جو اس کے عشق کے صورت آفرینوں میں گوناگونی اور بوقلمونی پیدا کرتی ہے۔ اور یہی جان شعریت ہے۔

۵

زیب عنوان شعر پر غور کرنے سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی شاعرہ کسی مرد پر عاشق ہے۔ نظر ملتی ہے جس کی نظارہ سوزیاں آنکھوں میں ہیولے ڈال چکی ہیں۔ ایک خاص زمانہ کی یکجائی سے آبلۂ دل میں شعلۂ الفت فروزاں ہے۔ اور وہ تمام منازل پیش نظر ہیں۔ جن میں سے اس راہ کے ہر مسافر کو گذرنا لازمی ہے۔

خیال یار ستاتا ہے۔ سوز و گداز کی موجیں اٹھتی ہیں۔ شباب جنون کے ابتدائے اشتیاق کے کارفرمائیاں رنگ لا رہی ہیں۔ ہجر و فراق کے جان گداز لمحے سوہان روح ہوتے جاتے ہیں۔

حسرتیں ٹھوکے دے رہی ہیں۔ ارمان گدگداتے ہیں۔ کہ کسی کو انیس الفت بنائے اور راز دل کہے مگر آئے گئے کا لحاظ مانع ہے۔ آبرو کا پاس حاجب ہے۔ اور خود وضع کے احتیاط سے مجبور ہے۔

رنگ صورت کی غمازیوں سے بھی ڈرتی ہے۔ کہ کہیں کسی پر یہ راز آشکار نہ ہو جائے اس لئے ہر ایک صحبت سے نفرت کلی کئے اپنے خلوت خانہ بے کسی و بے بسی میں غمگین بیٹھی ہے۔ بیقرار دل کو دونوں ہاتھوں سے دبا رہی ہے۔ فتنہ زا آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی ہیں۔ خوبصورت چہرہ پر غم واندوہ۔ یاس و حسرت کے آثار پیدا ہیں۔ اور دل ہی دل میں خود نہایت سوز و گداز سے بار بار گنگنا اٹھتی ہے ؎

اسیر دل نہ ہو کیوں حرف آرزو میرا
گلا دباتی ہے کمبخت آبرو میرا

وہیں یہ بھی صاف ظاہر ہے۔ کہ یہ ایک ایسی عورت کے حالات طاریہ کا منظوم نتیجۂ فکر ہے۔ جو عشق و محبت کے وہ تمام مراحل سوز و گداز تو۔ طے کر چکی ہے جن کا اظہار آرزو سے پہلے اس شیوۂ دلپذیر میں پیش آنا لازمی و ناگزیر ہے۔ لیکن حرف آرزو کا ممنون احسان ہونا نہیں جانتی کیونکہ یہ منزل عورت کے نزدیک اس کی فطرت کی نفی ہے۔

چنانچہ وہ اپنی عزیز آرزوؤں کو دل کے تنگ قید خانہ میں محبوس کرتی ہے۔ آبرو کے خوف سے اپنا گلا گھونٹتی دباتی ہے مگر چونکہ عورت ہے۔ قدرت کے ودیعت کئے ہوئے شرم و حیا کے ننگ و ناموس کو ہاتھ سے دے کر نیچ کے مجرم بننا گوارہ نہیں کرتی۔

مقتضائے بشریت کی تحریکیں جذبات دردانگیز کے آلام و مصائب کی تاب نہ لاکر مشورہ دیتی ہیں کہ پھوٹ بہے اور سارا راز محبوب کے منہ پر رکھدے۔ مگر غیرت نسوانی کی مجبور ادعا حیائیں شرم دلاکر چپ کر دیتی ہیں۔ کہ خبردار۔ تم عورت ہو۔ اور عورت مغلوبیت کا زندہ مجسمہ اور انفعال کا پیکر متحرک ہے۔ تمہارے لئے یہی مناسب ہے کہ حرف آرزو جو تمام حیات عاشقی کا خلاصہ ہے۔ اُسے دل کی قید تنہائی ہی میں اسیر رکھو۔ اور منہ پر نہ لاؤ۔ ورنہ بدنام ہوگی۔ مردوں کی دنیا محرم بننے کی قدرت نہیں رکھتی۔ اپنی آبرو اپنے ہاتھ ہے۔ وہ زبان سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مگر دفعتاً معلوم ہوتا ہے۔ کہ دل سے زبان تک جو راستہ ہے۔ اُس کی منزل بے عزتی کی پرخار گھاٹیوں سے زیادہ دشوار گذار ہے اس لئے اس کا حرف آرزو خوف آبرو سے منہ تک آتے آتے رک جاتا ہے۔

آہ اس "پاس آرزو" کا برا ہو۔ جس کی بدولت ایک حسین عورت۔ جو حسن صورت کے علاوہ حسن فطرت سے بھی بہرۂ وافی رکھتی ہے۔ لیکن اپنے حرف آرزو کو اسیر دل بنانے پر مجبور ہے۔ اپنی تمام حسین وجمیل حسرتوں۔ اور شعریت آمیز تمناؤں کو محض حیات اجتماعی کے چند مفروضہ ضوابط و دستور العمل کے قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیتی ہے۔

وہی حرف آرزو جو اس کی زندگی کا بہترین دقیفہ تھا ہمیشہ کے لئے گورستان سینہ میں دفن ہو کر رہ جاتا ہے۔ کوئی چیز ہے کہ گلے میں آ کے اٹکتی ہے مگر منہ تک نہیں آتی۔ کوئی خیال ہے کوئی خطرہ ہے۔ کوئی اندیشہ ہے۔ کوئی تشویش ہے۔ جو رہ رہ کے ڈراتی ہے کہ دیکھنا اسی حرف کو لب تک نہ لانا۔ ورنہ غضب آجائیگا۔ دنیا کیا کہیگی۔ زمانہ کیا سمجھے گا۔ اور وہ متلون مزاج جو اس حرف آرزو کا مخاطب ہے۔ وہ کیا خیال کریگا۔ آئے دن اسی قسم کے تمام خطرات وخیالات مجتمع ہو کر یورش کرتے ہیں۔ اور حرف آرزو کو پھر دل ہی دل میں قید کر دیتے ہیں۔ اور وہ بیکس عالم جبر و اختیار کی اس جان فرسا کشمکش میں رہ رہ کے پکار اٹھتی ہے ؎

اسیر دل نہ ہو کیوں حرف آرزو میرا　　گلا دباتی ہے کمبخت آبرو میرا

راقم

کے بہر ہر نامحرمی چاک جگر خواہم نمود
منکہ ایں زخمت نہاں از چشم سوزن داشتم

ازلاہور

یک جہنمی تخیل

کہ گذشت است ازیں وادیہ وحشی اینک
نبض رہ مے تپد و سینۂ صحرا گرم است
وحشی

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی
میر

پنجابی بیل

تجدید بہار

از جناب مولانا ابو رشید عبد المجید خانصاحب سالک اڈیٹر زمیندار

بیار بادہ کہ فصل بہار باز آمد
صبا بہ تربیت لالہ زار باز آمد

بیا بعزم چمن باز رخت بربندیم
کہ ابرہا بہ سر کوہسار باز آمد

بیار بادہ کہ در بارگاہ خلوتیاں
حریف سادہ رُخے بادہ خوار باز آمد

زمانہ چنگ صبوحی کشان بلند نواخت
کہ دور دورِ شکستِ خمار باز آمد

شراب کہنہ بہ پیمانۂ دلم جوشید
کہ عہد مغبچۂ عشوہ کار باز آمد

ببانگ چنگ غزل را دگر ز سر گیریم
کہ ناصح از بر ما رفت و یار باز آمد

ببیں کرامت شوقم کہ یار برہم خو
زجذبۂ دلِ من بیقرار باز آمد

نگار شوخ کہ تمکین ناروا ورزید
بپرسش دلِ امیدوار باز آمد

بیار رفت چو سالک معاشراں گفتند
کہ بندۂ بہ در شہریار باز آمد

سالک

بیا کہ بادۂ گلگونہ از چمن جوئیم
کہ جامہا ز سر شاخسار باز آمد

بیدل

مزار مومن دہلوی کی بے نشانی

نہ ہے قبر دارا نہ گورِ سکندر
مٹے نامیوں کے نشاں کیسے کیسے

ہر چند فن شاعری اور بالخصوص ایشیائی شاعری صفحہ دنیا پر باقی نہیں۔ مگر کچھ اس کا مٹا مٹا سا نشان ہنوز پایا جاتا ہے۔ میر و سودا کے عہد کے بعد غالباً دلی کا وہ عہد جس میں غالب و مومن تھے، وہ غنیمت عہد تھا جس کے بعد پھر اس پایہ کے بامذاق شعرا نظر نہ آئے نہ اب آئیں گے،

اس خاکپائے مومن کو آثار قدیمہ سے عشق ہے، باوجود اپنی تباہی کے اکثر آگرہ اور دلّی کا سفر کرتا ہے۔ اور عمارات قدیمہ و بزرگانِ سلف کی زیارت کا فخر حاصل کیا کرتا ہے چنانچہ نومبر گذشتہ میں بھی میں دلّی گیا تھا۔ اب کے نہایت سرگرمی کے ساتھ استاد الاساتذہ حکیم مومن خاں کے مزار کی تلاش کی مگر وائے محرومی،

شمس العلماء آزاد نے لکھا ہے کہ دلّی دروازہ کے باہر مہندیوں میں جانب غرب دفن ہوئے۔ موجودہ دلّی میں اُس عہد و مذاق کے لوگ کہاں ملتے، مٹیا محل میں جاکر جناب بیخود شاگرد داغ سے اپنی خواہش ظاہر کی وہ مجھے شہر کے باہر ایک احاطہ میں لیگئے، اسی احاطہ میں مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی کا خاندان مدفون ہے۔ بیخود صاحب کو مزار مومن یاد تھا۔ وہ کہہ چکے تھے۔ کہ خام مزار ہے۔ مگر مقام مذکور تک پہنچکر پس دیوار مقبرہ شاہ صاحب موصوف انہوں نے اک مزار دکھلا دیا، جو شکستہ مگر پختہ تھا۔ اُس پر گلاب کی پنکھڑیاں پڑی تھیں، مجھ کو وسواس کے سبب اس مزار پر مزار مومن کا یقین نہ ہُوا، کہ اب اُن کا کون سا نام لیوا ایسا باقی ہے جو اُن کی قبر پر

۱۰۹۱۲

پھول چڑھائیگا۔ کمال تعجب کہ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ سے اُستاد پرست نے بھی اس پرلحاظ نہ کیا، سنا گیا کہ کسی کمیٹی نے شاہ عبدالعزیز صاحب کے خاندان والے مزارات پر لوح لگائی ہے۔ کمال افسوس اس ناقدردانی پر کہ مومن خاں کے مزار کو محروم لوح رکھا، اس اندازِ قدرافزائی پر خُدا کا شکر کہ غالب و ذوق کے مزارات پر لوح موجود ہے،

منتظم احاطہ مذکور کی زبانی بھی میرے خیال کی تصدیق ہوئی، یعنی وہ مزار جو بیخود صاحب نے دکھلایا تھا، اور جس پر مزار مومن کا یقین تھا، وہ مزار کسی اور کا تھا،

اب مٹی ہوئی دلی میں ایسے لوگ کہاں ہیں۔ جن میں آثار قدیمہ کی بقا اور قائم کرنے کا خیال ہو البتہ ایک مقدس ذات حکیم اجمل خانصاحب مسیح الملک کی یا لالہ سری رام ایم اے کی ہے چنانچہ میں نے حکیم صاحب موصوف سے تحریک بھی کی ہے۔ کہ کمیٹی مذکور کے ذریعہ سے خواہ چندہ کے ذریعہ سے (جس کی شرکت کو میں بھی حاضر ہوں) خواہ بطور خود یا ضعیف العمر حضرات و عمائدین سے تصدیق کے بعد مزار مومن پر لوح ضرور لگوا دی جائے۔ اور اس کیلئے مجھ سے کوئی تاریخ طلب کی جائے۔ کہ میں غالباً اس کا بہتر حقدار ہوں۔ نیز اڈیٹر صاحب اخبار ہمدم سے کہ ان کی وطن پرستی مشہور ہے۔ امید کہ وہ اس تحریک کو زندہ رکھیں گے۔ نیز تصویر مومن کہ کتبخانہ رامپور میں ہے۔ حاصل فرما کر مجھ کو اور ملک کو ممنون فرمائیں گے۔ نیز یہ بھی ظاہر کریں گے۔ کہ مرحوم کا کوئی نوشتہ یا ان کی اولاد بھی کہیں باقی ہے، کہ نہیں ان کے بزرگوں کی سکونت دلی کے محلہ چیلوں میں تھی، آہ

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

نالۂ عرش

سن لو مرے زمزموں کو یارو	ہوں طوطیِ شاخسارِ مومن
بے چین ہے خاک میں بھی اب تک	ہے ہے دلِ بے قرارِ مومن

باقی نہیں کوئی نام لیوا ویران سا ہے دیارِ مومن

یعنے وہ دیار کون - دلّی دلّی وہ جو تھی نثارِ مومن

کوچے کوچے کو اس کے چھانا کوئی نہ تھا یار و غارِ مومن

بیخود نے کہا کہ چل دکھادوں تجھ کو میں حالِ زارِ مومن

لیکن اے عرش مہندیوں میں

مشکوک سا تھا مزارِ مومن

الفقیر الفانی ضمیر الدین احمد عرش گیاوی کفش برادر مومن و تسنیم دہلوی

افکارِ وحشت

لڑے آپس میں شیخ اور برہمن سے برہمن بگڑا اُٹھا وہ انجمن آرا تو رنگِ انجمن بگڑا

چلا ہے طفلِ اشک ایسا کہ روکے سے نہیں رُکتا نہیں معلوم اس لڑکے کا اتنا کیوں چلن بگڑا

پرانا رگِ باراں دیدہ تھا ہر چند ناصح بھی مگر منہ سے لگایا جب گھڑی جام کہن بگڑا

جو قسمت ہو بُری تو قوت بازو سے کیا حاصل نہ دیکھا تو نے آخر کام تیرا کوہکن بگڑا

کیا بیگانہ سب سے مجھ کو تیری آشنائی نے تیرے باعث وطن میں مجھ سے سب اہلِ وطن بگڑا

یہ کیسی تند خوئی ہے یہ کیا نازک مزاجی ہے کہ توڑا آپ پیماں آپ ہی پیماں شکن بگڑا

کلیدِ عقدۂ خاطر نہیں مضمونِ پیچیدہ

سخن میں جب بناوٹ آگئی وحشت سخن بگڑا

رضا علی وحشت

جامہ زیب اور کوئی روح سا دیکھا نہ سنا - جو پہنتی ہے وہی ٹھیک قبا ہوتی ہے

حیا بدایونی

۷۸۶

رشحاتِ جوش

(جناب منشی شبیر حسن خانصاحب جوش ملیح آبادی)

مجھے اس سے زیادہ کوئی سمجھا ہی نہیں سکتا
خدا وہ ہے جو حدِ عقل میں آ ہی نہیں سکتا

مرا دل عزتِ فانی پہ اترا ہی نہیں سکتا
ترے دھوکے میں آ دنیا کبھی آ ہی نہیں سکتا

رموزِ معرفت کو معنی بے لفظ کہتے ہیں
یہ وہ باتیں ہیں جن کو ناطقہ پا ہی نہیں سکتا

نہیں اس کی تمنا شرح سن لوں سوزِ باطن کی
مجھے اس کی پشیمانی کہ سمجھا ہی نہیں سکتا

جو ہر جنبش کے پیچھے اک سکوں محسوس کرتا ہو
کبھی وہ اضطرابِ دل سے گھبرا ہی نہیں سکتا

جسے حس ہو گیا یہ عقل اک طوقِ غلامی ہے
قیامت تک کبھی وہ ہوش میں آ ہی نہیں سکتا

عقائد نے مری دی اس کو آزادی جفاؤں کی
سمجھ رکھا ہے اس نے زہر کھا ہی نہیں سکتا

کسی سے محبت کرنا شاعرانہ تخیل کی حسن آرائی ہے --- مگر
تحریکِ مناکحت - شعریت جذبات کا گلا گھونٹ دینا ہے - خواہ
اس کا جواب اثبات ہی میں کیوں نہ ہو -

آسکر وائلڈ

سوز تپش

(جناب شیخ عبد اللطیف صاحب تپش منشی فاضل سابق اڈیٹر شباب اردو)

محشرستانِ وفا حسرتِ آغوش ہوں میں — داد اسے دیدۂ پر شوق کہ خاموش ہوں میں

ڈھونڈھ لے پرسشِ اعمال تلافی کے لئے — خوف ناکردہ گناہی کا ہے روپوش ہوں میں

ناز بھی بار ہے لیکن نہ اٹھاؤں کیونکر — سرگرانی محبّت کے لئے دوش ہوں میں

درد مطلوب ہے تحریکِ محبّت کے لئے — اُف ری ایذا طلبی نیش زنِ نوش ہوں میں

نہ ہے سودائے وفا محوِ زیاں ہے ہر سود — یاد آغاز ہے انجام فراموش ہوں میں

واقفِ طور نہیں دیدۂ نظارہ نواز — حیرتِ عشق ہے ماتم کدۂ ہوش ہوں میں

آتشِ عشق میں جلکر ہمہ تن داغ ہے دل — ہے بہارونؔ خزاں میری کہ گلپوش ہوں میں

نشۂ انگیز نہ ہو کیوں مرا خوابِ ہستی — کشتۂ کیفیتِ بادۂ سرجوش ہوں میں

سازِ ہستی میں بجز زمزمۂ مرگ ہے کیا
اے تپش کیا کہوں پھر کیوں ہمہ تن گوش ہوں میں

تپش از لاہور

آہ دنیا دل سمجھتی ہے جسے وہ دل نہیں، پہلوئے ہستی میں اک ہنگامۂ خاموش ہے

حسیاتِ تاجور

(از فاضل دیوبند حضرت مولانا تاجور صاحب مولوی فاضل پروفیسر دیال سنگھ کالج)

اب تو جینے کی تمنّا دلِ مضطر میں نہیں
وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تیرے مقدر میں نہیں

بس رہا ہے مری آنکھوں میں وہی جانِ بہار
جس کا ہمرنگ کوئی پھول چمن بھر میں نہیں

یادِ گل میں مجھے رونے کی اجازت بھی نہ دی
اتنا آرام بھی صیّاد ترے گھر میں نہیں

دادخواہوں کو وہ محشر میں یہ دم دیتا ہے
تم سے نفرت مجھے دنیا میں تھی محشر میں نہیں

کیا دل افروز ہے ساقی تری آنکھوں کا خمار
جو مئے ہوشربا ان میں ہے ساغر میں نہیں

سنگدل تجھ پہ محبّت کا اثر ہو بھی تو کیوں ؟
دل میں احساس ہُوا کرتا ہے پتّھر میں نہیں

وہ بھی ہیں میری طرح عشق کے ہاتھوں مجبور
اب تو کچھ فرق ستمکش میں ستمگر میں نہیں

میرا منظورِ نظر تو۔ ترا مطلوب عدو
میری قسمت میں جو ہے تیرے مقدر میں نہیں

عشق نے کھینچ دی ہر اشک میں تصویر اُنکی
جیسی ان موتیوں میں آب ہے گوہر میں نہیں

محفلِ حشر بھی سونی نظر آتی ہے مجھے
ڈھونڈتی ہیں جسے نظریں وہی محشر میں نہیں

دل کا وہ حال کہ ہر وعدے پہ دم دیتا ہے
ان کی یہ شان ابھی ہاں ہے گھڑی بھر میں نہیں

تاجور شعر ترے سن کے تڑپ جاتا ہوں
کاٹ جو تیری زباں میں ہے وہ خنجر میں نہیں

(تاجور)

اعترافِ محبّت

(پنڈت میلارام صاحب وفاؔ اسسٹنٹ اڈیٹر بندے ماترم)

لوگ کہتے ہیں وفاؔ خوش خو ہے خوش اطوار ہے
نیک دل ہے نیک نیت ہے دیانت دار ہے

دوست کھاتے ہیں اگر میری شرافت کی قسم
دیتے ہیں اغیار بھی میری نجابت کی قسم

قائل اک عالم ہے میرے کلکِ گوہر بار کا
غلغلہ ہے اک زمانے میں میرے اشعار کا

کاشفِ اسرارِ پنہاں نکتہ دانی ہے مری
آج مشہورِ جہاں شیوہ بیانی ہے مری

میں ہوں نخچیرِ خدنگِ جذبۂ حُبِّ وطن
میری نظموں میں ہے رنگِ جذبۂ حُبِّ وطن

لیکن اے جلوہ فروزِ عالمِ انوارِ حُسن
اے جہانتاب تجھ سے تجلّی زارِ حسن

کسبِ ضو کرتا ہوں تیرے حسن عالمگیر سے
عکس لیتا ہوں خیالوں کا تیری تنویر سے

تجھ سے عالم ہے مرے اشعار میں اعجاز کا
اور تو باعث ہے میری رفعتِ پرواز کا

اڑتا ہوں تیری ہوائے شوق میں افلاک پر
کرتا ہوں نغموں کی بارش ساکنانِ خاک پر

حسن کامل ہے ترا میری فضیلت کا سبب
میری شہرت کا ذریعہ میری عزّت کا سبب

اے منوّر آفتابِ آسمانِ آرزو
تجھ سے پُر تنویر ہے میرا جہانِ آرزو

گرمجوشِ آرزو رکھتا ہے تیرا اشتیاق
تیرے شوقِ قرب میں ہوں میں سراپا اشتیاق

اپنی ہستی کو ترے قابل بنانا ہے مجھے
یعنی اپنے آپ کو اُونچا اُٹھانا ہے مجھے

تیری عظمت درس دیتی ہے ثباتِ عہد کا
تجھ سے قائم ہے تسلسل میری جد و جہد کا

میں ہوں سرگرم حصولِ این و آں تیرے لئے
جمع کرتا ہوں متاعِ دو جہاں تیرے لئے

تیری خوشنودی ہے میرا مدعائے زندگی
ہاں یہی مقصد ہے میرا رہنمائے زندگی

زندہ ہوں تیرے لئے اے رشکِ مہر و ماہ میں
آج کرتا ہوں تجھے اس راز سے آگاہ میں

(میلارام وفاؔ)

۶۸۶

مجذوب کی بڑ

کہتے ہیں۔ ایک دن دنیا میں سب مرجائینگے۔ موت سب سے جان لے لیگی۔ تو کیا میں ۔ میں بھی مرجاؤں گا۔۔ ؟ مجھ... مجھ کو بھی موت آجائیگی... ؟

نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ مجھ کو موت نہیں آئیگی۔ میں کبھی نہیں مرونگا۔ اور میں کیوں مروں۔ میں کوئی مرنیکے لئے آیا ہوں۔ مری زندگی کوئی موت کا صدقہ ہے۔ نہیں میں نہیں مرونگا۔ میں اپنی زندگی کا مالک ہوں۔ جیونگا اور ضرور جیونگا۔

میری ایسی اچھی جان۔ ایسی پیاری زندگی۔ مجھ سے کون چھین سکتا ہے کس کی مجال ہے۔

بیچاری موت کی کیا طاقت ہے۔ جو مجھ سے میری جان چھین لیگی۔ میری اپنی جان ہے۔ میں اپنے ساتھ لایا ہوں۔ جہاں جاؤنگا ساتھ لیجاؤنگا۔ جہاں رہونگا۔ ساتھ رکھونگا۔ کسی کا اجارہ ہے۔

میری ایسی عزیز جان جس کے لئے میں نے سینکڑوں تکلیفیں اُٹھائیں۔ صدہا مصیبتیں جھیلیں ساری عمر اس کی حفاظت کی۔ دنیا کا برا بنا۔ عزیز و اقارب سے اچھا جانا۔ دوستوں سے عزیز سمجھا۔ دشمنوں سے نگہداشت کی۔ چوروں سے بچایا۔ ڈاکوؤں سے چھپایا۔ اور میں ایسے کسی کو یوں ہی حق ناحق دیدونگا موت مجھ سے بے کہنے سنے چھین لیگی۔ بے پوچھے گچھے لے جائیگی۔ نہیں کبھی نہیں۔

ہاں ہاں۔ میں اپنی زندگی کسی کو نہیں دونگا۔ میں تو اگر مانگے تانگے کی زندگی ہوتی۔ گری پڑی بھی کہیں سے جان اُٹھا لاتا۔ جب بھی اللہ عزیز کرکے اسے رکھتا۔ اور کسی غیر کی پرچھائیں بھی نہ پڑنے دیتا۔

اور اچھا مانا۔ موت آئی بھی۔ کیونکہ اس کی تو عادت ہے۔ میرے پاس بھی آئی۔ تو جہاں میں اسے آتے دیکھونگا۔ اپنے گھر کی سب سے اندر کی اندھیری کوٹھری کے کسی کونے کھدرے میں جاکے چھپ جاؤنگا۔ دروازہ بند کرلونگا۔ کواڑ بھیڑ لونگا۔ اور مقدور کی جڑی بنی خاک کی موٹی سی چادر اوڑھ لپیٹ اور منہ چھپا کے لیٹ رہونگا۔ دم سادھ لونگا۔ آنکھیں خوب زور سے بھینچ کے موند لونگا۔ موت آئیگی مجھے پکاریگی میں نہیں بولوں گا۔ وہ چیخے گی۔ چلائیگی۔ میں سانس نہیں لونگا۔ وہ زنجیر کھٹکھٹائیگی میں نہیں کھولونگا۔ چاہے قیامت ہی کیوں نہ آجائے۔

آخر موت تھک کر بیٹھ رہیگی۔ اپنا سا منہ لیکر چلی جائیگی۔ اور ہاں اُسے بھی تو موت آجائیگی۔ کیونکہ دنیا میں جو پیدا ہے۔ وہ ناپید ہوگا۔ غرض جب وہ دفع ہوجائیگی۔ تو۔

میں اُٹھونگا۔ منہ کھولونگا۔ دروازہ کھولکے اس رات سے زیادہ اندھیری کوٹھری سے باہر نکل آؤنگا۔ اس لباس کو اتار کے پھینکدونگا۔ کوئی اور اچھا سا چولہ بدل لونگا۔ جدھر منہ اُٹھے گا اپنی زندگی لیکے چلدونگا۔ اور جس جیتی جاگتی دنیا کو مناسب سمجھونگا۔ اپنے لئے منتخب کرکے رہنے لگونگا۔

میں جامہ زیب تو قدیم سے ہی ہوں یہ لباس بھی میرے اوپر سج جائیگا۔ اس لئے نہ کوئی مجھ سے وحشت کریگا۔ اور نہ لوگ بیگانہ سمجھینگے۔ سب اپنے دیس کا آدمی جانینگے۔ یہاں تک کہ موت بھی اس روپ اور اس بھیس میں مجھے پہچانیگی۔

اور وہ تو خود مر چکی ہوگی۔ مجھے پھر ڈر ہی کس کا ہوگا۔ بس میں ہوں گا۔ اور میری پیاری زندگی۔ زندگی ہوگی۔ اور میری بولتی چالتی جان۔ اسے اپنے سینہ سے لگائے انند کے تاروں پر اپنی الوہیت کے راگ گاتا پھرونگا۔

جدھر جی ہوگا آؤں جاؤں گا۔ جہاں طبیعت لگیگی رہونگا سہونگا۔ جس صحبت میں دل چاہیگا۔ اٹھوں بیٹھونگا۔ جو شخص اپنے مذاق کا ملیگا۔ اُس سے ملوں جلوں گا۔ نہ کوئی میرا مزاحم ہوگا نہ عنان گیر۔ میں خود اپنی مرضی کا مختار ہونگا۔ اور خود اپنی خوشی کا مالک ہونگا۔

زمین آسمان میرے پائے خیال کے جولانگاہ ہونگے۔ وسعت عالم میرے ارادہ نظر کی حد قدرت ہوگی۔ باغوں میں جاؤنگا۔ جس پھول کلی کی طرف میلان ہوگا۔ سونگھ لونگا۔ مگر اُسے توڑوں گا نہیں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں۔ پھول کا توڑنا حسن فطرت کی ناقدری ہے۔ جن کو قدرت نے ذوق نظر اور کیف طبیعت ودیعت کیا ہے۔ وہ ان کو ڈالیوں ہی میں لگا دیکھ کر مسرور ہوتے ہیں۔ نااہلوں کی طرح ان کے حسن شگفتگی کو پامال بے حسی نہیں کرتے۔ اور سچ بھی ہے۔ کہ جام و ساغر کی پرکیف تزئین کے لئے ساقی کی ساعد سمیں ہی بہت زیادہ موزوں مناسبت ہے۔ اس لئے میں انہیں پیار کرونگا۔ ان کے ہونٹوں پہ ہونٹ دھرونگا۔ مگر انہیں ان کے مرکز حسن سے جدا کرکے شکوہ سنج بیدردی نہیں ہونے دونگا۔

جو پھل من بھائیگا۔ میرے فطرتی اشتہا و طلب اُسی سے روحانی تعذیہ کے متمتع ہوجائیگی۔ مگر مجھے اس کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ میری خواہشات تو بھوک پیاس سے بے نیاز ہوگی۔ میں تو اپنی ہی ذوق خودی میں سرمست لذت ہونگا۔ میرے مشاغل محویت تو ایک اور شعریت میں مستغرق ہونگے۔

میں جنگلوں میں جاؤنگا ہر ہرے بانس کی ایک پوری کاٹونگا۔ اس کی بانسری بناؤنگا۔ اپنے ساز ہستی کے ربط کی کیفیت متعدیہ سے اُسے بھی ہم نوا کرلونگا۔ پھر خوب مست ہوکر اسے بجاؤنگا۔ میری نے نوازی سُنکر جنگل کی ویران خاموشیاں حسن فطرت کے گیت گائینگے۔ خوش لباس طاؤس میرے ساتھ ناچینگے غزالان دشت کی مضطرب شوخیاں میرے اردگرد پھر پھر کر قربان ہونگی۔ جانوروں کی حیات مردہ کو میرے دلگداز نغموں کا اعجاز ممنون زندگی کریگا۔ اور میں ہنسونگا۔

جب کون ہستی کی فضائیں میرے نغموں سے معمور ہو جائینگی۔ جب سارا جنگل میرے زمزمہ کے حسن مرتعش سے گونج اُٹھے گا۔ تو میں مرلی کو پھینک پھانک کے اور کسی دوسری طرف کو چل دونگا۔

میں جدھر جاؤنگا۔ دنیا مجھے اپنا مہمان عزیز سمجھ کر آنکھوں میں جگہ دیگی۔ نوع انسانی کے ہم جنس نفوس قدسیہ خاطر مدارات سے پیش آئینگے۔ سر پر بٹھائینگے۔

گلزار ہستی کی حیات افروزیاں میری قدر کرینگی۔ پھولے پھلے باغوں کے پھول۔ کلیاں میرا خیر مقدم کرینگی ہرے بھرے کہساروں کی لہلہاتی گھاس میرے لئے بچھونا بچھائینگی۔ درخت پنکھا جھلنے لگیں گے۔ نازک نازک ڈالیاں میری قدمبوسی کے فخر و ناز پر رقص کرینگی۔ پتے تالیاں بجا بجا کر ہپ ہپ ہرے کا شور مچائینگے میں اپنے سر سے اپنا نورانی مکٹ اتارونگا۔ اور ایک ادا ایسا ہر سبز مخملی فرش پر لیٹ جاؤنگا اچھی اچھی حسین اور قبول صورت عورتیں لوریاں گائینگی۔ اور سلانے کی کوشش کرینگی۔

مگر میں سوؤنگا نہیں۔ کیونکہ اول تو میں اپنے پرانے گھر ہی سے بہت سو کے گیا ہوا ہونگا۔ نیند آنے ہی کیوں لگی۔ دوسری میں اسے بھی تو وہیں چھوڑ آیا ہونگا۔ جہاں اسکی نامراد بہن موت کو چھوڑا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد مجھے رہنے سہنے دن گذر جائینگے۔ میرے نئے جنم کی زندگی اس نئے وطن سے مالوف ہو جائیگی۔ اجنبیت دور ہو جائیگی۔ میں سب سے اور سب مجھ سے ہل مل جائینگے۔

ہم سب یاراں ہم اقامت روز مل جل کے بیٹھا کرینگے۔ کوئی آپ بیتی کہیگا۔ کوئی جگ بیتی سنائیگا۔ مگر میری روداد زندگی ہر حسن سماعت کے لئے فردوس گوش متصور ہوگی۔ میری داستان حسن صحبت احباب کے لئے روح اور جان ہوگی۔ میرے دن رات جذبات عشقیہ کی گرم بازاری کا سبب سمجھے جائینگے۔

گویا میں شراب کا ایک ایسا سرچشمہ ہوں۔ جس سے سینکڑوں ندیاں بہہ رہی ہیں جو جذبات انسانیہ کے ہر ہر شعبہ کو سیراب کر رہی ہیں میں ایک آفتاب ہوں جس کی شعاعیں عالم احساس کے چپہ چپہ کو زریں کر رہی ہیں۔ میں ایک خوش آہنگ رباب ہوں۔ جس کے مضطرب تاروں کی گونج سے تمام گنبد گردوں گونج رہا ہوگا۔ [illegible] ہر دوست کی دلسوزی میری تنہائی پر متاسف ہوگی۔ کوئی حسن و عشق کے [illegible] کوئی میری رفاقت کیلئے انیس زندگی کی تلاش کی رائے دیگا۔

[illegible] دلہن انتخاب کرینگے۔ میری برات رچائینگے۔ میں دولہا ہونگا۔ اور میری کامران حیات زندگی۔ ان سارے منفعل ناکامیابی ارمانوں کی تلافی پر مستعد ہو جائیگی۔ جن کے لئے گذشتہ عہد شباب کا ہر ناکام عہد اور دور زریں ستارہ چمکا ہے۔ اور جن کے لئے نامراد قسمت کی کسی گردش نے کبھی مجھے حصول کا موقع نہیں دیا تھا میں جب سہرا باندھ کے اور دولہا بن کے بیٹھونگا۔ تو میرے حسن و جمال کو دیکھ کر سب اپنے پرائے درود پڑھینگے۔ میری ثنا و صفت کے قصیدے کہینگے۔ مطرب اور مغنی سہرے اور مبارکبادیں گائینگے۔

مشاطۂ قدرت ایک حسن مطلق کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیدیگی میرا دست شوق اپنے دیدۂ تمنائی کے حاجب نقاب کو اسکے منہ پر سے ہٹا دیگا۔ نقاب کے سرکتے ہی میں کچھ دیکھونگا۔ مگر دیکھ نہ سکونگا میری ساری ہستیاں خود اپنی ہی محو حیرت ہستی میں مجذوب ہو جائینگی۔ میرا بھی وہی حال ہوگا جو طور پر موسیٰ کا کبھی ہوا تھا۔ پھر میں یہ کہتا ہوا بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑونگا۔۔

"ہائیں! یہ تو وہی ۔ وہی ۔ وہی ۔۔۔ !! ہائے بالکل وہی!!!

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما"

مجذوب

نمبر ۲ | جلد ۲۱
قیمت قسم اول للعہ | قیمت قسم دوم سے

فہرست مخزن بابت ماہ جون سنہ ۱۹۲۱

شذرات

گذشتہ مئی کے رسالہ میں کتابت اور طباعت کی بعض نامطبوع بدعنوانیوں کے علاوہ چند املا انشا اور عروض کی بھی ایسی فحش و شرمناک غلطیاں رہ گئی ہیں جن کے صدور کا باعث محض کاتب کی بے علمی نہیں ہے بلکہ ایک متعارف دوست کی علمی قابلیت پر میرا غلط اعتماد بھی ہے، جن کی منشیانہ خامہ فرسائی اور کاپی۔پروف کی سعی تصحیح کو میری سہولت پسندیوں نے اپنا عارضی اور وقتی معین بنانے میں نہایت حسن ظن سے کام لیا،

اس لئے میں جہاں ناظرین مخزن سے تاسف اور ندامت کے ساتھ معذرت خواہ ہوں، وہیں ان احباب کا بھی شکرگذار ہوں، جنہوں نے ان اغلاط کے مزید تنبیہ میں معاصرانہ اور منصفانہ ہمدردی سے مجھے ممنون احسان کیا، اور آئندہ کیلئے عصمت اغلاط کی توفیق کے محرک صحیح ہوئے، گو یہ عذر بھی ارتکاب گناہ سے بدترین ہے،

مئی کے پرچہ میں قارئین مخزن کو متوقع کیا گیا تھا، کہ آئندہ مخزن "روح ادب" اور "چترانہ" پرانے پرانے ہدیہ ناظرین کرسکیگا، مگر درحقیقت ان دونوں کتابوں کی ندرت تصنیف و ترجمہ کا خراج تحسین ادا کرنا اس کی دماغی و بے بضاعتی کی قدرت و استطاعت سے بالاتر ہے، اس لئے روح ادب کے لئے مولانا عبدالمجید خانصاحب سالک اور مولوی اکبر شاہ خانصاحب اکبر نجیب آبادی کی خدمت میں درخواست کی گئی ہے کہ اسکے حق تنقید سے مخزن کو سبکدوش ہونے میں مدد دیں، اور چترا کے لئے سید احمد شاہ صاحب بخاری (پطرس) اور مرزا محمد سعید صاحب ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے امید ہے کہ یہ حضرات بتعمیل درخواست بہت جلد شکریہ کا موقع دینگے،

اس عرصہ میں بہت سے مستند و معتبر ادیب اور معزز و ممتاز انشا پرداز احباب کے خطوط موصول ہوئے ہیں، جن میں مخزن کی قلمی اعانت کا حتمی وعدہ ہے، مگر افسوس اسکے ایفا کا انتظار موت سے زیادہ شدید ثابت ہو رہا ہے کاش ان کا استغنا کمال ادارت کی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے اس راز سے آگاہ ہوتا، کہ ایڈیٹر کے لئے جہاں کچھ نہ لکھنا قابل اعتراض ہے، وہاں محض پیشہ ہی خیالات کے اجتماع کو ہمیشہ پیش کرتے رہنا بھی آئین ادارت کے نزدیک سخت معیوب متصور ہے

مخزن کی ترتیب میں ہر مہینہ جو دقتیں اور مشکلات سنگ راہ ہیں، اُن میں سب سے زیادہ مکلف مضامین کی

کم فراہمی ہے، اس لئے ملک کے اہل قلم حضرات کی خدمت میں مجزو ادب کیساتھ التجا ہے کہ وہ پھر اس صحیفۂ ادبی کی بقائے حیات کی جانب چشم التفات مبذول فرمائیں وراسکے گذشتہ شباب کے واپس لانے میں بہت جلد میرا ہاتھ بٹائیں، ورنہ: بہ امید افزا توقعات اندیشہ ہے کہ انہیں ارمانوں میں نہ محسوب ہوں جو محض ناقدری کے ہاتھوں خانہ دل کی تنگ وسعتی سے پایہ اپنے پائے ارادت نہ بڑھا سکنے پر مجبور ہو جاتا ہیں،

موجودہ حلقہ ادب وانشا میں بہت سے اہل قلم رسال مضامین پر کسی معاوضہ کے خواہاں ہیں اور یہ خواہش انکی ایک حد تک صحیح بھی ہے کیونکہ کوئی شخص اپنے شوق و تشغف میں اس وقت تک استقلال و مداومت جائز نہیں رکھتا، جب تک اس سے نفع و مفاد کے اغراض نہ وابستہ ہوں اچنانچہ یورپ کے ادبی میگزین محض اسی قدر افزا اور حوصلہ آفرین حسن عمل سے آسمانِ انشا پر مہر و ماہ کے ہم ضو ہیں! مگر افسوس مخزن کا دورِ ماضی ہو یا حال اس صیغہ خاص میں ملک کا ساتھ دینے سے معذور ہے اور رہا،

کیونکہ جب اسکا زمانہ موافق تھا، تو اسکے بزم ادب میں ایسے اولوالعزم حضرات جلیس و انیس تھے، جو معاوضہ سے غنی و بے نیاز تھے، اور ان کا ذوق تفنن مخزن میں مضامین کے چھپ جانے ہی کو صلہ و تحسین جانتا تھا، اور اب جب اسکی زندگی معرض زوال میں ہے، نامساعدت نے بقاؤ ثبات کو مشتبہ کر دیا ہے تو نہ اسے وہ اغنیا نصیب ہیں، اور نہ اسمیں استطاعت معاوضہ ہے،

مخزن کا دور جدید اپنے معاصر "صبح امید" کے اس معاصرانہ احسان کا تہ دل سے شکر گذار ہے کہ اس نے اپنی معلومات کو بغیر پایۂ ثبوت تک پہنچائے، اسکے دنیا سے ناپید ہو جانے پر اظہار تاسف کرنے میں جلدی کی! اور اسکی حیات موجودہ کے لئے نیک فال ثابت ہوا، حالانکہ صبح امید کے معزز ایڈیٹر صاحب کو اسکی دوبارہ اشاعت سے بھی مطلع کیا جا چکا تھا، اور بحیثیت قابل احترام اہل قلم ہونے کے طلب مضمون کی درخواست بھی کی گئی تھی، معلوم نہیں کیوں معزز معاصر نے مخزن کی ان دونوں درخواستوں کو حوالۂ طاقِ نسیان کر دینا جائز رکھا،

اب امید ہے کہ ہمارے محترم دوست اس قبل از وقت افسوس کی تردید کرتے ہوئے اپنی معاصرانہ بیش قیمت رائے سے بھی ممنون احسان فرمائینگے تاکہ مخزن کو ایک اپنے ہم مقصد و ہم نوا دوست کے مزید شکریہ کا بھی موقعہ ملے، اور باہمی رابطہ و اتحاد میں بھی روز افزوں ترقی ہو،

(ایڈیٹر)

سبدِ گل

اصطلاحاتِ علمی محترمی مولانا سید ممتاز علی صاحب مدظلہ ان بزرگانِ ملک سے ہیں جنکی عمریں علم و ادب کی خدمتیں کرتے بسر ہو گئیں، ممدوح نے اپنے مرحوم اخبار "تالیف و اشاعت" کے ذریعہ سے ادب اردو کی جو عظیم الشان خدمات انجام دیں، یا "مطبع رفاہ عام" سے جیسی اچھی اچھی کتابیں شائع فرما کر قوم کو علم آشنا کیا، ان کے سپاس منت سے ملک کسی طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتا،

تعلیمِ **اطفال** و نسوان کی ضرورت کا احساس بھی سب سے پہلے جناب ہی کا ممنونِ عمل ہے، آپ نے جہاں "تہذیب نسواں" کے ذریعہ عورتوں میں تعلیم کی روح پھونکی، گھر گھر انسان کے مکتبِ اولین کی تاسیس میں پہل کی، وہیں اخبار "پھول" کا سببِ اشاعت بھی آپ ہی کی جدتِ فکر کا نتیجۂ عملی ہے، جو آج ملک کے بچہ بچہ میں اردو ادب کا صحیح مذاق پیدا کرنے میں باامتیاز خصوصیت کامیاب ہے،

یہ مضمون ممدوح کے اس مفید سلسلہ کی پہلی قسط ہے، جو نہ صرف دورِ حاضر کے انشا پردازوں کے لئے رہبرِ مصطلحاتِ علوم و فنون ہے، بلکہ عام علمی و ادبی مضامین لکھنے والوں کے لئے چراغِ ہدایت، مولانا کا اندازِ تحریر نہایت سلیس و سادہ مدلل و دلنشیں ہوتا ہے، پھر زبان اتنی عام فہم کہ مشکل سے مشکل مطالب بہ آسانی سمجھ میں آجاتے ہیں،

ہم نہایت ناز و مسرت کے ساتھ مولانا کے اس عطاءِ مرحمت کے شکر گذار ہیں، اور فخر کرتے ہیں، کہ مولانا ممدوح نے مخزن کا خیر مقدم کرتے ہوئے انعطافِ توجہ میں بھی بزرگانہ فراخدلی سے حوصلہ افزائی فرمائی ہے، اس سلسلے کے علاوہ دو اور مفید مضامین عنایت کئے ہیں، جن میں "ارتقا" اور "علم طبقات الارض" کے اسرارِ مخفیہ سے ملک کو روشناس کیا ہے اور جو اپنے معیارِ تحقیق، تبحرِ علمی، وسعتِ مطالعہ کے کافی شاہد ہیں، انشاء اللہ اس سلسلہ کے ختم ہونے پر وہ بھی باقساط نذرِ ناظرین ہونگی،

خلوتیانِ راز کا فرماجرا "نیاز" کی عشق طرازیاں محتاجِ تعارف نہیں، جو ذوقِ ادب سے آشنا احباب "کیوپڈ اور سائک"۔ "ایک شب کی قیمت"۔ "مصور فرشتہ" جیسے مضامین۔ اور "گیتان جلی" "جذبات بھاشہ" "گہوارۂ تمدن" جیسی مصنفہ و ترجمہ تدوین سے مستفیض کیف ہیں، ان کی عقیدتیں معترف ہیں کہ "نیاز" کے گہربار قلم کی اعجاز نگاریاں موجودہ ادبی حلقہ کیلئے مایۂ ناز حیرت افروزیاں ہیں، قدرت نے آپکو جو صحیح اور مہذب مذاقِ انشا عطا فرمایا ہے وہ زبانِ توصیف کی قدرتِ بیان سے بالاتر ہے، آپ کے اندازِ تحریر میں تبحرِ علمی کے شعلہ ریز تجلیوں کے ساتھ ادبِ لطیف کی بھی وہ سرور افزا کیفیات مضمر ہوتی ہیں، جن سے ذوقِ فطرت برسوں مسرور لذت رہ کر بھی حقِ تحسین سے سبکدوش نہیں ہوتا،

خلوتیانِ راز میں دوستوں کے نفسیات پر گہری نظر ڈالتے ہوئے جہاں محفلِ احباب کی تمام ہنگامہ افروزیاں پیش نظر کر دی ہیں وہیں فلسفۂ محبت کے بہت سے اہم نکات بھی جلوہ نما ہیں جو عام دلدادگانِ مظاہرِ قدرت اور پرستارانِ حسنِ فطرت کے لئے سبق آموزِ عشق ہیں،

ہم حضرت نیاز کے تہِ دل سے شکر گذار ہیں کہ باوجود تصنیف و تالیف کی بیحد مصروفیت کے انہوں نے مخزن کو اپنے الطاف کا مرہونِ منت کیا ہے، اور آئندہ بھی وعدہ ہے کہ اس سلسلۂ عواطف کو اسی طرح جاری رکھیں گے،

سونے بھرا دماغ۔ میر افضل علی خاں ایم اے کا نام ادبی حلقہ میں نیا نہیں، آپکی قلمی اور ادبی شوخ نگاریاں مخزن کے دورِ متوسط میں بھی انشا پردازی کے جواہرِ لطیف نذرِ احباب کرتی رہی ہیں گو بعض مصروفیتوں کی وجہ سے کچھ عرصے تک یہ عارضی خاموشی رہی، لیکن خدا خدا کر کے پھر شرابِ ادب کے اس خم کی مہر ٹوٹی، اب امید ہے کہ اسی ایک جامِ لطف پر یہ دورِ ثانی ختم نہ ہوگا، بلکہ یہ سلسلۂ بادہ پیمائی ہمیشہ جاری رہ کر مخزن کو فخر و غرور کا موقع دیگا،

(ایڈیٹر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نمبر۲　مخزن بابت ماہ جون ۱۹۲۱ء　جلد ۲۱

مخزن کا دورِ جدید

اور

معاصرین کی رائے

مخزن کے دورِ جدید کی اشاعت اوّلین کے بعد انتظار تھا، کہ دیکھئے ملک اسے شرفِ قبولیت دے کر حوصلہ افزا بھی ہوتا ہے، یا ملکی سیاسیات کی قربان گاہ پر یہ بھی بھینٹ چڑھ جاتا ہے، الحمدللہ کہ احباب نے چند اغلاط فواحش کے اظہار فرو گذاشت کے علاوہ (جس کا مجھے خود اعتراف اور ندامت ہے) اس کا بہت اچھا خیر مقدم کیا،

چنانچہ میں اپنے بعض احباب کی قابل قدر رائے کو جو اُنہوں نے محض منصفانہ اور مخلصانہ طور پر مجھے شکریہ کا موقع دیا ہے، نہایت فخر کے ساتھ درج ذیل کرتا ہوں، اور امیدوار ہوں، کہ آئندہ بھی وہ مخزن کو حسنِ قبول دیتے ہوئے اسی طرح میری بے مائگی کا ہاتھ بٹانے سے دریغ نہیں جائز رکھیں گے،

جریدۂ زمیندار روزانہ کی رائے،

"قارئین کرام کو یاد ہوگا، ہم نے آج سے کوئی ایک ماہ پہلے یہ توقع ظاہر کی تھی، کہ پنجاب کا مشہور ادبی صحیفہ مخزن مولوی سید حامد حسین صاحب بیکیل شاہجہانپوری کے زیر ادارت اپنی مٹی ہوئی دلفریبیاں حاصل کریگا، چنانچہ ہماری توقعات بہت بڑی حد تک پوری ہوئیں، اور مخزن کے دورِ جدید کی اشاعت اولیٰ اس وقت ہمارے سامنے ہے،

مخزن کی تقطیع ۱۸×۲۲/۸ سے بڑھا کر ۲۰×۲۶/۸ کردی گئی ہے اور یہی آج کل ادبی رسالوں کی مقبول و معروف تقطیع ہے، کاغذ بھی اس ہوش ربا گرانی کے زمانے میں عمدہ اور چکنا لگایا گیا ہے کتابت بھی خاصی۔ لیکن مزید توجہ کی محتاج ہے،

چونکہ مخزن کے کاتب صاحب بہت نومشق معلوم ہوتے ہیں، اس لئے انہوں نے دیگر معمولی اغلاط کے علاوہ املا وانشا کی حیرت انگیز غلطیاں کی ہیں مثلاً "حتمی وعدہ" کی جگہ "حطمی وعدہ" "مضمحل" کے بجائے "مضمهل"۔ "ناصیہ" کی جگہ "ناسیہ" "موسیقیت" کی جگہ "موثیقیت" "قطرے" کی جگہ "خطرے" سپرد قلم کیا ہے کسی اعلیٰ درجے کے ادبی رسالے کے لئے اس قسم کی بے احتیاطی شرمناک ہے اور اگر بہت جلد اس کی تلافی نہ کردی گئی تو رسالے کی ہر دلعزیزی کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے،

اس رسالہ کی نمایاں خصوصیت یہ نظر آتی ہے، کہ مخزن کے پرانے ایڈیٹر اور سرپرست شیخ عبدالقادر صاحب بھی بحیثیت مضمون نگار اس میں موجود ہیں، آپ نے گویائی کے عنوان سے ادب وانشا کی دنیا میں اپنی طاقت گویائی کے بدستور سلامت ہونے کا ثبوت دیا ہے،

رسالے کے مہرۂ ادبی ہیں سید امتیاز علی صاحب تاج کا آئینہ کائنات بہت عمدہ مضمون ہے اور محوی کے خیالات پریشان بھی اچھے ہیں، مولانا گرامی کی غزل "عشق در کار و کار در نیرنگ" جسے قارئین کرام ایک چھوڑ دو دفعہ "زمیندار" میں ملاحظہ فرما چکے ہیں، اب تیسری دفعہ مخزن کے صفحات کی جلوہ گر ہے، (لیکن افسوس ہے کہ زمیندار کا حوالہ نہیں دیا گیا) جناب یاس عظیم آبادی نے شاہ عباس صفوی کے متعلق بعض دلچسپ تاریخی واقعات لکھے ہیں سید معشوق حسین صاحب اطہر ہاپوڑی نے "جان جاں" کی ترکیب کے متعلق ایک تحقیقی مضمون لکھا ہے،

نظم کا حصہ کمزور ہے، بیدل۔ جوش۔ تپش، تاجور کی غزلیں اچھی ہیں لیکن غزلوں کی اتنی ضرورت نہیں، جتنی قومی فطری اخلاقی، اور جذباتی نظموں کی ہے،

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا بیدل نے رسالے کی ترتیب و تہذیب میں بہت محنت کی ہے "مخزن کا دور جدید اور ہم"۔ "شذرات"۔ "سبد گل"۔ "شعر اور تصویر"۔ اڈیٹر کے قلم سے نکلے ہیں۔ دو اور مضامین بھی "ضبط آرزو" اور "مجذوب کی بڑ" کے عنواں سے شائع ہوئے ہیں۔ ان کے نیچے گو کسی مضمون نگار کا نام درج نہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک وہ بھی بیدل صاحب ہی کے بہار آفرین قلم کے نتائج ہیں۔

بیدل صاحب کا انداز تحریر نہایت متین اور ادیبانہ ہے جس میں فلسفہ اور ادب عالیہ دست و گریبان نظر آتے ہیں، اس انداز میں لکھنے والے بہت کم ہیں لیکن حقیقت یہ ہے، کہ کوئی انداز اپنی ایشیائی خوبیوں اور محبوبیوں میں اس طرز تحریر سے لگا نہیں کھا سکتا، مثلاً فرماتے ہیں،

وہی مخزن جو کبھی مردہ دلوں کے لئے معجزۂ جانبخشی تھا، اب نامساعدت زمانہ کے ہاتھوں خود ایک عرصے سے جسم مردہ ہے، جس کی شکل و ہیولیٰ تو وہی ہے، مگر روح نہیں، ایک خوش رنگ پھول ہے لیکن بو کا نام و نشان نہیں، گویا دامن سراب ہے کہ خوش خرامی امواج کی شوخی نقش پا تو نظر فریب آب حیات ہے، مگر در حقیقت پانی نہیں،

مخزن کے پرانے انشا پردازوں کی خاموشی کی توجیہ کرتے ہوئے ان حضرات کی کہولت و پیری کی طرف کس انداز سے اشارہ کیا ہے،

جبرا دب کی بنیاد تعمیر محض ہنگامۂ شباب کے کیف و تخیل پر مبنی ہوتی ہے اس کی

عمر بھی ولولہ ہنگامی کی طرح کم اور ناپائیدار ہوتی ہے، عمر کے امتداد و انقلاب کے ساتھ شبابی جذبات کی شوخیاں بھی متانت و سنجیدگی بن جاتی ہیں، پھر وہی ادب طرازیاں بازیچۂ اطفال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں،

غرض مخزن کا مستقبل بہت امید افزا نظر آتا ہے اور امید ہے کہ آئندہ پرچے اس سے بھی اچھے نکلیں گے لیکن بیدل صاحب کو رسالے کی کتابت اور زیبائش کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہیے، نظموں کے حصہ میں ابھی اچھی نظموں کی بہت گنجائش ہے تاریخ اور معلومات علمیہ کے مضامین بھی فراہم کرنے چاہئیں، رسالے کی ضخامت ۴۸ صفحے کی ہے اور قیمت قسم اول کی چار روپے اور قسم دوم کی تین روپے مقرر ہے، ایک پرچہ چھ آنے کو ملتا ہے،

"مینجر صاحب مخزن بھاٹی دروازہ لاہور سے طلب کیجئے"

ہفتہ وار اخبار زمیندار کی رائے،

"محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے چودہویں سالانہ جلسہ میں جو ریاست رامپور میں منعقد ہوا تھا ہم نے سب سے پہلی مرتبہ شیخ عبدالقادر صاحب بی اے کو دیکھا، اور اسی جگہ معلوم ہوا کہ وہ مخزن نامی ایک اردو رسالہ جاری کرنے والے ہیں اسکے چند ہی روز بعد مخزن نکلنا شروع ہوا، اس بیس سال کے عرصہ میں مخزن کی دیکھا دیکھی یا اردو کا اثر و اقتدار اور اعتراف ضرورت کے نتیجہ میں بہت سے ادبی رسالے جاری ہوئے جن میں بعض مخزن سے زیادہ خوبصورت اور زیادہ نفع رساں بھی تھے، لیکن ادبی رسالوں میں جو شہرت و قبولیت مخزن کو ہمیشہ حاصل رہی وہ کسی دوسرے کو میسر نہ ہوئی، اور ان میں سے کوئی بھی ناقدر شناسئی عالم کا مقابلہ مخزن کی طرح نہ کر سکا یعنی بڑی عمر نہ پا سکا، مخزن کی اکیسویں جلد کا پہلا نمبر بجائے ۲۲×۱۸/۸ تقطیع کے ۲۶×۲۰/۸ تقطیع اور خوبصورت سفید چکنے کاغذ پر شائع ہوا اور دفتر میں لغرض ریویو پہنچا ہے کسی بیس اکیس سال کے بوڑھے رسالے پر ریویو کرنا تحصیل حاصل سمجھا جائیگا جسکو لوگ فعل عبث کہا کرتے ہیں تاہم چونکہ جناب مولانا سید حامد حسین صاحب بیدل شاہجہانپوری کی ادارت میں یہ پہلا نمبر شائع ہوا ہے، اور اپنے انداز حسن ظاہری کے علاوہ معنوی خوبیاں بھی رکھتا ہے جیسا کہ حضرت بیدل سے توقع ہو سکتی تھی، لہٰذا احباب کرام سے سفارش کی جاتی ہے کہ وہ ماہ مئی ۱۹۲۱ء کا رسالہ مخزن بطور نمونہ منگا کر ضرور ملاحظہ فرمائیں اس دور جدید کے چند نمبر اور دیکھنے کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ تفصیلی تقریظ لکھی جا سکیگی،

منشی شبیر حسن خاں صاحب جوش ملیح آبادی کی غزل میں ایک شعر ہے، ؎

جسے حس ہو گیا یہ عقل اک طوق غلامی ہے،
قیامت تک کبھی وہ ہوش میں آ ہی نہیں سکتا

اس شعر میں لفظ حس بجائے احساس استعمال ہوا ہے جو صحیح نہیں،

تپش صاحب کی غزل میں ایک شعر ہے ؎

تشنہ انگیز نہ ہو کیوں مرا خواب ہستی،
کشتۂ کیفیت بادۂ سرجوش ہوں میں

اس شعر میں لفظ کیفیت بالتخفیف استعمال ہوا ہے جو فارسی اردو میں صرف انہیں شعرا نے استعمال کیا ہے،

جن کو کم علمی سے متہم کیا جاتا ہے غالب کی غزل کے اس شعر کو پڑھ کر صاحب ذوق پر تواجد و تراقص کی کیفیت طاری ہو جائے گی، ع

او لفکر کشتن ما بود آہ از من کہ من
لاابالی خواندمش نامہربان نامیدمش

اور بھی ملاحظہ ہو ع

برامید شیوۂ صبر آزمائی زیستم | تو بریدی از من و من امتحاں نامیدمش
بود غالب عندلیبے از گلستان عجم | من زغفلت طوطی ہندوستاں نامیدمش

صفحہ ۱۲ پر شعر اور تصویر والا مقالہ خوب ہے ایڈیٹر صاحب کی زبان دانی اور قابلیت علمی کے بلند مرتبہ کا علم نہ ہوتا تو کاتب کی یہ غلطی ضرور ان کے سر تھوپی جاتی۔ کہ گنتی کو گلنتی لکھا ہے، تاہم ان سے یہ شکائیت ضرور ہے، کہ اُنہوں نے انگریزی لفظ آرٹ کا مترادف کوئی لفظ نہ بتایا، اور اردو زبان کو ایک قدم اور آگے نہ بڑھایا،

مینجر مخزن یعنی مولوی ظہور الدین صاحب نے بھی ادائے بیان اور حسن تکلم میں قابل تعریف ترقی کی ہے، جس کے لئے ان کے دوسرے صفحہ والا اعتذار شاہد عدل ہے،

بالاخر مولانا سید حامد حسین صاحب بیدل شاہجہانپوری اور اہل ملک دونوں کی خدمت میں مبارک باد عرض کی جاتی ہے، کیونکہ بیدل کو مخزن جیسا کثیر الاشاعت رسالہ اور مخزن کو بیدل جیسا بے بدل اڈیٹر مل گیا،

ان کے علاوہ بھی بعض معاصرین نے اپنی بیش بہا آرا سے ممنون بنانے میں فراخدلی سے کام لیا ہے۔ جو امید ہے آیندہ درج کی جا سکیں۔

ماسوا جرائد کے بعض حوصلہ افزا خطوط بھی موصول ہوئے ہیں جن کا اندراج گو طوالت سے خالی نہیں ہے، مگر میں مولانا سید علی حیدر صاحب طباطبائی کے سرفراز نامہ کی نقل کو جو میرے لئے مایۂ ناز منصوبۂ فخر ہے پیش کر کے، شکر گذار ہوں

"کرم فرما۔ تسلیم۔ اس مہینہ کے مخزن کو دیکھ کر نہائیت خوشی ہوئی، اس انتظام جدید سے بہت کچھ امیدیں وابستہ نظر آتی ہیں، خدا کرے مخزن کی پھر اگلی سی شان پیدا ہوا میں ایک عرصہ سے اس علمی و ادبی رسالہ کی خدمت سے قاصر رہا ہوں، مگر اب ایک سلسلہ مضامین علمیہ اور ادبیہ کا مخزن کے لئے شروع کر رہا ہوں، جنہیں مخزن کا حق خدمت سمجھونگا"،

نیاز مند
سید علی حیدر طباطبائی

مجھے امید ہے کہ اگر ان نفوس قدسیہ کی اسی طرح عنائتیں مخزن کی طرف مبذول رہیں تو انشاء اللہ بقول ایک عصر مندار مخزن اپنی کھوئی ہوئی دلفریبیاں بہت جلد پھر پیدا کر لیگا،

ایڈیٹر

خلوتیانِ راز

(ایک صحبت کی یاد)

بعض کہتے ہیں، افضال کو محبت کا مرض تھا، بعض زیادہ لٹریری انداز میں یوں ظاہر کرتے ہیں، کہ "اسکی زندگی میں محبت خود اپنی عمر بسر کر رہی تھی" مگر میں سمجھتا ہوں کہ نہ اسے محبت تھی۔ نہ کسی سے عشق تھا اُس کے پیشِ نظر کبھی یہ خیال ہی نہیں آیا کہ وہ کسی کو اپنا محبوب قرار دے، اور اپنی آرزوئیں کسی سے متعلق کرے اس کی حیات یکسر کاوش و خلش تھی۔ اور اس کی زندگی سراپا تلاش و جستجو،

کوئی لمحہ اس کی زندگی کا ایسا نہ تھا جو مطلوب تک پہنچنے کی تمنا سے آباد گذرا ہو، اور اسکی کوئی نگاہ ایسی نہ تھی، جو پذیرائی کی خواہش سے نمناک نکلی ہو،

وہ چاہتا تھا، کہ دنیا کو دیکھے صرف دور سے، اس کا مطالعہ کرے، بہت بعید فاصلہ سے، لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے قیاسات کی دنیا، اپنے خیالات کی مملکت کو اس قدر بے پایاں صورت میں وسعت پذیر بنا لینا چاہتا تھا، کہ ہر نامعلوم شئے اس کے لئے معلوم حیثیت اور ہر مجہول منظر ایک معروف صورت اختیار کر لے،

اس کی فطرت تھی کہ وہ عالم کی ہر حقیقت، کائنات کی تمام موجودات کو دیکھے نہیں بلکہ سمجھے آفتاب کا طلوع و غروب، اور اس کے درمیان ہر نظر آنے والی چیز اس کے ضم کردہ خیال کے لئے ایک مستقل بت سازی تھی۔ جس کی پرستش سے وہ کبھی بیزار نہ ہوتا تھا، اور یہ کیفیت اس پر اسدرجہ غالب رہتی تھی، کہ رات کو وہ خواب میں بھی یہی سوچتا تھا، کہ نیند کیا چیز ہے اور آنکھیں بند ہو جانے پر بھی انسان یہ سب کچھ کیونکر دیکھ سکتا ہے،

ایک دن وہ اسی خیال میں مستغرق تھا، کہ دفعتہً اک خفیف سے مطمئن تبسم کے ساتھ بولا، "اگر کہا جائے کہ خدا سنتا ہے حالانکہ اعصاب سامعہ نہیں رکھتا، دیکھتا ہے حالانکہ اس کے آنکھ نہیں، تو آپ متحیر کیوں ہوں، پہلے مجھے کوئی یہ سمجھا دے، کہ خواب میں جب کہ ہماری آنکھیں بند ہوتی

ہیں، ہم کس قوت کی مدد سے سب کچھ دیکھ لیتے ہیں، اصل چیز دیکھنے اور سننے والی صرف قوتِ مُدرکہ ہے، اور میرے نزدیک خدا نام ہے ادراکِ محض کا، کیا تم کلیے کچھ اور کہتا ہے؟"

بارہا ایسا ہوا کہ اس کے احباب باغ میں پھول توڑ رہے ہیں۔ اور وہ ایک شاخ کے پاس گھنٹوں اس فکر میں مستغرق رہا، کہ ایک کلی کی پتیوں کا اجتماع ان کا انتشار، رنگ کی یکسانیت، تازگی و شگفتگی، اور پھر شاخوں اور پتیوں کا تناسب یہ کس قوت کا کرشمہ ہے، وہ متحیر تھا کہ کیوں ہمیشہ گلاب سے ایک ہی قسم کی کلی اور یاسمن سے ایک ہی رنگ و وضع کا پھول پیدا ہوتا ہے،

سب لوگوں کا خیال تھا کہ افضال سخت حسن پرست ہے، مگر میرے نزدیک وہ صرف فطرت پرست تھا، اور فطرت سے زیادہ حسین چیز اُس کے لئے اور کوئی نہ تھی،

اگر کبھی وہ اپنے بلند خیالات سے ہٹ کر نیچے آتا تھا، تو بھی اس میں ایک خاص ندرت ہوتی تھی، اور یہاں بھی وہ صرف اپنے خیال ہی سے لذت اندوز ہونا چاہتا تھا،

جس کمرہ میں وہ رہا کرتا تھا، اس کے بالکل محاذ کے بالاخانہ پر ایک حسین لڑکی رہتی تھی جس کے حُسن کی خاص شہرت قرب و جوار میں تھی،

اس نازنین کی خواب گاہ اس بالاخانہ سے جہاں افضال کی نشست رہتی تھی بالکل سامنے واقع تھی، اور رات کو جب اس کی کھڑکیاں برقی روشنی سے جگمگا اٹھتی تھیں تو اکثر ہم لوگ اس کے ذکر سے اپنی صحبتوں کو منوّر و رنگین بنانے کی کوششیں کیا کرتے تھے۔ افضال اس گفتگو میں بہت کم حصّہ لیا کرتا تھا، لیکن یہ خلافِ حقیقت ہوگا، اگر کہا جائے کہ اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ گھنٹوں اُن کھڑکیوں کی طرف دیکھتا رہتا، اور خدا جانے کن کن حسین خیالات میں اپنے دماغ کو مشغول رکھتا تھا،

ایک رات وہ نسبتاً زیادہ مسرور تھا، اور ہم لوگ بھی اپنے اوقات اس پر لطف و بے تکلف مکالمہ میں صرف کر رہے تھے، جو صحبت احباب کی جان سمجھا جاتا ہے،

میں نے ظریفانہ انداز میں ایک سوال پیش کیا۔ کہ :۔

"اگر اس حسین دوشیزہ سے محبت کرنے کی ضرورت لاحق ہو جائے تو ہر شخص کیا تدابیر اختیار کرے

اور انتہائے محبت کا اقتضا کیا قرار پائے؟"

اس سوال کو سنتے ہی ایک صاحب نے ہارڈ ( ) کی آواز سے خیر مقدم کیا، لیکن مجھے معلوم ہے، کہ اُن کا یہ کہنا ہمیشہ اظہار پسندیدگی میں ہوا کرتا ہے،

پہلے تو عرصہ تک "ضرورت لاحق ہونے" پر بحث ہوتی رہی اور مختلف ترمیمیں پیش کی گئیں لیکن سب مسترد ہوئیں کیونکہ "از خود محبت ہو جانے" کی صورت میں "تدبیر" کا سوال ہی اُٹھ جاتا ہے، اور دریافت طلب امر یہی تھا، بہر حال سوال ہی قائم رہا، اور ہر شخص سے رائے طلب کی گئی،

ہمارے ایک بدایونی دوست اپنی تمام ان برودتوں کے ساتھ جو ایک نباتاتی آدمی میں پائی جا سکتی ہیں، بولے :- "اگر واقعی کبھی میں محبت کرنے کی ضرورت سے مجبور ہو جاؤں (جس کو میں کسی طرح نہیں سمجھ سکتا کہ کیونکر ایسا ہو سکتا ہے) تو سب سے پہلے یہ کوشش کروں۔ کہ اس ضرورت کو مغلوب ...."

مختلف آوازیں "یہ امر سوال سے خارج ہے، مجبوری تسلیم کرنے کے بعد رائے زنی کرو"

چونکہ یہ حضرت ہمیشہ اس امر کی احتیاط کرتے ہیں، کہ اُن ـ کے وہ جذبات جن کا تعلق خلوت کی عریانیوں سے ہے، کسی پر ظاہر نہ ہوں، اس لئے انہوں نے باوجود اصرار کے اس سے زیادہ کچھ نہ کہا۔ کہ "اگر مجبور ہو جاؤں، تو محبت کر لوں اور کیا کر سکتا ہوں، رہا یہ سوال کہ محبت کا اقتضا کیا ہو، اور میں کیا تدابیر اختیار کروں اس کے متعلق میں کیا کہہ سکتا ہوں، جب تک محبت نہ ہو جائے، پہلے محبت کر لینے دیجئے، پھر اس کی نسبت سوال کیجئے"

ان کے اس جواب سے کوئی شگفتگی پیدا نہ ہوئی، اور فوراً دوسرے صاحب کو مخاطب بنایا گیا، جو اپنی رائے ظاہر کرنے کے لئے بیتابانہ طریقہ سے اپنی جگہ کسمسا کسمسا کر رہ جاتے تھے، یہ بولے :-

"میں تو سب سے پہلے ذریعہ ڈاک .... کا وہ پرچہ اس کے پاس بھیجوں جس میں میری تصویر شائع ہوئی ہے، میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس حد تک اس سے متاثر ہوگی، لیکن اُسے اثر قبول کر لینا چاہئے، کیونکہ وہ تصویر میرے شباب کے عالم پختگی کی ہے، اور مجھ میں کوئی حسن ہو یا نہ ہو لیکن میرے شباب میں نفس شباب ہونے کی حیثیت سے کافی جاذبیت پائی جاتی ہے،

اور ہاں میں بھول گیا، اس پرچہ کے ساتھ ایک خط بھی تہ یہ کا روانہ کردوں، اور اس میں ہر سطر

کے بعد ایک عاشقانہ شعر درج کروں، خط کا کاغذ گلابی رنگ کا ہو، اس کے چاروں طرف خوشنما سبز رنگ کی بیل ہو۔ اور سر مکتوب ایک مونوگرام ہو۔ خواہ وہ کسی کے نام کا ہو۔ مونوگرام صرف اس لئے کہ اس پر میری دولت و امارت، جدید تہذیب و شائستگی کا بھی اثر پڑے، علاوہ اس کے جاپان کی اُن رنگین اور منتقل ہونے والی تصویروں سے جو پانی میں بھگونے سے دوسرے کاغذ پر چسپاں ہو سکتی ہیں۔ لفافے کے کونہ پر گلاب کا پھول یا فاختہ کی وہ تصویر جو اپنی چونچ میں لفافہ لئے ہوتی ہے چپکا دوں، یقیناً وہ جواب دیگی کیونکہ تہذیب جدید کا اقتضا یہی ہے، بس پھر کیا ہے۔ میں رسالہ کے پرچوں، خطوں اور غزلوں پر دھر لونگا، یہاں تک کہ وہ ملاقات کے لئے ایک شام مقرر کرے گی، میں ایک گلابی رنگ کی قمیص پہن۔ کندھے پر ولائیتی کمبل ڈال اور ہاتھ میں نہائت نکیلی شلم کا ڈنڈا لیکر پہنچ جاؤنگا، وہ کمرہ کے اندر بلائے گی میں چلا جاؤں گا۔ وہ کھانے کو کہیگی، میں انکار کروں گا، جب زیادہ اصرار ہوگا، تو راضی ہو جاؤں گا مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ اپنے ہاتھ سے نوالہ بنا بنا کر دے، جب میرے منہ کے پاس نوالہ آئے گا، تو بجائے لقمہ کے اس کی نازک انگلیوں پر حملہ کروں گا، اور یقیناً زخمی کر دونگا، نتیجہ یہ ہوگا، کہ دانتوں کے زہر سے زخم بگڑ جائیگا، میں اسکی عیادت کروں گا، دوائیں لاؤں گا، خود بھی کھانا پینا ترک کر دونگا یہاں تک کہ جب وہ صحت یاب ہوگی، تو میں بھی گھل گھلا کر ایک چھریرے جسم کا آدمی بن جاؤں گا، حضرت میری محبت کا اقتضا تو صرف یہ ہے، کہ کسی طرح سے میں دُبلا ہو جاؤں،،

ان سے کہا گیا کہ "حضرت" وہ اردو تو جانتی ہی نہیں، آپ کے میگزین کو کیا سمجھیگی، خطوط کا جواب کیوں کر دے گی،،

یہ حقیقت ان کے لیئے نہائت دلشکن ثابت ہوئی، اور انہوں نے اک حسرت آمیز لہجہ میں کہا، "تو کیا پھر میری قسمت میں کبھی دُبلا ہونا لکھا ہی نہیں؟،،

اس میں شک نہیں کہ یہ صاحب بڑے اداشناس شخص ہیں، انہوں نے پوری کوشش کی کہ پہلے حضرت کے جواب سے جو تنغص پیدا ہو گیا ہے اُسے دور کر دیں اور اس میں کلام نہیں۔ کہ وہ مسموم اثر زائل ہو گیا،

ان کے بعد ایک دوسرے اکبرآبادی صاحب کی باری آئی، یہ نہائت دُبلے پتلے نحیف و نزار عاشق تن آدمی ہیں، اور اپنے ماقبل کے ساتھ ان کو وہی حیثیت حاصل ہے جو منسلق بن موجبہ کلیہ

کے ساتھ سالبہ جزئیہ کی ہوتی ہے، انہوں نے نہائیت اصرار کے بعد کہا کہ :-
"میں پہلے تو اس سوسائٹی کا ممبر بنوں جس کے تمام ممبر آپس میں تبادلۂ تصاویر کر سکتے ہیں، یقیناً یہ خاتون بھی اسکی ممبر ہوگی، اس کے بعد میں چند تصاویر مختلف مناظر کی روانہ کر کے ان کی تصویر طلب کروں گا، وہ یقیناً بھیجیں گی - میں اس کی رسید میں ان کے حسن سے زیادہ اپنے لطیف تاثرات کا اظہار نہائیت مہذب انداز میں کروں گا، چونکہ آجکل میں بھی کلکتہ میں ہوں، اس لیئے ملاقات کا وقت جلد مقرر ہو جائے گا، بس پھر کیا ہے، میں انہیں روز شام کو تصاویر متحرکہ کے تماشہ میں لے جاؤنگا بہترین ہوٹلوں میں کھانا کھلاؤں گا، موٹر میں سیریں کراؤنگا، گھوڑ دوڑ میں ان کی طرف سے قمار بازی کروں گا، جیت ہوگی تو پیش کرونگا، ہار ہوئی تو (It matters not) کہہ کر خاموش ہو جاؤنگا قیمتی قیمتی ساریاں ان کی خدمت میں پیش کروں گا، یہاں تک کہ میں اپنا سارا وقت کلکتہ سے وطن اور وطن سے کلکتہ کے سفر میں صرف کرونگا، اور اپنی تجارت کو تباہ و برباد، یقیناً وہ میرے تمام ایثار کو دیکھ کر شادی کرے گی، اور جب میں اس کے مغربی انداز کی زندگی سے کچھ دنوں کے بعد بیزار ہو جاؤں گا، تو خودکشی کر لونگا، کیونکہ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا"

پھر ایک اور صاحب کو درمیان میں چھوڑ کر ایک جالندھری دوست کی باری آئی، سب لوگ ان کے جواب کے مشتاق تھے، کیونکہ اس فن میں ان کو ید طولےٰ حاصل ہے، اور سب کو یقین تھا کہ ان کا گفتگو کرنا ایک ماہر فن کا گفتگو کرنا ہوگا،

انہوں نے اس طرح ابتدا کی :- "چونکہ مردوں پر اولین ظلم عورت ہی کی طرف سے ہوا ہے اس لیئے میں نے تو یہ عہد کر لیا ہے، کہ جہاں تک ممکن ہوگا، اس جنس کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا نہ اٹھا رکھونگا، اس وقت تک میں اس ارادہ پر استحکام کے ساتھ قایم ہوں، اور رہوں گا جب تک میرے چہرہ کی صباحت و صفائی اور مصنوعی اداؤں میں جاذبیت باقی ہے، میں سب سے پہلے اس امر کی جستجو کرونگا، کہ وہ کب سفر کرتی ہے، اگر اس میں کامیاب ہو گیا، تو پھر میری فتح ہے کیونکہ آپ حضرات کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ہر فرلانگ پر ایک مار رکھنے والی ادا صرف کر سکتا ہوں، خواہ وہ سفر ہزار میل کا ہو، تمام وہ مہذب عوائد جن سے ایک تعلیم یافتہ خاتون متاثر ہو سکتی ہے مجھے ازبر یاد ہیں، اور مجھے معلوم ہے کہ کس وقت کن اداؤں (Man ners) کے استعمال کی ضرورت ہوتی ہے"

میں دورانِ گفتگو میں سفر یوروپ کا بھی ذکر کرونگا، اور اپنی گفتگو سے اسکو یقین دلا دونگا، کہ مجھ سے زیادہ عورت کا قدر شناس۔ مجھ سے زیادہ سنٹی منٹل (Sentimental) اور کوئی نہیں ہو سکتا، اگر وہ اس سے متاثر ہو کر مالوف ہو گئی، تو میں اسے اپنی ترکیبوں سے جکڑتا جاؤنگا اور جب دیکھونگا کہ وہ بالکل مجبور ہو گئی ہے تو بے اعتنائی اختیار کرونگا اسکو تکلیفیں پہونچاؤنگا، یہاں تک کہ اگر وہ بستر مرگ پر ہو گی تو بھی میں اپنا وقت سیر و تفریح میں بسر کرونگا، نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ مر جائیگی اور میں کوئی دوسرا شکار تلاش کرونگا،،

اس کے بعد ایک خلق مجسم دہلوی تھے، انہوں نے کہا کہ "بھائی میں اپنے لڑکے کی ماں کے سامنے وعدہ کر چکا ہوں، کان پکڑ چکا ہوں کہ کبھی عشق نہ کرونگا، اس لئے میں تو اب اس کا ذکر بھی مناسب نہیں سمجھتا، ہر چند مجھے اس کا افسوس ضرور ہے اور خیال ہے کہ احباب برہم نہ ہو جائیں، لیکن کیا کروں حلف کا احترام مجھ پر واجب ہے، تاہم اگر میرے اس جواب کو نہ مانا جائے اور اظہار رائے ضروری ہو تو میں سوا اسکے اور کچھ نہ کرونگا، کہ جا کر اس کے قدموں پر گر پڑونگا اور کہونگا کہ خدا کیلئے رحم کرو اور اس شہر سے کہیں اور چلی جاؤ، تمہیں کیا ملیگا اگر میں گھر سے نکال دیا گیا، تمہاری تو ایک دن کی تفریح ہو جائے گی۔ اور میں بیچارہ تو اے مہربان مارا جاؤنگا،،

افضال بولا:- "آپ حضرات نے ایک صورت فرض کر کے محض ظنی و قیاسی تدابیر سے کام لیا، لیکن میں ایسا نہیں کرونگا، کیونکہ مجھے حقیقتاً اسکے ساتھ محبت ہے اور نہ صرف اس کے ساتھ بلکہ ہر اس چیز سے جو مجھ سے دور، میری دسترس سے علیحدہ، اور میری آغوش سے جدا ہے، ممکن ہے آپ حضرات کے مساعی کا منتہائے نظر ایک عورت کو قریب ترین مطالعہ کا ہدف بنانا قرار پائے، محض اس دلیل کی بنا پر کہ وہ حسین ہے، نوجوان ہے، مہذب و شائستہ ہے لیکن میرے لئے یہی وہ باتیں ہیں جو ہمیشہ اس سے دور رہنے پر مجھے مجبور کرینگی،

یہ آپ کو معلوم ہے کہ کسی حسین منظر کو دیکھ کر اصل لطف اٹھانے والی چیز ہماری آنکھ نہیں بلکہ ہمارا خیال ہے، پھر جب تک خیال کا تعلق صرف نا معلوم و غیر محقق اشیا سے ہے اس وقت تک اس کے پر و بال زیادہ آزادی کے ساتھ کام کر سکتے ہیں، لیکن جب ایک چیز کا پورا علم حاصل ہو جاتا ہے تو تمام کاوشیں اور آرزوئیں آسودہ ہو جاتی ہیں اور پھر کیفیات و تاثرات کا وہ مادی دور شروع ہو

ہے جہاں سوائے انقباض کے کوئی لطیف لذت نہیں پائی جا سکتی،

اگر اس خاتون کے کمرہ کا دروازہ میری نگاہوں کے سامنے کھلا کرتا اور میں دن میں کئی بار اسکو دیکھ سکتا، تو شاید میری محبت کی زندگی کبھی کی ختم ہو چکی ہوتی، لیکن چونکہ اس کمرہ کی پشت میری طرف رہتی ہے اور صرف کھڑکیوں کے شیشوں سے کبھی کبھی کسی چلنے پھرنے والی تصویر کا دھندلا سا عکس دیکھ لیا کرتا ہوں اس لئے میرا تعلق ہنوز باقی ہے اور میری خیال آرائیاں بدستور قائم، پھر میں اپنے تخیل کی وضاحت کہاں تک کر سکتا ہوں، میرے خیال کے جزئیات کیونکر بیان ہو سکتے ہیں، جب کہ رات کی تنہائیوں میں، بعض اوقات اس کی خواب گاہ اور وہاں کی ہر ہر چیز میرے پاس ہوتی ہے،

جس وقت وہ کپڑے اتارتی ہے، جب وہ لیٹتی ہے۔ جب اسکی آنکھیں بند ہو کر اپنی لانبی لانبی پلکوں کا سایہ رخساروں پر ڈالنے لگتی ہیں، جب اسکے سینہ و شانہ کی بلوری ضیا سے کمرہ کی فضا جگمگا اٹھتی ہے جب وہ صبح کو انگڑائی لیتی ہوئی، اپنے چاروں طرف کی پھیلی ہوئی نکہت میں تلاطم برپا کر دیتی ہے، جب وہ عالم سکون کی متاملانہ ساعتوں میں محو خیال ہوتی ہے اور رضا بدلنے کیا سوچکر ایک سرد آہ کے ساتھ کروٹ لے لیتی ہے تو میں اس کے پاس ہوتا ہوں اور وہ مجھ سے قریب۔ پھر اس سے زیادہ کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے اور مجھ سے زیادہ بے وقوف کون ہوگا اگر میں اپنی کامرانی کی لذتوں کو اس سے ملکر ضائع کر دوں، اس لئے میں تو یہی چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے دور رہے اور میں ہمیشہ یونہی اس کی اور اس کی خوابگاہ کی خاموش پرستش کیا کروں،

(نیاز فتحپوری)

اُروَشی۔ گنگا کے کنارے ریت کے ٹیلے بنا بنا کر کھیل رہی تھی، اور اسکے لمبے اور گھنیرے سیاہ اور گھونگر والے بالوں کی لٹیں ہرائی گئی نظر سے اس کا منہ چھپا نیکو نقاب بنی ہوئی تھیں، ــــــ سادہ دل راج رشی کو کیا خبر تھی۔ کہ اروشی اسی بکھرے جھرمٹ اور بالوں کے گھونگھٹ میں سے سب کچھ دیکھ رہی ہے ــــــ وہ چہلیں کرتا ہوا آگے بڑھا، اور دونوں ہاتھوں سے اس کی آنکھیں بند کر لیں۔ اروشی رشک سے آگ بگولا ہو گئی اور اسکی محبت شعلہ شمع ہو کر اڑ گئی۔

حقیقت میں محبت کی زیادتی ذرا سے میلانِ غیر کو بھی گوارا نہیں کر سکتی +

(کالیداس)

سونے بھرا دماغ

اس حکایت کے پیرایہ میں مجھے ایک آدمی کے جاں گداز سوانح سننے کا اتفاق ہوا جسکا دماغ کہا جاتا ہے کہ سونیکا تھا، لوگ ضرور حیران ہونگے، کہ سونے کا دماغ کیا معنی ۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اس بدنصیب کے دماغ میں بجائے مغز کے سونا ہی سونا بھرا ہوا تھا،

جب وہ عالم ارواح سے زندانئی حیات ہو کر اس دنیا میں آیا تو ڈاکٹر اسکے گراں بار سر اور بڑے سے بیڈول دماغ کو دیکھ کر گہری سوچ میں چلے گئے، اور بڑے عرصے تک آپس میں سرگوشیاں کرنیکے بعد انہوں نے رائے قائم کی کہ یہ بچہ جیئے گا نہیں، مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے ۔ اس عجیب الخلقت بچے کی نشوِ حیات آفتاب کی شعاعوں کو سیم جذب کرنے سے ہوتی رہی، مگر اس کا بھاری اور بوجھل سر اسے ہمیشہ مشکلات میں ڈالتا رہتا تھا، اس کے والدین مذاقِ شاعری کے سامان سے اسکے درسی کمرے کو آراستہ رکھتے تھے، لیکن جب وہ لڑکھڑاتا ہوا کمرے کے سامان آرائش سے ٹکراتا گذرتا تھا، تو اسکی قابلِ رحم حالت دیکھی نہیں جاسکتی تھی،

اسے اپنے سر کا بوجھ سنبھالنا دشوار ہو گیا تھا، ایک مرتبہ سیڑھیوں پر سے اسکا پاؤں رپٹا اور بے طرح سنگین دہلیز پر سر کے بل آرہا، دھماکے سے ایسی آواز پیدا ہوئی، گویا سونے کی گیند سنگ مرمر پر گر پڑی ماں نے سمجھا کہ ڈاکٹروں کی پیش گوئی پوری ہوگئی ۔ مگر جب اسے چارپائی پر ڈالا گیا تو اس نے حالتِ کرب میں کروٹ لی اور اپنے بال نوچنے شروع کئے، ماں نے اسکے سنہری بال سلجھائے تو دیکھا کہ اس کے سر کو سخت ضرب آئی ہے اور بالوں میں دو ایک سونے کے قطرے الجھ رہے ہیں، ماں کو پہلی مرتبہ علم ہوا کہ اس کے بچہ کا دماغ سونے کا ہے،

ماں نے خوف کے مارے یہ راز چھپائے رکھا، لڑکے کو خود معلوم نہ ہوا، کہ اب سے عام لڑکوں میں کھیلنے کی اجازت کیوں نہیں دی جاتی، جب وہ ضد کرتا تو ماں کہتی "میرے لال وہ تمہیں چرا لے جائیں گے"

اب لڑکے کو ہر لحظہ یہی خوف دامنگیر رہتا تھا، کہ کہیں میں چوری نہ جاؤں، وہ تن تنہا مکان

کے کمروں میں گرتا پڑتا اپنا دل بہلایا کرتا تھا،

جب اُس نے اٹھارہویں سال میں قدم رکھا تو اُس کی ماں نے اسے بتایا کہ تقدیر نے اسکے سر میں کیسا خزانہ مخفی رکھا ہے ، ماں نے کہا " بیٹا اب تک میں نے تمہیں چشم بد سے بچا بچا کر نازوں سے پالا، اعلیٰ تعلیم دلوائی، جو تھا تم پر لگا بیٹھی۔ اب خیر سے تم جوان ہوئے میرے تھکے وقت کا سہارا تمہیں تم ہو"

ماں ضروریات سے مجبور ہو کر کبھی کبھی اس سے سونا مانگتی تو ہونہار بچہ فوراً اپنے دماغ سے ایک سونے کا ڈلا نکال کر دیدیتا، کسطرح ؟ کہانی میں تو اس امر کی وضاحت نہیں کی گئی۔ مگر جب کبھی بھی ماں نے بچے سے درخواست کی تو بچے نے عذر نہیں کیا، بلکہ وہ جھٹ چڑیا کے انڈے کے برابر دمکتی ہوئی سونے کی ڈلی ہاتھوں میں اچھالتا ہوا ماں کے قدموں میں ڈالدیتا تھا، اور دل میں پھولا نہیں سماتا تھا، آخر اس بے بہا خزانے پر نازاں ہو کر جو قدرت نے اس کے دماغ میں ودیعت کیا تھا، اسے اپنے دل میں طرح طرح کی آرزوئیں پیدا کیں اور ہزاروں ارمان سینے میں لیکر وہ اپنے گھر سے نکل کھڑا ہوا، اور کاہش دماغ سے اس نے اپنے تئیں فراوانئے عیش میں ڈالدیا،

جس ٹھاٹھ سے وہ شاہزادوں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا، اور جس بیدردی سے وہ سونا موتی گاجر کیطرح بکھیرتا پھرتا تھا، اس کے متعلقین کو خیال پیدا ہوتا تھا، کہ اسکی سونا اگلنے والی دماغی کان کبھی ختم نہ ہوگی ہوگی، آخر تابہ کے ، اس کا دماغ خالی ہونا شروع ہوا ، اور مرور ایام سے اسکی بجلیاں برسانے والی چمکدار آنکھیں بے نور ہوتی گئیں ، اور اس کے شوخ رخساروں میں گڑھے پڑگئے ، تمام رات کی عشرت سے درماندہ ہو کر مبتلائے عیش مخمور نوجوان نے ایک صبح جب انگڑائی لے کر آنکھ کھولی، تو شب گذشتہ کے ہنگاموں کی خاموشی پر چند ٹمٹماتے ہوئے شمع دانوں سے منعید دھوئیں کے سوا اسے کچھ نظر نہ آیا، اب اسے پہلی بار علم ہوا، کہ اس کے دماغی خزانے سے لوگوں نے سونا کھینچ کھینچ کر ہوا بھر دی ہے وہ سوچنے لگا۔ کہ زمانے کی دستبرد سے جو کچھ بچ رہا ہے اب اسے نہیں گنوانا چاہئے، چنانچہ اس نے اپنی زندگی کی نئی روش پر بدلی، وہی آدمی جسے اپنے سونے کے دماغ پر فخر تھا، اب عیش کے نام سے گھبرانے لگا، اب وہ سب سے الگ تھلگ رہتا تھا، اور اپنی گذشتہ زندگی پر نوحے لکھا کرتا تھا، لیکن پیٹ پالنے کے لئے دماغ سے اسے کچھ میسر آتا تھا، اس لئے اسنے کمر ہمت باندھ کر محنت مزدوری شروع کردی، کنجوسوں کی طرح وہ کسی پر بھروسہ نہ

کرتا تھا، اور اپنے سُکے سے بھی سہما رہتا تھا، عیش کے ذکر سے بھی اسے نفرت ہو گئی تھی، اب وہ خود فراموشی میں عمر گذارنا چاہتا تھا، بدقسمتی سے ایک دوست نے گوشۂ عزلت میں بھی اسکا پیچھا نہ چھوڑا کیونکہ یہ دوست اسکی دماغی کیفیت سے آگاہ تھا،

ایک پرطوفان رات میں جسکی تاریکی دور کرنے کے لئے غریب مزدوری پیشہ آدمی کے پاس شمع تک بھی نہ تھی، اسکی نیند ایک ہولناک خواب نے پریشان کر دی، یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سر میں کسی نے تیز نشتر چبھو دیا ہے، وہ چیخ مار کر اٹھ کھڑا ہوا اور دیوانہ وار اپنے کلبۂ احزان سے چھلانگ مار کر باہر آیا، یا سلائی جلا کر دیکھا تو اس کا پرانا رفیق لمبے کوٹ کی آستینوں میں ہاتھ چھپائے بھاگا جا رہا ہے،

آہ - اب اسے معلوم ہوا کہ اس کے دماغ کا ایک اور ٹکڑا بھی نکمال بے جگری سے چرا لیا گیا ہے کئی سال کی سخت مشقت کے بعد دن پھرتے نظر آتے تھے کہ فراغت کے آتے ہی سونے والے دماغ کے آدمی کا سر پھر گیا۔ دماغ کے ساتھ اسکا دل بھی ہاتھ سے جاتا نظر آتا تھا، اب وہ دل وجان سے ایک سنہری بالوں والی کمسن لڑکی پر فریفتہ ہو گیا، لڑکی بھی جواب میں اسکے ساتھ اظہار عشق کرتی تھی، مگر چنچل لڑکی کو اپنے سنہری بالوں کی قیمتی موباف، جڑاؤ چندن ہار، اور اونچی ایڑی کی مخملی جوتی سے بھی کچھ کم پیار نہ تھا، وہ سونا بھرے دماغ والے پر اگرچہ ہزار جان سے فریفتہ تھی، مگر اپنے بناؤ سنگھار میں بھی اسے کامل انہماک تھا، اگر دس منٹ وہ اپنے عاشق کی دلداری میں صرف کرتی تھی، تو پورا گھنٹہ وہ آئینہ کے سامنے گذار دیتی تھی،

اس دلنواز ہستی کے ہاتھوں میں جو شکل وصورت میں یونانی بت اور نغمہ وصوت میں بہشتی پرند کی مانند تھی، سونے کے ٹکڑے پانی کیطرح پگھلنے شروع ہو گئے، وہ سونا اڑانے کے نت نئے طریق اختراع کرتی اسکے عاشق نے اس خیال سے کہ مبادا انکار سے اسے صدمہ ہو آخر دم تک اس بھید اس راز کو چھپائے رکھا، کہ سونا مجھے کاہش دماغ سے پیدا کرنا پڑتا ہے،

وہ کہتی " ابھی تو ہمارے پاس سونے کی فراوانی ہے !" - بیچارہ عاشق جواب دیتا: "حضور ہمیشہ فراوانی ہی رکھے گا"، اور وہ اس خیال پر مسکراتا کہ لطیف بہشتی عندلیب میرا دماغ کھا کھا کر چہچہاتی اور گاتی ہے گویا کہ اس کے تمام نغمے میرے دماغ سے ہی پیدا ہوتے ہیں، بعض اوقات اس پر اپنی گذشتہ زندگی کے تصور سے ہراس طاری ہو جاتا، اور وہ دوبارہ کنجوسوں کی سی زندگی گذارنے کا ارادہ کرتا، عین اسی وقت اس کی بیوی انداز دلربائی کے ساتھ ولایتی جوتی کی ایڑی سے پھولوں کی پتیاں

کو مسلتی اور گاتی ہوئی اس کے پاس آجاتی اور کہتی "میرے پیارے تمہارے پاس سونے کی تو کچھ کمی نہیں میری مسہری پر سونے کے تلسّے ٹکوا دو تو مسہری میں پڑے پڑے مجھو تاروں بھری رات کا لطف آئے"

دو سال تک یہی حالت جاری رہی، ایک دن صبح کو وہ سحر ساز لڑکی سیج پر مردہ پائی گئی، شاید پھولوں کی فراوانی کے باعث اسکا داغ تیز خوشبو کا متحمل نہ ہوسکا، خاوند کا دماغ بھی خالی ہوچکا تھا جو کچھ باقی تھا، اس سے اعلیٰ پیمانے پر تجہیز و تکفین کا سامان کیا گیا، قبر کے تعویذ پر سنگ مرمر کا گنبد اور مرمر کی برجیاں بلند کی گئیں، اور ان پر سونے کے کلس چڑھائے گئے، قبر کے گرد چھوٹا سا خوشنما باغ لگایا گیا آبشاروں کی تعمیر میں سونے کو پانی کی طرح بہادیا، اب سونا رکھ کر بھی وہ کیا کرتا، غرضیکہ جب مقبرہ کی تعمیر ختم ہوئی تو اسکا عجیب دماغ خالی ہوچکا تھا، کاسۂ دماغ کی سلوٹوں میں چند ریزے سونے کے ابھی باقی تھے، جن کے کھرچنے سے تار نفس کے ٹوٹنے کا اندیشہ تھا،

اب وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ پکڑے حواس باختہ گلی کوچوں میں مجنونانہ انداز سے مارا مارا پھرتا تھا اسکے چہرے پر ایسی جنون خیز وحشت برستی تھی، جو حریف نگاہ نہ تھی، وہ مدہوش آدمیوں کی طرح گرتا پڑتا پرستیدۂ خیال کے لئے تحائف خریدنے کی غرض سے جوہریوں کی دوکانوں کا چکر لگایا کرتا تھا

ایک شب کو جب تمام دوکانیں برقی روشنی سے بقعۂ نور ہو رہی تھیں، وہ ایک "شوکیس" کے پاس کھڑا ہوگیا۔ موتیوں اور جواہرات کی ضیا پاشی برقی روشنی کو تجلی بخش رہی تھی، اسکی نگاہ دو ساٹن کی جوتیوں پر پڑی۔ جن پر ٹائی کی جگہ دو بڑے بڑے ہیرے ٹکے تھے، "یہ جوتیاں پہنکر وہ کیسی خوش ہوگی"، اس خیال کے ساتھ مجنوں شاعر مسکرایا اور حادثۂ مرگ کو فراموش کرکے وہ جوتیاں خریدنے کے لئے دوکان میں گھس گیا۔

سیٹھ نے اپنی دوکان کے اندر سے ایک چیخ سنی وہ بھاگا آیا تو کیا دیکھتا ہے، کہ ایک بوڑھا آدمی جس کے سر کے بال بے ترتیبی سے اس کے ابھرے ہوئے شانوں پر پریشان ہو رہے ہیں وحشیانہ نگاہوں سے اسے گھور رہا ہے ایک ہاتھ میں ہیرے جڑے جوتیوں کا جوڑا ہے اور دوسرا ہاتھ خون میں تر آلود سیٹھ کی طرف پھیلا ہوا ہے۔ خون آلودہ ناخنوں میں سونے کے چند ذرے چمک رہے ہیں!
اور روح کالبد خاکی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ چکی ہے۔

دراصل یہ تو بچوں کو بہلانے والی کہانی۔ لیکن شروع سے لیکر آخر تک حقیقت پر مبنی ہے اس دنیا میں آجکل

بھی آپکو بہت سے مصیبت زدہ آدمی ایسے نظر آئیں گے، جو اپنے دماغ کے بھروسہ پر زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، لیکن اپنا مغز واستخوان گھلا کر زرِ عیار کے بدلے ادنیٰ ترین سامان زیست بصد مشکل فراہم کر سکتے ہیں، اُنہیں کاہشِ دماغ ہمیشہ ناقابل برداشت درد میں مبتلا رکھتی ہے اور آخر وہ آلام روزگار کا شکار یوں ہی ہو جاتے ہیں۔

میر افضل علی۔ ایم۔ اے

حسن تخیل

کیا میں اس پیارے پیارے چمن کو چھوڑ کے یوں ہی نامراد چلا جاؤنگا؟ کیا یہ خوبصورت خوبصورت پھول نازک نازک منہ بند کلیاں ہر شخص کی قسمت کے لئے نہیں ہوتیں، ــــ یوں تو آئے دن اس باغ میں سینکڑوں آتے ہیں، بہت سے تو گلشن میں اس پھول کلی کے ہونیکا احساس بھی نہیں کرتے کوئی آتا ہے اسے ہاتھوں سے مسلتا ہے پاؤں سے ملتا ہے اور چلا جاتا ہے کوئی ان پھولوں۔ اس سبزہ پر اس طرح سے بیٹھتا اٹھتا اور چلتا پھرتا ہے، جیسے معلم مدرسہ میں، معمار گاری کی طغاریں بلکہ جلاد قتلگاہ میں .... لیکن کچھ مجھ سے فطرت پرست ایسے بھی ہیں، جو محض اپنی زندگی کی حقیقت پہچاننے کے لئے اس باغ میں آتے ہیں، ـــــــ ـــــــ میں نے کئی کلیوں کو چوما۔ اور جسکو چوما پھول بنگئی .... اے میری چھوٹی سی ننھی کلی۔ آ میرے غنچہ دہن پیاری کلی، تو تنہا اس باغِ حسن میں کیوں ہے میرے لب تیری نزاکت کے چومنے کو ترس رہے ہیں، میری آنکھیں تیرے حسنِ عارض کی گلچینی کے لئے بیچین ہیں مگر تو پروا نہیں کرتی .... آہ میں اب اس باغ سے چلا جاؤں گا۔ اور تو یہیں رہ جائیگی ــــ

ممکن ہے کہ کوئی ناقدرا انسان میرے بعد تجھے مل مسل ڈالے، تیرے ننھے سے دلکو دکھاوے، تیرے رازِ حقیقت سے معمور اور ایسے سینہ کو چاک کر دے، میلے ہاتھوں سے چھو چھو کے میلا کر دے، مگر اے باغِ حسن کی بہار۔ جب تو پژمردہ ہو جائیگی (خدا کرے کہ وہ دن بہت دور ہو) جب تو مرجھا جائیگی، میں اسوقت بھی تجھے چوری چوری محبت بھری نگاہوں سے دیکھا کرونگا ــ لیکن مجھے اتنا تو بتادے کہ کچھ تجھے بھی میرا خیال ہے، تیرے دل میں بھی مری محبت ہے کہ نہیں پیاری میں جانتا ہوں کہ ضرور تو بھی مجھے چاہتی ہے ــ کیا تو مجھے دیکھکر آنکھیں نہیں جھکا لیتی، کیا تو میرے سامنے آکر منہ نہیں چھپا لیتی شرما نہیں جاتی۔ بڑھ کے جلدی سے آنچل منہ پر نہیں ڈال لیتی، آخر کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے، (مجید)

عشق کی خودکشی

مفصلۂ ذیل تحریر کے پرزے جیلخانے کی اس کوٹھڑی میں پائے گئے جہاں میرا دوست قاسم پھانسی پانے سے پہلے محبوس تھا، اور مجھے سعادت علیخاں داروغۂ جیل کی مہربانی سے دستیاب ہوئے ہیں، قاسم جس کی زندگی شوق اور کیف کے سرچکرا دینے والے جذبات سے معمور تھی، آج دوسری دنیا میں ہے جہاں خود جانے سے پیشتر وہ اپنی محبوب بیوی رضیہ کو بھیج چکا تھا، خدا ان دونوں کی روحوں کو عافیت عطا فرمائے، (ارشد)

(۱) شاید مجھے داروغۂ جیل کا شکر گذار ہونا چاہیئے، کہ اسکی اجازت سے میں یہ چند سطریں تحریر کر رہا ہوں، لیکن میرا دل اسوقت جذبات سے بالکل خالی ہے، میرے دل کی اسوقت وہی حالت ہے جو کسی محفل کی صبح کے وقت ہوتی ہے، جب سحر کی پھیکی روشنی اور تکان کا خواب آلود سکون مشاغل شبانہ کی ہوسناکیوں اور عشرتوں کو بیرنگ و بھیانک کر دیتا ہے، میرا دل ایک کھنڈر ہے، جس میں زندگی نہیں، آثار ہیں، جہاں حال بیدار نہیں، ماضی خفتہ ہے۔ جہاں نہ نالہ ہے نہ نغمہ، فقط ایک ویران سی گونج ہے، جسکے میرے نزدیک کوئی معنی نہیں، جو نوائے زندگی اور غلغلۂ حیات نہیں، ایک خندۂ بے مسرت۔ ایک فریاد بیدرد ہے،

کل مجھے قانون کی انتہائی سزا دیجائے گی، میں اس کے لئے تیار ہوں، ہر شخص اس کے لئے تیار ہوتا ہے۔ موت کے لئے کسی تیاری کی ضرورت نہیں، موت اسی لئے موت ہے کہ ناگہانی ہوتی ہے، ہر ایک موت ناگہانی موت ہے، موت کا وقت معین ہے، اور اس طرح معین کیا گیا ہے کہ بموقع آئے، اگر ہمیں اپنی موت کا وقت معلوم ہو۔ تو ہماری تمام زندگی اس موت ہی کی تیاری میں صرف ہو جائے زندگی اس قیام کی مانند ہو، جو ریل کے سٹیشن پر گاڑی کے انتظار میں کیا جاتا ہے،

(۲) انسان کی ہستی فوری ضروریات اور فوری انتظامات کا ایک اجتماع ہو جس میں عشق کی ناپائداری حسن کی بیوفائی کیطرح ہو۔ جہاں تعمیر ایک غلطی ہو اور جہاں اعتماد ایک حماقت ہو،

مجھے اپنی موت کا وقت بتا دیا گیا ہے، اس لئے میں نے جو کچھ تعمیر کیا تھا، اسے منہدم کر چکا ہوں مجھے اس تخریب میں بہت کم تکلیف ہوئی ہے۔ میں نے کبھی کسی عمارت کی بنیاد استوار نہیں رکھی، میری

آرزوؤں کے محل - میری توقعات کے قصر، میرے ارادوں کے قلعے سب بلند اور شاندار تھے، لیکن مجھے انہدام کے وقت معلوم ہوا ہے کہ سب کی بنیادیں نہائت کمزور تھیں،

شروع میں جب میں نے مجرم ہونیسے انکار کر دیا تھا، تو اکثر لوگ مجھے سچا جانتے تھے، انکو یقین تھا، کہ میں اپنی بیوی کا قاتل نہیں ہو سکتا - ارشد بھی مجھے بیگناہ سمجھتا تھا، حالانکہ وہ مجھے کتنی مدت سے جانتا ہے، ایسے لوگ مجھ پر رحم کھاتے تھے، اور مجھ سے ہمدردی کرتے تھے،

چند ایسے بھی تھے، جو مجھے جھوٹا سمجھتے تھے، ان کا گمان تھا، کہ "رضیہ" کی موت میرے ہی ہاتھوں ہوئی ہے، وہ بھی مجھ پر رحم کھاتے تھے، لیکن مجھے حقیر جانتے تھے،

یہ دونوں غلطی پر تھے، میرے اعترافِ جرم کو دیوانگی سمجھنے والے سُن لیں، کہ میں نے واقعی رضیہ کو قتل کیا ہے، اسی دائیں ہاتھ نے جو اسوقت خامہ فرسائی کر رہا ہے - رضیہ کے نازک گلے کو اپنی لمبی لمبی انگلیوں میں دبا کر اسکے سانس کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا ہے، میرے انکار جرم کو میری بزدلی اور دروغگوئی سمجھنے والے سُن لیں، کہ جب میں نے عدالت میں کھڑے ہو کر ملا تامل کہدیا تھا، کہ میں رضیہ کا قاتل نہیں، تو میرے دل اور زبان میں وہی سچائی تھی، جسنے مجھ سے بعد میں اعتراف کروایا - میں ایک نہیں، دو ہوں - شاید میں دس بیس ہوں مجھے اب اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں احساس ہو رہا ہے کہ میری ایک تنہا ہستی میں کس قدر کثرت تھی، رضیہ کو چاہنے والا ایک انسان تھا، جو اب اس کے قتل کی سزا میں پھانسی پانے والا ہے میں کیسے مانوں؟ اگر میں ایک ہوں، تو میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں نے رضیہ کو اسلئے قتل کیا - کہ مجھے اس سے محبت تھی، یہ کتنی لغو بات معلوم ہوتی ہے، لیکن نہیں یہی ٹھیک ہے، سب کچھ ٹھیک ہے، کوئی بات غلط نہیں ہو سکتی - میں سب کچھ ہوں مجھے نہیں معلوم میں کیا ہوں - شاید میں نے غلطی کی ہے، میں ایک کمزور انسان ہوں - سب انسان کمزور ہوتے ہیں،

(۲) دو سال ہوئے - میں اور رضیہ بیاہے گئے - اسکے سنگدل والدین نے ابتک اسے معاف نہیں کیا، میرے محلے کے لوگ اب تک میری شادی کو "اوباشی" سمجھتے ہیں - کیونکہ وہ رضیہ کے والدین کی مرضی کے خلاف ہوئی، اگر ہمارے محلے میں حُسن اسقدر کمیاب نہ ہوتا، تو شاید چند اور والدین بھی اسوقت اپنی بیٹیوں سے ناراض ہوتے، لیکن وہ سمجھتے ہیں، کہ ان کے ماموں رہنے کی وجہ ان کی اولاد کی عصمت شعاری ہے، کیا شاعرانہ خیال ہے! وہ اپنی لڑکیوں کی نیک خصالی پر فخر کرتے ہیں - اس صفت پر فخر کرتے ہیں،-

جو مردوں کے وہم و تخیل نے عورت کو بخشدی ہے، ان سے کہدو جو مجھ سے بھگئے ہیں کہ اصل وجہ انکی لڑکیوں کی پاکبازی نہیں، میری عالی نگاہی تھی، جو انہیں سے کسیکو بحیثیت بیوی کے گوارا نہ کر سکتی تھی، یہ نقادانِ اخلاق سمجھتے ہیں کہ مَیں نے رضیہ کو اسکی بدچلنی کی وجہ سے مار ڈالا۔ او خدا! جب مجھے پھانسی ہی پانا ہے تو محض ایک قتل کے بدلے کیوں؟ مَیں رضیہ کا قاتل کیوں ہوں؟

رضیہ کو کسنے مارا؟ شاید مینے۔ یہ نہ کہو۔ تم رضیہ سے جاکر پوچھ لو۔ وہ کبھی میرا نام نہ لیگی۔ وہ کبھی یقین نہیں کر سکتی۔ کہ مینے اُسے قتل کیا ہے۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے، کہ میں تمام دنیا سے بڑھ کر اس سے محبت کرتا تھا۔ تم یقین جانو کہ وہ اس محبت کی قدر کرتی تھی، محض میری خاطر اس نے تمام جہان کے الزامات اپنے سر لئے، دنیا بھر کے مصائب اسنے میرے ساتھ ملکر برداشت کئے، ٹھیک وقت پر میرے لئے کھانا تیار کرنا۔ اور بڑے اہتمام سے میرے بستر کو بچھانا وہ اپنی زندگی کے اعلیٰ فرائض میں سے سمجھتی تھی، گرمی کے دنوں میں ساری ساری دوپہر وہ مجھے پنکھا جھلتی رہتی۔ رات کو بڑی دیر تک میرے انتظار میں جاگتی رہتی، ہاں یہ نہ کہو۔ کہ میں نے اسے مارا ہے، یہ جھوٹ ہے۔ تم اس سے پوچھ لو۔ جاؤ تمہیں اختیار ہے۔ پوچھ لو۔

[عورت اگر چاہے، تو مرد کی زندگی کو تباہ کر سکتی ہے] فطرت نے دلوں کے توڑنے کے جس قدر بھی ڈھنگ ہیں، وہ تمام عورت کو سکھا رکھے ہیں، قدرت نے مردوں کے دل محض اس لئے بنائے ہیں۔ کہ عورتیں ان کو بے پروائی سے توڑ ڈالا کریں۔ ہماری آنکھیں اس لئے ہیں۔ کہ یا ہم انکو دیکھیں یا ان کے لئے روئیں۔ عورت کو خراجِ نگاہ چاہیئے، یا خراجِ اشک، اسی دولت سے وہ کشوردل پر حکمرانی کرتی ہے۔ ان کا عہد ایک دورِ ظلم ہوتا ہے اور ایک عہدِ ستم۔ جہاں بغاوت کے بغیر چارہ نہیں میں نے رضیہ سے بغاوت نہیں کی۔ میں نے صرف یہ چاہا۔ کہ وہ مجھ سے محبت کرے، وہ برف تھی۔ میں نے چاہا اسے آگ بنا دوں، وہ برودت تھی۔ میں چاہتا تھا حرارت ہو، وہ چپ چاپ پانی کی طرح بہتی تھی، میں اسے شعلوں کی طرح بھڑکانا چاہتا تھا۔ میں رات کی خاموشی میں بار ہا گھنٹوں تک متواتر اسکے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لئے لمبے لمبے درد بھرے فقروں میں اس سے اپنے عشق کی داستان کہتا، اسے دلوی سمجھ کر پجاریوں کی طرح اسکی پوجا کرتا، وہ بت کی طرح بیٹھی رہا کرتی میں اس سے کہتا۔ "اے میرے دل پر حکومت کرنے والی ملکہ۔ میں تیرا ایک ادنیٰ غلام ہوں۔ تیری خدمت کرنا میرے لئے جنت میں زندگی گذارنا ہے۔ کیا تجھے مجھ سے محبت ہے"۔ وہ کچھ نہ بولتی۔

میں اسکی باہیں مروڑتا۔ جب بھی وہ کچھ نہ بولتی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار ظاہر ہوتے۔ مجھے خوشی حاصل ہوتی، کیونکہ اسپر بھی وہ کچھ نہ بولتی۔ تم کہوگے شرم کی وجہ سے! تم کیا جانو؟ تم نے صرف عورتوں کو دیکھا ہے، تمہیں "نسوانیت" کا کچھ علم نہیں، تم صرف مرد ہو! تم میں مردانگی نہیں۔ تمہاری تمناؤں میں بلندی کی قابلیت نہیں۔ تم کو چھوٹی چھوٹی باتیں خوش کر سکتی ہیں۔ او کم ظرف انسانو! تم مجھے کچھ نہ کہو،

(۴) کئی دفعہ میں رات کو دیر میں گھر آیا۔ اسنے کبھی اسکا گلہ نہیں کیا۔ جہاں محبّت ہوتی ہے وہاں طلب ہوتی ہے۔ طلب کے ساتھ شکایت ہوتی ہے، میں کیا جانوں وہ میرا انتظار کرتی تھی۔ میں نے کئی دفعہ اس سے پوچھا۔ رضیہ۔ میرا دیر سے آنا تمہیں ناگوار تو نہیں معلوم ہوتا؟ وہ کہتی۔ "آپ کی کوئی بات مجھے ناگوار معلوم نہیں ہوتی۔" تمہیں تمہاری بیوی یوں کہے، تو تمہارے لیے اطمینان کا باعث ہو۔ شاید تمہیں کبھی یہ خیال بھی نہ آئے، کہ جسے تمہاری کوئی بات ناپسند نہیں، اسے تمہاری کوئی بات پسند بھی نہیں۔ شاید تم یہ کبھی نہ سوچو۔ کہ وہ کونسا مشغلہ ہے۔ جو تمہاری غیر حاضری کو اس کے لیئے بے معنی بنا دیتا ہے، تم کیوں سوچو۔ تمہیں عورتوں کا تجربہ نہیں، تم میں غیرت نہیں!

ایک دن میں نے اس سے کہا۔ رضیہ۔ جب تم میری ہو۔ تو پھر یہ کیا ہے۔ کہ تم میرے ہوتے ہوئے بھی اس قدر وقت پڑھنے اور سینے پرونے میں صرف کر دیتی ہو، تم مجھ سے باتیں کیا کرو۔" وہ پھر بھی پڑھنے سے باز نہ آئی۔ میں نے اسکی سب کتابیں پھاڑ ڈالیں۔ میں نے اسکے کپڑے جلا دیئے، وہ روتی رہی اور کھانا پکاتی رہی، ان کتابوں اور کپڑوں کے لئے روتی رہی۔ جنکو وہ مجھ پر ترجیح دیتی تھی۔ میرے دل میں اس دن ایک ارادہ آیا۔ لیکن جلد غائب ہوگیا، اور میں مٹھیوں کو بند کرکے رہ گیا، دو دن میں اس سے روٹھا رہا۔ اس نے مجھے نہ منایا۔ تم کہوگے۔ ڈرتی تھی! پھر تغافل کسے کہتے ہیں۔

کل میری زندگی کا خاتمہ کر دیا جائیگا۔ میں خوش ہوں۔ رضیہ کو مار ڈالنے کے بعد میرا زندہ رہنا فضول ہے جس پروانے کو شمع کے جلتے ہوئے مرجانا چاہیئے تھا۔ وہ شمع کے بجھ جانے کے بعد بھی زندہ رہے تو یہ عشق کی خامی ہے، رضیہ۔ تم مجھے معاف کر دینا۔ دنیا کی معافی کی مجھے پروا نہیں دنیا میں جس نے اگر کسی عورت کے ساتھ وفا نہیں کی۔ تو اسکا الزام مجھ پر نہیں عائد ہوتا۔ وہ اسی

قابل نہیں۔ کہ ایک رات کے لئے بدرِ منیر ہو تیں اور بس۔ ان کو چند لمحوں کے مشغلے سے زیادہ کچھ بھی سمجھنا مذاق سلیم کا خون کرنا تھا، اسپر بھی اگر اہلِ دنیا مجھے قصوروار سمجھتے ہیں تو مجھے اسکی پروا نہیں وہ مجھے کل مار ڈالیں گے۔ اس سے زیادہ کسی کو کیا سزا دے سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کیا انتقام لے سکتے ہیں، افسوس۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ مجھ سے یوں بدلہ لیا جائیگا۔ تو اب ناکردہ گناہوں کی حسرت دل میں نہ ہوتی، کسی سے کوئی ایسا پیمان نہ باندہتا۔ جسکو توڑتے ہوئے میرے دلکو ذرا بھی رنج ہوتا میں رضیہ سے شادی کرتا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ جسکی زبان نے مجھے کبھی پیار سے نہیں بلایا، جسنے چپ کے سوا کبھی دوسرا جواب نہیں دیا۔ جس نے دل کا حال ہمیشہ مجھ سے چھپایا۔ جسے میرے مشتعل جذبات کے روح سوز شعلے کبھی نہ بھڑکا سکے۔ جسے میرے عشق کے فنا انجام زلزلے کبھی نہ ہلا سکے اس سے شادی کرتا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟

چودھویں کی چاندنی میں وہ سفید لباس پہنے تھک کر لیٹی ہوئی تھی، اور میں اس کے پاس بیٹھا ہوا اپنے دل کی بیقراری کو کانپتے ہوئے ہونٹوں سے لرزتے ہوئے فقروں میں بیان کر رہا تھا، "رضیہ۔ تم نے مجھ پر یہ کیا جادو پھونک دیا ہے، کہ میرے جسم میں کوئی روح ہے۔ تو وہ تم ہو۔ میری آنکھوں میں کوئی نور ہے۔ میرے دل میں کوئی سرور ہے۔ تو وہ تم ہو۔ میری زندگی میری راحت، اب یہ ناممکن ہو گیا ہے کہ میں تمہارے بغیر اس دنیا میں کہیں خوشی پاؤں۔ رضیہ صرف تمہارے ہوتے ہوئے، میرے سینے میں ہزاروں امنگیں اٹھتی ہیں، آرزوؤں کا ایک تلاطم بپا ہوتا ہے، تمناؤں کا ایک کہرام مچ جاتا ہے، تمہیں ایک دفعہ دیکھ لینا ساز ہستی کے تمام تاروں کو یوں چھیڑ دیتا ہے۔ جیسے ہوا کا کوئی لطیف جھونکا ان پر سے گذر گیا، میرے دل میں نغمے گونجتے ہیں۔ کہ تو اُن کو سُنے۔ کیا تو سنتی ہے؟" وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے کہا۔ "رضیہ۔ سنتی ہے" کہنے لگی۔ "سُنتی ہوں"۔ میں نے کہا۔ "کیا تمہارے دل میں موسیقی نہیں؟ کیا تم مجھے وہ نہیں سنانا چاہتیں؟" وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے اسے کندہوں سے پکڑ لیا۔ اور بہت انکسار سے کہا۔ "رضیہ کچھ تو کہہ"۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ یا شاید یہ کہا کہ میں کیا کہوں۔ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ اسکی بند آنکھوں کو دیکھتا رہا۔ اس کے ہونٹوں کے سکون کو دیکھتا رہا، اس کے چہرے کی بے پروائی کو دیکھتا رہا۔ اس کا تغافل مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میرے ہاتھ اسکے گلے کے قریب آتے گئے میری

انگلیوں کو ایک زبردست خواہش نے فولاد بنا دیا ۔ میرا نچلا ہونٹ میرے دانتوں میں کٹ گیا میرے دائیں ہاتھ کا پنجہ سکڑتا گیا، اسنے آنکھیں کھولدیں ۔ مجھے اسکی نظروں میں وحشت نظر آئی، لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی ۔ میں اور وحشی ہو گیا، میرے پنجے کی گرفت مضبوط ہوتی گئی، اس نے کچھ کہا ۔ لیکن اس کے کہنے میں الفاظ نہ تھے، میں اسکا گلا بھینچتا گیا ۔ حتے کہ میرا ہاتھ تھک گیا ۔ یہاں تک کہ اسکا اور دنیا کا تعلق منقطع ہو گیا ۔ مجھے چاند تاریک دکھائی دینے لگا ۔ میری نگاہ میں ایک سیاہ سی سرخی پھیر گئی، میرا گلا خشک ہو گیا، میں نے ایک چیخ ماری اور اس سے لپٹ گیا ۔ چلا چلا کر پوچھتا رہا کہ "رضیہ ۔ میری جان ۔ تم کیوں چپ ہو، تم کو کس نے مار ڈالا ہے ۔ رضیہ میری پیاری رضیہ ۔ تمہارا قاتل کون ہے؟" وہ کچھ نہ بولی،

(۶) وہ بیچاری مر گئی ۔ میرے ہاتھوں سے مر گئی، میں نے اسے مارا، میں کل مر جاؤں گا ۔ اس نے میرا دل دکھایا، میں اس کے لئے مرتا تھا ۔ وہ میری بہت خدمت کرتی تھی، خدائی قوانین کی گرفت مضبوط ہے، اور ان سے رہائی مشکل ۔ مرد عورت کا مطالعہ کرتے ہیں ۔ اس خیال سے کہ اسکی خواہشات کی تکمیل بطریق احسن ہو ۔ وہ اسکی مرضی ڈھونڈتے رہتے ہیں کہ اسے پورا کریں ۔ عورت دیوانگی کا سحر کرنا جانتی ہے ۔ راحت کی نیند سلانا نہیں جانتی ۔ اندھا کر دیتی ہے ۔ اپنے نزدیک آنے کا رستہ نہیں بتاتی ۔ اس نے تمام دنیا کو ناراض کیا ۔ کہ مجھے خوش کرے، میں نے اسے مار ڈالا، کہ وہ مجھے خوش نہ کر سکی، کائنات ایک مجسم بے قاعدگی ہے ۔ عورت کی محبت ایک افسانہ ہی روح جسم کا دوسرا نام ہے، جذبات کی کوئی حقیقت نہیں ۔ ایک ہستی کئی ہستیوں سے مرکب ہوتی ہے، آج تم کچھ ہو کل خدا جانے کیا ہو گے؟

"قاسم"

"پطرس"

جب میں دنیا کی، اس خاموش تحیر سے معمور فضاؤں میں تیرے گانے کی آواز سنتا تھا، تو میرا قلب آرزو مند ہو جاتا تھا کہ تیرے نغموں کا ہم نوا ہو جاؤں، مگر میرے لول نغمہ سننے کی قدرت نہیں رکھتے تھے،

آج جب تو نے خود مسرت سرود سے مست و سرشار ہو کر مجھے اپنے ساتھ گانے کا حکم دیا، تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرا قلب فخر و غرور سے ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے، فرط خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اور میں خدا جانے کیوں ہمیشہ کیلئے خاموش ہو گیا،

(ٹیگور)

غم کی وادی

(آشفتگیِ وہم و قیاس کا ایک مرقع)

ایک دن آسمانوں کی حسین ترین بیٹی "عقل" اپنی سہیلی "ثابت قدمی" کو ساتھ لئے خدائے علیم کی بارگاہ سے اس وادی میں اُتری۔ جہاں انسانوں کی تکلیفوں اور مصیبتوں نے اپنے نشیمن بنا رکھے تھے، حیاتِ انسانی کی رنگا رنگ پیچیدگیوں میں اس نے ان تمام تکالیف و مصائب کا مشاہدہ کیا اور جہاں ضرورت سمجھی اپنے تسکین بخش ہاتھ پھیر دیئے جن کے مس سے سالہا سال کے لاعلاج اور گہرے زخم مندمل ہو گئے، آخر ایک چٹان کی خوفناک بلندی کے پاس کیا دیکھا، کہ ایک غار ہے جہاں "اندوہ" اپنے تمام خدم و حشم کے ساتھ بود و ماند رکھتا ہے،

اس غار کے ویران آستانے پر درد رسیدہ "وحشت" ایک چٹان سے ٹیک لگائے مرجھائی ہوئی اور اداس بیٹھی تھی، اس کے پریشان بال ہوا کے تُند و تیز فراٹوں سے اور بھی پریشان ہو رہے تھے، پھٹی پھٹی آنکھیں زرد رنگ اور کھلا ہوا سینہ قلبی حالت کا پتہ دے رہا تھا، اس کے قریب ہی ایک پتھر پر "یاس" اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے خاموش کھڑی تھی، اور زبانِ حال سے تمام معمولی مصائب کا مضحکہ اڑا رہی تھی، "بے صبری" اندھا دھند ننگے پاؤں چٹان پر بجلی کی طرح بھاگتی، خطرات پر خندہ زنی کرتی ہوئی آئی اگر پڑنے کے خیال سے خالی الذہن، کانٹوں کی خلش سے بے پروا، موت سے قطعاً بے خوف، سب سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرتی تھی، اس نے ذرا ٹھیر کر اپنی خواہش مند آنکھیں پھر بلندی کی طرف اٹھائیں اور مسکراتی ہوئی پہاڑ کی ایک چوٹی سے دوسری پر اُچھلتی کودتی اس مہلک غار کے پاس سے گذر گئی۔ لیکن زیادہ دور گئی تھی کہ پاؤں پھسل گیا، اور وہ غریب سر کے بل پہاڑ سے نیچے آگری،

اس کے بعد "دہشت" اپنے وحشیانہ رنگ استعجاب میں تیر کی طرح آگے بڑھی، اس کا ایک ایک بالِ تن مو براستادہ تھا، آنکھوں کے تنے ہوئے ڈھیلے ہر طرف آگ برسا رہے تھے، اور "فطرت" اس کی مؤثر نگاہوں کو دیکھ کر کانپ رہی تھی، "دہشت" نہایت سرعت اور تیزی سے ہولناک گھاٹی کے کنارے پہنچی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے بالا بلند جسم کو پورے زور کے ساتھ نیچے غار میں پھینک دینا چاہتی ہے، لیکن پاس ہی ایک تاریک گوشے میں سے جہاں پہاڑی جھاڑیوں اور بیلوں کا جھنڈ تھا، "خوف" نے اپنا زرد چہرہ نکالا، اور دہشت کو مخاطب کرکے

نہائیت دھیمی آواز میں کہا،

"بے وقوف۔ یہ نہ سمجھ کہ موت کی طاقت تیرے مصائب پر غلبہ پالے گی" اس کے بعد دہشت نے اپنی خونی نگاہیں اوپر سے دامان کوہ میں ڈالیں، تو کیا دیکھتی ہے کہ جنات کے ایک حلقے میں "خودکشی" بیہوش و بے حواس پڑی ہے، اس کے سینے میں بے شمار زخم ہیں جن میں سے چشمۂ زندگی پھوٹ پھوٹ کر بہ رہا ہے،

پاس ہی "ندامت" کھڑی تھی جس کے رخساروں سے ندامت کے شعلے نکل رہے تھے،

"بزدلی" نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانک رکھا تھا۔

"ضمیر" اپنی تپتی ہوئی پیشانی کانٹوں کے تکیہ پر رکھے سسکیاں لے رہا تھا۔

"گناہ" کے تمام جسم پر بچھو لپٹ رہے تھے، اور اس کی تکلیف زدہ آنکھوں سے ایک درد جاودانی کا احساس ٹپک رہا تھا،

اس کے بعد "عشرت" ایک نہائت نرم بستر پر لیٹی ہوئی اپنی دو لڑکیوں یعنی "حماقت" اور "بیماری" کے کاندھوں پر سوار آئی،

"مسرت" اس کے سر پر گلاب کے پھولوں کا تاج پہنانے کو تیار تھی،

"اطاعت" سر جھکائے حکم کی منتظر کھڑی تھی۔

لیکن عشرت کا رنگ فق اور آنکھیں آنسوں سے بھری تھیں، وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتی اور ہنس ہنس کر اپنی کی آواز دلوں کو ستم ڈھاتی تھی، بستر کے پاس ہی "فالج" اپنا ایک ہاتھ لٹکائے اور دوسرا آگے بڑھائے کھڑا تھا،

"سیاہ کاری" — "اختلاط" — "نزع" — سب اپنے اپنے مقام پر ادائے خدمت کیلئے کھڑے تھے،

اس کے بعد کیا دیکھا، کہ مفلسی اپنے خاموش۔ سکون آمیز اور ضعیف قدم بڑھاتی ہوئی آئی، اس کی قمیص کے چیتھڑے ہوا میں اڑ رہے تھے اور تازہ آنسو اس کے رخساروں اور اس کے سینے پر ڈھلک رہے تھے۔ چہرے پر جھریوں نے آلام زندگی کے تمام آثار منقوش کر رکھے تھے، اور اس کے کانوں میں "سفاہت" و "زوالت" کی طرف سے طعن و تشنیع کی آوازیں آرہی تھیں،

"مفلسی" کے پیچھے پیچھے ذلیل "ملامت" مسکراتی ہوئی آئی۔ اس کی آنکھوں میں ثبات اور نگاہوں میں حجاب نظر آرہا تھا۔ وہ بے پرواہی کے ساتھ پاس سے گذر گئی۔ نہ کسی کی مدد کی شرمندۂ احسان ہوئی، نہ شور مچانے والے ہجوم ہی کا خیال کیا، اس کے غم رسیدہ دل نے جو شکوہ و شکایت کے خیال سے احتراز کرتا تھا، اپنی غم کی کراہوں اور دکھ کی چیخوں کو دبایا اور ایک مغرورانہ حقارت سے دھڑکنے لگا،

ملامت کے قدموں میں ایک عیار و چالاک لڑکا "حسد" بیٹھا تھا۔ اس کے خوف ناک اور بدصورت چہرے سے شیطنت ٹپک رہی تھی۔ جب ملامت وفور غم سے رو رو کر اندر ہی اندر گھلی جاتی تھی، تو یہ لڑکا اسکے رونے کی ہنسی اڑایا کرتا تھا۔ "غیبت" کا سانپ اسکی گردن سے لپٹا ہوا اپنی زبان سے تباہ کن زہر بکھیر رہا تھا اسکے دھڑکتے ہوئے سینے کے اندر جہالت نے اسلئے اپنے چنگل گاڑ رکھے تھے، کہ آرام و اطمینان کا کوئی نشان بھی ہو۔ تو مٹا دے،

ایک سنسان گوشے میں تاریک سائے کے نیچے ناکام آرزو "عشق" سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے آب دار موتی بہ رہے تھے، اور وہ اپنے ماتھے پر پہننے کے لئے ان موتیوں کا ایک چھوٹا سا ہار گوندھنے کی کوشش کر رہا تھا،

"عشق" کے قدموں میں پاس ہی ایک ننگ دھڑنگ شخص جس کا نام "جنون" تھا۔ زنجیروں میں جکڑا ہوا سر اوندھائے پڑا تھا، اور جب یہ شخص اس چٹان پر کروٹ بدلتا۔ تو زنجیروں کی جھنکار ایک شور محشر برپا کر دیتی تھی۔ "عشق" زنجیر کا شور و غل سن کر چونکا، وحشیانہ طور سے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا اور "جنون" کو اس قدر اپنے قریب دیکھ کر پریشانی میں ہار گوندھنا بھول گیا۔ اس کے تمام موتی گر پڑے۔ اور آنسو بن کر بہ گئے،

•

"طمع"۔ اپنے کاندھوں پر بے اندازہ زر و مال اٹھائے ہوئے چٹان کے دشوار گزار رستے پر بڑی محنت اور ہمت کے ساتھ چلی آ رہی تھی، بوجھ کے مارے دبی جاتی تھی، کندھے زخمی ہو رہے تھے، اس کے کمسن بسال جسم پر صرف ایک معمولی سا کپڑا تھا، جو موسم سرما کی منجمد کر دینے والی ہوا سے بھی محفوظ رکھنے کی صلاحیت رکھتا تھا "طمع" کے آگے آگے "قحط" جا رہا تھا جس کے جسم پر پوست و استخوان کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ "شبہ" اور "بدگمانی" دونوں بھائی بہن "طمع" کے سائے کا پیچھا کر رہے تھے، آخر "دغابازی" سانپ کی طرح رینگتی ہوئی آئی، اور ایک ہی جھپٹے میں "طمع" کا سارا مال و زر اڑا کر اس بخیل کو ہاتھ ملتے چھوڑ گئی،

اس کے بعد "مکاری" نظر آئی، اس کی زبان صاف لیکن چاپلوسی اور تملق سے آلودہ تھی، اس نے اپنے سینے پر خوشامد کا ایک آئینہ لٹکا رکھا تھا، کمر کے گرد جھوٹے مفلیش کا ایک کمربند پڑا ہوا تھا۔ "مکاری" نے اپنا ہاتھ کمربند میں چھپا رکھا تھا، لیکن اسی ہاتھ میں ایک تیز دم زہر و گداز خنجر بھی لئے ہوئے تھی، اگرچہ بظاہر اس کے چہرے پر اطمینان نظر آتا تھا، لیکن اس کے مکار سینے میں اسکی بزدل اور

ضعیف روح مسرت کی مس سے بیگانہ تھی، اسکی عاجزانہ اور منکسرانہ آواز گوش شنوا کو مسحور کر دیتی تھی اور اس کا شیطانی ہنر یہ تھا، کہ لبوں پر تبسم لیکن دل میں عزم قتل پرورش پا رہا تھا،

اتنے میں غار سے ایک فولاد بازو نوجوان یعنی تشدد برآمد ہوا، اس نے ایک انداز تحکم میں اپنا خوفناک نیزہ آسمان کیطرف اُٹھا کر گھمایا تو کیا نظر آیا کہ محکومی کے بوجھ سے دبی ہوئی ہستیاں کانپ کر سربسجود ہوگئیں اور غلامی کے بدنصیب فرزند سرنگوں ہو کر زمیں بوسی کرنے لگے،

اتنے میں انتقام نہایت جوش و خروش سے تہدید آمیز آواز میں للکار کر آگے بڑھا، اور تشدد کے ہاتھ سے اسکا بلند نیزہ چھین کر الگ جا کھڑا ہوا، تشدد اپنے زبردست مخالف کی صورت دیکھتے ہی زرد ہوگیا اور اسکے بازو میں اتنی طاقت نہ رہی کہ نیزہ پھر چھین لے،

اس کے بعد غرور ملبوس فاخرہ پہنے ہوئے نہایت شان اور سطوت سے قدم بڑھاتا ہوا آیا۔ اس کے ابروؤں پر خوبصورت درخشاں موتیوں کی ایک لڑی لٹک رہی تھی، دائیں ہاتھ میں ایک عصائے شاہی تھامے ہوئے بیش بہا زربفت کی عبا لپیٹے ہوئے شہنشاہانہ انداز سے اس وادی میں کھڑا تھا، اس کے چہرے پر حسن جاودانی کی جھلک سی نظر آتی تھی، اس کی آنکھوں سے اقتدار ٹپک رہا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں خدا کی نہیں بلکہ اسی کی حکومت ہے،

آخر موت بوری چڑھائے آگے بڑھی۔ اس حسن و درخشانی کے مجسمے کو ایک ضرب سے سرنگوں کر دیا اور اس کے عصائے شاہی کو دور پھینک دیا،

آس پاس کے میدانوں سے شاندار جھنکار کی مسلسل آواز آرہی تھی، تھوڑی دیر میں دیکھنے والوں نے دیکھا کہ "دولت" کی سواری آرہی ہے، یہ خاتون ایک نہایت خوبصورت اور قیمتی گاڑی میں سوار اپنے پاس تمام سامان عشرت جمع کئے ہوئے بیٹھی تھی، اور تمام دنیا کو حقارت کی نظر سے دیکھتی تھی،

گاڑی کے پیچھے لاغر و منحنی "مشقت" زمانے کی تکلیفوں سے چور اور اپنی ضرورتوں سے مجبور گرتی پڑتی چلی آرہی تھی، "دولت" نے اپنی گاڑی میں مڑ کر دیکھا، تو مسکرا کر اپنی گردن کبر اور بھی بلند کی،

لیکن جب تغافل زدہ مشقت نے تنگ آکر دولت کا ساتھ چھوڑ دیا تو نہ وہ شان و شوکت رہی، نہ وہ ساز و سامان رہے۔ "دولت" ہر طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی، مگر کوئی نظر نہ آیا،

ناقدری نمودار ہوئی، اور اس نے "مشقت" پر اپنی شہنشاہی کا اعلان کر دیا،

اس کے پیچھے پر اس ہلاکت انگیز غار کے اندر شور پیدا ہوا۔ ہول اور دہشت کی بلند آوازیں چٹانوں میں گونجنے لگیں۔ تمام کم درجہ شیطانوں نے تاسف کے مارے گردنیں جھکا لیں، آخر "ناقدری" نے شیطانی تخت پر قبضہ کر لیا،

اس موقع پر "عقل" نے اپنی سہیلی سے کہا، چلو اب چل دیں، جہاں "ناقدری" ہو، وہاں میری تمام دانش و فراست بیکار ہے"

عقل نے پھر ایک دفعہ اس ہولناک منظر کی طرف دیکھا، اپنے پروں کی شکنیں کھول دیں، اور بلند ہو کر اپنے آسمانی وطن کو پرواز کر گئی!

سالک

تخیلات

آج کیوں میرا دل غیر معمولی طور پر تھرّا رہا ہے .... تڑپ رہا ہے؟ کیا میں کسی حسین دوشیزہ کا دلدادہ ہوں؟ کیا کسی ساحر صفت محبوبہ نے میرے طفلِ دل کو ایک ایسے بے پناہ خدنگِ نظر سے مجروح کیا ہے جس کا پیکان زہرِ عشق میں بجھا ہوا تھا؟ کیا اس باغ میں (آہ مجھ سے باغ کا نام و نشان نہ پوچھیں اور میں بتاؤں گا بھی نہیں، کیونکہ اس باغ کا نخل نخل بلکہ شاخ شاخ، پتہ پتہ، نہیں ہر پتّے کی رگ رگ میری زندگی، وا الہانہ زندگی کے پر لطف و رنگین واقعات کی مظہر ہے۔ اس کی زرین و عشق آفرین خاک اور خاک کے ہر ذرّے میں میرے اور اس کے حسن و عشق کے رازہائے سربستہ وا اسرارِ دوشیزہ مدفون ہیں) جب میں اپنی امید مری، تمنائے متشکل، اور آرزوئے مجسّم کے حسنِ آتشیں سے آنکھیں سینک رہا تھا، تو کسی اجنبی نے مجھے اس کیف زا حالت میں دیکھ لیا تھا؟

کیا میرا دل سیماب ہے؟ برق ہے؟ شرر ہے؟ یا شعلہ ہے؟ اگر شعلہ ہے تو اسے بند مکان میں لرزش کیوں ہے؟ اچھا یہ بھی نہ سہی، پھر نہ معلوم

آج کیوں میرا دل غیر معمولی طور پر تھرّا رہا ہے .... تڑپ رہا ہے؟

میں ایک دفعہ کسی محفلِ رقص و سرود میں گیا تھا، میرے دوستوں نے مجھے سب سے اگلی صف میں بٹھا دیا، جب حسین رقاصہ اپنے گھنگروؤں کی سرور خیز آواز سے فضائے محیط کو نغمہ ہائے مسرت سے لبریز کرتی ہوئی ایک نزاکت، ایک دلربایانہ ادا سے میرے سامنے آکر بیٹھ گئی اور اس مصرع "رخ پہ گیسو جھلک گئے آدھے ادھر آدھے ادھر" کو اس حسن سے ادا کیا جس سے بہتر ممکن نہیں تو مجھے ایسا معلوم ہوا، کہ اسکے دونوں گیسو روزِ روشن کو شبِ تاریک میں تبدیل کرکے اہلِ عالم کو مسِ ساحرانہ سے سُلا رہے ہیں، اور میری آنکھوں کے سامنے ماہِ نیم ماہ اپنی پوری روشنی سے چمک رہا ہے، میں اس وقت عالم بیخودی میں محو خواب تھا، نہیں کہہ سکتا کہ محفل کا رنگ کیا تھا اور گانے والی نے سننے والوں سے کسقدر خراجِ تحسین وصول کیا۔ اتنے میں کسی عیسیٰ نفس کے سحرِ دم نے میری حسیات خفتہ کو شانہ ہلا کر بیدار کر دیا۔ میرے تمام جسم میں ایک موجۂ برق دوڑ گیا۔ قالبِ حواس کی لن لن سے سن سن کی صدا آنے لگی۔ اور میں سنبھل کر اپنی نشست کو درست کرکے بیٹھ گیا۔ میری طبیعت میں کسل اور اعضا میں تھکن سی معلوم ہونے لگی، پانچ دس منٹ تک تو دوستوں کے اصرار سے مجبوراً وہاں بیٹھا رہا، مگر پھر ناسازیِ طبع کا بہانہ کرکے گھر چلا آیا۔ آتے ہی بستر پر دراز ہو گیا۔ میرے دماغ میں طرح طرح کے وحشت خیز خیالات موجزن ہونے لگے تھوڑی دیر کے بعد مجھے نیند آ گئی، اور خواب میں وہی حسین شکل اور وہی حسین منظر پیش نظر ہو گیا جب وہی گیسوؤں والا لوچ دار مصرع پڑھا گیا تو میری آنکھ کھل گئی، آج تک اُس حسین رقاصہ کی حسین تصویر میرے صفحۂ قلب پر نقش ہے، اس حسین و خوبصورت واقعہ کو گذرے ہوئے تو چند سال کا عرصہ ہو گیا ہے پھر خدا جانے

آج کیوں میرا دل غیر معمولی طور پر پھڑ رہا ہے .... تڑپ رہا ہے ؟

اس جھیل میں جو میرے گاؤں سے نصف میل کے فاصلہ پر واقع ہے ایک عذرا شمائل لمبے لمبے سیاہ بالوں کو دونوں شانوں پر چھوڑے ہوئے نہا رہی ہے جھیل کا پانی قلبِ مومن کی طرح صاف و شفاف ہے وہ اپنی نوعمر الھڑ، اور بھولی بھالی سہیلیوں کے ساتھ محو غسل ہے۔ ایک لڑکی اپنے خوبصورت نازک ہاتھوں سے بیتاب لہروں کو درسِ اضطراب دیتی ہوئی سطح آب کو جو یقیناً اسکے سینۂ بلوریں کی آب تاب دیکھ کر پانی پانی ہوئی جاتی۔ ہے پھیرتی ہوئی دوسری لڑکی کے پیچھے دوڑی .... حُسن حُسن کا تعاقب کر رہا ہے اور عشق ساحل پر بیٹھا اس حسین و جمیل نظارے کا لطف اٹھا رہا ہے۔ ایک لڑکی۔ اے عاشقانہ خیالات کی دسترس سے بعید دوشیزہ لڑکی تیرے حسن ناکتخدا کی اچھوتی اور خوبصورت یاد کا آبدار و ناسفتہ موتی میں اپنے کنوارے دل کی ڈبیا میں محفوظ رکھے ہوئے ہوں جب تو ساحل پر سے ایک کنکر اٹھا کر پانی میں پھینک دیتی ہے، اور مدور لہروں کو دیکھ کر کھلکھلا کے ہنستی نہیں بلکہ خندہ

زیرِ لب سے مسکرا دیتی ہے، تو تیری موجِ تبسم موجۂ آب کے ساتھ ملکر میری بیاضِ دل کے ہر ورق پر چھوٹے چھوٹے گول دائرے بنا دیتی ہے جن میں لطیف مسکراہٹ اور آبگوں لطافت کی ایسی ایسی مختلف اللون تصویریں نظر آتی ہیں جن کے خیال ہی سے شاعریت تنکر رہ جاتا اور مصور کے ہاتھ سے مُوقلم گر پڑتا ہے،

یہ دلفریب و باصرہ پرور واقعہ تو گذشتہ موسم بہار میں گذرا تھا۔ پھر نہ معلوم

آج کیوں میرا دل غیر معمولی طور پر تھرّا رہا ہے .... تڑپ رہا ہے؟

مجھے پہاڑ کی سیر میں ایک خاص لطف آتا ہے، اللہ اکبر۔ کیا پُر فضا وادی ہے! صاف و شفاف پانی کے چشمے کسی کے گیسوئے خمیدہ کی طرح بل کھاتے ہوئے بہ رہے ہیں گویا جا بجا پارے کے سانپ لہرا رہے ہیں۔ ایک دوشیزہ کوہسا پانی میں اپنے سادہ مگر قیامت خیز حسن کا نظارہ کر رہی ہے لبوں پر ایک مسکراہٹ سی کھیل رہی ہے نہیں نہیں، حسین فطرت کا بہترین نمونہ عورت کی شکل میں میرے کوہستان کو لکلا ہے۔ اے پیکرِ حسن و رعنائی اپنی شعبدہ باز و مسحور کن زلفوں سے اٹھکیلیاں نہ کر۔ کہ ان کے عکس سے یہ چشمہ مجھے مارستان نظر آتا ہے موئے کاکل کی مستانہ جنبش سے میرے آبگینۂ قلب میں بال آ رہا ہے،

اے تخیلِ غالب سے زیادہ نازک اور خیالِ ٹیگور سے زیادہ حسین کوہسا گی پری! پھولوں کی پتیاں بکھیر کر ہوا میں نہ اڑا کہ میرا کلیجہ تو پہلے ہی کسی کی چٹکیاں لینے والی اداؤں سے گلِ نیلوفر بنا ہوا ہے، اے کانِ صباحت، ہوا، ہاں ظالم ہوا کے گستاخ ہاتھوں نے تیرے صبیح سینے سے آبِ رواں کے دوپٹے کو سرکا دیا ہے، ہوش میں آ۔ اور دامن سنبھال، اے مجسمۂ جمال، اے ناظورۂ برق، اے تصویرِ مستی و رنگینی اور اے چرخِ حسن کی ہاروت فریب زہرا چاہتا ہوں، آہ کشتۂ صد دل سے چاہتا ہوں کہ اپنی ساری عمر کا زہد و تقویٰ اور اپنی ہستی تیرے قدموں پر نثار کر دوں، تو میرے سر کو اٹھا کر اپنے زانو پر رکھ لے، اسی دم میری روح ہوا ہو جائے، اور تیرے مرغوب خاطر چمن زار محبت کے اس سرو بلند بالا پر جس کے بالمقابل تو موسمِ گل کی چاندنی راتوں میں بلا ناغہ لمبی لمبی شبنم آلود گھاس پر پہروں بیٹھی صحیفۂ فطرت کا مطالعہ کیا کرتی ہے قمری بنکر بیٹھ جائے اور اس کی منقار میری داستانِ عشق کے دلگداز نغموں سے تا ابد ترنم ریز رہے،

اس گلگشتِ جبل کا لطف اٹھائے ہوئے تو کافی مدت گذر چکی ہے۔ پھر مجھ پر یہ نہیں کھلتا کہ

آج کیوں میرا دل غیر معمولی طور پر تھرّا رہا ہے .... تڑپ رہا ہے؟

ابو النعیم نشتر جالندھری

کرمکِ شب تاب

جب میں اپنی زندگی کے نہ حل ہونے والے معموں سے گھبرا اُٹھتا اکثر سر شام گھر سے نکلتا تھا، کہ باغ جنگل کہیں چل کر گھڑی دو گھڑی کو اپنا جی بہلا ؤنگا تو یہ ننھا سا چمکیلا کیڑا روز سامنے آکر میری راہ کاٹ جاتا تھا، میں جدہر جاتا تھا۔ یہ بھی آسمان کے ٹوٹے ستارے کی طرح سے آگے آگے میرے ساتھ ہولیتا تھا،

میں حیران تھا کہ اللہ، کیا کروں، درختوں کی ڈالیوں، پھولوں کی کیاریوں، گھاس کے جھنڈوں میں، جہاں دیکھو یہ کمبخت مجھ فرقت زدہ اختر شمار کے چھیڑنے ستانے کو موجود ہے، میرے سارے خیالات جنہیں میں کن کن مشکلوں اور دقتوں سے مجتمع و یکسو کر کے چلتا ہوں کہ آج کسی تنہائی میں بیٹھ کر اپنے دل سے کچھ باتیں کرونگا، یہ بیچ میں آ کر اور دخل در معقولات دیکر سبکو منتشر کر دیتا ہے،

کل شام کو میرے جی میں آیا کہ لاؤ آج اس سے پوچھوں تو سہی کہ اسے ایسی میرے ساتھ کیا دشمنی ہے، یہ خیال آتا تھا کہ ایک پٹ بیجنا پھدک کر میرے کندہے پر آبیٹھا میں نے اسے پکڑ لیا، پہلے تو دیر تک غصہ بھری نظروں سے دیکھتا رہا، پھر یکبارگی خدا جانے میرے جی میں کیا آیا، کہ میں نے خوب ور سے بھینچکر سینہ سے لپٹا لیا اور چٹ چٹ پیار کرنے لگا،

"میں نہیں کہہ سکتا کہ اس آتش حسن فطرت کی سر بستہ شرر بگاری میں کونسی آگ مشتعل تھی، کہ باوجود ظاہری گرمی و تپش نہ ہونے کے، دل کی ہر ٹھنڈی چوٹ سینکدینے کی پوری قدرت مضمر تھی، میں نہیں بتا سکتا کہ اس شمع قدرت کے جلتے ہوئے پھول میں کس کلی کا حسن تبسم پوش تھا جس سے دل کے گوشہ گوشہ کی تاریکیاں شمعیں روشن ہو گئیں"

جب میں پیار کر چکا، جب میرے ہوش ٹھکانے ہو گئے، جب میرا غصہ محبت سے بدل گیا، تو میں نے محبت کے نہایت نرم لہجہ میں اس سے کہا، میاں جگنو! تم روز زمین و آسمان کی تاریک فضاؤں میں، شہر جنگل کی گھٹا ٹوپ اندہیری میں ادھر اُدھر کیوں بھٹکتے پھرتے ہو، یہ آئینہ قدرت کے دیئے ہوئے ٹمٹماتے چراغ کو لیکر ساری ساری رات کسکو ڈہونڈتے تلاش کرتے رہتے ہو،

جگنو نے اس سوال کا جواب گو میری توقع کے خلاف سوائے ایک خاموش تبسم کے اور کچھ نہ دیا، مگر آہ وہ تبسم، وہ تبسم خند ایک برق خاطف تھی، جو میرے خرمن غیرت پر گری اور سارے جذبات خود داری کو جلا کر خاک سیاہ کر گئی، ایک شرارہ تھا جسنے میرے دل و دماغ کے سامان زندگی یعنی ہوش و حواس میں آگ لگا دی، میرے تن بدن میں ایک بجلی کی رو سی دوڑ گئی جس سے رگ رگ میں خون کھولنے لگا، مگر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا، اور پھر اسی لجاجت اور محبت سے پوچھنے لگا،

میرے ننھے سے لعل در آتش پیر کالے، سچ بتا کہ تیری یہ بے بضاعت زندگی اتنی مضطرب اور بے چین کیوں ہے؟ تیری ننھی سی جان کو اس دنیا میں سکون و اطمینان کیوں نصیب نہیں؟ کیا تیرا بھی کچھ جاتا رہا ہے؟ کیا

تیری ناکام و نامراد زندگی بھی میری طرح سے کسی کھوئی گمی چیز کی تلاش میں سرگردان ہے؟ کیا تیری صبح وطن بھی شام غریبی کی اندھیری گھپ تاریکیوں میں اوجھل ہو گئی ہے، کیا تیرے دل کو بھی قدرت کے دست تطاول نے قرار چھین لیا ہے،

آہ۔ اگر تو مسرت کا متلاشی ہے، تو اس تلاش کو خیرباد کہہ، اور میری روداد زندگی سے سبق لے، دیکھ میں نے اپنے بچپنے کی تکلیفوں سے بچپن اور رنج و غم سے بے خبر زمانہ کو اسکی تلاش میں کھویا اور برباد کیا، شباب کے منور اور اجالے دن جوانی کی مست اور ٹھنڈی راتیں، محض اسی کی جستجو میں تباہ کیں، اب بڑھاپے کے مغتنم اور مضمحل دن صرف اسی کی تمناؤں اور ارمانوں کی پرستش میں وقف اور نذر کر رہا ہوں مگر یہ مجھے کبھی حاصل نہیں ہوئی،

اگر تجھے کسی محبوب کی جستجو ہے، تو بھی میری نامساعد قسمت سے عبرت حاصل کر، میں نے حسن قدرت کے ہر مادی غیر مادی تلون کو مظہر محبوبیت جانا، سراب زندگی کے ہر چمکیلے ذرہ کو اپنے دل کے مندر میں حسن کی دیوی بنا کر بٹھایا، اور پوجا، مگر اسیر عشق نے خود مجھ سے وفا کی، اور مجھے ہمیشہ یہی کہتے گذری سے کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؛ بندگی سے میرا بھلا نہ ہوا،

اگر تجھے اس موجودہ قحط الاحباب میں کسی خالص مخلص شفیق رفیق اور غمخوار دوست کے حصول کی تمنا ہے تو میں اپنے ذاتی تجربہ سے یقین دلاتا ہوں کہ تیری سعی بے حاصل اس عالم غربت میں مشکور کامیابی نہیں ہو سکتی،

اس دنیا میں دوستی و الفت اہل عقل کے نزدیک اس مفروضہ طائر خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ جیسے عنقا سے نامزد کر کے ہر منطقی اپنے دعاوی کو دلائل و براہین سے مستحکم کرنے کی بیجا جرأت کرتا ہے،

میں نے کائنات ہستی کے چپہ چپہ پر اسکی تلاش میں سرگردانی کی۔ مگر سوائے اسکے کچھ حاصل نہ ہوا کہ اصل محبت اخلاق آلہی کا پرتو ہے اس لیئے اسکا ملنا بھی خدا کے دستیاب ہونے سے کم مشکل نہیں،

میرے واہمہ نے دنیا کے ہر تیز رو متنفس پر رہبر الفت ہونے کا دھوکا کھایا، مگر جب غور سے دیکھا، تو یہی دیکھا کہ عالم الفت محض ایک فریب سراب ہے، جو درحقیقت تشنہ کامان سعی و تلاش کے چند لمحوں کی عارضی خوشی اور جھوٹی سیرابی سے زیادہ اصلیت نہیں رکھتا لوگ اظہار دوستی میں سرگرم سخن ہوتے ہیں، مگر ان کی خوش بیانیاں زیب داستان ہونے سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں، میں نے بارہا دیکھا ہے کہ جن مدعیان الفت نفوس سے ملکر آج روح خوش ہوتی ہے، کل انہیں کے مقتضائے طبیعت سے زیادہ روحانی صدمہ کے باعث ہو گئی ہے جن احباب کے مخلص پرتپاک حیات الفت کے بہترین دقیقے سمجھے جاتے ہیں انہیں کے جارحانہ حملے دل و جگر کو مشبک کرنے میں پیشقدمی کرتے نظر آتے ہیں،

آہ۔ یہ دنیا محشرستان بیوفائی ہے، اس میں انسان چند بیگانوں کو یگانوں پر ترجیح دیتا ہے، حاضر غائب جن کے مداحی ہوتا جاگتے جنکی دعا گوئی کو اپنے اعتقاد میں فرض محبت جانتا ہے جن کی عظمت و احترام کی قربانگاہ پر اپنے جذبات کی خودداریوں کو

بھینٹ چڑھا دینا ایمان و دوستی سمجھتا ہے وہی اپنی ہر خواہش سے اسکی خوشی کو کم قیمت سمجھنے میں انتہائے بیدردی سے کام لیتے دکھائی دیتے ہیں،

اس لیئے میں تجھے مخلصانہ مشورہ دیتا ہوں کہ اس بے سود ہوس سے درگذر، اس سعی بیجا حاصل سے باز آ، اس فضول جد و جہد سے ہاتھ کھینچ لے، اور اس دنیائے ارتباط سے بے تعلق ہو کر اور میری طرح عزلت نشین بنکر کسی کونہ میں بیٹھ جا، موجودہ عالم انسانی کا ظاہر و باطن یکساں نہیں، مہر و محبت، وفا و الفت محض فرضی نام ہیں، دوست کی تلاش محض اس بچہ کی طفلانہ سعی ہے، جو چاندنی رات میں اپنے گہوارۂ شیرخوارگی میں لیٹا چاند کے چھونیکی کوشش کر رہا ہو،

جگنو نے یہ سب سنکر زور سے قہقہہ مارا اور ہنس کے کہا کہ اے خود غرض تو بھی کتنا بھولا بھالا سیدھا سادا انسان ہے، کیا میں نہیں جانتا کہ دنیا عالم فنا ہے اور زندگی چلتی پھرتی چھاؤں ہے، اس میں جو دم ہے غنیمت ہے، مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ اپنے چند انفاس قیمتی کو ایک معدوم شئے کی تلاش میں کھو دینا خلاف عقل ہے مگر مجھے تو نہ دوستی سے غرض ہے نہ دشمنی سے واسطہ، میری زندگی دنیا و بے وفائی کے جھگڑے قضیوں سے بے تعلق ہے، میں تو اپنی عمر کی بقیہ ساعتوں کو ایک غیر فانی اور نہ ملنے والی چیز کی تلاش ہی میں صرف کر دینا مقتضائے زندگی اور فطرت جانتا ہوں گو میں بھی اس عمل میں تیری طرح ناکام ہوں، مگر میں اپنی ناکامی سے دل گرفتہ نہیں ہوں، کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ جو چیز حاصل نہ ہو سکے، اسی کے حصول کی تمنا پر لطف ہوتی ہے، محبوب کا ملجانا، جذبات فطرت کی شعریت کا ملیامیٹ ہو جانا ہے میرے جذبات ہم آغوشی کی آرزوؤں سے سادہ ہیں، اصل مطلوب ہے لطف اندوزی محض تمنا میں ہے حصول میں نہیں سعی و تلاش جب حد کامیابی تک پہنچ جاتی ہے تو آرزوئیں بھی سیر و آسودہ ہو جاتی ہیں پھر وہ لطف نہیں رہتا بلکہ ایک انقباض حجاب مسرت بنجاتا ہے طبیعت انسانی زود سیر ہے، اسکے لیئے یہی منشاء عقل و فطرت ہے کہ اسے کبھی کامیابی نہ ہو، وصل محبوب بظاہر نخل محبت کی زندگی کا سبب بھی ہو، مگر درحقیقت حیات الفت کا خاتمہ ہے یہی وجہ ہے کہ مجھے اپنی اس تلاش بے سود میں بھی مزہ ہے ؎

نشان منزل جاناں ملے ملے نہ ملے مزہ کی چیز ہے یہ ذوق جستجو میرا،

یہ کہا اور اڑ کر آسمان کے ان بت سے چمکتے ہوئے تاروں میں جا ملا، جو دیر سے اس کرمک شب تاب کو مجھ سے ہمکلام دیکھ کر چشم حیرت کھولے وقف تبسم اور دیدہ انتظار تھے۔

میں پہلے تو بہت دیر تک اوپر کو منہ اٹھائے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا، مگر جب ہوا کے ایک تیز سے جھونکے نے میرے عارضی سکون و اطمینان میں خلل ڈالا، تو میں اٹھا اور گھر کی سمت چلدیا،

رات زیادہ آچکی تھی، فضائے عالم پر تاریکی چھا رہی تھی، بازار سنسان تھے، دنیا سو رہی تھی گلی کوچوں میں خاموشی پہرہ دے رہی تھی، اور میں چپ چاپ قدم اٹھائے پاؤں بڑھائے ان انتظامات خانگی میں محو جا رہا تھا، جو مجھے سونے سے

پہلے اپنے کلبۂ احزان میں پہنچکر رنے شاق گذر رہے تھے، اتنے میں ایک آہٹ سی کان میں پڑی (نامانوس سی)، نظر اٹھاکے جو دیکھا، تو ؎

دی شیخ با چراغ ہمے گشت گرد شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست

زین ہمرہاں سست عناصر دلم گرفت — شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

گفتم کہ یافت مے نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت مے نشود آنم آرزوست

مجذوب

دلسوزی شمع

میرے غربت کدہ زندگی کی تاریک نصیب راتوں کو تو روز شمع و چراغ کی روشنی کہاں نصیب ہاں جب کبھی میں اور کسی کی شبستان عشرت میں بھی شمع کو روشن دیکھتا ہوں تو میرا دل دکھ جاتا ہے، ــــــ میں جب امیروں کے عیش محلوں، اور عشرت منزلوں میں گیا ہوں، تو اس غریب کو جلتے سلگتے دیکھ کر گھنٹوں روتا رہا ہوں، کہ الٰہی کیا اس نامراد سوختہ قسمت کی تقدیر میں یہی لکھا ہے، کہ عمر بھر اوروں کی راتیں اجالی کرنیکو اپنی زندگی کالی کرتی رہی، کیا اس آتش در بغل نصیبوں جلی کے مقدر میں یہی ہے کہ وہ اپنی اچھی بھلی جان کو محض دوسروں کی خوشنودی کے لئے پھونک جلا کے خاک سیاہ کیا کرے، اور کوئی اللہ کا بندہ اسکے دل سینہ کی لگی بھڑکی۔ دبی چھپی کی طرف نظر التفات تک نہ کرے، ــــــ میں نے اکثر غریبوں کے جھونپڑوں میں جا کے دیکھا ہے اور آج اتفاق سے خود اپنی ہی محنتستان تنہائی (گھر) میں دیکھ رہا ہوں کہ سرہانے ایک مٹی کے دیئے میں خاموش سا چراغ ٹمٹما رہا ہے، پروانے آتے ہیں اور اردگرد ہر پھر کے خود اپنی لگی کو بجھا لیتے ہیں مگر کوئی مرا جیتا بتنگا اسطرف نہیں جھانکتا کہ آخر یہ بدنصیب کس کے عشق و محبت سے لو لگائے زندگی کو ناحق لو کا لگا رہی ہے، ــــــ اے حسن کی آتش لہب سے آنکھیں سینکنے والو کاش تمہیں یہی اطلاع ہوتی کہ خود حسن کے دل میں بھی ایک آتش عشق کا شعلہ مشتعل ہے جو محض حسن کے دل و جگر کے خون سے اپنی زندگی کو پرورش کرتا اور پروان چڑھاتا ہے اور حسن باوجود سراپا زبان ہونیکے بھی اُف تک منہ سے نہیں نکال سکتا ہے ؎

از گداز شمع باشد شعلہ را پائندگی — میکند در پہلوئے مظلوم ظالم زندگی

میں اسی خیال میں محو تھا، رات اپنی زندگی کا بیشتر حصہ طی کر چکی تھی، لیلائے شب کی زلف معنبریں کمر سے گذر کر ساق سیمیں سے بھی آگے بڑھ رہی تھی، اچانک کھڑکی کا پردہ اڑا۔ ایک ٹھنڈا سا ہوا کا جھونکا آیا، اور میرے سرہانے کے چراغ مردہ کو گل کر کے چلا گیا، شمع بجھ گئی چند دھندلے سے دھوئیں کے حلقے چکر باندھتے ہوئے اٹھے اور اپنے ہمرنگ آسمان پر جگہ جگہ چلتے پھرتے ہوئے بادلوں کے ٹکڑوں میں جا ملے پھر جو دیکھا تو نہ خاک پروانہ تھی، نہ شمع بالیں، سپیدۂ صبح نمودار ہو رہا تھا نسیم سحری کے خوشخرام جھونکے بھی لوریاں دیکے سلام

ملہمات اکبر

(لسان العصر حضرت مولانا سید اکبر حسین صاحب اکبر الہ آبادی)

جو شام فتنہ افق پر جہاں میں طاری ہے،
وہ سلسلہ ابھی قائم ہے اور جاری ہے
نتیجہ اس کا عیاں ہوگا چند روز کے بعد
ظہور ساز بھی ہوگا وفور سوز کے بعد
خدا کی یاد سے پر نور جن کا ہے سینا
سمجھ رہے ہیں کہ فطرت نہیں ہے نا بینا

یہ جو ہنگامہ ہے جس کی ہر طرف تائید ہے
آپ کی تعلیم ہے اور آپ کی تقلید ہے
مستحقانِ ادب کو آپ نے رسوا کیا،
آپ کے دعویٰ عظمت کی بھی اب دید ہے
مرگ کا خطرہ مبارک ہو انہیں جو زندہ ہیں
ہم تو مردہ ہیں قیامت کی ہمیں امید ہے

(اکبر الہ آبادی)

اصطلاحات علمی

اُردو کتابوں میں

اردو لٹریچر میں بڑی بھاری کمی کتب حکمیہ کی ہے اور کتب حکمیہ کے ترجمہ یا تصنیف میں بہت سی سخت مشکل اصطلاحات وضع کرنے کی ہے، یہ مشکل دو وجہ سے ہے، ایک تو اس وجہ سے کہ کثرت تصانیف یورپ کی وجہ سے اصطلاحات کا مفہوم متعین کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے، اس قسم کی کتابوں کے ترجمہ کرنے والے عموماً انگریزی کالجوں کے گراجویٹ ہوتے ہیں۔ اور انکو صرف اپنے کورس کی چند کتابوں کی خبر ہوتی ہے لیکن ترجمہ اور خصوصاً وضع اصطلاحات کے لئے مترجم کی نظر کا وسیع ہونا ازبس ضروری ہے،

دوسری مشکل خود اپنی زبان کی ناقابلیت کی وجہ سے ہے یعنی ہماری زبان میں الفاظ کا اسقدر ذخیرہ نہیں کہ ہم ان میں سے مناسب الفاظ خیالات حکمیہ کے اظہار کیواسطے منتخب کرسکیں، ان مشکلات پر بھی ملک میں کچھ علم دوست سرکار کی کوشش اور کچھ اپنی جھوٹی سچی غیرت سے تھوڑی بہت کتابیں اردو میں ترجمہ اور مختلف علوم وفنون کی اصطلاحات قائم ہوتی جاتی تھیں، کہ ہندوستان کی بدقسمتی سے خدا کو کچھ اور منظور ہوا۔ اور اہل ہنود اور اہل اسلام کے دلوں میں فرق آگیا، اور اردو ہندی کا شورش انگیز اختلاف اٹھا، اس اختلاف کا مضر اثر وضع اصطلاحات پر بھی پڑا، اور منصف گورنمنٹ کے سررشتہ تعلیم پنجاب نے دونوں قوموں میں جوتی پیزار دیکھ کر فیصلہ کر دیا، کہ اصطلاحات کے ترجمے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ اور اصطلاحات انگریزی کی انگریزی ہی رہنی چاہئیں،

ہماری دانست میں اردو ہندی کا کچھ تنازعہ تھا، تو ابتدائی تعلیم کی نسبت تھا جس میں بچوں کی آسانی اور زود فہمی کا زیادہ ترخیال ہوتا ہے، علمی اصطلاحات عموماً زبان روزمرہ سے اجنبی اور زبانہائے قدیمہ کے الفاظ میں ہوا کرتی ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو لازم ہے کہ اس باب میں ملکر دوستانہ اور برادرانہ طور پر غور کریں اور سوچیں کہ ہندوستان کے علم کی ترقی پر اس اختلاف کا کیسا مہلک اثر پڑتا ہے

ہمیں انگریزی الفاظ و اصطلاحات کے لیے لینے میں بھی کچھ مضائقہ نہیں ہے، لیکن بڑی دقت یہ ہے کہ انگریزی اعراب میں بعض اعراب ایسے ہیں جو مشرقی زبانوں میں نہیں پائے جاتے۔ اس لئے ان اعرابوں کا صحیح تلفظ ہمارے حروف کے ذریعہ سے ممکن نہیں۔ برخلاف اس کے اگرچہ سنسکرت اسی سلسلہ کی زبانوں میں سے ہے جس میں انگریزی زبان شامل ہے، یعنی سلسلہ آریائی سے، مگر سنسکرت کے اعراب زبان عربی کے اعراب کے بالکل مشابہ ہیں، اور علیٰ ہذا القیاس فارسی زبان کے اعراب بھی، اسلیئے ان زبانوں کے الفاظ سندو ہستانی زبان میں طبعی طور پر نہائیت آسانی سے ملجاتے اور گھل ملکر شیر وشکر ہو جاتے ہیں، مگر انگریزی الفاظ خصوصاً وہ جن میں وہ اعراب غیر مانوس ہیں، مدتوں اجنبی ہی رہتے ہیں اور جزو زبان نہیں بنتے، اہل وطن کو کوشش کرنی چاہئیے، کہ جب تک اپنی مادری زبان اپنے ملکی اور آبائی ذخیرہ علمی سے متمول ہو سکتی ہے، تب تک اجنبی زبانوں سے دریوزہ گری نہیں کرنی چاہیئے، ہاں جن خیالات کے اظہار سے ہمارے آباؤ اجداد کا ذخیرہ الفاظ بھی عاجز اور عاری رہ جائے، ان کے لئے دوسرے سے استمداد کئے بغیر چارہ نہیں، لیکن اسی کے ساتھ ان الفاظ پر جو اصطلاحات کے لئے منتخب کئے جائیں۔ اس نظر سے بھی غور کرنا ضروری ہے کہ آیا یہ الفاظ آسانی سے وہ مختلف صورتیں اختیار کر سکینگے۔ جنکی اکثر مختلف انواع کلام میں ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ مثلاً کسی مسئلہ کو کسی خاص علم کی طرف نسبت دیکر کلمہ نسبت بنانا ایک ایسی ضرورت ہے کہ تقریر و تحریر میں اسکی احتیاج آپڑتی ہے یعنی لبسا اوقات یہ کہنا پڑتا ہے، کہ یہ مسئلہ فلاں علم کا ہے۔ پس اگر اس علم کے نام کے لئے کوئی اصطلاح از قسم لفظ مفرد ہوگی، تو اسکے آخر میں یائے نسبت زیادہ کرکے آسانی سے کلمہ نسبت بنا سکینگے، مثلاً لفظ نحو کہ مفرد لفظ ہے اسکے آخیر میں یائے نسبت زیادہ کرنے سے بآسانی لفظ نحوی بن سکتا ہے، اور اگر کوئی مسئلہ نحو کے متعلق ہو۔ تو اسکو اختصاراً مسئلہ نحوی کہہ سکتے ہیں، لیکن اگر کوئی نحو کے بجائے کوئی اصطلاح دو تین لفظوں سے مرکب قائم کی جائے مثلاً علم نحو کا نام کوئی شخص علم رابطہ الفاظ قرار دے، اور پھر ہمیں کسی مسئلے کو اس علم کی طرف منسوب کرکے کلمہ نسبت بنانا پڑے، تو اس صورت میں یائے نسبت کس لفظ کے آخر میں زیادہ کرینگے؟ کسی کے آخر میں بھی نہیں، اس صورت میں اس قسم کے مسئلہ کو "مسئلہ متعلق بعلم رابطہ الفاظ" کہینگے۔ جو نہائیت طول طویل طریقہ کلام ہوگا، خیال کرنا چاہیئے کہ وضع اصطلاحات میں اصطلاحات کو مختلف صورتوں میں لا سکنے کی سہولیت کیسا امر اہم ہے،

میری اپنی رائے یہ ہے کہ جس زبان کے لفظ ہماری زبان میں آسانی اور درستی سے کھپ سکتے ہیں اور جنکی مختلف صورتیں مثل صورت متذکرہ بالا آسانی سے بدل جاسکتی ہیں، اس زبان کے الفاظ بلاتکلف اردو میں لے لیے جائیں، اردو زبان اپنی ساخت - اشتقاق - صرف نحو - اور ذخیرہ علمی میں بہت سی زبانوں کی محتاج اور دست نگر ہے - پس اگر اسکی اصطلاحات میں بھی متعدد زبانوں سے مدد لی جائے - تو کچھ مضائقہ نہیں، مگر پھر ہم یہی کہینگے، کہ اس باب میں سب سے اول حق اس زبان کا ہے جو ہماری بولی کی اصلی بیخ و بنیاد ہے، اور اسکے بعد ان زبانوں کا - جو اسکی پرورش کرتی ہیں - یا اس کے جسم میں خون کا حکم رکھتی ہیں، اور اس کے بعد ان متفرق زبانوں کا جن سے اردو زبان کو تھوڑا سا سہارا ملتا ہے،

اردو زبان اب ایک عالیشان نہیں - تو پھر بھی ایک اچھے بلند مکان کی مانند ہے، جسکی عمارت میں ہندو عرب و ایران کی اینٹیں لگی ہیں - اب اگر اس عمارت کو ضرورتاً اور اونچا کرنا منظور ہے، تو اسی تناسب سے یا کسی قدر کمی بیشی کے ساتھ انہیں اینٹوں سے یہ عمارت اونچی کرنی چاہئے جن سے وہ پہلے تعمیر ہوئی ہے - لیکن اگر ہماری زبان کو وسعت دینے کے لئے یوروپ کی بیڈول ٹیڑھی بنکی، اصطلاحات داخل کی جائیں، تو اس کی مثال ایسی ہوگی - کہ تم اپنی قدیمی اینٹوں کی بجائے جھانویں رکھ کر اس عمارت کو بلند کرنے لگو - یہ جھانویں ہندی یا عربی یا ایرانی خوشنما اینٹوں میں کسطرح نہیں کھپ سکینگے،

جو اصطلاحات اجنبی ملک و اجنبی زبان سے لیجائیں، ان کے لئے یہ بھی ضروری ہے، کہ الفاظ ایسے ہوں، جو آسانی کے ساتھ صحت و درستی سے بولے جاسکیں، ورنہ ان لفظوں کا غلط تلفظ کرنا بمنزلہ وضع الفاظ جدید کے ہوگا، یہ ممکن ہے کہ لفظ مثلث کو کوئی شخص اعراب نہ ہونے کی صورت میں کچھ کا کچھ پڑھ لے لیکن انگریزی الفاظ خواہ کتنے ہی اعرابوں اور علامتوں کے ساتھ بھی لکھے جائیں، پھر بھی وہ ہمارے ہم وطنوں کی زبانوں اور مخارج سے صحیح طور پر ادا نہیں ہو سکتے - اور جب وہ الفاظ صحیح طور پر ادا نہیں ہوتے بلکہ بولنے والے ان کو کچھ کا کچھ بنا دیتے ہیں - تو ہم اپنی زبان میں سے ہی آسان آسان لفظ ان مطالب کے لئے کیوں نہ اخذ کریں؟

ہمنے اس مضمون کو جہاں تک سوچا ہے اور سوچنے کا زمانہ بھی پچیس تیس برس سے کم نہیں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں، کہ اصطلاحات علمی کے لئے سب سے بہتر موزون الفاظ کی مدد دینے والی زبان عربی ہے، اس کے بعد فارسی - لیکن اگر کسی وجہ سے ان زبانوں کو ناپسند کیا جائے، اور ان زبانوں

کی اصطلاحات کو مشکل کی وجہ سے لینا گوارا نہ کیا جائے۔ تو پھر ہمیں اپنے گھر کی بول چال یعنی روزمرہ
ہندوستانی الفاظ سے کام کیوں نہ لینا چاہئیے، ہمیں نہایت رنج ہے کہ جب سے اصطلاحات مشرقی
کی طرف سے سررشتہ تعلیم نے اپنی توجہ اٹھائی ہے، یہ کام ایسے ناقابل غیر موزوں لوگوں کے ہاتھوں میں
پڑ گیا ہے، کہ اس کا نتیجہ بجز بربادی فصاحی زبان ہندوستان کے اور کچھ نظر نہیں آتا، میجر فلر اور کرنل
ہالرائڈ کے زمانے میں جو سالہا سال کی محنت اور صرف کثیر کے بعد عمارت قائم کی گئی تھی، وہ ڈاکٹر
سائم کے زمانہ میں نہایت بے دردی کے ساتھ گرائی گئی، اور جس چال سے سررشتہ تعلیم اس زمانے
میں چل رہا تھا، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رہیگا، ملک پنجاب
کی خوش قسمتی ہے، کہ اس کے سررشتہ تعلیم کی باگ مسٹر اینڈرسن کے ہاتھ میں آئی ہے، اور اب ہمارا
فرض یہ ہے، کہ ہم سب ملکر اپنی ضرورت اور حاجت کو ان کی خدمت میں بیان کریں اور ان سے
اپنے درد کا علاج چاہیں۔

جن لوگوں نے سررشتہ تعلیم کی بہت ابتدائی کتابوں سے آگے بڑھ کر ذرا اونچی کتابوں پر
نظر ڈالی ہوگی، انہوں نے بخوبی دیکھا ہوگا کہ وہ کتابیں نہ اردو زبان کی کتابیں کہلائی جاسکتی ہیں، نہ
انگریزی زبان کی، بلکہ چھاؤنی کے کباڑیوں کی بولی یا کسی کیمپ کی گورہ شاہی اردو ہے۔ ہمارے ملک کے
نوجوان اکثر اوقات باہم ایک دوسرے کے ساتھ ایسی مخلوط بولی بولتے دیکھے جاتے ہیں، جسے سنکر
ادب اردو کے بہی خواہوں کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ مگر ازحد رنج اور افسوس کا مقام ہوگا۔ اگر
یہ خرافات علم کا نام اختیار کرکے درسی کتابوں میں بھی گھس جائے، ہزارہا اہل ہنود ایسے ہوں گے
جن کے نیک دلوں میں قدرتاً شکرگذاری کا مادہ ہوگا، اور وہ تسلیم کریں گے، کہ فارسی وعربی نے ہماری
زبان کو کس قدر اپنے علمی خزانہ سے مالامال کیا ہے اور وہ نہایت خوشی کے ساتھ بقدر احتیاج اب بھی
اس خزانہ سے قرض لینے کو بلا تکلف تیار ہونگے، لیکن جن لوگوں کو تعلیم جدید نے غیرت و حب الوطنی
کے پردے میں بدقسمتی سے تعصب کا سبق پڑھایا ہے، ہم ان کو اپنے نادر خیالات بدلنے کی تکلیف
نہیں دینا چاہتے، وہ ہماری طرف نہیں جھکتے، تو نہ جھکیں، ہم خود اُن کی طرف جھکتے ہیں۔ اور ان کو
ان کے خیالات میں ہی مدد دینے کو تیار ہیں۔ کیا ان کے لئے شرمندہ ہونے اور ڈوب مرنے کا مقام
نہیں، کہ وہ اپنے ہاتھوں اپنی زبان کی بربادی کا سامان جمع کر رہے ہیں، وہ اپنی شامت اعمال

اپنا مال۔ اپنا ملک۔ اپنا راج۔ اپنے علوم سب کچھ برباد کر چکے ہیں، کیا اب یہ وقت بھی آگیا ہے کہ ان کے لئے اپنے منہ سے بولنے کے جو باپ دادا کے زمانے کے چار حرف باقی رہ گئے تھے، ان کا بھی نام و نشان ملک میں سے مٹ جائے، اور وہ یوروپ کی زبانوں سے بھیک مانگنے کے لئے ہاتھ پھیلاتے پھریں،

یوروپ کے وہ علوم جنکے ترجموں میں اصطلاحات جدیدہ کی سخت ضرورت ہے بے تعداد ہیں خصوصاً علم کیمیا اور طبعیات تو ایسے علوم ہیں جن میں بے اصطلاحات ایک قدم بھی اٹھانا مشکل ہے مگر ہم نے جہاں تک اپنی ہندوستانی زبان پر غور کیا، تو اس میں تقریباً تمام خیالات علمی کے لئے اصطلاحات وضع کرنے کے واسطے بخوبی گنجائش پائی، چنانچہ ہم تمثیلاً علم کیمیا کی اصطلاحات خاص اپنی روزمرہ زبان سے جسے ذرا سی عمر کا بچہ بھی سمجھ سکے۔ قائم کر کے دکھاتے ہیں، اور پوچھتے ہیں کہ آیا یہ ہمارے قومی الفاظ یوروپین نامانوس و غیر جنس اصطلاحوں سے بہتر نہیں ہیں؟ باقی آئندہ

(سید ممتاز علی)

دود آہ

(از ممتاز علی آہ تلمیذ امیر مینائی لکھنوی)

بال کھولے وہ قبر پر آیا ۔۔۔ اس محبت میں کب اثر آیا
سب مجھے دیکھنے کو آتے ہیں ۔۔۔ کس کا جلوہ مجھے نظر آیا
پیشوائی یہ کس کے، تیر کی ہے ۔۔۔ منہ کو سو بار کیوں جگر آیا
کیا الٹ پھیر اس نگاہ میں ہے ۔۔۔ زخم کھاتے ہی زخم بھر آیا
کون پرسانِ حال تھا میرا ۔۔۔ ایک افسوس عمر بھر آیا

فائدہ جب اٹھا نہیں سکتے
آہ نالے میں تب اثر آیا

رباعیات عمر خیام

رباعی میں عمر خیام کو وہی شہرت حاصل ہے جو قطعہ میں ابن یمین کو۔ لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ابن یمین کا کلام محض ملاؤں کا وعظ یا بڑے بوڑھوں کی نصیحت ہے، اور خیام کا کلام مجموعۂ لطافت وظرافت۔ اسکے کلام میں شوخی اور شاعرانہ تخیل درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ اس شوخی کو دیکھ کر بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ خیام ایک رند مشرب، مذہب سے بے پروا شخص تھا۔ لیکن حقیقت میں کسی کے کلام کو شوخ اور رندانہ دیکھ کر اسطرح کا قیاس قائم کرنا صحیح نہیں ہے، اسلئے کہ شاعر کو اس طرز و روش سے گریز نہیں ہے، سہ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو　　بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام　　چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

جب یہ امر مسلم ہے تو پھر خیام کی نسبت بدگمانی کی کوئی وجہ نہیں ہے اور تذکروں سے بھی یہ بات متحقق ہے کہ خیام ایک بڑا فاضل اور حکیم ہونے کے علاوہ فکر معاد سے بھی غافل نہ تھا، چنانچہ اُسنے اپنی متعدد رباعیوں میں آخرت کا خوف اور گناہوں سے شرم لائی ہے، ایک صاحب نے امرتسر میں اسکی رباعیوں کا مجموعہ طبع فرمایا ہے اُسمیں وہ لکھتے ہیں کہ خیام کے کلام میں شراب بادہ سے حوض کوثر کی شراب مراد ہے، اور اپنے اس دعوی کی دلیل میں اُس کی یہ رباعی پیش کی ہے، سہ

اے دل بے معشوق مکن در باقی　　سالوس رہا کن و مکن زراقی
گر پیرو احمدی خوری جام شراب　　زاں حوض کہ مرتضاش باشد ساقی

میرے خیال میں یہ تاویل محض تکلف ہے اسلئے کہ اول تو یہ رباعی خیام کی ہے ہی نہیں الحاقی معلوم ہوتی ہے، اکثر نسخوں میں نہیں پائی جاتی، مطبع نولکشور کے مستند مطبوعہ مجموعہ میں بھی درج نہیں ہے، دوسرے بندش کے اعتبار سے بھی درست نہیں معلوم ہوتی، چنانچہ پہلے مصرعہ میں مکن درباقی ابھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ تیسرے یہ بات بھی قابل لحاظ ہے، کہ اگر اسکو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس کی دیگر رباعیوں میں شراب بادہ کے یہ معنے ٹھیک نہیں بیٹھتے مثلاً سہ

گر بادہ خوری تو با خردمنداں خور — یا با صنمے لالہ رخ خنداں خور
بسیار مخور و رد مکن فاش مساز — اندک خور و گہ گاہ خور و پنہاں خور

اس رباعی میں اگر بادہ سے بادۂ طہور یا شراب کوثر مراد لیجائے تو معنے خبط ہو جاتے ہیں،

خیام کی نسبت بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ صوفی مشرب تھا، اُنھوں نے اپنی تمام رباعیوں میں تصوف کے نکات و غوامض کو بیان کیا ہے، اور بعض کی رائے اسکے خلاف ہے، وہ کہتے ہیں کہ "صوفی لوگ خاص طور پر اس سے متنفر اور ترساں تھے،" مجھکو ان دونوں سے اختلاف ہے حقیقتِ حال یہ ہے کہ خیام نے اخلاقی تصوفی ـ حکیمانہ اور فلسفیانہ ہر قسم کے مضامین کو رندانہ اور عاشقانہ رنگ میں بیان کیا ہے، تاکہ عام طور پر دلنشیں ہو جائیں، اور اس مقصد میں وہ کامیاب بھی ہؤا، کیسا ہی زاہد خشک ہو اس کے شراب و کباب کے مضمون کو پڑھ کر چٹخارے لینا شروع کرتا ہے ہم آئندہ اسکی ہر قسم کی رباعیوں کا نمونہ پیش کرینگے اس کا سال وفات ۵۱۷ھ اور مدفن نیشاپور لکھتے ہیں،

اگرچہ اسکی رباعیاں مشہور و معروف ہیں اور اسکے حالات بھی تحریر ہو چکے ہیں، میرے کچھ لکھنے کی چنداں احتیاج نہ تھی لیکن میری اس خامہ فرسائی کے چار سبب ہیں۔ اوّل یہ کہ میرے دوست ایڈیٹر مخزن کی فرمائش تھی، جو بحکم المامور معذور مجھ کو اسپر کچھ لکھنا پڑا، دوم یہ کہ اسوقت اسکی رباعیوں کے جسقدر مجموعے میں نے دیکھے، ان میں اکثر رباعیاں غلط اور ناموزوں چھپی ہیں، ان کی صحت بھی مقصود تھی سوم یہ کہ بعض رباعیاں خاص طور پر ترجمہ کی محتاج پائی گئیں، چہارم یہ کہ ان رباعیوں کے مندرجہ مضامین دوسرے شعرا کے کلام میں بھی پائے گئے اس کا اظہار بھی مناسب معلوم ہؤا تاکہ ہر ایک کے طرز بیان کا اندازہ ہو سکے، وما توفیقی الا باللہ،

رباعی

با دشمن و دوست فعل نیکو نیکوست — بد کے کند آنکہ نیکی آتش عادت اوست
با دوست چو بد کنی شود دشمنِ تو — با دشمن اگر نیک کنی گردد دوست،

اس رباعی کا مطلب ظاہر ہے، ترجمہ کی ضرورت نہیں، لیکن اسکے دوسرے مصرع میں (آتش) زائد اور غلط ہے، اگر آتش کو صحیح مانا جائے تو (او) بے کار اور غلط ہو جائے گا، یہ رباعی میں نے مطبع روز بازار امرت سر کے مطبوعہ مجموعہ سے نقل کی ہے مطبع منشی نولکشور کے مطبوعہ مجموعہ میں مصرع ثانی اس طرح ہے (بد کے کند آنکہ نیکیش عادت و خوست) یہ مصرع صحیح اور قواعد زبان

کے مطابق ہے،

اس رباعی کے پہلے دو مصرعوں کے مضمون کو خواجۂ شیراز علیہ الرحمہ نے اور بعد کے دو مصرعوں کے مضمون کو شیخ شیراز علیہ الرحمہ نے بہ ترتیب اسطرح نظم فرمایا ہے،

(حافظ رح)
آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف است
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا،

(سعدی رح)
بندۂ حلقہ بگوش ار ننوازی برود
لطف کن لطف کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

میرے قلم میں اتنی قوت نہیں ہے، کہ ان تینوں باکمالوں کے کلام میں سے ایک دوسرے پر ترجیح دے سکوں لیکن ان میں خیام کو تقدم کا جو شرف حاصل ہے، اُس سے کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا کما قال ؎

فلو قبل مبکاھا بکیت صبابتہ — بعدی شفیت النفس قبل التندم
ولکن بکت قبلی فھیج لی البکا — بکاھا فقلت الفضل للمتقدم

غرض خیام کی ہر ایک رباعی بجائے خود حکمت و اخلاق کا ایک دفتر ہے لیکن اس کے ساتھ ہی چند ایسی رباعیاں بھی اس کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، جو اسکے علم و فضل کو خاک میں ملانے والی ہیں، اسوقت اسکی رباعیوں کے جو مجموعے دستیاب ہوتے ہیں، ان میں تقریباً ایک ہزار رباعیاں درج ہیں، جن میں سے میرے خیال میں قریب قریب ایک ربع کے ایسی ہیں جو یقیناً خیام کی نہیں ہیں، فٹز جیرلڈ صاحب نے انگریزی میں ان کا جو ترجمہ کیا ہے، اس نے تو صرف پچھتر رباعیاں لی ہیں، باقی تمام رباعیوں کو چھوڑ دیا ہے، مگر یہ بھی منجملہ تفریط ہے،

اب ناظرین مجھ سے یہ سوال کرینگے، کہ آخر ان میں سے کون سی رباعیاں خیام کی ہیں اور کون سی الحاقی ہیں، اور ان کے معلوم کرنے کا کیا طریقہ ہے، میں یہ عرض کروں گا کہ اس کے معلوم کرنے کا طریقہ نہایت آسان ہے، یعنے جو رباعی اصول فن اور قواعد زبان کے خلاف ہے وہ ہرگز خیام کی نہیں ہے مثلاً ؎

دل چراغیست کہ از نور رخ دلبر گیرد — ور بمیرد ز غمش زندگی از سر گیرد
صفت شمع بہ پروانہ نباید گفت — کیں حدیثیست کہ با سوختگاں در گیرد،

اب بتلائیے کون سا شاعر اسکو رباعی کہے گا کیا کسی وزن میں بھی چار مصرع کہہ دینے سے اسکا نام رباعی ہو جائیگا، کیا خیام آتا بھی نہ جانتا تھا، رباعی تو بحر ہزج میں ہوتی ہے یہ بحر رمل میں رباعی کیسی۔ یہ تو وہی مثل ہوئی ؎

کہنے کو جبکہ یار غزل در غزل چلے
بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے

یہاں تک تو خیر کوئی وزن بھی ہے ہزج ہو یا رمل شعر موزون تو ہیں اس سے بھی زیادہ سنئے کسی میں تو وزن ہی کا خاتمہ ہو گیا ہے، مثلاً ؎

ساقی چو صلاح از مجنوں آید — حال از تو مگر باز لیلیٰ نون آید
پر کن قدحے تہی دست و دل ایم — از دست و دل تہی چہ بیروں آید

اب فرمائیے (ساقی چو صلاح از مجنوں آید) یہ رباعی ہے یا ناقۂ لیلیٰ ہے ؎

تال کی نہ سم کی نہ سُر کی
حویلی علی نقی خاں بہادر کی

اور لفظ پر تو (پر کن قدحے تہی دست و دل ایم) میں نور علیٰ نور ہے وہی مثل ہے ع

بھر بھر چھاجوں برست نور

یہ دونوں رباعیاں مطبع روز بازار امرت سر کے مطبوعہ مجموعہ سے نقل کی گئی ہیں، جو نہایت اہتمام سے عمدہ کاغذ پر خوشخط اور بڑے بڑے مولوی صاحبوں کے حسن انتظام سے چھپا ہے، بعض رباعیوں میں قافیہ مکرر آگیا ہے، مثلاً ؎

زاں سرو گلے کہ پیر دہقاں دارد — ہر کوں کہ دلم میل فراواں دارد
از سر گل آرزو بدر کوں کہ جہاں — در زیر گل آرزو فراواں دارد

اور بعض میں غلط قافیے لکھے گئے ہیں جیسے دست اور لبست کا قافیہ گذشت۔ مثلاً ؎

تا باز شناختم من ایں پائے ز دست — ایں چرخ فرومایہ مرا دست بہ لبست
افسوس کہ در حساب خواہند نہاد — عمرے کہ مرا بے مے و معشوق گذشت

اور بعض میں تو سرے سے قافیہ ہی نہیں ہے مثلاً ؎

گر بر فلکے ترا بخاک آرند — ور بر سر نازی بہ نیاز آرندت

فی الجملہ تو بگذار جدل تا بتواں　　آزار مجوئے تا نیاز آرندت

اس میں تنزا کے ساتھ آرندت بھی قابل ملاحظہ ہے جس کے سبب سے زبان بھی گئی گذری ہوئی...

اس رباعی کو امرت سری طبع نے اسطرح درست کرکے چھاپا ہے ؎

گر بر فلکی بخاک باز آرندت　　ور بر سر نازی بہ نیاز آرندت

فی الجملہ تو بگذار جدل تا بتوانی　　آزار مجو تا کہ نیاز آرندت

اسنے قافیہ اور زبان کو تو درست کر لیا لیکن تیسرے مصرع میں بتواں کی جگہ بتوانی کہکر مصرع کی دم بڑھا دی

ایک آدھ رباعی میں عربی کی بھی ٹانگ توڑی گئی ہے مثلاً ؎

روزیکہ شود اِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ　　وآندم کہ بود اِذَا النُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ

من دامن تو بگیرم اندر عرصات　　گویم صنما بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ

اس میں قتلت بصیغۂ معروف پڑھیئے یا قتلت بصیغۂ مجہول پڑھیئے۔ جیسا کہ قران شریف میں ہے غرض دونوں صورتوں میں ایک ابتدائی صرف کی کتاب پڑھا ہوا شخص بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے یعنی بصورت معروف اس کے معنے اُس عورت نے قتل کیا، اور بصورت مجہول وہ قتل کی گئی، اب اس معنے کو پیش نظر رکھ کر رباعی کا ترجمہ کیجیئے تو سوا مجذوب کی بڑ کے مطلب کچھ بھی حاصل نہ ہوگا یعنے جس روز قیامت ہوگی، تو میں تیرا دامن تھام کر اے صنم یہ کہوں گا کہ اس عورت نے کس جرم میں قتل کیا یا وہ کس جرم میں قتل کی گئی، امرت سری چھاپہ میں اس کا یہ مطلب لکھا ہے کہ وہ اپنے معشوق کی زبردستی کی داد کی امید کو بروز قیامت میں خداوند تعالےٰ اسے اُسے ہے، ان الفاظ میں بیان کرتا ہے" میں کہتا ہوں کہ یہ مطلب ہرگز نہیں نکل سکتا، خصوصاً جب کہ اُنہوں نے قتلت کو نہایت اہتمام سے بضم قاف و کسرۂ تا بصیغۂ مجہول چھاپا ہے، اگر اسکو کتابت کی غلطی بھی سمجھ کر قَتَلَتْ بصیغۂ معروف ہی پڑھیں، تو جب بھی یہ بات رہ جاتی ہے کہ کس نے اور کسکو قتل کیا اور لفظ تو یا صنما کا مخاطب کون ہے، بعض لوگ اسکو دارا شکوہ کی رباعی بتاتے ہیں لیکن مجھکو دارا شکوہ سے بھی ایسی توقع نہیں ہے، اکثر سواد لوگ البتہ اسطرح کی تک بندیاں کیا کرتے ہیں، کُلا کی شان اس سے ارفع ہے، اس فقرے کو اردو میں بھی نہایت خوبی سے نظم کیا گیا ہے یہ شائد مرزا دبیر مرحوم کی اعجاز بیانی کا نتیجہ عمل ہے ؎

جس دن ہوگا اذا السماءُ انشقت　　ہو جائیگا جب اذا النجوم انکدرت

محشر میں یہ فاطمہؓ کہیں گی رو کر　　اولاد مری بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ

اس میں قُتِلَتْ سے مقصود اولاد ہے یعنی اولاد میری کس جرم میں قتل کیگئی،

حضرت ذوق نے بھی اک ذراسے تصرف کے ساتھ اسکو نظم فرمایا ہے اور خوب نظم فرمایا ہے ؎

اہی کس بیگنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کُشتنی ہے
کہ آج کوچہ میں اُس کے شور بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ ہے

غرض اس قسم کی بے تکی رباعیوں کے نکالدینے کے بعد خیام کی جو حقیقی اور اصلی رباعیاں رہ جاتی ہیں وہ وہی ہیں کہ جن کے سبب سے خیام کا نام دنیا میں اُسوقت تک باقی رہیگا، جب تک کہ خیمۂ گردون فرش زمین پر بغیر طناب و ستون کے قایم ہے انشاء اللہ ان رباعیوں کو ہم آیندہ ناظرین کے ملاحظہ سے گذاریں گے،

لمعہ

افکار یاس

(از حکیم سید شاہ محمد الیاس صاحب یاس بہاری)

غش تھے جب وہ خونِ دل ہنگامہ آرا ہوگیا		امتحاں کو کھیل سمجھے تھے تماشا ہوگیا
ہائے حسن و عشق میں باہم یہ یارب کیا لگاؤ		شمع کا جب دل جلا پروانہ ٹھنڈا ہوگیا
جوشِ بیتابی کو کیا رسوا کیا ہے ضبط نے		وہ سمجھتے ہیں کہ درد عشق اچھا ہوگیا
جلوۂ تیغ نگہ پر اپنی گردن جھک گئی		حسن کی خوں گرمیوں سے عشق رسوا ہوگیا
داستانِ اضطرابِ دل کچھ الظالم نہ پوچھ		شوخیوں پر تیری اکثر مجھ کو دھوکا ہوگیا
شکوہ سنج ناتوانی جذبۂ وحشت سہی		ذوق گردش کو مرے اے چارہ گر کیا ہوگیا
محنت آبادِ فنا میں اضطرابِ دل نہ پوچھ		ہائے وہ قطرہ کہ وقفِ موج دریا ہوگیا

دیکھتے ہی تیرا جلوہ مرگیا محشر میں یاس
اک قیامت آگئی وعدہ جو پورا ہوگیا

یاس بہاری

بھاشا

(از منشی محمد شفیع الدین خانصاحب مرادآبادی ایم آر اے ایس)

ارباب تاریخ جانتے ہیں کہ ۵۶ق م میں مہاراجہ بکرماجیت اسی ہندوستان میں گذرے ہیں اور انکے دربار کی زبان سنسکرت اور عام پراکرت تھی، ملک الشعرا کالیداس کا ڈراما شکنتلا اس امر کی بیّن شہادت ہے، ایک زمانہ آیا کہ مہاتما گوتم بدھ پیدا ہوئے انہوں نے مگدھ دیش کی پراکرت میں وعظ کہا اور آج بھی مہاتما مہرج کی ملفوظات اسی زبان میں موجود ہیں، بدھ مت دسویں صدی عیسوی تک رہا، گو ہے تو اب بھی، لیکن اس کا عدم وجود برابر ہے، اور جب تک وہ قائم رہا مگدھ دیش کی پراکرت بھی زندہ رہی،

سنہ ۱۱۰۰ء میں ملک کی زبان ہندی بھاشا ہو چکی تھی، نہ مہاراجہ بکرماجیت کی پراکرت رہی تھی، اور نہ مگدھ دیش کی زبان۔ دہ صدی میں زبان پر ایسا انقلاب آیا، کہ اسکا قالب ہی بدل گیا، سلطان شہاب الدین غوری اسی سنہ میں داخل ہندوستان ہوا، اور ظاہر ہے کہ فارسی کے اختلاط نے بھاشا کو ایک نئی زبان بنا دیا ہوگا، اس عہد کی ایک تصنیف "پرتھی راج راسو" (مصنفہ چند کوی) ہمارے سامنے ہے، جس میں بہت سے عربی فارسی الفاظ ہیں،

سنہ ۱۳۲۵ء میں امیر خسرو دہلوی نے (بزمانہ سلاطین خلجی) بھاشا میں نظم لکھی، اور وہ آجتک موجود ہے سلطان بہلول لودی کے زمانہ میں عام طور سے ہندوؤں خصوصاً کائستھوں نے فارسی عربی کی جانب توجہ کی، اور ہندوستان میں کثرت کے ساتھ ذی علم ہنود نظر آنے لگے، مسلمانوں نے اپنے شوق سے سنسکرت اور بھاشا کی جانب توجہ کی، اور جب ہم اس زمانہ کے موجودہ وقت سے مقابلہ کرتے ہیں، تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے آگے ہمنے بھاشا کے مسلمان ناظموں کا کلام درج کیا ہے، اُسے ملاحظہ فرمائیے، اس مبارک میل جول کا یہ نتیجہ ہوا، کہ ہندوستان کی دو بڑی قومیں عام طور پر فارسی، عربی، سنسکرت اور بھاشا جان گئیں، ہندؤں نے فارسی میں اور مسلمانوں نے بھاشا میں کتابیں لکھیں، اور وہ آج بھی موجود ہیں، حکومت خود تحریک کرتی اور مصنّفین کو بیش قرار صلہ دیتی تھی، پھر ترقی کیسے نہ ہوتی، گرو نانک صاحب، گرو کبیر داس جی وغیرہ کا کلام دیکھو، شاہزادہ دانیال، مرزا عبدالرحیم خانخاناں، ملک محمد جائسی۔ غوّاصی، نوری، محمد بلگرامی کا کلام اور تصانیف دیکھو، اور موازنہ کرو،

سنہ ۱۶۴۵ء میں یہی بھاشا (بعہد شاہجہان) ترقی کرتے کرتے اردو ہوگئی اور وہ آجتک موجود ہے لیکن اسکی اصل وہی بھاشا ہے، اب اسمیں یہ فرق ہوگیا ہے، کہ انگریزی کے الفاظ بھی بکثرت داخل ہوگئے ہیں، اور ہم نہیں سمجھتے

کہ آجکل کی اردو یا بھاشا کا کیا نام رکھیں، اس وقت ہمیں مرحوم شمس العلما مولانا سید علی بلگرامی کا قول یاد آیا، وہ فرماتے ہیں کہ آج کل کی اردو کا نام اردوئے معلّٰی تو نہیں بلکہ اردوئے مارکٹ (بازاری اردو) رکھنا چاہیئے، یاد رکھنے کی بات ہے کہ جو ملک اپنی زبان یا تمدن کو غیروں کے اختلاط سے نہ بچا سکے وہ کیا ترقی کریگا، اس سے ہمارا یہ منشا نہیں ہے، کہ ہندوستانی انگریزی تعلیم حاصل نہ کریں، لیکن انکو چاہیئے کہ اپنی زبان کو تو غیر مانوس انگریزی الفاظ سے محفوظ رکھیں،

حضرت امیر خسرو دہلویؒ پہلے شاعر ہیں، جنہوں نے بھاشا میں کلام تصنیف فرمایا، اور ولی دکھنی دوسرے بزرگ ہیں، جن کا دیوان بھاشا میں ہے، ان کے بعد اردو کی ثقالت دور ہوتی گئی، اور میر، سودا، انشا، مومن، ذوق، غالب، ناسخ، آتش وغیرہ نے چار چاند لگا دیئے، لکھنؤ اور دہلی میں اردو کی ٹکسالیں قائم ہوگئیں، اور حالانکہ دہلی اور لکھنؤ وہ نہیں رہے، لیکن زبان کے لحاظ سے ان دونوں شہروں کو ابتک فوقیت دی جاتی ہے، دور آخر کے ملک الشعرا داغ مرحوم آخر پکار ہی اٹھے ؎

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سندوستان میں دھوم ہماری زباں کی ہے

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی حکومت مستقل طور پر سرکار برطانیہ کے قبضہ میں آئی، اور ہماری سرکار نے ابتداً اردو کی ایسی سرپرستی کی، جس کا بجا طور پر شکر گذار ہونا چاہیئے، فورٹ ولیم کلکتہ میں ڈاکٹر جان گلکرائسٹ کی نگرانی میں تراجم کا ایک محکمہ منجانب گورنمنٹ قائم ہوا، اور اس میں ہندوستان کے بڑے بڑے قابل ہندو اور مسلمان اہل قلم جمع کئے گئے اور تصانیف کا سلسلہ شروع ہوا، یہ ہی نہیں بلکہ انگریزی مصنفین نے بھی اردو میں تصانیف تحریر فرمائیں، جن میں فرگیوسن اور جنرل پٹیرک کی لغت اردو اور ڈاکٹر گلکرائسٹ کی اردو انگریزی ڈکشنری (لغت) مشہور ہے، ڈاکٹر فیلن، مسٹر جان شیکسپیر کا نام بھی اس فہرست میں شامل کرنا چاہیئے ان صاحبوں نے بھی مفید تالیفات سے اردو کو مرہون احسان کیا

فورٹ ولیم کلکتہ میں جو محکمہ ترویج و اشاعت اردو کے واسطے قائم ہوا تھا، اس میں حسب ذیل اہل قلم شامل تھے،

(۱) نگران۔ ڈاکٹر جان گلکرائسٹ

(۲) میر شیر علی افسوس لکھنوی
(۳) میر بہادر علی حسینی
(۴) سید حیدر بخش حیدری
(۵) مولانا حفیظ الدین احمد
(۶) میر امّن دہلوی
(۷) میر کاظم علی دہلوی

(۸) شری للوجی پنڈت (۹) میر اکرام علی

(۱۰) لالہ نہال چند لاہوری (۱۱) میر مظہر علی ولا

اردو یا بھاشا کی بدقسمتی دیکھیے کہ یہ محکمہ بالمصلحت گورنمنٹ نے بند کر دیا اور اب ملک کی زبان کے معاملہ مین جو حالت ہے وہ ظاہر ہے،

اہل ملک کا فرض ہے کہ وہ خود بھاشا یا اردو کے واسطے غور کریں اور اس کے لئے کانگریس کے اہل الرائے ہندو اور مسلمان اصحاب کی ایک جماعت قائم کی جائے، جو بھاشا اور اردو کا ایسا عمدہ اور جامع کورس (نصاب تعلیمی) طیار کرے جسکو تھوڑے عرصہ میں پڑھ کر مسلمان کامل ہندی دان اور ہندو لائق اردو دان ہو جائیں، تاکہ زبان کی رکیک بحث ختم ہو جائے،

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ حضرت امیر خسرو دہلوی نے بھاشا میں کلام تصنیف فرمایا، لیکن تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسعود سعد سلمان جو سلطنت غزنویہ کا مشہور شاعر اور حضرت امیر رہ سے تقریباً دو سال قبل گذرا ہے بھاشا کا قادر الکلام شاعر تھا، اور اسکا ایک دیوان اسی زبان میں موجود ہے، لیکن وہ ہندوستان سے باہر کا رہنے والا تھا، اس وجہ سے ہم اس کا زیادہ ذکر نہیں کرتے، اس سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ بھاشا کی شیرینی ہندوستان سے نکلکر اور ملکوں کو بھی شیریں کام کر رہی تھی،

امیر خسرو رہ کے بعد ملک محمد جائسی رہ پیدا ہوئے وہ نہایت زبردست شاعر تھے ان کی بے نظیر تصنیف پدماوت اب تک موجود ہے، اکبری اور جہانگیری عہد میں جس نے اس فن میں نام پیدا کیا، وہ شیخ شاہ محمد بلگرامی تھے، انکے شعر نہایت کثرت سے سرو آزاد حصہ دوئم میں موجود ہیں، ہم یہاں صرف ایک شعر لکھتے ہیں، سے

(۱) کم درگ دہری سنار (۲) مم آیو بھایو نہن،

(۱) کیوں تیری آنکھ آبدیدہ ہوئی ہے اے نازنین، (۲) کیا میرا آنا پسند نہیں ہوا، شاہان تیموریہ بھاشا کی قدر دانی مثل فارسی کے کرتے تھے، اور اسی وجہ سے یہ زبان روزانہ ترقی کرتی جاتی تھی، راجہ سورج سنگھ نے ایک ہندو شاعر کو دربار جہانگیری میں پیش کیا اور اس نے ایک اچھوتے مضمون کی نظم پڑھی تو جہانگیر نے ایک ہاتھی انعام میں دیا، اور اس کے حکم سے فارسی میں ان اشعار کا ترجمہ کیا گیا، بھاشا تصانیف کے ساتھ مسلمانوں کو سد رجہ شغف تھا، کہ بعض لوگوں کو اکثر کتابیں حفظ یاد تھیں، چنانچہ علامہ امین رازی نے میر ہاشم محترم کی بابت لکھا ہے کہ انکو رامائن حفظ تھی،

سے مضمون کا حصہ مقالات شاہی کا انتخاب ہے،

اورنگ زیب کے زمانہ میں بھاشا نے خوب ترقی کی، ضمیر نے جو ایرانی الاصل تھا، بھاشا میں ایسا تبحر حاصل کیا، کہ وہ مثل فارسی زبان کے اشعار موزون کرتا، اور اسکا تخلص اس زبان میں ہیتھی تھا، پارجاتک فن موسیقی میں اعلیٰ پایہ کی کتاب ہے، اسکا ترجمہ فارسی میں ضمیر نے کیا، دربار عالمگیری کا دوسرا ناظم دانا تھا، وہ بھی بھاشا میں خوب شعر کہتا تھا،

مولانا عبدالجلیل بلگرامی (جد مادری مولانا غلام علی آزاد بلگرامی) دربار عالمگیری میں منصبدار اور بھاشا میں قصائد لکھتے تھے، ایک شعر ملاحظہ ہو، ؎

اسیس دے کے کہے ہندی میں یوں سمت ہے جگت میں اچل یاس یہ وزیر سدا

محمد شاہ کے زمانہ میں جب راجہ جے سنگھ والئے جیپور نے بیس لاکھ روپیہ صرف کرکے رصدگاہ بنائی، تو مسلمان علما نے راجہ کے حکم سے شرح چغمینی اور ہیئت کی دوسری کتابوں کا بھاشا میں ترجمہ کیا، شرح چغمینی عربی میں نہایت مشکل کتاب ہے، اور اردو میں بھی ذرا مشکل سے ترجمہ ہو سکتا ہے، سمجھ لینے کی بات ہے کہ جن لوگوں نے بھاشا میں اسکا ترجمہ کیا ہوگا، ان کی قابلیت اس زبان میں کیسی ہوگی،

مولانا سید نظام الدین بلگرامی سنسکرت اور بھاشا کے بہت بڑے عالم تھے، اور انہوں نے بنارس میں ان زبانوں کی تکمیل کی تھی، موسیقی میں یہ کمال تھا، کہ لوگ انکو نائک کہتے تھے، اس فن کے متعلق دو کتابیں بھی ان سے یادگار ہیں "ناد چندرکا" اور "مدھنایک سنگھار" بھاشا میں مدھنایک تخلص کرتے تھے، کلام ملاحظہ ہو،

جو چتر ان چت چڑھے نہ ٹڈھے بدھ بیدن گرنتہ نہ گنائے
بھارتی بھوری کرے بھرن جپ جوگن جوگ اتھیہ گنائے
جو مکھ جوت جگے نہ تھکے مدھنایک گھونگٹ چنچل تارے
جنہیں دو کول چھپے جھلکے ابچیہ براجت اچھ رجھائے،

مطلب، تیری آنکھیں نقاب کے اندر جس قدر خوشنما ہیں، اس کی خوبی فرشتوں کے خیال میں بھی نہیں آ سکتی، اور نہ آسمانی کتابوں میں ان کی توصیف پائی جاتی ہے، قوت نطق خود محو حیرت ہے اور زاہد مرتاض سجدہ گردانی سے بھی زیادہ اسکا مداح ہے، نقاب ان آنکھوں کی خوبی کو نہیں چھپا سکتا، بلکہ باریک دوپٹہ اسکی خوبی کو اور بھی دوبالا کر دیتا ہے،

سرو آزاد میں اور بھی بہت سا کلام ہے، سید رحمت اللہ بھاشا کے مشہور استاد، در سلطنت تیموریہ میں دو صدی منصب دار تھے، ان کا دوہا ملاحظہ ہو، ؎

کر اُچالے جھہائے تیہ دناری پیچھے یہ بھائی سنو چیلا دوئی سیک ہوئے گرے بھوم پر آئی،

مطلب محبوب نے جمھائی لیتے ہوئے جب دونوں ہاتھ اٹھا کر نیچے کر لئے تو یہ معلوم ہوا کہ گویا دو بجلیاں چمک کر زمین پر گر پڑیں،

شائید حضرت نظامؒ نے اسی خیال کو منظوم کر دیا ہے، ؎

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ   دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ

مولانا سید غلام نبی اودھ میں متد بیدار تھے، بھاشا میں ان کا ایک دیوان ہے جس میں (۱۷۷) دوہے ہیں، اسکا نام انگ درپن تھا تخلص رس لین تھا، توحید میں کیا خوب لکھتے ہیں، ؎

تیری منور دھ کو ہوت ہے سین لوک توں ہے ہوئی اکاش کرت نکھت اُدوت ہے،
توں ہے چار و تو سیل ترس پنچھی ہوت توں ہے میگھ پوجے کوت دراگوت ہے،
توں ہے بن ناری بھرتا کے رسلین ہوت توں ہے ہوئے کے ستر لیس اپن تن لیت ہے
جاگ پریں جھونٹو جیوں سین لوگ ہوت تیو نہیں آتما بچاکی لوگ جاگت کو ہوت ہے

مطلب- تیرے ہی اشارے سے دنیا پیدا ہوتی ہے، تو ہی آسمان بنکر ستاروں کو روشن کرتا ہے، تو ہی ارجہ عناصر، پہاڑ، درخت، چرند اور پرند بنجاتا ہے، تو ہی بادل بنکر بحیثیت باب بارش کرتا ہے، تو ہی عورت کے قالب میں اگر مرد کا راحت رساں ہے تو ہی بالآخر موت کی صورت میں جان کا دشمن ہے، تو جس طرح کہ جاگنے کے بعد خواب بالکل وہم معلوم ہوتا ہے، اسی طرح خدا شناسوں کے نزدیک یہ دنیا تمام تر خواب ہے،

مولانا سید برکت اللہ فقیہ، بھاشا کے زبردست شاعر اور پیمی تخلص کرتے تھے، ان کے دیوان کا نام پیم پرکاش ہے ایک دوہا ملاحظہ ہو، ؎

چلہ جوگی کہنا گرین، ارن سیام اور سیت   آنسو بوند سمیرن لیس درس بھچا ہیت

مطلب- آنکھیں ایک ریاضت کش جوگی ہیں جو سرخ و سیاہ اور سفید دانوں کا مالا پہنے ہوئے اور آنسوؤں کی تسبیح لئے ہوئے دیدار کے بھیک کی طالب ہیں،

ان بزرگوں کے علاوہ اور بہت سے اہل کمال گذرے ہیں جنھوں نے بھاشا زبان کی انشا پردازی اور شاعری میں ناموری حاصل کی، اس مضمون کو لکھنے سے یہ مقصد ہے کہ اگر مسلمان و ہندو بھاشا اور اردو حاصل کرنے سے چونکتے ہیں تو ان کو ذرا پچھلے زمانہ پر بھی نظر ڈالنی چاہیئے، صاحب عقل اور دور اندیش انسان وہی ہے جو بزرگوں کے نیک کارناموں کی تقلید کرے، بھاشا زبان بڑی پیاری اور اسکی شاعری بیحد لطیف و نازک ہے

میرے خیال میں نظم کیواسطے اس سے بڑھ کر ہندوستان میں کوئی زبان نہیں ہوسکتی، اسکے یہاں ہر قسم کے الفاظ کا بڑا ذخیرہ موجود ہے، اور خصوصاً تصوف کے متعلق تو اتنا سرمایہ ہے کہ برسوں ختم نہ ہو، اردو بہت اچھی زبان ہے، لیکن جب کوئی مشکل آپڑتی ہے تو وہ فارسی یا عربی کا منہ تکتی ہے،

(محمد شفیع الدین)

جذبات یاسؔ

(از مرزا واجد حسین صاحب یاسؔ عظیم آبادی)

نہ انتقام کی عادت نہ دل دکھانے کی
بدی بھی کر نہیں آتی مجھے کجا نیکی

یقینِ وعدۂ فردا سے دل ہے مالا مال
نظر میں دولتِ دنیا نہیں سمانے کی

پلٹ کے گل میں نہ آئے گی بوئے مستانہ
نکل کے روحِ رواں منہ نہیں دکھانے کی

ہوا کا دخل نہیں یاں۔ وہاں ہوا کا عمل
قفس کی قسمت بنا ہے کہ آشیانے کی؟

دہائی ہے دلِ درد آشنا دہائی ہے
کہ آہ سر پہ تہمت ہے داغ کھانے کی!

ادھر اجل نے دیا حکم بازگشتِ وطن
ادھر حیا نے قسم دی قدم بڑھانے کی

ابھی سے ختم سفر میں کچھ ایسی دیر نہیں
جو دیر ہے تو فقط تھک کے بیٹھ جانے کی

قریبِ بانگِ جرس کیا عجب کنوئیں میں گر آئے
صلاح ٹھہری ہے اب دل سے بیٹھ جانے کی

ہوس ہے سلسلہ جنبانِ سعیِ لاحاصل
بھری ہے سر میں ہوا قسمت آزمانے کی

نہ جانے کون ہے مدت سے آدمیں اسیر
کہ ہم کو بھی اجازت نہیں ہے جانے کی

سمجھ میں آئی نہ رندانِ شش جہت کی کشش
کہ پاؤں رکھنے کی جا ہے نہ بھاگ جانے کی

جو ڈوبتے کو بچائے وہ آپ بھی ڈوبے
عوض ہے دونوں کا یکساں بدی ہو یا نیکی

(مرزا یاسؔ عظیم آبادی)

کیف و لذت

خوشی اور غم اگرچہ یہ دونوں غیر مرئی چیزیں ہیں۔ پھر بھی ایک قادر فن مصور جب انہیں روشناس خلق کرنا چاہتا ہے۔ تو قرطاس ہستی کے صفحہ پر ان کی حقیقت سے ملتا جلتا کوئی ایسا خاکہ ضرور کھینچ دیتا ہے جسے ارباب بصیرت کی چشم مشاہدہ دیکھے اور اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے۔

لیکن کیف و لذت؟ یہ وہ مستور کیفیات ہیں جن کا مادی اور غیر مادی ظہور تصویر و تشکیل سے قطعاً بے نیاز ہے۔ نہ کسی صورت طراز صناع کے موقلم میں یہ طاقت ہے۔ کہ ان کی شکل و صورت کو عالم مثال میں پیش کر سکے اور نہ ہی جذبات نگار شاعر کی قوت بیان ہی انکی حقیقت مستورہ کی صحیح ترجمانی پر قادر ہے۔

دنیا کے وقائع نگار فردوسی نے حوادث عالم کی آفرینش پر قلم اٹھایا۔ کائنات ہستی کے ذرے ذرے میں زندگی اور خوشی کی روح پھونک دی۔ ہندوستان کے فردوسی میرانیس کے الم نگار قلم نے مصائب کربلا کے غم میں گریہ و زاری کی۔ تمام دنیا کو مغموم و سوگوار رہنا سکھا دیا۔ عالم انسانی کے ایک ایک متنفس کو اس کا ایک ایک مصرعہ یہ تعلیم دیرہا ہے۔ کہ مشیت ایزدی پر صابر و شاکر رہنا ہی شہیدان تسلیم و رضا کی تقلید ایمانی ہے۔

مگر کیف و لذت کی مرقع کشی سے کسی کی استعداد مصوری عہدہ برآ نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ نہ کوئی انداز بیان ان جذبات لطیف کی تشکیل کا متحمل ہے نہ کوئی نظام صوت و آہنگ ہی انہیں اپنے اندر مقید کر سکتا ہے۔ کائنات کی نیرنگیاں سطح زمین پر نسیم بہار کی لالہ کاری و نکہت بیزی اور باد خزاں کی برگ ریزی و خار آفرینی کے دلفریب مناظر پیش کر کے ذوق نظر کو محو تماشا اور مسحور نظارہ کر سکتے ہیں مگر چاہیں کہ فطرت انسانی کے جذبات لطیف کا کوئی دھندلا سا خاکہ یا مرقع بھی کھینچ دیں یہ ناممکن ہے۔ کیونکہ ان جذبات کے حسن مستور کے متعلق فطرت کا یہی تقاضا ہے کہ وہ محض طبائع انسانی کے خیالی و ذہنی پردوں ہی میں محجوب رہے۔ آسمان کے متخیل آبگینے چاند اور سورج کے حسن و صورت کو دکھا کر عقل انسانی کو وقف حیرت بنا سکتے ہیں۔ مگر یہ محال ہے۔ کہ انسان کے عالی و لطیف ولولوں کی آئینہ داری بھی ان کے امکان میں ہو۔

علوم جدیدہ کی تعلیم یافتہ احباب مصر ہیں کہ انگلستان کا مشہور و معروف عالم سر جیمز جواج اقتصائے

مغرب میں علم النفس کا سب سے بڑا ماہر و محقق مانا جاتا ہو۔ یہ رائے رکھتا ہے۔ کہ جذبات انسانی کا کوئی موسوم و معین شعبہ خواہ وہ کسی نوعیت اور کسی معیار پر ہو یہ ناممکن ہے۔ کہ عالم ظہور میں صورت پذیر نہ ہو سکے۔ اور مشاہدۂ نظر سے روپوش رہے اس کا خیال ہے۔ کہ خوشی اور غم کی طرح کیف و لذات کی مستور کیفیات کا اظہار بھی کسی فن و صنعت کا شرمندۂ احسان ہو سکتا ہے، حالانکہ محقق موصوف کا یہ اجتہاد ذاتی فلسفۂ جذبات کے ایک ایسے مسلمہ کلیہ کے خلاف ہے۔ جس کا تجربہ و مشاہدہ ہر ذی نفس آئے دن اپنے وجدان سلیم سے کرتا رہتا ہے۔ ہر عقل صحیح کو اس حقیقت کا اعتراف ہے۔ کہ جذبۂ انسانی جب تک فطرت کے ارتقا و طبیعت کے تغیر کے ماتحت قوت سے فعل و عمل میں آجائے۔ اس وقت تک قوت باصرہ اس کے احساس سے قاصر رہتی ہو اور وہ ادراک انسانی میں آنیکی صلاحیت نہیں رکھتا اور جب کوئی جذبہ قوت سے فعل و عمل میں آجاتا ہے تو اس قلب ماہیت سے اصل حقیقت جذبہ سلامت نہیں رہتی۔ اسلئے فن فلسفہ کے علما و ماہرین اس ماہیت منقلبہ اور ارتقائی کیفیت کو عمل تاثر کہتے ہیں "نفس جذبہ" قرار نہیں دیتے۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ جو جذبہ انسان پر وارد ہوتا ہے وہ عمل تاثر کے درجے تک پہنچکر ذات جذبہ سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اسے اس جذبہ کی صورت عرضیہ اور نقش ثانی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس لئے کہ اصل جذبہ وہی ہو جو اپنی ذات میں مضمر ہو۔ اور احساس غیر کی نگاہ دور اس کی مستور پہنائیوں کی گرد بھی نہ پا سکے! اور جو محسوس حواس ہو جائے وہ درحقیقت ذات جذبہ نہیں بلکہ اس کی صورت عرضیہ اور نقش ثانی ہے۔ مثلاً ایک شخص کے دل میں درد ہے مگر ابھی اس کے جوارح ظاہری درد سے متاثر نہیں ہوئے۔ اس لئے اس کی ظاہری صورت میں کوئی مابہ الامتیاز فرق پیدا نہیں ہوا۔ لیکن باطن درد کی تکلیف سے متاثر ہے۔ جب تک درد خود نفس درد سے ایک درجہ آگے بڑھکر ارتقائی کیفیت حاصل کر کے درد کی صورت عرضیہ اختیار نہ کر لے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ کہ اس شخص کے کہیں درد ہے۔ جب وہی درد بڑھتا ہے اور بمقتضائے بشریت انسان اس کی شدت کی برداشت نہیں کر سکتا۔ جوارح ظاہری پر آثار تاثر نمودار ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص کہہ اٹھتا ہے کہ اس کے کہیں درد ہے۔ لیکن یہ حالت دراصل نفس درد نہیں۔ بلکہ نفس درد وہی تھا۔ جو دیکھنے والوں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔ اب تو درد کا تاثر ہی جو درحقیقت نفس درد کی صورت عرضیہ کے سوا کچھ نہیں۔

یہی حال خوشی و غم۔ تکلیف و راحت۔ غصہ و رحم۔ فکر و تشویش۔ بھوک پیاس اور دیگر جذبات انسانی کا ہے۔ مگر کیف و لذت اس سے مستثنےٰ ہیں۔ کیونکہ تمام جذبات انسانی جہاں انقلاب و ارتقا کے بعد بھی انہیں ناموں سے موسوم ہوتے ہیں جن سے کہ وہ تاثر سے پہلے موسوم تھے۔ وہیں ان کی صورت عرضیہ یعنی حالت تاثر میں یہ قابلیت بھی موجود ہوتی ہے کہ ارباب بصیرت بے تکلف ان کا مشاہدہ کر سکیں اور قیافہ شناس لوگ ان کی علامات ظاہری سے یہ حکم لگا سکیں۔ کہ فلاں کو

جذبہ وارد ہے۔ اگرچہ اس قسم کی تعریف و تسمیہ بھی اجتہادی غلطی ہے۔ مگر چونکہ اصطلاحی قرارداد ہے۔ اس لئے مقولۂ جذبات کے ظاہری تاثر کی خیالی نقاشی میں کامیاب ہو کر غلطی سے سمجھنے لگتا ہے۔ کہ میں نے اصل جذبہ کی تصویر کھینچی حالانکہ وہ تصویر نقش ثانی کی ہوتی ہے

لیکن کیف و لذت کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ ہیں تو یہ بھی جذبات۔ مگر جب تک ان کی اصل حد سلامت ہے۔ اسی وقت تک ان ناموں سے موسوم ہونگے۔ جہاں اس حد سے باہر نکلے اور تاثر کے میدان میں قدم رکھا ان کی ماہیت ہی بدل جاتی ہے اور ساتھ ہی ان کے نام بھی متغیر ہو جاتے ہیں + مثلاً ایک شخص کے دل میں کیف ہے۔ دلسا بکیف و مسرت ہو رہا ہے۔ لیکن وہ کیف ابھی ایسا نہیں۔ کہ اس کا کوئی اثر جوارح ظاہری پر بھی پڑا ہو۔ اس وقت تک وہ کیف ہی ہے۔ اور کیف ہی کہلائے گا۔ لیکن جہاں اس حالت میں ارتقا پیدا ہوا۔ کیف نے ایک قدم اور آگے بڑھا دیا تو پھر کیف محو ہو جاتا ہے۔ اور حالت وارده کو لوگ خوشی یا مسرت کے نام سے موسوم کرتے ہیں +

بخلاف ان کے دیگر جذبات انسانی چونکہ اپنے ستر و شہود اپنے ظاہر و باطن اپنے جوہر و عرض کی ہر حیثیت میں ایک ہی نام سے موسوم ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنی حالت تاثر میں مصور کے موقلم کے ممنون احسان ہو سکتے ہیں۔ گویا ہر جذبۂ انسانی کی تصویر اس وقت کھینچی جا سکتی ہے۔ جب وہ انسان کے جوارح ظاہری پر صادر ہو جائے + مگر کیف و لذت جیسا حس و وجدان سے آگے بڑھکر ظہور تاثر میں آتے ہیں۔ تو ان دونوں لطیف ترین جذبات کا وجود ہی نہیں رہتا۔ بلکہ وہ خوشی و مسرت ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس چیز کا کوئی وجود ہی نہ ہو اس کی تصویر کیونکر کھینچی جا سکتی ہے

لیکن اس بحث سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ جب کوئی جذبہ انسان کے اعضائے ظاہری اور حواس خمسہ پر موثر ہو جائے۔ تو چونکہ وہ اصل جذبہ نہیں ہوتا ۔ اس لئے اسے اصل جذبے سے منسوب کرنا ناجائز ہے نہیں یہ مراد نہیں ہے۔ بلکہ نقش ثانی کو نقش اول سے تعبیر کرنا۔ یا صورت عرضیہ کا نفس جذبہ سے موسوم کرنا اگرچہ اجتہادا اصطلاحی اور نسبت عرفی ہے۔ مگر خلاف قاعدہ نہیں۔ جو لوگ حسیات انسانی اور جذبات طبعی کے عمل فطرت سے کافی واقف ہیں۔ وہ اس راز سے آگاہ ہیں۔ کہ یہ مغالطۂ اصطلاحی اور التباس مجاز خلاف قیاس و عقل نہیں ہے +

قاعدہ ہے۔ کہ جب کوئی چیز اپنے مبلغ علم اور قدرت احساس و ادراک کی حد بلاغ سے روپوش حقیقت ہو قدرت باصرہ کی حد نظر اس کی دوری منزل سے عاجز آ جائے۔ دست کوتاہ کی محدود دسترس کو اس تک رسائی ناممکن ہو۔ پائے خیال کی تیز گامیاں اس کے نقش قدم کی گرد تک نہ چھو سکیں۔ تو فطرت مجبور

کی عادت ہے۔ کہ اس کے لئے کوئی ایسا اسم عرفی تجویز کر دے جو بظاہر اس ہستی مفروضہ کا نتیجہ عملی ہو۔ یا اس کی حقیقت کلیہ کا ہم شکل وہم اثر جزو ہو۔ تاکہ فریقین متکلم کو اپنے مقصود و مطلوب کے بیان میں تعریف و تسمیہ کی دقتیں نہ پیش آئیں۔ اور اس مجاز حرفی سے اصل حقیقت متصور و مفہوم ہو جائے؛

جس طرح آفتاب منازل فلکی پر صعود کرتا ہے۔ مگر دنیا کہتی ہے۔ دن چڑھا۔ سورج ڈھلتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں دن ڈھل گیا۔ حالانکہ دن تو صبح سے شام تک کے عرصۂ مسلسل کا نام ہے۔ یہ سب مدارج ہنگامی اور تقاسمہ وقتی تو سورج کی ذات سے متعلق ہیں نہ دن سے۔ مگر چونکہ دن اسی سورج کی خرام و رفتار۔ ظہور و خفا کا نتیجہ عملی ہے۔ اس لئے مجاز نے اسے جائز کر دیا؛

نہر میں پانی بہتا ہے۔ مگر زبان زد خلائق یہی ہے۔ کہ نہر بہہ رہی ہے۔ حالانکہ ہر عقل سلیم جانتی ہے۔ کہ نہر تو دراصل زمین میں اس کھودے ہوئے گڑھے اور نالی کا نام ہے؛

ایک تشنہ کام محبت۔ ناکام وصل ذوق دیدار کی بے پایاں محرومی سے متاثر ہو کر اپنے محبوب کی تصویر پر لوٹ کے گرتا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے کولی بھر کے گود میں لے لیتا ہے۔ رہ رہ کے چومتا ہے نشہ میں ڈوب ڈوب کر گلے لگاتا ہے۔ اس کی تمنائیں تصویر کے سکوت غیر مادی اور حسن غیر متحرک سے بےچین و مضطرب ہو کر شکوہ سنج خموشی ہوتی ہیں۔ وہ گڑگڑا کر پوچھتا ہے؛ ہائیں! تو چپ کیوں ہے۔ باتیں کیوں نہیں کرتی۔ کیا مجھ سے خفا ہے۔ خدا کے لئے مجھ سے بول۔ مجھے کچھ تسکیں دے۔ مجھے اپنے سینے سے لگا۔ میں گرتا ہوں۔ مجھے سنبھال۔ میری دلدہی کر مجھے دلاسا دے۔ میں بولایا جاتا ہوں۔ مجھے اپنی معنبر زلف کا لخلخہ سنگھا۔ مجھے ہوش میں لا۔ مجھ سے باتیں کر۔ کیا وہ نہیں جانتا۔ کہ یہ اصل محبوب نہیں ہے۔ مگر چونکہ اس کے محبوب کا عکس ہے۔ اس لئے وہ اسے عین محبوب سمجھ لیتا ہے۔ اور اس خیال کو بھی مخل عیش جانتا ہے کہ یہ تصویر ہے؛ ایک مظاہر پرست صوفی باغ و جنگل میں جاتا ہے حسن فطرت کی موسلا دھار بارش اس کو پیش نظر ہوتی ہے صنع قدرت کی نیرنگیاں لون حسن سے اس کی آنکھوں میں چکاچوند ڈال دیتی ہیں۔ وہ پھول پھول کلی کلی میں اپنے لیلائے حسن کو محمل نشیں پاتا ہے۔ کانٹے کانٹے کے آگے دل کے چھالوں جگر کے آبلوں کو پیش کرتا ہے۔ اس کی ادائیں طلب محفوظہ ہوتی ہیں۔ وہ پتّے پتّے کو معرفت حسن حقیقی کا دفتر سمجھتا ہے! اور ان سب کو عظمت محبت سے دیکھتا ہے۔ کیا وہ نہیں جانتا۔ کہ یہ مادی رنگ و بو فانی ہے۔ اور میری تلاش ایک غیر فانی کی عاشق ہے۔ مگر چونکہ یہ سب اسی حسن مطلق کا ظہور ہے اس لئے وہ اسے بھی اسی حقیقت کاملہ کا عکس سمجھتا ہے اس لئے اسکی وہی پرستش کرتا ہے جو موسیٰ نے طور پر ایک برق درخشندہ سے کم پایہ جلوہ کی کی تھی؛

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ؛ ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار ؛ بیدل

ثنا شاہجہانپوری

بادۂ دوشیں

(از میخانۂ نظیری نیشاپوری)

بدستِ طبع عناں دادۂ دریغ از تو بچنگِ صد ہوس افتادۂ دریغ از تو

حریفِ نغمۂ مستاں و صحنِ بستانی نہ مردِ سبحہ و سجادۂ دریغ از تو

ز عیش ہائے صبوحی بدامنِ عصمت چہ داغِ شرم کہ ننہادۂ دریغ از تو

بصید گاہِ حریفاں زبازوئے شوخے چہ تیرِ جور کہ نکشادۂ دریغ از تو

مگر دلالۂ لالے دریں سرابستاں بگفت سوسنِ آزادۂ دریغ از تو

جمالِ موصلیاں خوے کوفیاں داری نہ در دیارِ وفا زادۂ دریغ از تو

بناز کشتۂ و بر مزار کشتۂ خویش تحیتے نہ فرستادۂ دریغ از تو

ز دامِ شرم بیک جرعہ می رہائی دست تنک قوار و تنک بادۂ دریغ از تو

فسون و عشوہ اثر زودہ میکند بدست بہیچ رام نشوی سادۂ دریغ از تو

بمجمعے کہ بہ پروانگی نیرزند ت چو شمع تا سحر استادۂ دریغ از تو

بہر حدیث نظیری عتاب می ورزی
بکینِ اہلِ دل آمادۂ دریغ از تو

نشترِ عشق

(از ابو نعیم عبد الحکیم خان نشتر جالندھری اسسٹنٹ ایڈیٹر "وکیل" امرتسر)

ازل میں ہم نفسِ میرا جنونِ فتنہ ساماں تھا
مفسرِ نکتۂ لا کا خطِ چاکِ گریباں تھا

دمِ نظارہ میں آماجگاہِ تیرِ مژگاں تھا
کبھی آنکھیں تھیں پیکاں میں کبھی آنکھوں میں پیکاں تھا

کھلا رازِ طلسمِ دہر آنکھیں بند ہونے پر
یہ حیرت خیز نظارہ فقط خوابِ پریشاں تھا

ید طولائے وحشت کی یہ سب شیرازہ بندی ہے
ازل سے ورنہ میرا نسخۂ ہستی پریشاں تھا

نگاہِ شوق سے جس وقت مژگاں کا حجاب اٹھا
جہاں آئینہ دارِ شوخیِ دیدارِ جاناں تھا

فلک پر جو نظر آتا ہے خطِ کہکشاں بن کر
ازل میں تیرے دیوانے کا یہ چاکِ گریباں تھا

ہوا روشن یہ شمعِ گور سے پھولوں کی چادر سے
کسی گل پیرہن کا میں چراغِ زیرِ داماں تھا

طلسمِ آب و گل ٹوٹا تو گویا قید سے چھوٹے
ہمارے واسطے بابِ عناصر بابِ زنداں تھا

تماشا تھی مری نیرنگیٔ جوشِ جنوں نشتر
کبھی میں گل بداماں تھا کبھی گلشن بداماں تھا

رشحاتِ جوش

(از جناب شبیر حسن خاں صاحب جوش ملیح آبادی)

اتنا لبریز وفا روح کا پیمانہ ہے
اب تو ہر سانس مری آپ کا افسانہ ہے

ختم ہے عمر نہ ساقی ہے نہ میخانہ ہے
زندگی اب تو چھلکتا ہوا پیمانہ ہے

پنکھڑی کوئی بھی شبنم سے نہیں ہے خالی
ساقیٔ صبح کا ہر پھول میں میخانہ ہے

عقل مدہوش ہے اور روح دکھاتی ہے چراغ
بے خطر راہِ طلب میں ترا دیوانہ ہے

اے خدا دیکھ کہ اب یہ ہے زمانہ کی روش
جو ترے نام پہ مرتا ہے وہ دیوانہ ہے

شومیٔ بخت سے گو جوش وہ اسباب نہیں
پھر بھی خوش ہوں کہ طبیعت تو فقیرانہ ہے

حسیّاتِ اطہر

(ناظم الملک مولانا اطہر ہاپوڑی)

دمِ آخر ہے اب دل آرزو کیوں وصل دلبر کی
اجل آکر بدل دیگی نہ صورت کچھ مقدّر کی

یہ دیکھو بیوفائی ناوک ناز ستمگر کی
نکل کر خانۂ دل سے خبر بھی لی نہ اس گھر کی

نکل کر دل سے حسرت وصل کی پھر آگئی دل میں
خدا کا شکر ہے دولت رہی گھر ہی میں اس گھر کی

انہیں ترک تعلق پر بھی میری یاد ہے اتنی
قسم کھاتے ہیں جب جھوٹی تو کھاتے ہیں مرے سر کی

کبھی پھر چھٹ نہیں سکتی محبت ہو کے جیتے جی
یہ غم ہے عمر بھر کا یہ مصیبت زندگی بھر کی

سوالِ وصل پر کہتی ہے یہ اس بت کی خاموشی
کسی نے بولتے دیکھی بھی ہے تصویر پتھر کی

گلہ شکوہ تو کیسا اب وہاں تاکید ہوتی ہے
شکایت بھی کرے کوئی نہ اب اپنے مقدّر کی

ادائیں آئینہ میں دیکھتے ہیں وہ دم تزئین
کبھی زلفِ معنبر کی کبھی روئے منوّر کی

بجا ہے میکشوں کے حق میں جو کچھ آپ فرمائیں
خبر رہتی ہے واعظ آپ کو اللہ کے گھر کی

ہمیں ہے جلوہ گاہ حشر میں بھی دید کا رونا
شب غم آتی ہے صورت بدل کر صبح محشر کی

یہ ناممکن نہیں زاہد حرم پھر دیر بن جائے
نہ جانے کیا ہو کل - کس کو خبر اللہ کے گھر کی

خدا نے بات رکھ لی ان بتوں کو بے دہن کر کے
خدائی ورنہ یہ منوا کے رہتی سب سے آزر کی

اگر ایمان دے کر لی ہے زاہد تو بھی سستی لی
یہ قیمت کچھ زیادہ تو نہیں ہے ایک ساغر کی

پسند آئے نہ آئے تھوڑی سی چکھ جا زاہد
خبر کیا ہم کو کیسی ہے مزے میں جام کوثر کی

نہ ایک آنسو بھی نکلا ان کی آگے مرگ دشمن پر
حقیقت کھل گئی اطہر ہمارے دیدۂ تر کی

طلب کامل

آنکس کہ ترا بخواست جاں راچہ کند
فرزند و عیال و خانماں راچہ کند

دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی
دیوانۂ تو ہر دو جہاں راچہ کند

نقد و رائے

خدائی انکم ٹیکس - مصوّر فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کا تبحر علمی کسی معرفی کا محتاج نہیں، آپکو بزم ادب میں نہ صرف اس لئے حق صدر نشینی ہے کہ آپ کی ادبی دلفریبیاں اہل نظر اور ارباب بصیرت کیلئے فردوس ذوق ہیں، بلکہ آپ کی ذات اردو کے ان چند برگزیدہ محسنوں اور معاونوں میں سے ہے جو اپنے مخصوص انداز تحریر کی بنا پر ایک اسٹائل کے موجد کہے جانے کے مستحق ہیں اور جن کی روش انشا دور حاضر کی اہل قلم جماعت کے لئے قابل تقلید سمجھی جاتی ہے،

یہ کتاب آپکی تازہ ترمیم اور نو اشاعت تصنیف ہے، اس کا موضوع فرائض اسلام کا چوتھا رکن ذکواۃ ہے جس سے باوجود تیرہ سو سال کے مسلسل تعلیم اسلام ہونے کے بھی ابھی تک بعض حصص ملکی کے مسلمان نابلد ہیں میں نے خود اپنے قیام بمبئی میں مسلمانوں کے ایک ممتاز اور تعلیم یافتہ گروہ کے بعض ممبروں سے اس موضوع کی قطعی لا علمی پر گھنٹوں تعجب کیا ہے، اس لئے خواجہ صاحب کا یہ حسن عمل قوم کے لئے نہایت مناسب وقت اور قابل احترام احسان ہے کتاب میں متعلقات زکواۃ کے بیان کیلئے چند مفید مباحث ہیں اور ہر بحث نصوص قرآنی اور احادیث نبوی سے مدلل، فلسفہ زکواۃ کی بسیط تفصیل کے ساتھ مصارف زکواۃ کی تعلیم و ہدائت میں نہایت مدد دیتی ہے پھر زبان نہایت سلیس عام فہم، طرز بیان دلچسپ، غرض کتاب محاسن معنوی سے معمور ہونے کے ساتھ حسن صوری میں بھی دلفریب اور دیدہ زیب ہے لکھائی چھپائی نفیس کاغذ عمدہ 22×18 سائز ہے خواجہ بک ڈپو سے ملتی ہے، دس آنے قیمت ہے، ہم اپنی قوم کے ہر ممبر کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ اس کتاب سے سبق آموز اور ثواب اندوز ہو کر عند اللہ ماجور ہو،

سمرنا میں یونانی مظالم، اس کتاب کا تعلق موضوعی چونکہ سیاست ہے اور مخزن ایک ادبی رسالہ ہے اسلئے ہم اس مبحث پر کچھ زیادہ لکھنے سے معذور ہیں مگر ہاں یہ ضرور ہے، کہ مئی ۱۹ سے لیکر جولائی ۱۹ تک یونانیوں کے دست تطاول سے مسلمانان سمرنا پر جو شدائد پیش آئے ہیں، یہ کتاب ان مظالم کی مفصل روداد ہے، پہلے اس کی مدونی لاسینی (سوئٹزرلینڈ) کی انجمن عثمانی دار الاشاعت نے کی تھی، اب دہلی کی نوجوان جماعت کے ہونہار اہل قلم مولانا ابو الاعلی مودودی نے اس کا نہایت کامیاب ترجمہ کیا ہے، جو اسلام کی حرمت پر مرمٹنے والوں کی داستان مظلومی کی صحیح معلومات

کا بہترین ذریعہ ہے، ۱۸×۲۲/۸ سائز ہے، لکھائی چھپائی عمدہ۔ مگر کاغذ معمولی دار الاشاعت سیاسیات مشرقیہ سبزی منڈی دہلی سے ملسکتی ہے، عام قیمت عہ۔ مگر خلافت کمیٹیوں کے لئے قیمت رعایتی ۱۲ ار

عطر دیوان حافظ ۔ یہ مجموعہ بلبل شیراز حافظ کے مقبول خاص و عام دیوان کا بہترین انتخاب ہے مگر چونکہ حافظ کا دیوان انتخاب اور خلاصہ سے مستغنی ہے، کیونکہ وہ خود تمامہ و کمالہ شروع سے آخر تک ایک قابل وقعت انتخاب ہونے کی حیثیت رکھتا ہے، اس لئے مولانا ابو الحسن صاحب صدیقی بدایونی کی یہ جانفشانی اس معنے کر بہت زیادہ مستحق ستائش ہونے میں اہمیت نہیں رکھتی، البتہ اشعار منتخب کے دیکھنے سے مولانا کے مذاق کی صحت اور سلامتی پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو حافظ کے کلام کے ساتھ بدرجۂ اتم شغف محبت ہے، یہ کتاب چھوٹے سائز میں ہے عہ میں فرشوری محلہ بدایوں سے مل سکتی ہے،

عید مبارک کے روغنی رنگین فینسی کارڈ

ہمارے یہاں اس سال عید کارڈ نہایت اعلےٰ خوبصورت اور ہر رنگ کے طبع ہوئے ہیں اس سے قبل آپنے ایسے لاجواب کارڈ ہرگز نہ ملاحظہ کئے ہونگے، ایک درجن نفیس ڈیزائن جس میں مکہ اور مدینہ اور دیگر اسلامی متبرک مقامات و بہترین سینری کے فوٹو میں چالیس قسم کے اشعار رباعیاں عید کے متعلق درج ہیں ایسے کارڈ سوائے ہمارے دوسری جگہ سے نہ ملینگے، زیادہ تعریف فضول ہے بوقت ملاحظہ اگر پسند نہ ہوں تو فوراً ہی واپس کر کے دام وصول کر لیں، محصولڈاک رجسٹری وغیرہ بذمہ خریدار ہوگا،

عید کارڈ رنگین روغنی فی درجن ۷ سینکڑہ ؏ ۱۲ ار

عید کاغذ معہ لفافہ کلاں فی ۳ درجن عہ سینکڑہ ۵ ۱۳

عید چک اسلامی بنک ۸ ار عہ

عید کارڈ بشکل کرسمس ۸ ار عہ

عید کاغذ معہ لفافہ خورد ۲ ۱۲ ار صہ

نو کارڈ نہایت خوبصورت ۲ ار عہ

اسکے علاوہ ہر ایک قسم کی کتابیں بھی ہمارے یہاں سے ملسکتی ہیں اپنا پتہ بھیجکر عکسی پھولوں کے گلدستہ مفت طلب کریں،

ملنے کا پتہ:- **مینیجر میوچول ٹریڈنگ ایجنسی موچی دروازہ لاہور**

فہرست مضامین "مخزن" ماہ جولائی ۱۹۲۱ء

سبد گل

گناہ کی رات ۔ جناب حکیم احمد شجاع صاحب ادب عالیہ کی اس صنف سے جو ڈراما سے متعلق ہے۔ ذوق وافی اور درخور کافی رکھتے ہیں۔ چونکہ جذبات انسانی کی مصوری کسی قابل ڈرامٹسٹ سے بہتر کوئی نہیں کرسکتا اور ادب لطیف کی صنف فسانہ میں جذبات طرازی سب سے بڑا کمال ہے۔ اس لئے ہماری استدعا پر حکیم صاحب نے یہ لطیف فسانہ سپرد قلم فرمایا ہے۔

اس مضمون کی ادبی دلفریبیوں سے قطع نظر کرکے سب سے زیادہ قابل داد یہ امر ہے کہ فسانہ اپنی ادبی لطافتوں اور جذبات کی دلآویزیوں کے باوجود اپنے اندر ایک اخلاقی مقصد رکھتا ہے۔ حکیم صاحب کے کمال فن کا ثبوت مضمون کے آخری صفحہ میں ملتا ہے جس کی طرف ہم مصلحتاً تقریب میں اشارہ کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔ ہم اپنے مایہ ناز ادیب کی خدمت میں ہدیہ سپاس منت پیش کرتے ہیں اور سلسلۂ عواطف کے جاری رکھنے کی توقع رکھتے ہیں۔

انداز بیان ضرورت سے زائد انگریزی معلوم ہوتا ہے جس کی وجہ سے بعض مقامات پر زبان کسی قدر اجنبی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ فرعی باتیں ہیں اصل مقصد تو خیال کی لطافت اور ادب کی سلیم المذاقی ہے۔

وارفتگی جذبات سید احمد شاہ صاحب بخاری بی۔اے ملک کے ان غیر معمولی نوجوانوں میں سے ہیں جن سے ملک کی آیندہ امیدیں وابستہ ہیں۔ آپ انگریزی کے اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز ہیں بعض اینگلو انڈین جرائد و صحائف تک آپ کے دلکش انداز تحریر کے نہ صرف معترف ہیں بلکہ مداح ہیں۔

آپ "کہکشاں" کے اجرا سے اردو میں بھی مضامین لکھنے لگے ہیں۔ آپ کے چھوٹے چھوٹے فقرے اگرچہ کیف مغرب سے مسرور نظر آتے ہیں مگر فی الحقیقت ان کی جدت اور بے تکلفی نے انداز بیان کو بہت قابل تعریف کر دیا ہے۔ آپکو فطرت انسانی کے غوامض پر بھی بہت عبور معلوم ہوتا ہے۔ یہ مضمون آپ کے ایک خط کا اقتباس ہے۔

حالی کی کہانی حالی کی زبانی اگرچہ محترمی مکرمی جناب شیخ عبد القادر صاحب نے اس دفعہ خاص اپنے رشحات قلم سے بہرہ اندوز سعادت نہیں فرمایا لیکن اس کی تلافی کر دی ہے۔ یعنی شمس العلما مولانا حالی طاب اللہ ثراہ کے وہ حالات زندگی بہم پہنچائے ہیں جو خود مولانا مرحوم نے قلمبند فرمائے تھے۔ موجودہ زمانے میں شمس العلما مولانا حالی مرحوم کی چند غیر مطبوعہ سطریں بھی مل جائیں تو اردو کے قدردان انھیں آنکھوں سے لگاتے ہیں چہ جائیکہ ایک ایسا مضمون ہاتھ آجائے جو اردو کی ادبی تاریخ میں بھی ایک معتبر و مستند حیثیت رکھے۔ اور مولانا کے صحیح ترین حالات بہم پہنچائے۔ ہمیں امید ہے کہ قارئین کرام اس مضمون کو بہت شوق سے پڑھیں گے ٭

کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ

شذرات

ناچیز "مخزن" کی حوصلہ افزائی

ادیب بے ہمتا خان بہادر میر ناصر علی مدیر "صلائے عام" کا گرامی نامہ

جناب من! مخزن کے دو پرچے مجھے پہنچے۔ ان کا شکریہ عرض ہے۔ رسالوں کے نکل کر بند ہو جانے سے میں ایسا ڈرا ہوا ہوں کہ جس طرح ماں جس کے بچے یکے بعد دیگرے زمین کے پیوند ہو چکے ہوں۔ تو جو بچہ ذرا چلتا پھرتا نظر آئے اس کو نظر بھر کر نہیں دیکھتی کہ کہیں میری ہی نظر نہ لگ جائے میں بھی "مخزن" کے دوبارہ جاری ہونے پر مبارکباد دیتے ڈرتا ہوں میں ڈرا ہوا اس وجہ سے ہوں کہ مجھ سے "صلائے عام" جب سے چھٹا پھر نظر نہ آیا ہزار تدبیر کرتا ہوں۔ میری عمر رفتہ کی طرح ساری تدبیریں بیکار جاتی ہیں۔ بہر حال میں خوش ہوں کہ "مخزن" پھر نکلا۔ مجھے زیادہ خوشی اس وجہ سے ہوئی کہ آج کل خالص اردو لٹریچر کو لوگ ترس رہے تھے "مخزن" سے کچھ نہ کچھ آنسو پچھیں گے۔ اس کو دیکھ کر "صلائے عام" بھی شاید کروٹ لے لیکن جیسا آپ نے لکھا کہ مضمون نگاروں کی شکایت ہے "صلائے عام" کو بھی اس کا رونا ہے لیکن یہ رونا آپ کی محنت کی داد کے لئے حجاب نہ ہونا چاہئے گو افراط اشک مانع نظارہ ہوتی دیکھی گئی۔

مضامین نثر کی داد اس وقت میرے لئے مشکل ہے کہ فرصت اور طبیعت دونوں کی شکایت ہے۔ رباعیات "عمر خیام" اور "بھاشا" کے مضامین میں معلومات و تحقیق کوٹ کوٹ کر بھری ہے خیالی مضامین بھی اپنی اپنی وضع پر بہت اچھے ہیں نظم سے جی بہت خوش ہوا حضرت یاس عظیم آبادی کی غزل نہایت پاکیزہ ہے کیا خوب فرماتے ہیں:

نہ انتقام کی عادت نہ دل دکھانے کی — بدی بھی کر نہیں آتی مجھے نہ نیکی کی

ہوا کا دخل نہیں یاں۔ وہاں ہوا کا عمل — قفس کی سمت بنا ہو کہ آشیانے کی

دہائی ہے دل درد آشنا۔ دہائی ہے — کہ آہ سرد[۱] پہ تہمت ہے دل دکھانے کی

اب اپنے ختم سفر میں کچھ ایسی دیر نہیں — جو دیر ہے تو فقط تھک کے بیٹھ جانے کی

جو ڈوبتی کو بچائے وہ آپ بھی ڈوبے — عوض ہر دونوں کا یکساں بدی ہو یا نیکی

[۱] ٹھنڈی ہوا کیا خاک دل دکھائے گی۔

حضرت ممتاز علی آہ کا کلام بہت پاکیزہ ہے ؎

بال کھولے وہ قبر پر آیا	اس محبت میں کب اثر آیا
کیا الٹ پھیر اس نگاہ میں ہے	زخم کھاتے ہی زخم بھر آیا

حضرت جوش کی غزل کا کیا کہنا ؎

اتنا لبریز وفا روح کا پیمانہ ہے	اب تو ہر سانس مری آپ کا افسانہ ہے
ختم ہے عمر نہ ساقی ہے نہ میخانہ ہے	زندگی اب تو چھلکتا ہوا پیمانہ ہے
پنکھڑی کوئی بھی شبنم سے نہیں ہے خالی	ساقی صبح کا ہر پھول میں میخانہ ہے

اے خدا دیکھ کہ اب یہ ہے زمانہ کی روش
جو ترے نام پہ مرتا ہے وہ دیوانہ ہے

ہفتہ وار اخبار "زمیندار" کی رائے میں غالب کے یہ شعر گو پہلے دیکھے تھے مگر پھر سن کر بڑا لطف آیا کہ بے اختیار دیر تک زبان پر جاری رہے - یہ زبان میسر نہیں ؎

او بہ فکر کشتن من بود آہ از من کہ من	لاابالی خواندمش نامہربان نامیدمش
برامید شیوۂ صبر آزمائے زیستم	تو بریدی از من و من امتحان نامیدمش

از پاٹودی ضلع گورگانوں - پنجاب نیازمند **ناصر علی**

قارئین کرام سے چند باتیں!

(۱) جن حضرات کا چندہ اس دور جدید کے چندہ میں منہا کرنے کے بعد ختم ہو چکا ہے انکو آیندہ پرچہ وی پی کیا جائیگا

(۲) قارئین مخزن خط و کتابت کرتے ہوئے اپنے نمبر خریداری سے ضرور مطلع کیا کریں تاکہ دفتر میں تلاش کی دقت پیش نہ آئے بعض اوقات اکثر خطوط کی تعمیل محض اس وجہ نہیں ہو سکتی کہ خریداری کا نمبر نہیں ہوتا

(۳) اکثر حضرات نمونہ منگانے پر مصر ہوا کرتے ہیں انھیں مطلع کیا جاتا ہے کہ نمونہ کا پرچہ مفت ارسال نہیں کیا جا سکتا اور ایک پرچہ کی قیمت کا وی پی کیا جائے گا اس لئے انھیں چاہیے کہ ۶/ کے ٹکٹ ملفوف بھیج دیا کریں -

(۴) حضرات مضامین نگار سے با ادب گذارش ہے کہ مضامین لکھتے وقت ان باتوں کو قطعی ملحوظ خاطر رکھیں (۱) مضمون نہایت خوشخط اور صاف لکھا ہوا ہو (۲) بین السطور کافی چھوڑا جائے (۳) کاغذ کے صرف ایک طرف لکھا جائے - اگر ان معروضات پر عمل کیا گیا تو ہماری بہت سی دقتیں رفع ہو جائیں گی +

(منیجر)

گناہ کی رات

ممتاز اپنے دفتر کے خوبصورت اور آراستہ کمرے میں ایک نرم نازک اور نیچے صوفے پر بیٹھا تھا اس کا دایاں ہاتھ جس میں ایک جلتا ہوا سگریٹ تھا صوفے کے دائیں بازو کی بلندی پر سہارا لئے ہوئے تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ جس کی درمیانی انگلی میں ایک ہیرے کی بیش قیمت انگوٹھی درخشاں تھی۔ بار باراس کی پیشانی سے اوپر کی طرف حرکت کرتا اور رہ رہ کے اس کے لمبے اور گھنے بالوں میں چھپ جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں سامنے کی دیوار میں گڑی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دیوار میں کوئی مقناطیسی کشش ہے جو اس کی نگاہ کو ہٹنے نہیں دیتی۔ اس کا جسم بظاہر آرام و اطمینان کے مزے لے رہا تھا۔ مگر اس کا دماغ ایک مسلسل۔ ایک مرتعش ایک متحرک خیال کے ساتھ ساتھ بے قرار تھا۔

وہ شریف تھا۔ ذہین تھا۔ عقلمند تھا۔ مگر اس وقت وہ اس رات کی یاد میں محو تھا جس رات کو اس کی شرافت ایک مرگ ناگہاں کا شکار ہو گئی تھی۔ جس رات اس کا ذہن ایک خاص نقطۂ خیال کے اردگرد گھومنے کے سوا۔ اور ہر ادراک سے قاصر ہو گیا تھا جس رات اس کی عقل خلاف معمول اس بات کے حق میں رائے دے رہی تھی جس کو وہ اس رات سے پہلے نامناسب۔ مکروہ اور ناجائز خیال کرتا تھا۔

آہ! وہ رات تھی یا دنیا بھر کے جادو طلسموں کا ایک زندہ مظاہرہ جس کی ایک ایک ساعت کے ایک ایک غیر ممکن التقسیم حصے کے ساتھ اس کی امید۔ اس کی حسرت۔ اس کی خوشی کی یاد وابستہ تھی۔ اس نے اس رات اپنی عمر بھر میں پہلی مرتبہ موسیقی کو ایک زندہ عورت کی شکل میں تبدیل ہوتی دیکھا تھا جس کے نغمے کی ہر اٹھتی ہوئی لے ہوا کے ذرّوں کو حسین بنا رہی تھی۔ اس نے اس رات ایک عورت کے پاؤں کی حرکت کو ایک شعر کی کیفیت اختیار کرتے دیکھا تھا جس سے بے جان زمین میں جان پیدا

ہو گئی تھی ۔

وہ رات ممتاز کے لئے ایک عجیب رات تھی ۔ اس رات جو کچھ اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا ۔ اس کا ذہن نہ سمجھ سکتا تھا ۔ جو کچھ اس کا ذہن محسوس کر رہا تھا اس کی آنکھیں نہ دیکھ سکتی تھیں ۔ ایک عورت ۔ ایک بے باک کیفیت بے حجابی میں انسانی جذبات سے کھیل رہی تھی ۔ اس کی نگاہیں ۔ دلوں میں امیدیں پیدا کر کر کے ان کو ایک خشمگیں دیوی کی طرح پامال کر رہی تھیں ۔ اسی رات کو اس نے دیکھا کہ پارساؤں کی پارسائی عقلمندوں کی عقل ۔ ایک عورت کے ناز و انداز کی قربان گاہ پر مجروح ہو گئی اسی رات کو اس نے مرد کی کمزوری عورت کی طاقت ضمیر کی بزدلی اور اخلاق کی شکست کا مشاہدہ کیا

یہ رات گو دنیا کے لئے وقت کی غیر محدود مسافت میں اپنی معمولی منزل طے کر کے ختم ہو گئی مگر ممتاز کے لئے یہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والی رات تھی ۔ اس وقت بھی وہ اس رات کو اپنے دماغ میں اپنی آنکھوں میں محسوس کر رہا تھا ۔ اس کی زندگی کا دورہ واں اسی رات تک چل کر رک جاتا تھا ۔ اس کی یاد ۔ اس رات کے سوا اور تمام واقعات کو فراموش کر چکی تھی ۔

اس رات کو گذرے ایک مہینہ ہو چکا تھا ۔ اس ایک مہینے میں اس نے دن رات کی ان تھک کوششوں ۔ دولت کے اندھا دھند صرف اور اپنے ہمدردوں کے دماغ کی لگاتار کاوشوں سے اس خوبصورت رقاصہ کے گھر تک رسائی حاصل کی ۔ آہ جس گھر کے دروازے ہر دوسرے شخص کے لئے دن رات کھلے رہتے تھے ۔ ایک پُر فن دماغ کی عیاری سے ممتاز کے لئے بند ہو گئے تھے جس نے عشق کی چنگاری کو ایک روح سوز شعلے میں مشتعل کرنے کے لئے اپنا پرانا مجرب اور کامیاب نسخہ استعمال کیا تھا ۔ ہر کوشش کی ناکامیابی ۔ ہر امید کی ناکامی نے ممتاز کو پہلے سے زیادہ شائق کر دیا ۔ آخر کار اس وقت جب زندگی اور موت صرف ایک اقرار یا انکار پر منحصر تھی عقل اور جنون صرف ایک ہاں اور نا کے درمیان پناہ ڈھونڈھ رہا تھا ۔ اس کی فریاد سنی گئی ۔ اس کی کوششیں بارہ ور ہوئیں ۔ ہاں اس نے اس وقت دولت کی طاقت کو محسوس کیا ۔ اور خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اس قدر دولتمند تھا ۔

اس کے بعد اس کی کھوئی ہوئی صحت دوبارہ عود کر آئی۔ اس کو دنیا پھر ہنستی ہوئی نظر آئی۔ اسکو زندگی پھر جینے کے قابل معلوم ہوئی۔ اس کا سارا کاروبار ایک مسلسل بے توجہی سے بگڑ گیا۔ اس کے بوڑھے باپ۔ اس کی پیار کرنے والی بیوی۔ اس کی معصوم بہن کے دل کا آرام اجڑ گیا۔ اس کا وقت زیادہ تر اپنے دفتر کے کمرے میں گذرتا تھا جو اس کے گھر سے دور ایک پُر فضا مقام پر واقع تھا۔ وہ جب کبھی گھر جاتا تھا۔ تو اس طرح جیسے کوئی اجنبی زیادہ سے زیادہ ایک عارضی مہمان کی حیثیت سے کسی غیر کے مکان پر گھڑی دو گھڑی وقت گذارنے کے لئے جاتا ہے۔ اس کے ضعیف باپ پر فالج گرا۔ وہ ایک دفعہ اس کو دیکھنے کے لئے گیا۔ مگر جب اس نے ایک نقاہت۔ آزردگی اور افسردگی سے بھری ہوئی آواز کو اس رقاصہ کے خلاف نصیحت کرتے ہوئے سنا جو اب اس کی انتہائی حسرتوں کا آخری مقصد تھی تو وہ بیزار ہو گیا اور فوراً دفتر کو چل دیا اور پھر واپس نہ گیا۔ جب ایک پرانے ملازم نے جس نے ممتاز کو گود میں کھلایا تھا۔ اس کے کانوں تک ڈرتے ڈرتے یہ اطلاع پہنچائی کہ اس کی بیوی دن رات رو رو کر اپنے حسن۔ اپنی جوانی۔ اپنی زندگی کو ایک قبل از وقت موت۔ کی آغوش میں سپرد کر رہی ہے۔ تو اس نے ایک تمسخر آمیز تمسخر سے قہقہہ لگایا اور اپنی آزادی کو ایسی کمزور زنجیروں میں پابستہ نہ پاکر بڑی مسرت۔ بڑی طمانیت کا اظہار کیا۔

ممتاز نے سگریٹ کو ایک آخری کش لے کر پھینک دیا اور بائیں ہاتھ سے ایک تپائی پر سے جو صوفے کے قریب بائیں طرف رکھی تھی۔ ایک گلاس اٹھایا۔ اس میں زعفرانی رنگ کی شراب برف اور سوڈے کے پُر جوش بخارات سے دست و گریبان ہو رہی تھی۔ اس نے اس گلاس کو کسی مدت کے پیاسے کی نگاہوں سے دیکھا اور پھر بغیر رُکے۔ بغیر سوچے سمجھے منہ میں الٹا اور حلق سے اتار دیا۔ گویا وہ اتنا بے خبر تھا کہ کام و زبان کی وساطت کو بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ خدا جانے اس آب آتشین نے اس کے اندرونی نظام پر کیا اثر کیا کہ اس کی پیاس بجھنے کی جگہ بھڑکی اور اس نے پے در پے گلاس کو بھرنا اور اسی طرح خالی کرنا شروع کر دیا۔

اب میز پر ایک خالی بوتل نظر آ رہی تھی اور ایک بھرا ہوا گلاس جو اس بوتل کا آخری سرمایہ تھا

اس کے ہاتھ میں تھا۔ مگر اب اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کا چہرہ سرخ تھا۔ اس کی آنکھ کے سُرخ ڈورے آگ کی روشن تحریریں بن کر پتلیوں کی سطح سے اُبھرے اُبھرے دکھائی دیتے تھے۔ اس کی سانس میں ایک غیر معمولی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ بے شمار جلے ہوئے سگرٹوں کا ایک انبار اس کے خاکستردان میں جمع ہو گیا تھا۔ وہ اٹھا اور اس نے بجلی کے پنکھے کی کارگذاری سے غیر مطمئن ہو کر اس کی کل کے کان مروڑے جس سے اس کی رفتار میں اور زیادہ تیزی پیدا ہو گئی وہ اٹھنے کو تو اٹھ چکا تھا مگر اس کے پاؤں کی لغزش اس کی عصبی کمزوری کا پتہ دے رہی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر رکھی ہوئی کرسیوں۔ تپائیوں اور الماریوں کا سہارا لے کر اپنی نشست تک پہنچنے کے لئے چلا۔ مگر پیشتر اس کے کہ وہ اس جگہ تک پہنچے اس کی آنکھ ایک قد آدم آئینہ پر رُکی جو اس کمرے کے آتشدان کی دیوار کے ساتھ آویزاں تھا۔

اس نے ذرا بڑھ کر اپنے آپ کو اس آئینہ میں دیکھنا شروع کیا۔ اس نے اپنے آپ کو پہچاننے میں ضرورت سے ذرا زیادہ دیر لگائی۔ وہ سنبھل کر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی جدوجہد اپنی آنکھوں کو آئینہ کی شفاف سطح کے کسی ایک مرکز پر جمانے کی سعی میں سرگرم تھی۔ وہ اپنے دماغ کو آئینہ میں اپنے عکس کی موجودگی کا یقین دلانے پر اصرار کر رہا تھا۔ پھر جب اس نے اپنے آپ کو پہچان لیا تو اس کے چہرے پر ایک مغرور فاتح کی سی۔ ایک حسین عورت کی سی طمانیت بخش مسرت ظاہر ہوئی۔ آج اس نے اپنے لباس کے مختلف اجزا کو ایک پورا دن صرف کر کے منتخب کیا تھا۔ اور اس وقت اپنے جسم کے تناسب پر اس دن بھر کی محنت کو بارور ہوتے دیکھ کر وہ بہت مسرور ہوا۔ پھر کچھ سوچ کر اپنی گردن پھرائی اور شراب کی خالی بوتل کو دیکھا۔ پھر آئینہ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اس چیز کو جس سے بوتل خالی ہو چکی تھی اپنی آنکھوں کے عکس کی گہرائی میں تلاش کر رہا تھا۔ اس گم گشتہ سیلاب آتشیں کو اپنی آنکھوں میں ایک زندہ کیفیت میں موجزن پا کر اس نے اطمینان۔ امید۔ زندگی کی ایک سانس لی اور پھر اپنی حرکت کو اپنی نشست کی طرف جاری رکھتے ہوئے معمول سے زیادہ زور سے اپنے ملازم کو آواز دی۔

ملازم بڑی تیزی سے کمرے میں داخل ہوا اور ابھی اس نے مشکل سے "جی سرکار" کہا ہی تھا کہ ممتاز

نے اس کو موٹر تیار کرنے کے لیے حکم دیا۔ ابھی ملازم نے بیٹھ ہی پھرائی تھی کہ اس پر جلدی بہت جلدی کا تحکمانہ تازیانہ پڑا جس کام کے لیے وہ آج صبح سے تیاریاں کر رہا تھا۔ اس کو تکمیل تک پہنچانے کا وقت آ پہنچا تھا۔ اس کے سامنے گوشۂ رائی پر رکھا ہوا کلاک آٹھ بجا رہا تھا اور اب وہ ذرا سی دیر کا تحمل نہ ہو سکتا تھا۔ آہ یہ وقت۔ یہ رات۔ اسے کتنی محنتوں کتنی کاوشوں کتنی حسرتوں کے بعد میسر آئی تھی۔ اس نے اس رات کو اپنے موعودہ وقت سے پہلے لانے کے لیے کتنی پُر اضطراب۔ پُر آرزو۔ اور پُر آلام کوششیں کی تھیں آج کے سورج کو اپنے ہی دوران حیات میں ڈوبتے ہوئے دیکھنے کا شوق اس کی زندگی کے کتنے دنوں کو تاریک سے تاریک رات سے زیادہ تاریک بنا چکا تھا۔

یہ وہی رات تھی جس کی آرزو کی خاکستر میں ہزاروں عشاق دفن ہو گئے۔ یہ وہی رات تھی جس کے حصول کی تمنا عشق کی تربیت کا موجب ہوتی ہے۔ یہ وہی رات تھی جس کا شوق کڑی سے کڑی منزل کو آن واحد میں طے اور مشکل سے مشکل مہم کو ایک اشارے میں سر کرا دیتا ہے۔ یہ وہی رات تھی جس کی امید زندگی کی تلخیوں کو شیریں۔ درد ہجر کی مصیبتوں کو خوبصورت شوق کی ناکامیوں کو خوشگوار بنا دیتی ہے۔ یہ وہی رات تھی جو خداوندی قانون کی پابندیوں کے ساتھ۔ قدرت کا بہترین تحفہ۔ ایک عورت اور مرد کی محبت کا خوشترین ثمر۔ ارتباط جسمانی کا اعلیٰ ترین معراج ہے۔ یہ وہی رات تھی جو حکم جواز کے بغیر شیطان کا سب سے مہیب آلہ۔ اخلاقی ذلت کی سب سے اسفل گہرائی۔ عورت اور مرد کی کمزوری کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

آج ممتاز اپنی محبت کے زندہ اور متحرک بت کو اپنے پہلو میں محسوس کرنے۔ اپنے شوق کے پیکر بے قرار کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اس جذبے کو تکمیل تک پہنچانے جا رہا تھا جس نے اس کی نظر میں دنیا کے سب سے بڑے گناہ کو ایک ثواب۔ سب سے بڑی برائی کو ایک نیکی۔ سب سے بڑی اخلاقی کمزوری کو ایک اخلاقی جرأت کر دکھایا تھا۔

وہ موٹر کے انتظار میں اپنے مخملی دیوان پر جس کو اس نے ترکی وضع کی تقلید میں اپنے کمرے کی سب سے حسین زینت بنا رکھا تھا لیٹ گیا۔ اب وہ اس بڑی کشمکش سے پہلے جس کا اس کو انتظار تھا اور اس بڑی کشمکش کے بعد جس سے وہ تھک گیا تھا۔ ذرا آرام کرنا چاہتا تھا۔ یہ چند لمحوں کی فرصت غنیمت تھی۔ اس نے

اپنے پاؤں سامنے کی کرسی پر رکھ کے اپنے سر کو ایک نرم اور سبز دار مخمل کے گاؤ تکیے کا سہارا دیا۔ رونے کے بعد بچہ بہت جلد سو جاتا ہے۔ جسمانی درد کے بعد دماغ بہت جلد تسکین پاتا ہے۔ طوفان کے بعد سمندر کی سطح پر غیر معمولی سکون نظر آتا ہے۔ اس کا دماغ بہت سی تکلیفوں سے تھک چکا تھا۔ اس کا جسم آج دن بھر کی محنت سے تنگ آ چکا تھا۔ اس کے اعصاب شراب کے جوش اور جدت سے اپنی انتہائی کشاکش کر چکے تھے اس لئے اس وقت یہ دیوان معمول سے زیادہ آرام دہ۔ یہ گاؤ تکیہ ضرورت سے زیادہ نرم۔ یہ چند لمحے بہت سے دنوں سے زیادہ کارآمد محسوس کئے۔ وہ اپنی آنکھیں بند کر کے دل ہی دل میں دیوان۔ گاؤ تکیہ اور مخمل کے ایجاد کرنے والے دماغوں کی ذہانت کی تعریف کر رہا تھا۔ اس ملازم کی سستی کو جسے موٹر تیار کرنے کے لئے حکم دیا گیا تھا کچھ زیادہ معیوب نہ سمجھنے کے لئے بہانے سوچ رہا تھا۔

اتنے میں اس نے ملازم کو دروازے سے داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اور اس کے کانوں نے "سرکار موٹر تیار ہے" کی آواز سنی۔ وہ جلدی سے اٹھا اور دروازے سے باہر نکل کر موٹر پر سوار ہو گیا۔ اس وقت اس کی عجیب حالت تھی۔ اس نے محسوس تک نہ کیا کہ اس کے سر پر ٹوپی اور ہاتھ میں لکڑی ہے یا نہیں۔ یہ ایک خلاف معمول بات تھی۔ کیونکہ آج تک ان دو چیزوں کے بغیر وہ کبھی گھر سے باہر نہ نکلا تھا۔ اس کو اس امر کا احساس ضرور ہوا کہ شاید آج وہ ملازم کو اپنے سامنے سے ہٹانے یا بند دروازے کو کھولنے کے بغیر ان میں سے گذر گیا آج ہر ایک چیز نے کچھ ایسی شفاف۔ آبی بخارات کی سی لطیف کیفیت اختیار کر لی تھی۔

موٹر منزل مقصود پر پہنچ گیا۔ مگر آج خدا جانے کیا بات تھی کہ وقت اور فاصلہ اپنے فطری خواص کے استعمال سے عاجز تھا۔ وہ یہ نہ جان سکا کہ وہ کب چلا اور کب پہنچا۔ یا یہ راستہ کیسے طے ہوا۔ اس کو موٹر پر بیٹھنے اور پھر موٹر سے اترنے کے سوا۔ اور کچھ یاد نہ رہا۔ کیا ان دونوں حرکتوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہ تھا کچھ وقت صرف نہ ہوا تھا۔ یا اس کا دماغ اس وقت فاصلہ اور وقت کی سی کثیف اور مادی اشیاء کے نقوش کو اخذ کرنے سے قاصر تھا۔

وہ موٹر سے اترا۔ اور ایک بہت سی روشنیوں سے روشن بازار میں تھوڑی دور چل کر ایک خوبصورت بلند اور وسیع مکان کے دروازے پر رکا۔ وہ دروازے کے اندر پاؤں رکھنے ہی کو تھا کہ کسی آواز نے جو

اس کے دماغ سے یا دل سے یا جسم کے ہر روئیں روئیں سے نکلی۔ اس کے متحرک جسم کو ایک لمحہ کے لئے ساکن کر دیا۔ انسان کی فطری نیکی نے اپنی موت سے پہلے زندگی کے لئے آخری کشمکش کی۔ اخلاق نے اپنے وقار کی حفاظت کے لئے آخری تدبیر کی۔ حواس نے اپنی صحت کا آخری ثبوت دیا ضمیر نے اس رشتہ کو ٹوٹتے دیکھکر جو بندے کی گردن کو مالک کی مرضی کے ساتھ وابستہ رکھتا تھا۔ اس کو بچانے کے لئے آخری جد وجہد کی۔ مجروح شرافت نے آخری سانس لی وضعداری سربازار ہشیار دیکھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے ذلیل ہوکر تڑپی۔ اس کے نظام عصبی نے۔ اس کے قوائے جسمانی نے ایک زلزلہ محسوس کیا۔ اس کے دماغ کی سلطنت میں بغاوت ہوگئی۔ ممتاز نے سب کچھ دیکھا۔ سب کچھ سنا اور پھر اپنی آنکھوں پر خواہشوں کی پٹی باندھ کر اپنے کانوں میں ہوس کا پگھلا ہوا سیسہ ڈال کر اپنے ضمیر کا گناہ کی آہنی پنجہ سے گلا گھونٹ کر ایک جست بھری۔ اور اس برقی روشنی سے روشن۔ موسیقی کے نغموں سے لبریز۔ حسن کے کرشموں سے مسحور مکان کے اندر داخل ہوگیا۔

اس مکان کی منور و درخشاں فضا میں ایک برقی روشنی سے زیادہ روشن بجلی چمکی۔ ممتاز کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس نے اپنے آپ کو یک بخت کسی بڑے تصادم سے رکتے ہوئے یا شاید اس کے زور اور رعب سے مرعوب ہوکر ایک قدم پیچھے ہٹ کر سنبھلتے ہوئے محسوس کیا۔ ایک حسن سے زیادہ حسین۔ نور سے زیادہ منور خوشبو سے زیادہ معطر چہرہ اس کے حسرت مند لبوں کے قریب ایک خطرناک قربت پر آکے رک گیا تھا۔ سفید رنگ کے نازک۔ شفاف اور نرم ریشم کی باریک تہ میں سے جھلملاتے ہوئے دو بازو جن پر سیاہ سنہری رنگ کی آمیزش سے نکھرے ہوئے لمبے اور پیچ در پیچ بال بکھرے تھے۔ اس کی آغوش میں الجھ گئے تھے۔ اور دو روشن۔ بڑی اور نیم وا آنکھیں مسکرا مسکرا کر اس کی آنکھوں سے ایک خاموش مگر عام فہم زبان میں کچھ ایسی باتیں کر رہی تھیں جن کو اس کا دل سن سن کر سمجھ سمجھ کر مسرور ہو رہا تھا۔

انہی آنکھوں کے پر کیف جذب سے کھنچ کر۔ انہی بازوؤں کے الجھے ہوئے جال میں پھنس کر انہی باتوں کی کشش سے متاثر ہوکر وہ ایک کمرے میں جس کے کھلے ہوئے دروازے درمیانی صحن کے دائیں کونے میں لاکھوں دلربائیوں کے جادو جگا کر ہر تشنہ لب ارمان کو تکمیل حسرت کی دعوت دے

رہے تھے؟ پہنچ گیا . . . .

. . . . . . اس رات کے بعد کئی، راتیں آئیں اور گذر گئیں ۔ کئی دن پیدا ہو ہو کر کتم عدم میں چھپ گئے
دن مہینوں میں ۔ مہینے برسوں میں تبدیل ہو گئے ۔ بچے جوان ۔ جوان بڈھے ہو گئے ۔

زمانے کے ساتھ اہل زمانہ کے خیالات ۔ وقت کے ساتھ لوگوں کی صفات پیدا ہو ہو کے فنا ہونے والی فنا ہو ہو کے ۔ زندہ ہونے والی دنیا کے ساتھ سلسلہ حیات و ممات بدل گیا ۔ مگر ممتاز کے جذبات میں کوئی تبدیلی ۔ کوئی تغیر رونما نہ ہوا ۔ وہ اسی طرح ۔ اس ساحرہ کے سحر سے مسحور ۔ اس قاہرہ کے حکم سے مجبور رہ کر اپنی جوانی ۔ اپنی صحت ۔ اپنی دولت حسن و ناز کی چوکھٹ پر بھینٹ چڑھاتا رہا ۔ اس عرصہ میں ایسا زمانہ بھی آیا ۔ جب ممتاز نے دنوں تک ۔ مہینوں تک اس مکان کی اندرونی دنیا کے سوائے بیرونی دنیا کی کسی چیز کو نہ دیکھا ۔ کیا اس نے ساری دنیا کا ماحصل اس محدود چار دیواری کے اندر حاصل کر لیا تھا ۔ یا دنیا نے اس کو اپنی وسیع نعمتوں کے خلاف بغاوت کرتے دیکھ کر اس زندان میں محبوس کر دیا تھا ۔ اس تمام عرصہ میں وہ اگر سوتا تو صرف اس لئے کہ وہ غارت گر دین و ایمان اس کو خواب میں نظر آئے ۔ اگر بیدار ہوتا تو محض اس لئے کہ اس غارت گر کو اپنی آنکھوں کے سامنے مشق ستم کرتے دیکھے جب وہ کسی بات پر بگڑ جاتی تو وہ اپنے دل کی حسرتوں کو ۔ اپنی جوانی کے ولولوں کو ۔ اپنی زندگی کی امیدوں کو آنسو کے ایک قطرے میں منجمد کر کے اس کے قدموں پر گرا دیتا ۔ جب وہ من جاتی تو اپنے شوق کو اپنے اضطراب کو ۔ اپنی خود فراموش عقیدت کو ۔ اپنے سر کی ایک جنبش میں منتقل کر کے اس کے پاؤں پر نچھاور کر دیتا ۔

ایک شب وہ اس حسن فروش کی آغوش میں بے خبر پڑا تھا کہ اس نے اپنی بیوی کی ناگہانی موت کی خبر سنی ۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اس کو جس نے مرنے والی کے جائز حق کو ایک جابر ملک گیر کی طرح غصب کر لیا تھا ۔ فاتحانہ مسرت سے مسرور دیکھ کر مطمئن ہو گیا ۔

ایک دن جب وہ اس مکان کی ہر پابندی سے بے پروا آزادی سے بیزار ہو کر اس عورت کے لئے جس پر وہ ایک واحد مالک کی حیثیت سے قبضہ کرنے کا متمنی تھا جس کو وہ اپنے سوا کسی اور کی آنکھوں سے دیکھا جانا بھی پسند نہ کرتا تھا ۔ ایک علیحدہ عشرت منزل بنانے کی فکر میں تھا ۔ اس کے لئے بہت سے نقشوں پر جو اس کے دماغ کے منظر گاہ پر باری باری منقش ہو ہو کر محو ہو جاتے تھے غور کر رہا تھا

اور ان نقشوں کی تکمیل کے لئے اپنے حاصل کو ناکافی پاکر خیال ہی خیال میں اپنے باپ کی جمع کی ہوئی دولت کو ایک خود غرض لالچی کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک بند اور سربمہر لفافے کو کھول کر جس کو ابھی ابھی ڈاکیے نے اس کے ہاتھ میں دے کر رسید حاصل کی تھی اپنی آنکھوں سے یہ پڑھا کہ اس کے باپ نے اس کی روز افزوں بدکاریوں سے تنگ آکر اس کو ایک دن بھی پہلے سے بہتر نہ پاکر اپنی جائداد سے محروم کر دیا ہے۔ اس کے دماغ پر ایک دھکا سا لگا مگر جب اس نے آنکھیں اٹھا کر اس عورت کو جس کے استعمال کے لئے وہ اس تمام دولت کو پیار کرتا تھا۔ اسی طرح مسرور۔ اسی طرح مطمئن۔ اسی طرح اپنے قبضہ میں پایا تو وہ ایک بوڑھے شخص کے کمزور ارادے پر۔ ایک باپ کے بہت جلد فرو ہو جانیوالے غصہ پر ہنس کر چپ ہو رہا۔

ابھی اس کے پاس اپنی محنت سے کمائی ہوئی۔ اپنے مصارف سے بچا کر جمع کی ہوئی دولت تھی اگرچہ وہ کئی بار یہ سمجھنے کی بے کار کوشش کرنا چاہتا تھا کہ یہ دولت بہت دیر تک اس کے موجودہ اخراجات کی متحمل نہیں ہو سکتی ابھی اس کو اس بات کی تسلی تھی کہ اس کا مایوس باپ اس کے لئے اس خوبصورت اور آراستہ مکان کے دروازے بند نہیں کر سکتا جس کو وہ ہمیشہ میرا خوبصورت دفتر کہہ کر پکارتا تھا اور جس کو اس نے اپنے روپے سے اپنے نام پر خریدا تھا۔ اس کو بیوی کی موت۔ دولت کے نقصان۔ باپ کے غصے۔ بہن کی مایوسی کا کچھ احساس نہ ہوا۔ کیونکہ وہ عورت جس کی محبت سے بھری ہوئی ایک نظر میں وہ اپنے دل کی تمام جذبات کو مرکوز کئے ہوئے تھا۔ اس پر مہربان تھی۔ اس کے پہلو میں تھی۔ اس کی تھی۔ وہ دنیا کے تمام رشتوں کو۔ تعلقات کو۔ تمام چیزوں کو صرف اسی ایک عورت کی وساطت سے محسوس کر سکتا تھا۔ وہ عورت ایک رنگین چشمہ تھی جس نے ممتاز کی نگاہ میں دنیا کی ہر چیز کو اپنے ہی رنگ میں رنگ دیا تھا۔

آخر ایک دن وہ بھی آیا جو قانون فطرت کے ہر گنہگار کے لئے موت سے زیادہ یقینی ہے جب اس کا تمام سرمایہ توقعات سے بہت پہلے ختم ہو گیا۔ جب اس کے لئے اس کے دفتر کے خوبصورت دروازے۔ اگر باپ کے غصے نے نہیں تو قرض خواہوں کی قرقی نے بند کر دئے۔ آہ! اس دن کو اگر آنا ہی تھا تو ذرا پہلے آیا ہوتا۔ جب ممتاز تندرست تھا جب اس کا دماغ صحیح تھا جب وہ کام کر کے دولت کمانے کی

قابلیت رکھتا تھا۔ مگر اس وقت وہ شہر کی سب سے زیادہ غریب پرور سرائے کے ایک تنگ و تاریک کمرے میں ایک شکستہ چارپائی پر لیٹا تھا۔ اس کے پاؤں حرکت سے۔ اس کے ہاتھ استقامت سے اس کا دماغ ادراک حقیقت سے قاصر تھا۔ شراب نے جس کی کثرت اسی رقاصہ کی کوششوں کی شرمندۂ احسان تھی پانی۔ چائے۔ طعام اور ہر قسم کی خوراک کی جس کا وہ عادی تھا جگہ لے لی تھی۔ دختر رز نے ممتاز کو اپنی اداؤں کا اس قدر سوالا بنا دیا تھا کہ وہ پیاس۔ بھوک۔ درد بغرض قوائے جسمانی کے ہر مطالبے کا علاج اسی کی عشوہ گریوں سے کرتا تھا۔ اور اب جب کہ اس کے پاس اس قیمت کے بغیر نہ ہاتھ آنے والے پانی کو خریدنے کیلئے حبہ تک نہ تھا۔ اب جب کہ اعصابی تشنج کے درد انگیز دردوں کی شدت کو مٹانے کے لئے اس کو اس کی پہلے سے زیادہ ضرورت تھی۔ وہ اس کی غیر موجودگی میں درد سے کراہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ مگر وہ اردگرد کے منظر کو سمجھنے سے قاصر تھیں۔ وہ رات کو اسی کمرے میں سویا تھا جس میں آج سے بارہ سال پہلے ایک رات کو وہ بے شمار امیدوں کو آغوش میں لئے داخل ہوا تھا۔ مگر آج صبح بیدار ہوکر اس نے آپ کو اس سرائے کے کمرے میں اس بے کسی اور بے بسی کی حالت میں دیکھا۔ اس نے کچھ سمجھنے کی کوشش کی۔ مگر جب اس کو اس خوبصورت رقاصہ کی وفا کا خیال آیا جس کے پاؤں کی ایک حرکت نے بارہ سال گذرے اس کی آیندہ زندگی کا دستور العمل تحریر کر دیا تھا۔ اور جو ابھی ابھی یعنی اس وقت جس وقت کی یاد اس کے مختل دماغ میں سب سے زیادہ محفوظ تھی۔ اس کو پنکھا کر کے پیار سے بھری ہوئی تسلی دے دے کر سلانے کی کوشش کر رہی تھی تو وہ یہ تمام درد و تکلیف۔ یہ تمام احتیاج و افلاس۔ یہ تمام مایوسی و ذلت بھول گیا۔

اس نے کسی قدر حیرت کسی قدر مسرت اور کسی قدر نفرت سے ایک بند لفافے کو دیکھا جو اس کی دائیں ہاتھ کے قریب۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایک نمایاں جگہ پر رکھا تھا۔ حیرت اس لئے کہ آج اتنے طویل عرصہ کے بعد ایک خط کی موجودگی نے اس کو اس امر کا پتہ دیا کہ وہ اب تک اسی دنیا میں زندہ ہے جس کے رہنے والوں کے ساتھ اس کو کبھی تعلق تھا۔ کیا کسی دل میں اس کی یاد اب تک باقی تھی کہ اس کا اظہار اس خاموش طریق سے کیا گیا تھا۔ مسرت اس لئے کہ شاید باپ نے بیٹے کی مصیبتوں کا حال سن کر اپنے فطری جذبے سے کام لیا ہے۔ اور اس دولت کو جسے اس کے غصے نے چھین لیا تھا۔ اس کی شفقت نے واپس کر دیا ہے۔ نفرت اس لئے کہ آہ یہ دولت اس وقت مل رہی ہے جب وہ اس کو استعمال کر کے حصول لذات کی قابلیت نہیں رکھتا

اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس لفافے کو اٹھایا۔ ہاتھوں سے زیادہ کانپتی ہوئی انگلیوں سے اسے کھولا اور انگلیوں سے زیادہ کانپتی ہوئی نظروں سے اسے پڑھنا شروع کیا۔

"میں دولت کی بیٹی ہوں۔ جب تک تمھارے پاس دولت تھی تمھاری تھی۔ اور اب ان کی خاطر جن کے پاس دولت ہے تمھیں ہمیشہ کے لئے چھوڑتی ہوں"

جو دماغ بیوی کی موت۔ باپ کی مایوسی۔ دولت کے نقصان سے نہ گھبرایا تھا۔ اس عورت کی دائمی جدائی کی خبر سن کر جس کی موجودگی میں دنیا بھر کی تکلیفیں راحتوں سے زیادہ تھیں ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اس نے ایک چیخ ماری۔ آنکھیں کھول دیں اور انتہائی اضطراب کی حالت میں تھا۔

اس کی آنکھوں سے ایک ہولناک خواب کی جانکاہ کاوش ظاہر تھی۔ اس نے آنکھوں کو اور زیادہ کھول کر کلاک کو دیکھا۔ گیارہ بج رہے تھے۔ ملازم نے ذرا آگے بڑھ کر پھر یاد دلایا "سرکار موٹر تیار ہے"۔

آہ! ان تین گھنٹوں کی غفلت میں اس نے کیا کیا دیکھ لیا۔ کیا یہ سب کچھ ایک خواب تھا۔ اس نے اپنے آرام دہ دیوان کو۔ اپنے دفتر کے آراستہ کمرے کو اپنے ملازم کی مودب یاددہانی کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔

پھر اس نے کسی جائے نماز کی ضرورت کو محسوس کرنے کے بغیر کسی مسجد کو تلاش کرنے کے بغیر اسی کمرے کے فرش پر گر کر سر سجود کو اپنے مالک کی فیاض درگاہ پر جھکا دیا جس نے اس کو اس تمام مصیبت سے بچا لیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شکریہ اور احسانمندی سے بھرے ہوئے دو بڑے بڑے آنسو نکلے۔ وہ اٹھا بہت سنجیدگی سے اپنی ٹوپی سر پر رکھی۔ لکڑی ہاتھ میں لی اور دروازے سے نکل کر موٹر پر سوار ہو گیا جب موٹر ڈرائیور نے منتظر اور متجسس نگاہوں سے منزل مقصود کا پتہ دریافت کرنے کے لئے اس کی طرف دیکھا تو اس نے صرف یہی کہا ——— گھر چلو، "جلدی بہت جلدی"

آج وہ پورے ایک مہینے کے بعد ایک افسردہ باپ۔ ایک مایوس ساجن۔ ایک منتظر بیوی کے پاس جا رہا تھا۔ وہ گھر میں داخل ہوا۔ اس کی رفتار سے کچھ پریشانی اور بہت زیادہ خوشی ظاہر تھی۔ اندر جاتے ہی۔ اس نے اپنی بیوی کو جو شاید اس وقت بھی اسی کے انتظار میں بیدار اور اسی کی یاد میں اشکبار تھی سینہ سے لپٹا لیا۔ آنسو بہ بہ کر گناہوں کے داغوں اور دلوں کے شکووں کو دھو رہے تھے ✦

احمد شجاع

دی روز۔ امروز و فردا کا قصّہ

"دارالبقا" کی مغرب کی جانب شاہراہ ہستی پر ایک ملک آباد ہے جس کا نام "دارالفنا" ہے۔ اس ملک میں ایک شخص رہتا تھا جس کا نام "استقلال" تھا۔ استقلال کے والدین کچھ بہت امیر نہ تھے۔ مگر انھوں نے اس کی شادی ایک مالدار عورت "محنت" سے کر دی تھی جس کی بدولت رفتہ رفتہ استقلال اپنے ملک میں ایک بڑا مالدار آدمی ہو گیا۔ استقلال کے بہت اولاد نہ تھی۔ صرف ایک لڑکا تھا جس کا نام "امید موہوم" تھا۔ یہ لڑکا جب سن بلوغ کو پہنچا تو ایک حسین خاتون "کامرانی" پر غائبانہ عاشق ہو گیا اور شب و روز اسی فکر میں رہتا تھا کہ کسی طرح اس کا پتہ لگائے اور اس تک پہنچ سکے۔ اس کی حالت تعشق دن بدن بڑھتی گئی۔ اور "بسا ایں دولت از گفتار خیزد" کے چکر میں ایسا آیا کہ رفتہ رفتہ اس کی اس وارفتگی کا حال۔ اس کے والدین تک پہنچ گیا جب انھوں نے اپنے اکلوتے اور چہیتے بیٹے کی یہ حالت دیکھی تو آپس میں میاں بیوی نے صلاح کی کہ اس کا کیا علاج کرنا چاہیے۔ بعد بحث و مباحثہ کے یہ فیصلہ قرار پایا کہ لڑکے کو اس کی معشوقہ کے پتہ لگ جانے کا بھید جس سے وہ واقف تھے بتا دینا چاہیے۔ چنانچہ اس سے ایک دن علیحدگی میں کہا۔ اگر تو کامرانی پر ایسا ہی شیدا ہوا ہے۔ تو اس کا پتہ معلوم کرنے کی صورت یہ ہے کہ بڑے "بابا وقت" کی خدمت میں حاضر ہو اور ان سے اس کے مکان کا راستہ دریافت کر۔ بابا وقت ملک "ابدالآباد" کا بادشاہ تھا۔ اور ان دنوں اپنے محل "دارالشمس" میں رہتا تھا۔ یہ مکان نہایت بلند تھا جو فوق السما کوہ کی چوٹی پر واقع تھا۔ اس مکان کے بہت راستے تھے مگر نہایت باریک اور ڈھلوان تھے یہ راستے "طرق الشعاع" کہلاتے تھے۔ ہر شخص کی مجال نہ تھی کہ ان کو طے کرے۔

جوان امید موہوم نے جونہی یہ بات اپنے والدین سے سنی سیدھا گھر سے نکل کھڑا ہوا اور چلتے چلتے دوسرے روز جونہی دن نکلا فوراً طرق الشعاع کی راہ سے "دارالشمس" میں داخل ہوا۔ وہاں پہنچکر کیا دیکھتا ہے کہ ایک تخت زریں پر چمکدار تاج پہنے ہوئے ایک بڈھا شخص ہاتھ میں ایک تیز تلوار لئے بیٹھا ہے اور اس کا تلوار والا ہاتھ برابر چلے جا رہا ہے۔ گویا کسی چیز کو قطع کر رہا ہے۔ اس کے برابر تین پریاں بیٹھی ہیں انہیں سے

سب سے بڑی کا نام "دی روز" تھا۔ اس سے چھوٹی کا نام "امروز" اور سب سے چھوٹی کا نام "فردا" تھا۔ یہ تینوں اسی بڈھے "باباوقت" کی بیٹیاں تھیں جن کی "ملک دار الفنا" پر حکومت تھی۔ جوان موہوم کو خیال ہوا کہ شاید انہی میں میری محبوبہ بھی ہو۔ غور سے اُن کو تاکنے لگا۔ دی روز چپ چاپ ایک سفید چادر میں سر سے پاؤں تک لپٹی ہوئی تھی "امروز" کی شکل معمولی تھی۔ شرمیلی آنکھوں سے زمین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر ایک قسم کی اداسی چھائی ہوئی تھی "فردا" نہایت حسین اور شوخ و چنچل تھی۔ اس کے دلربایانہ عشوہ و ناز زاہد فریب تھے۔ اس کی ہر ادا معشوقانہ تھی اور خواہ مخواہ ہر شخص کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔

"جوان موہوم" بڈھے "باباوقت" کے قدموں میں گر پڑا" باباوقت نے بغیر سر اٹھانے کے پوچھا کیوں بیٹا تو یہاں کیونکر آیا اور تیرا مطلب کیا ہے" امید موہوم" نے دست بستہ عرض کیا کہ قبلہ عالم میں کامرانی کی تلاش میں سرگردان و پریشان کوہ و بیابان میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ اب یہ معلوم ہوا ہے کہ حضور کو اس کا پتہ معلوم ہے۔ برائے خدا میری عرض قبول کیجئے اور میری اس عفت مآب پردہ نشین مہ جبین تک رسائی کرا دیجئے۔ بڈھے بابا نے نہایت سنجیدگی سے کہا کہ کامرانی ایک تنگ و تاریک غار میں مقفل ہے اور اس کی کنجی ان لڑکیوں میں سے کسی کے پاس ہے۔ اور انہیں کو اس کا راستہ بھی معلوم ہے۔ اس سے زیادہ میں نہ بتاؤں گا۔ اب تو ان سے اپنا مطلب حاصل کر۔ نوجوان موہوم ان کی طرف مخاطب ہوا۔ اس نے دیکھا کہ امروز تو غائب ہی ہو چکی" دی روز" نے آہ سرد بھری اور اس کی طرف سے منہ موڑ لیا۔ اس کی یہ ادا موہوم کو بہت بھائی۔ اور اس کے نقاب پوش ہونے سے اسے خیال ہوا۔ کہ شاید یہ سب سے زیادہ حسین ہو اور اسی سے مطلب نکلے۔ مگر جب فردا کی طرف دیکھا تو اس کے ملک فریب حسن پر لٹو ہو گیا۔ اُدھر فردا نے آنکھیں مارنی شروع کیں۔ پھر کیا تھا سمند ناز پہ ایک اور تازیانہ ہوا یہ اُدھر کو بڑھا وہ مسکرائی۔ امید کو یقین کامل ہو گیا کہ ہو نہ ہو اس قید خانے کی کنجی اسی کے پاس ہے فردا نے ایک دلربایانہ ادا سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ کیا آپ کامرانی کی تلاش میں سرگرداں ہیں اگر آپ کو کوئی اس کا پتہ لگا دے تو آپ کیا دلوائیں۔

موہوم "وہ جو کچھ طلب کرے۔ دل۔ جان۔ مال۔ عزت"

دیروز۔ نے ایک نگاہ بھر کر دیکھا اور مایوسی سے پرواز کرتی ہوئی آنکھوں سے غائب ہو گئی

موہوم نے مضطربانہ طور سے پھر کہا۔ ہاں ہاں جو کچھ مرے پاس ہے دونگا۔

فردا ۔ تو چل میرے پیچھے پیچھے چلا آ۔ یہ کہہ کر فردا آگے آگے ہولی ۔

یہ دونوں سرسبز و شاداب مرغزاروں سے گذرے ۔ خوشبودار درختوں کے جنگل طے کئے ۔ ایسے خوشنما باغوں میں سے گذرے جو جادو کے زور سے بنائے ہوئے معلوم ہوتے تھے ۔ ان باغوں میں فوارے چھوٹ رہے تھے اور بجائے پانی کے گوہر و الماس برسا رہے تھے ۔ ہزاروں میں سچے سونے اور چاندی کی مچھلیاں تھیں سرو و شمشاد کی قطاریں تھیں ۔ زمرد کے تختے تھے اور لعل و یاقوت کی روشیں تھیں ۔

موہوم یہاں ذرا ٹھٹکا ۔ فردا برابر آگے آگے چلی جا رہی تھی ۔ "موہوم" کو مڑ کر دیکھا کہ ٹھہرنا چاہتا ہے ۔ ذرا دھمکی اور للچانے کے لہجے میں کہا کہ ٹھیر نہیں ۔ چلا چل ۔ پھر دیکھیو کیا کیا سبز باغ نظر آئیں گے ۔

موہوم نے اپنا سفر جاری رکھا ۔ راستہ رفتہ رفتہ پتھریلا اور خاردار ہوتا گیا ۔ چاروں طرف سپاٹ چٹانیں آسمان سے باتیں کرتی تھیں ۔ مگر فردا نے ایک اونچی چٹان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا کہ گھبراتا کیوں ہے ۔ دیکھ! وہ جگہ تیری منزل مقصود ہے ۔ یہ کہا اور آگے بڑھتی چلی گئی ۔ موہوم پیچھے پیچھے تھا ۔ مگر اس کے پاؤں تھک گئے ۔ تلوؤں میں چھالے پڑ گئے ۔ راستہ ڈھلوان اور پرخطر تھا ۔ ہر موڑ پر خار دامن گیر تھیں ۔ مگر ہوا کریں ۔ منزل مقصود بھی تو وہی تھی ۔ راستہ میں ایک زخمی بچہ ملا جسے گر کر چوٹ لگ گئی تھی ۔ وہ ان دونوں کو جاتے دیکھ کر چیخا ۔ للہ ذرا مجھے اٹھانا ۔ فردا چلائی ۔ خبردار جو کسی کی سنی ۔

موہوم سر جھکائے چلتا رہا ۔ دن غروب ہو گیا ۔ بادل کی گرج اور بجلی کی چمک سے دل دہلتا تھا جنگل کے درندوں کی آواز سے جی کانپا جاتا تھا ۔ اس خوفناک سماں میں دور سے ایک عورت کی دردبھری آواز آئی ۔ ہائے کوئی مجھے اس موذی کے جنگل سے چھڑائے "موہوم" نے ادھر کان لگائے ۔ مگر فردا نے غضبناک شکل سے اس کی طرف دیکھا اور پھر وہ سیدھا ہو لیا ۔ فردا آگے آگے تھی ۔ موہوم پیچھے پیچھے اتنے میں بجلی زور سے کڑکی ۔ بادل گرجا اور موسلا دھار مینہ برسنا شروع ہو گیا ۔ موہوم کو چلتے چلتے ایک عمر ہو گئی تھی ۔ اب وہ ضعیف اور بڈھا ہو گیا تھا ۔ اس کو ایک قدم بھی بڑھانا مصیبت تھا ۔ مگر فردا رحم کے نام سے ناآشنا تھی ۔ اس نے سختی کی آواز سے کہا کہ دیکھ جلدی کر ۔ ورنہ منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے تیری عمر تجھ کو جواب دے دے گی موہوم کو بڑھاپے نے آگھیرا تھا ۔ اس کی آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی تھی ۔ اسی جنگل میں سے ایک لکڑی ڈھونڈی اور اس پر سہارا دے کر گھسٹتا ۔ ٹٹولتا ۔ لڑکھڑاتا چلتا رہا ۔

سورج غروب ہوچکا راستہ پیچدار تھا چمگادڑوں نے آسمان پر اِدھر سے اُدھر۔ اور اُدھر سے اِدھر اڑ اڑ کر شفق کی روشنی کو دھندلا کر دیا تھا۔ زمین پر سانپ اور اژدہے پھنکاریں مار رہے تھے۔ اور ہر طرف طرح طرح کے زہریلے کیڑے مکوڑے رینگ رہے تھے۔ موہوم دہشت سے ڈگمگایا۔ اس نے اپنی دھندلی آنکھیں منزل مقصود کی طرف اُٹھائیں۔ اور مایوسی سے آہ سرد بھر کر چلایا۔ افسوس میں بڈھا ہوگیا اندھا ہوگیا۔ کامرانی اب ملی بھی تو کیا مزا۔

فردا نے جرأت دینے والے الفاظ میں کہا چلو بڑھے چلو۔ کام مار لیا ہے۔ اب دیر کرنے کا وقت نہیں۔ موہوم کا دم چڑھ گیا تھا۔ قدم اٹھانا دوبھر تھا۔ ایک ایک پاؤں ہزار ہزار من کا ہوگیا تھا۔ اس میں اتنی قوت کہاں تھی کہ سفر برابر کئے جاتا۔ مگر خیر اب وہ منزل مقصود پر پہنچ چکا تھا۔

یہاں پہنچکر دیکھا کہ پہاڑوں کے بیچوں بیچ ایک پرخوف غار ہے۔ اس میں ایک طرف کو ایک گھاٹی ہے جس میں یہ دونوں اترے۔ وہاں ایک تنگ تاریک کھڈ پر ایک پتھر کا کواڑ لگا ہے۔ جو مضبوط زنجیر قفل سے جکڑا ہوا ہے۔ موہوم نے خوشی اور انبساط سے فردا کی طرف دیکھا اور کنجی کے لئے ہاتھ بڑھایا فردا نے تبسم کیا اور کنجی اس کے حوالے کی۔

موہوم کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ وہ ضعیف اور ناتواں ہوگیا تھا۔ بڑھاپے سے رگ و پے میں رعشہ تھا۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں اور دھڑکتے ہوئے دل سے کنجی قفل میں ڈالی۔ کنجی کا قفل میں پڑنا تھا کہ ایک وحشتناک توپ کی سی آواز آئی۔ موہوم بیہوش ہو کر گر پڑا جب ہوش آیا تو دیکھتا کیا ہے کہ نہ وہ پہاڑ ہیں۔ نہ وہ گھاٹی۔ نہ وہ پتھر کا دروازہ ہے۔ نہ وہ قفل۔ ایک لق ودق میدان ہے اور وہ ہے۔ چاروں طرف تمسخر قہقہوں کی آواز آرہی ہے۔ موہوم کی تحیر وخوف سے عجیب حالت تھی۔ اتنے میں آسمان پر سے ایک برف سے زیادہ سفید پروں والی پری اڑتی ہوئی اس کے پاس آ اتری یہ پری فردا کی بہن امروز تھی۔ اس کی تیوری چڑھی تھی۔ گال غصے سے تمتما رہے تھے۔ مگر فوراً اس کا غصہ مبدل برحم ہوگیا اور بڈھے سے کہا۔ اے نادان جس چیز کی تجھکو تلاش تھی وہ تو اصل میں میرے پاس تھی۔ تو نے اسے جہاں سمجھا تھا۔ وہاں کیا تھا۔ وہاں تو محض دھوکا اور دل لگی تھی۔ افسوس تو نے اپنی عمر گرانمایہ ایک بیسود تلاش میں صرف کی اور اس سعی بے حاصل میں اپنی تمام قدرتی قوتوں کو زائل کر دیا۔ کاش کہ تو میرا غلام ہوجاتا۔ کاش کہ تو فردا کی بجائے امروز کا خیال کرتا . . . .

امروز اپنے جوش میں نصیحت آمیز الفاظ کہے چلی گئی۔ مگر آنکھ اُٹھا کر جو دیکھا تو بڈھے کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں جسم اکڑ کر تختہ ہو گیا تھا۔ اور امید موہوم بے جان مُردہ سا زمین پر پڑا تھا امروز نے مڑ کر دیکھا تو دیروز بھی آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی تھی۔ امروز نے تاسف کے لہجے میں دیروز سے کہا۔ آہ۔ یہ امیدوں کا ابھرا پُرجوش نوجوان گمراہ ہونے سے آخر کس درجے کو پہنچا۔ اب یہ بڈھا ہے بے جان مردہ ہے اور سرد ہو چکا ہے۔ لے اب یہ تیرے سپرد ہے۔

دیروز نے ایک ماتمی چادر سے اس بڈھے مرحوم۔ امید موہوم کو ڈھانپ دیا۔ اور پاس کے دریائے قعر گمنامی میں ڈال دیا ✤

زاہدی از بھاول پور

حُسنِ طلب

ایک آدمی سحبان زمان مرزا اسد اللہ خان غالب مرحوم کا نوکر تھا جن کی خوش بیانی۔ خوش زبانی۔ خوش تقریری۔ خوش تحریری۔ خوش طبعی کا ایک زمانہ معتقد ہے۔ اس آدمی کی تنخواہ کئی مہینے سے مرزا صاحب مرحوم نے نہیں دی تھی۔ ایک دن مرزا صاحب مرحوم نے اسے پکارا۔ ارے میاں روشن چلم بھر لاؤ۔ وہ کئی آوازوں میں آیا چلم لے کے آگ کے ٹھیکرے کے پاس جا بیٹھا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا جب چلم بھر کے لایا تو مرزا صاحب مرحوم نے پوچھا بھائی اتنی دیر سے تم آگ کے ٹھیکرے کے پاس بیٹھے کیا کر رہے تھے؟ اس نے کہا حضرت ٹھیکرے سے باتیں کر رہا تھا کہ میاں ہماری تنخواہ نہیں دیتے۔ بازار والے قرض نہیں دیتے۔ بال بچے بھوکے مرتے ہیں۔ بتاؤ کہ ہم کیا کریں۔ اور کہاں جائیں۔

مرزا صاحب مرحوم نے خوش طبعی سے فرمایا۔ اچھا بھئی پھر ٹھیکرے نے تم کو کیا جواب دیا۔ اس نے کہا حضرت ٹھیکرے نے مجھے یہ جواب دیا کہ بھائی اگر یہی حال ہے تو گھبراؤ نہیں۔ ایک دن ہم تمھارے ہاتھ میں ہوں گے۔ اور تم کسی بازار میں مانگتے پھرو گے۔ مرزا صاحب مرحوم کو اس کا یہ لطیفہ بہت پسند آیا۔ اور اس کے حال پر ترس کھا کر۔ اس کی تنخواہ کوڑی کوڑی چکا دی ✤

(فیض الدین دہلوی)

پیکِ گُل

صبح صادق کی مدھم روشنی ابھی کانپ رہی تھی کہ شاہی محل تری پور کے پائیں باغ کی روش پر چند لڑکیوں کا شاداں و فرحاں گروہ نظر آیا۔ ان کے چہرے حسن و عصمت میں صبح کی شرمیلی دیوی سے مشابہ تھے۔ یہ راجکماری رتنا کی خواصیں تھیں اور جشن بہار منانے کی غرض سے محل کے قریب ہی ایک جنگل میں جا رہی تھیں۔ یہ تیوہار بہار کے دیوتا کی عزت میں منایا جانے والا تھا جس نے اپنی تشریف آوری کی خبر سے ابھی مسرور کیا تھا۔

راجکماری سنہری پالکی میں سوار ہو کر اپنی متبسم سہیلیوں کے ساتھ شاہی باغ سے برآمد ہوئی۔ باغ میں سے تو سب خاموشی کے ساتھ گذر گئے لیکن جنگل کا راستہ ان کے نقرئی قہقہوں سے گونج اٹھا۔ اور پرندے تک محجوب ہو کر ساکت ہو گئے کہاروں نے جنگل میں پہنچکر پالکی رکھ دی اور خود کچھ فاصلہ پر چلے گئے نازنین لڑکیوں کو بہار کے دیوتا پر پھول چڑھانے تھے۔ اس لئے کسی مرد کی آنکھ ان کو نہ دیکھ سکتی تھی۔ لوگوں کو قبل از وقت مطلع کر دیا گیا تھا۔ اس لئے کوئی آدمی بھی محل کے پاس نظر نہ آتا تھا۔ جب یہ نازنینیں پھولوں سے بھرے ہوئے جنگل میں چاروں طرف پھرنے لگیں تو چونکے ہوئے ہرنوں اور جنگل کی دیویوں کے سوا کوئی آنکھ نہ تھی جو ان کو دیکھتی ہو۔ اس مسرور گروہ میں سے ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ اس کا چڑھاوا سب سے افضل اور اچھا ہو۔ اور دیوتا کے لئے سب سے زیادہ خوشنودی کا باعث ہو۔ ان کی حسین آنکھیں پھولوں اور بیلوں کے توڑنے کی خواہش میں تمام جنگل کا جائزہ لے رہی تھیں اپنی تلاش میں محو وہ ایک دوسرے سے رفتہ رفتہ دور ہوتی گئیں۔ یہاں تک کہ راجکماری رتنا نے چونک کر دیکھا کہ وہ اکیلی رہ گئی۔ اس نے چاروں طرف بے تاب اور مشوش نگاہیں دوڑائیں مگر کسی کو بھی نہ پایا۔ کچھ فاصلہ پر اسے ہلتا ہوا۔ ایک سبز کپڑا سا نظر آیا۔ لیکن وہ یہ معلوم نہ کر سکی کہ وہ اس کی سہیلی منجو لیکا ہے۔ یا کوئی جنگل کی پری

راجکماری نے ابھی اپنے پسندیدہ پھول نہیں چُنے تھے۔ اس کی سنہری ساڑھی کے پَلّے میں جنگلی پھولوں کا صرف ایک خوشہ تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں متواتر اِدھر اُدھر تلاش میں مصروف تھیں

وہ ڈرتی تھی کہ کہیں شہزادی ہو کر وہ تحفہ کے انتخاب میں اپنی سہیلیوں اور خاصوں سے پیچھے نہ رہ جائے
یکایک ہوا کے جھونکے کے ساتھ ایک گرم اور تیز خوشبو آئی جو جنگل کی کسی نوجوان مہجو۔ پری کی آہ
سے مشابہ تھی۔ رتنا متحیر ہو کے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ گو وہ اس قسم کی خوشبو سے آشنا تو تھی لیکن پھر
بھی اس میں کوئی نئی بات ضرور تھی جنگل کی ہوا مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے لبریز تھی اور وہ سب اسی طرف
اڑی چلی جا رہی تھیں۔ جدھر سے وہ جھونکا آیا تھا۔ رتنا ان کے پیچھے پیچھے ہولی۔ وہ یہ دیکھ کر متعجب ہوئی
کہ اس کشش کا سبب آم کے شگوفے کے سوا اور کچھ نہ تھا لیکن معمولی آم سے یہ شگوفہ اس قدر مختلف تھا جیسے
رتنا خود اپنے رسوئی بنانے والے سے۔ وہ سوچتی تھی کہ یہ خوشبو اور خوبصورتی کا اوتار کہاں سے آیا۔ بہار کے
دیوتا پر چڑھانے کے لئے اس سے زیادہ موزوں پیشکش تو شاید نندن کا آسمانی باغ بھی مہیا نہ کر سکتا لیکن
سوال یہ تھا کہ اسے حاصل کس طرح کیا جائے۔ کیونکہ وہ تو شہزادی کی پہنچ سے بالکل باہر تھا۔

راجکماری کی غزال نما آنکھیں اپنی سہیلیوں کو تلاش کرنے لگیں لیکن ان میں سے کوئی بھی نظر نہ آئی
راجکماری نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح وہ اس شگوفہ کو حاصل کرلے گی۔ چنانچہ وہ مدد کی تلاش
میں جس راستے سے آئی تھی اسی پر واپس چل دی۔ اس کی عقل حیران تھی کہ وہ ہر دفعہ جہاں سے چلتی تھی وہیں پھر
پہنچ جاتی تھی۔ رتنا حسن و شباب کی شگفتگیوں میں دیوی معلوم ہوتی تھی۔ شاید پھولدار درخت اس پر عاشق ہو گیا
تھا جو گھڑی گھڑی نادیدہ ہاتھوں سے اسے اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ راجکماری لاچار ہو کر درخت کے نیچے پڑ رہی
اور سوچنے لگی کہ اب کیا کرے۔ مدد کی امید ظاہرا کوئی نہ تھی۔ کیونکہ اس روز تو جنگل میں کسی کو بھی داخل ہونے
کی اجازت نہ تھی۔

قدموں کی آہٹ سے رتنا چونک اٹھی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور متعجب ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے دل
میں مختلف خیال آنے لگے۔ وہ سوچنے لگی "یہ کون ہے؟ کیا بہار کا دیوتا خود بیراچڑھاوا لینے آیا ہے؟ یا یہ عشق
کا دیوتا (بہار کا ہمیشہ کا ساتھی) ہے؟ کس قدر خوبصورت ہے۔ بھلا کسی فانی انسان میں ایسا حسن ہو سکتا ہے؟"
یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ راہ گیر کہیں دور سے چل کر آیا ہے۔ کیونکہ راستہ کی گرد ابھی تک اس کے کپڑوں پر جمی ہوئی
تھی۔ اور پھولوں سے لدے ہوئے جنگل کے راستوں پر چلنے سے جو بہت سے پھول اس پر گر پڑے تھے۔
اس کی پتیاں اب تک اس کے کاکل پر پڑی ہوئی تھیں وہ راجکماری کے سامنے آکر کہنے لگا "تم ایک تھکے ماندے
مسافر کو دارالسلطنت تری پور کا راستہ بتا سکتی ہو؟" رتنا نے اپنی متحیر نگاہیں اس کے چہرے پر جما کر جواب دیا

میں خود ہی راستہ بھول گئی ہوں۔ اور تھک کر چور ہو گئی ہوں۔ بہار کے دیوتا کو پیش کرنے کے لئے میں پھول چننے یہاں آئی تھی اور اپنے راستہ اور سہیلیوں سے بھٹک گئی ہوں"۔

مسافر ہنسا اور کہنے لگا" آپ کے رہنے کے لئے تو یہ بہت ہی موزوں جگہ ہے جنگل کی پریاں ایک دفعہ آپ کی صحبت سے لطف اندوز ہو گئی ہیں۔ اب وہ آپ کو جانے نہ دیں گی لیکن بھلا مجھ غریب سے انھیں کیا مطلب ؟ اتنے میں ان کے پیچھے سے ایک نازک قہقہہ کی آواز آئی اور کوئی با آواز بلند بولا" جنگل کی دیویاں شاید ایک سے زیادہ قسم کے دوستوں کی خواہشمند ہیں"؟

رتنا محجوب ہو گئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر جو دیکھا تو اس کی پیاری سہیلی منجو لیکا پاس کھڑی تھی۔ منجو لیکا نے دریافت کیا کہ" تمھارا چڑھاوا کہاں ہے ؟ ہم ہمیشہ سستی نہیں کر سکتے اور یہ پھول مرجھائے جا رہے ہیں لیکن تم تو اس شخص میں اس قدر مشغول نظر آتی ہو کہ تمھیں شاید دیوتا کا تو خیال ہی نہیں رہا"۔

اس چبھتی تقریر سے راجکماری کا چہرہ مارے شرم کے اور بھی گلابی ہو گیا۔ بات ٹالنے کے لئے اس نے اپنی سہیلی کی طرف دیکھا اور کہنے لگی۔ میری پیاری مجھے جس چیز کی خواہش تھی وہ تو میں نے دیکھ لی ہے لیکن اسے حاصل کرنا میرے بس سے باہر ہے۔

راجکماری نے اوپر کی طرف دیکھا اور اس کے ساتھی بھی دیکھنے لگے۔ منجو لیکا کا چہرہ خوشی اور رشک سے چمک اٹھا۔ اجنبی مسافر سامنے آیا۔ اور رتنا کو مخاطب کر کے بولا" میں سمجھ گیا کہ جنگل کی دیویوں کا کیا مطلب تھا۔ آپ اپنے دیوتا کی پرستش میں مجھ سے مدد لیں"۔

مرد کے مضبوط ہاتھوں کے مقابلہ سے مغلوب ہو کر آم کے درخت نے اپنی تمام دولت حاضر کر دی اور نا شکر گذار شگوفے رتنا کے خوشنما ہاتھوں کو چومتے وقت اپنے ماں باپ کو بالکل بھول گئے۔

مسافر نے کہا" اب میں رخصت ہوتا ہوں۔ میرا کام بخیر و خوبی پورا ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب میں اپنا رستہ ڈھونڈھ لوں گا"۔

یہ کہکر اور ایک مسرت بھری نگاہ شہزادی پر ڈال کر وہ اپنی منزل مقصود کی طرف روانہ ہو گیا اور اس کے سفید لباس کا پھڑ پھڑاتا ہوا دامن جلد ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ رتنا کا جی چاہتا تھا کہ اپنی آنکھیں اس راستہ سے نہ ہٹائے جدھر سے وہ پردیسی گذرا تھا لیکن اس کی سہیلیوں کے بلند قہقہوں کی آواز نے اس کے منتشر حواس بجا کر دئے۔ شوخ اور گستاخ نازنین منجو لیکا۔ راجکماری کے ساتھ بہت ہی کم مقررہ تعظیم و آداب کی

پابندی کرتی تھی اور بچپن کی سہیلی ہونے کے حقوق سے پوری طرح مستفید ہوتی تھی۔ وہ راجکماری کو کنکھیوں سے دیکھ کر بولی "راجکماری معلوم ہوتا ہے کہ وہ خوبصورت مسافر اکیلا ہی نہیں گیا۔ بلکہ کوئی اور چیز بھی اپنے ساتھ لے گیا ہے"۔

پھولوں کے ہار بنانے میں انھیں بہت دیر لگ گئی تھی۔ راجکماری پوری توجہ اپنے کام پر نہ لگا سکی انسان دیوتا کے رقیب کی حیثیت سے کھڑا تھا۔ اور پھولوں کے چڑھاوے میں سے اپنا حصہ مانگ رہا تھا۔

سنجو لیکا نے رتنا کے چہرے کی طرف دیکھا اور کہنے لگی "بہن! معلوم ہوتا ہے کہ تم تو بہار کے دیوتا کے ساتھ عشق کے دیوتا کو بھی خوش کرنے میں کامیاب ہوگئی ہو"۔

رتنا نے بڑے زور شور سے اس الزام کو رد کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی آنکھیں تو جرم کا اعتراف کر رہی تھیں!

جب راجکماری کی پالکی محل کے دروازے میں سے گذر رہی تھی تو سورج آسمان پر اچھی طرح چڑھ چکا تھا اور لڑکیوں نے جو پھول اپنے بالوں میں سجا لئے تھے۔ وہ اپنی مادر وطن کی جدائی کے صدمہ سے مرجھا گئے تھے۔

یکایک ناقوس کی بلند اور مسرت انگیز آواز نے محل کے تمام ساکنوں کو چونکا دیا۔ راجکماری کی خواصیں وجہ دریافت کرنے گئیں۔ اور یہ خبر لائیں کہ "کنور اندام کیلیاتری پور کے دربار میں بحیثیت ایک مہمان کے آیا ہے۔ اس کا خیر مقدم کیا گیا ہے"۔ رتنا اور سنجو لیکا نے آنکھوں آنکھوں میں تبادلہ خیالات کیا۔ راجکماری تنہا اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اور سنجو لیکا بھی زنان کے باغ حصہ کے واسطے رخصت ہوگئی۔

رات کے وقت وہ واپس آئی اور رتنا کے کان میں کہنے لگی "راجکماری تمھارے دل نے تمھیں دھوکا نہیں دیا"۔

کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ کس ذریعہ سے اور کہاں سے یہ پیغام آیا تھا۔ لیکن راجکماری کا دل خود بخود خوش تھا۔

بہار کا دیوتا کسی حالت میں بھی زمین پر دو ماہ سے زیادہ قیام نہ کرتا تھا۔ اس عرصہ کے اختتام پر وہ تمام آنسو بھری اور بیتاب نگاہوں سے بے پرواہ ہو کر سب نوجوانوں کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا تھا اس زمانے میں سب اپنے وقت کو بہترین طور پر استعمال کرتے تھے۔ کیونکہ سست اور کاہل پھر تمام سال کے دوران میں بھی اپنی غلطی کی تلافی نہ کر سکتے تھے چنانچہ راجکماری رتنا اس معاملہ میں یقیناً ناقابل الزام تھی

کہ اس نے بہار کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔

اس موسم کا ہر ایک دن راجکماری کے چہرے پر سرخی اور اس کی آنکھوں میں چمک کی زیادتی کرجاتا تھا۔ پس پردہ ایک ڈراما کھیلا جارہا تھا جس کے ایکٹر خوبصورت راجکماری۔ ایک فانی جوان اور ایک شیدہ دیوتا تھے۔ دربار تری پور کا شاہی مہمان دن بدن اپنے عرصۂ قیام کو وسیع کرتا جاتا تھا۔ اور اس کے لئے وہ طرح طرح کے بہت سے بہانے بنا لیا کرتا تھا ضعیف راجہ اس خیال سے مسرور تھا کہ اس نے اپنی میزبانی اور خاطر و مدارات سے مہمان کا دل تسخیر کر لیا ہے۔ عام خیال یہ تھا کہ تری پور کی وسیع شکارگاہ شہزادے کے زمانہ قیام کو بڑھا رہی ہے۔ دربار کے ایکٹر اور نقال اپنے آپ کو قابل مبارکباد خیال کرتے تھے لیکن اس امر سے کہ وہاں ایک اور قسم کا تماشہ اور شکار ہو رہا تھا۔ صرف نازنینان محل اور رن بیر (جو محل کے پہرہ داروں کا افسر تھا) ہی واقف تھے۔

ہولی کا رنگین تہوار قریب آرہا تھا اور جوان لوگ "عبیر" اور "کم کم" بڑی مقدار میں جمع کرنے میں مصروف تھے لیکن رن بیر کا دل ایک ایسا رنگ اختیار کرتا جاتا تھا جو نہ تہوار کی طرح رنگین تھا اور نہ جوان دلوں کی مانند سبز (حسد) بلکہ جو کبھی پُرطوفان آسمان کی مانند سیاہ اور کبھی کسی دشمن کے خون کی طرح قرمزی ہو جاتا تھا۔

کنور اور راجکماری اکثر ملتے رہتے تھے۔ ان دونوں کی آنکھوں سے شادکامی کا اظہار۔ رن بیر کے دماغ میں ایک آگ سی سُلگا دیتا تھا۔ اور اس کی خوفناک آنکھوں سے خون ٹپکنے لگتا۔

تہوار کا دن بالآخر آگیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پائیں باغ نے سبز سے سُرخ جوڑا پہن لیا۔ ہوا بھی پھولوں کے رنگ اور عبیر کی سرخی سے لبریز نظر آنے لگی۔ باغ کے اس سرے سے اس سرے تک نغمہ ہائے مسرت گونج اٹھے اور نوجوان دیوتا کی شان میں بیشمار قصائد تصنیف کیے گئے۔ سب جوانی اور خوشی کے نشہ میں سرشار تھے۔ رنج نے دو دلوں میں راہ پالی اور آنسوؤں نے دو آنکھوں کی چمک میں تخفیف کردی۔ کنور اور راجکماری کو ہولی کے خیر مقدم کے راگوں میں جدائی کا ایک غمناک سُر ملا ہوا نظر آتا تھا۔ کیونکہ اس پورنماشی کی رات کو تری پور کا شاہی مہمان رخصت ہونے والا تھا۔

رخصت ہوتے وقت ارندام نے رتنا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے اور اس کی آنسو بھری آنکھوں پر نظر جما کر اس کے کان میں کہا "پیاری میں اپنے ساتھ سوائے ان آنسوؤں کی یاد کے اور کوئی

قابل یادگار تحفہ نہیں لیئے جاتا۔ اور یہی مجھے پھر واپس لائیں گے۔" راجکماری نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا کب ؟

ارندام نے جواب دیا۔ "پانچ پورنماشی کے چاندوں کے بعد میں پھر یہیں موجود ہوں گا۔ ہر ایک چودھویں کی رات کو تمھارے پاس ایک "پیک گل" آئے گا۔ اور تم اس سے سن لینا کہ میں تمھاری جدائی کے دن گن گن کر کاٹ رہا ہوں۔ ہم پہلے پہل پھولوں کے دیوتا کے ذریعے ملے تھے۔ اس لئے میں اپنے نامہ بر کو اسی دیوتا کی رعیت میں سے بھیجوں گا۔ اگر مقررہ دن پر قاصد نہ پہنچے تو تم جان لینا کہ میں کسی ایسی سلطنت میں بلایا گیا ہوں جہاں سے قاصد نہیں آ سکتا۔

اپنی پوشیدہ جگہ سے رن بیر اس رخصت کی کیفیت کو دیکھ رہا تھا۔ اور وہ اس غضبناک کالے کی طرح جو ابھی کاٹنے والا ہو پھنکاریں مارنے لگا۔ چودھویں کا چاند تک اس کی آنکھوں میں تیرہ و تار ہو گیا لیکن وہ انتظار کرنے کے سوا اس وقت کیا کر سکتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ڈسے گا۔ مگر وہ صرف اندھیرے کا منتظر تھا۔

چودھویں کے چاند کے ساتھ ہی کیکیا کے خاندان کا کنور بھی چلا گیا۔ رتنا پانی کی پری کی طرح موسم گرما کی آمد کے رنج میں گھلنے لگی۔ رن بیر کی محبت چاروں طرف سے اس کے دل میں داخل ہونے کا راستہ تلاش کرتی تھی لیکن چونکہ اس کے قلعۂ دل کی مورچہ بندی مضبوط تھی۔ اس لئے رن بیر کو چور کی طرح رات کے وقت جانے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

چودھویں کی رات پھر دوبارہ آئی۔ رتنا منتظر آنکھوں سے اپنے محبوب کے "پیک گل" کے انتظار میں محل شاہی کے چبوترے پر کھڑی تھی اور چاند سے منور دنیا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی سہیلیاں اس کے پاس آئیں لیکن ان کے قہقہوں کا جواب راجکماری نے خاموشی سے دیا۔ اور وہ مایوس ہو کر واپس چلی گئیں۔

راجکماری کی آنکھوں کے سامنے تری پور کی سلطنت اپنی پوری وسعت کے ساتھ ایک تصویر کی شکل میں موجود تھی۔ پاس ہی ایک رستہ تھا جو باغ کے دروازہ میں نکلتا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک سنتری کھڑا تھا جو نور کی سفیدی میں ایک دھبہ سا معلوم ہو رہا تھا۔ رات زیادہ آ گئی تھی اور تمام شہر رفتہ رفتہ خاموش ہوتا جا رہا تھا لیکن رتنا کی محبت کا پیغام ابھی تک نہیں آیا تھا۔ سنتری اب بھی اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا یکایک وہ اس چبوترے کے نیچے ٹھٹکا جس پر شہزادی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا سیاہ ہاتھ ہوا میں اوپر کی طرف کو اٹھا اسی وقت رتنا کے پیروں پر کوئی نرم سی چیز لگی۔ کانپتی ہوئی وہ نیچے جھکی تو دیکھا کہ اشوک کے پھولوں کا ایک

گچھا ہے۔ پھولوں کا رنگ اس کے دل کے خون کی مانند سرخ تھا۔ اس نے انھیں اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور سنتری کی طرف غور سے دیکھنے لگی۔ اس نے بھی نگاہ اٹھائی تو رتنا کو تعجب ہوا۔ کہ یہ شخص وہ سنتری نہ تھا جسے وہ بچپن سے دیکھتی آئی تھی۔ بلکہ ایک اجنبی تھا۔ وہ یہ نہ سمجھ سکی کہ ارندام کا یہ دلیر ملازم اس اندرونی باغ میں کس طرح پہنچ سکا۔ سنتری جلد ہی غائب ہوگیا اور رتنا اپنے کمرہ میں واپس آگئی۔ رن بیر کے قاصد آئے اور ناکام چلے گئے۔ رن بیر نے یہ فیصلہ کر لیا کہ کسی نہ کسی طرح ان پیغاموں کو رستہ ہی میں روکنا چاہیئے۔ کیونکہ جب تک ارندام کے قاصد کو راجکماری تک پہنچنے کی پوری آزادی تھی کسی اور کی کامیابی کی بظاہر کوئی صورت نظر نہ آتی تھی سنتریوں اور پوشیدہ جاسوسوں کی صورت میں رن بیر کا حسد رات دن محل کا پہرہ دیتا تھا۔

موسم گرما کے پہلے مہینے کی چودھویں رات آئی۔ رتنا دیوتا سے اپنی پریت کا ور مانگنے گئی تھی۔ اسے وہاں دیر ہوگئی۔ اس لئے وہ تیزی سے واپس آرہی تھی کہ کہیں پیغامبر اس کی غیر حاضری میں نہ ہو جائے۔ چبوترے پر چاندنی پوری آب و تاب سے پھیلی ہوئی تھی۔ رتنا وہاں گئی اور نیچے دیکھنے لگی۔ دروازے پر چار پہرہ دار موجود تھے جن کے سیاہ چہروں سے غصہ ٹپک رہا تھا۔ ان کے ذریعے سے تو سوائے پیغام موت کے اور کوئی پیغام آنے کی امید نہ تھی۔

وہ وہاں تنہا اور مغموم کھڑی اپنے حسن سے چاند کو شرما رہی تھی لیکن اس کا دل اندر سے بالکل تاریک تھا۔ اس نے اپنے دل سے سوال کیا کہ "اس صورت میں قاصد کس طرح آسکتا ہے"۔ وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ سوچ سکی۔ چودھویں کا چاند مغرب کی طرف ڈوبنے لگا۔ اور رتنا آخر کار مایوس ہو کر نیچے چلی آئی۔ راستہ میں اس نے دیکھا کہ ایک سفید پوش تصویر زینہ کے نیچے خاموش رکھی ہے۔ وہ متعجب تھی کہ اس محل میں رہنے پر بھی یہ غیر معمولی نقاب اس کے چہرے پر کیوں تھا۔ تصویر خاموشی سے شہزادی کی طرف بڑھی۔ اور ہاتھ بڑھا کر اسے پھولوں کا ایک گچھا دیا۔ اس دفعہ یہ تصویر نئی بیوہ کی طرح سفید لباس میں تھی۔ اب نقاب اٹھا۔ اور اس میں سے اسی سنتری کا چہرہ نمودار ہوا جسے اس نے پچھلی دفعہ دیکھا تھا۔ اپنا فرض انجام دے کر وہ پھر کسی پوشیدہ راستہ سے چلا گیا جس کا علم شہزادی کو بھی نہ تھا۔

اس دفعہ کی ناکامی پر رن بیر ایسے شیر کی طرح دھاڑنے لگا جس کے پنجوں سے شکار بچ کر نکل گیا ہو۔ اب جاسوس عورتیں نظر آنی شروع ہوئیں اور انھوں نے شہزادی کی لگاتار نگہبانی شروع کی۔ ان کی گھڑی گھڑی اندر آنے اور باہر جانے نے محل والوں کو بے چین کر رکھا تھا۔

فانی انسانوں کے لئے ایک بے جسم دیوتا سے لڑنا مشکل تھا۔ ارندام کا پیغامبر اسی دیوتا کی عنایت سے اپنی منزل مقصود تک کسی نہ کسی طرح پہنچ ہی جاتا تھا۔

گرمی کا دوسرا مہینہ آیا اور اس دفعہ رتنا نے دیکھا کہ چودھویں کو سنہری چمپک کے پھولوں کا ایک ہار اس سونے کے برتن میں تیر رہا ہے جس میں اس کے استعمال کا پانی رکھا جاتا تھا۔

موسم برسات اپنے بادلوں اور بارشوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ اور اس مرتبہ پیغامبر "کیتکی" کے پھولوں کی صورت میں آیا گچھے کے چاروں طرف تو کانٹے لگے ہوئے تھے لیکن اس کا دل اندر سے خوشبوؤں سے معطر تھا۔

رتنا اور اس کے محبوب کی ملاقات میں اب صرف ایک چودھویں کا چاند باقی تھا۔ اگر ایک مرتبہ پیغامبر اور پہنچ گیا تو رتنا رن بیر کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ رن بیر کا دماغ غصہ اور نفرت کی آگ سے دہک رہا تھا۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اس آخری پیغام کو ہرگز نہیں پہنچنے دے گا۔

مقررہ رات آئی لیکن چاند بھاری بھاری کالے بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ تاریکی ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ صرف بجلی کی چمک کبھی کبھی سیاہی کے سحر کو توڑ دیتی تھی۔ رتنا شہزادہ کے پیغامبر کی تلاش میں نکلی اور سوچنے لگی کہ اس تاریکی میں وہ کہاں چھپا ہوگا۔ اس خیال سے کہ کہیں وہ پاس والی سیاہ آبشار میں نہ کھویا گیا ہو۔ اس پر خوف طاری ہونے لگا۔ اور وہ نامعلوم خطروں سے لرزنے لگی۔

شاہی محل رفتہ رفتہ خاموش ہو گیا۔ رتنا اپنے کمرے میں چپ چاپ لیٹ رہی۔ وہ رات کے تاریک گھنٹے گن گن کر کاٹ رہی تھی۔ پیغامبر کے نہ آنے کے باعث وہ پریشان معلوم ہوتی تھی کہ کسی طرح اندھیری گھپ رات پر سے سیاہی کا پردہ اٹھے۔ اور اس کی امیدوں کا خاتمہ ہو۔

یکایک ایک کھڑ کھڑاہٹ ہوئی جس کی آواز طوفان کے شور سے بڑھ کر تھی۔ کمرے کی کھڑکی اس انداز سے کھل گئی۔ جیسے کسی فاتح کو اپنی عزت تصور کر کے اندر لے لینا چاہتی ہے۔ مینہ اور تند ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہی خوشبو کی ایک لہر تمام کمرے میں پھیل گئی کسی نرم چیز کے چھو جانے سے راج کماری کے بدن میں سنسناہٹ سی ہوئی۔ اور وہ لرزنے لگی۔ غور سے دیکھا تو تمام کمرے میں پھول بکھرے ہوئے تھے۔ رتنا نے مٹھیاں بھر بھر کے ان کو چنا اور سونگھنے لگی۔ بادل ہٹ گئے اور صبح کی شاندار روشنی کمرے میں داخل ہو گئی راجکماری کے دل کی روشنی کے مقابلہ میں یہ بالکل ماند تھی۔

رن بیر کے غصہ پر اب سیاہ تاریکی پوری طرح مسلط ہو گئی۔ اپنی ننگی تلوار لئے وہ یم (موت کا فرشتہ) کی مانند اپنے آدمیوں میں گھس گیا۔ اس نے پہرہ داروں اور جاسوسوں کے سردار سے خفگی سے کہا کہ "جس وقت ارندام کی رتھ شاہی محل کے دروازے میں داخل ہوگی۔ تمھارا آخری وقت ہوگا۔ تم تو اس بات پر ناز کر رہے تھے کہ آخر کار تم پیغامبر کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہوا کہ آدھی رات کے وقت وہ پیغامبر شہزادی کے پاس جا پہنچا؟!"

سردار نے خاموشی سے سامنے کی طرف اشارہ کیا ارندام کا دلیر نوکر بیٹھا تھا۔ اس کے بہت سے زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کا لباس جا بجا پھٹا ہوا تھا۔ اور مرجھائے ہوئے پھولوں کا ایک گلدستہ اس کے ہاتھ میں تھا۔

رن بیر معلوم کرنے محل کے دروازے کی طرف دوڑا کہ پھر اور کون ایسی جرأت کر سکا۔ یکایک اس کے ایک نوکر نے اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ شہزادی کی خوابگاہ کے قریب جو پھول دار "باکل" تھا۔ اس کی ایک شاخ طوفان کی سختی سے ٹوٹی۔ گرتے وقت یہ شاخ کھڑکی سے ٹکرائی اور اس طرح اس کے پھول اندر کمرے میں پھیل گئے۔ رن بیر نے یہ دیکھ کر اٹل قسمت کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔

علی الصباح ناقوس کی بلند آواز نے کسی پیارے مہمان کے ورود کا اظہار کیا۔ اور محل کا دروازہ اس کے داخل ہونے کے لئے کھل گیا +

خواجہ منظور حسین دہلوی

مرد کا سایہ

اپنے سائے کے پیچھے دوڑو معلوم ہوگا کہ وہ تم سے دور بھاگ رہا ہے۔ اپنے سائے سے گریز کرو۔ وہ تمھارا تعاقب کرتا دکھائی دے گا۔ اسی طرح عورت، کو چاہو وہ استغنا سے کام لے گی اس سے تغافل برتو وہ تم پر جان دے دے گی۔ تو کیا عورتیں سچ مچ ہم مردوں کا سایہ نہیں ہیں؟

تاج (بن جانسن)

وارفتگیٔ جذبات

بھائی .... تم سے کیا کہوں طبیعت روز بروز حسّاس ہوتی جاتی ہے۔ دل میں ایک بے نام سا رنج رہتا ہے جس کو تنہائی اور بھی بڑھا دیتی ہے مختلف اسباب مل کر ایک عجیب بے دلی پیدا کر دیتے ہیں میں فطرتاً ہوسناک ہوں۔ ناکامیوں نے مجھے دل برداشتہ بنا دیا ہے۔ اس لئے بعض اوقات ایک پیالی کا ٹوٹ جانا زلزلے کی طرح مجھے برہم کر دیتا ہے۔ اسے شاعری نہ سمجھنا یہ حقیقت ہے گھنٹوں مطالعہ میں مشغول رہتا ہوں۔ پھر خیال آتا ہے کہ یہ سب بے فائدہ ہے۔ پہروں سوچتا رہتا ہوں اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ رات کو لیمپ بجھا دیتا ہوں کہ اب سو جاؤں اور پھر جلا لیتا ہوں کہ نیند نہیں آتی۔ آدھی رات کے وقت گھر کے سب لوگ دن بھر کی کلفت اور تکان کے بعد خواب راحت میں ہوتے ہیں میں اپنے آپ میں اس وقت حسیات کی ایک بیداری اور جذبات کی ایک بے قراری پاتا ہوں جو مجھے سونے نہیں دیتی۔

کہیں دور چند غریب پٹھان مزدور رباب بجا رہے ہیں اور پشتو کے کسی دردناک گیت کی فراق زدہ نوا رباب کی سادہ موسیقی رات کی تنہائی اور خاموشی دل کے تاروں میں ایک دھیمے سے درد کا نغمہ چھیڑ دیتی ہے جس کو گھنٹوں تک بے حس و حرکت پڑا سنتا رہتا ہوں مضطرب روح سرحدی کوہستانوں کے درشت عشق و حسن کی داستان سن کر اور مضطرب ہو جاتی ہے۔ بار بار یہی تصور آتا ہے کہ ایک جنگجو غیور اور تنومند افغان نے اپنی بندوق کو کندھے سے اتار کر پتھروں پر رکھ دیا ہے اور ایک ٹیلے پر بیٹھے ہوئے تصنع سے مبرّا فقروں میں اپنے عشق کی کہانی کہہ رہا ہے خیبر کی آغوش کوہ کی پروردہ حسین کے خوبصورت سڈول بازوؤں کو نسوانیت نے ڈھیلا کر دیا ہے اور اس کی معصوم نگاہوں میں ایک محجوبیت آ گئی ہے۔ یکایک اس کے جوانی بھرے سینے کو غیرت نے ابھار دیا ہے۔ اور وہ اپنے چاہنے والے کو بزدلی کے بھوت کے خوف کے طعنے دے رہی ہے۔ رعب حسن میں تنی ہوئی اسے اجتناب کی نگاہوں سے دیکھ رہی ہے پھر غصے میں آ کر اس نے اپنی گھاس کی گٹھری اور درانتی کو سر پر رکھ لیا ہے

اور ندی کے بیچ میں سے گذر کر اس پار چلی گئی ہے۔ رباب کے تاروں میں ایک اضطراب ایک شکستگی سنائی دیتی ہے۔ غیر تمند افغان نے اپنی بندوق کو اٹھا کر مضبوط گرفت میں پکڑ لیا ہے اور ایک پتھر پر کھڑا ارد گرد کی چوٹیوں کو پتھریلے ٹیلوں کو بے رحم پہاڑیوں کو طیش کی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں خون ہے اور آگ ہے اس نے بندوق میں ایک کارتوس بھر لیا ہے اور اس بنجر اور ریتیلے کوہستان میں اس کے گیت کی جھنجھوریں وادیوں میں گونج گونج کر موت کو تلاش کر رہی ہیں۔ ایک جنگجو کی موت کو۔ ایک فاتح کی موت کو۔ عشق اس میدان و کوہ میں آوارہ سرگرداں پھر رہا ہے۔ اس جستجو میں کہ کہیں ایک بے رحم عورت کی خاطر اپنی جان مردانگی اور بہادری کے حوالے کر دے خیبر کے بنجر اور ٹیلوں نے پہاڑ محبت کی اس وارفتگی کو دیکھ رہے ہیں اور موت کی طرح خاموش اور دہشت انگیز ہیں۔ اس موت کی طرح جو اتنی ظالم ہے کہ نہیں آتی۔ رباب کی موسیقی بے دردی سے دل کے ٹکڑے کر رہی ہے۔

مجھے اس وقت ایک عجیب دور افتادگی ایک غربت۔ ایک بے کسی کا احساس ہوتا ہے۔ گویا ایک درماندہ اور راہ گم کردہ مسافر ہوں نظر کو سوائے افق کی ناشکستہ لکیر کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا اور تکان نے منزل سے مایوس کر دیا ہے گویا میں صحرا کی دہشت اور آسمان کی پہنائی میں ایک ذرہ ہوں اور ستاروں کی دور دراز دنیا تک اپنی آواز پہنچانا چاہتا ہوں کیونکہ وہی سب سے نزدیک معلوم ہوتے ہیں۔ چاند کھجور کے درختوں کے ایک جھنڈ میں سے چمک رہا ہے اور کائنات میں چاندنی ہے جو چپ چاپ خاموشی سے برس رہی ہے۔ یا تاریک سائے ہیں جن میں رات نے اپنے پُر اسرار اقتدار کی ہیبت کو چھپا رکھا ہے۔ فضا میں اس درد کے گیت نے ایک بیحد بیقراری پیدا کر دی ہے۔ میرے دل میں اس وقت ڈر نہیں ہوتا۔ خوف نہیں کھاتا فقط ایک اضطراب ہوتا ہے۔ ایک ناقابل بیان بیقراری ہوتی ہے اپنے آپ کو بستر پر سکون کی حالت میں مردہ کی طرح دیکھ کر دل غصے میں پیچ و تاب کھاتا ہے کہ میں بے بس کیوں ہوں۔ بس یہ بے بسی کا احساس جذبات میں ایک تلاطم پیدا کر دیتا ہے اور تنہائی ایک محشرستان۔ بیداری ایک ہنگامہ بن جاتی ہے۔

رفتہ رفتہ رباب کی موسیقی دھیمی ہوتی جاتی ہے اور گیت کی لے آہستہ آہستہ چاندنی میں تحلیل ہو کر خاموش ہو جاتی ہے۔ رات کا طلسم جذبات کی سروں پر سکون کی چادر ڈال دیتا ہے۔ آنسو پلکوں پر سوکھ جاتے ہیں اور آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ قدرت کے دل میں رحم آ جائے تو ہوا کے جھونکے تھپک تھپک کر سلا دیتے ہیں۔ نیند آ ہی جاتی ہے۔ مگر آہ کس بیداری کے بعد +

"پطرس"

ھلال عید

جب لوگ ہلال عید دیکھ رہے تھے تو میں بھی کوٹھے پر کھڑا اسی پیغمبر عید یا تمہید مسرت کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہا تھا۔ گھر کے لوگوں اور بچوں نے چاند چاند کا شور مچا رکھا تھا۔ میری نظریں تو افق پر گڑی ہوئی تھیں لیکن خیال اب سے سات سال پہلے کی عید میں نظر کر رہا تھا جب میں اور "وہ" دونوں تنہا کوٹھے پر ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے اُفق مغرب کی طرف دیکھ رہے تھے۔ برسات کی ہوائیں زور شور سے چل رہی تھیں۔ کیونکہ ابھی بارش تھم کر مطلع صاف ہوا تھا۔ ان کے ریشمین زنگاری دوپٹے کا آنچل بار بار ہوا کے جھونکوں سے اڑ جاتا تھا۔ اور وہ بار بار شرما کر اسے اٹھائیں اور نہایت احتیاط سے اوڑھ لیتیں۔

دفعتاً انھوں نے میرے رخسار کے پاس اپنا رخسار لاکر اپنی نازک انگلی اٹھائی اور مغرب کی طرف ایک نہایت "باریک اشارہ" کرکے کہا "دیکھنا وہ سامنے کبری کے مکان کی ممٹی کے بائیں کونے کے اوپر تار سا نظر آتا ہے"۔

میں نے چاند دیکھ تو لیا۔ مگر کیا کہوں کیوں اور کس لئے کہا "مجھے تو نظر نہیں آیا" انھوں نے بھولپن سے میرے گلے میں اپنا بایاں بازو ڈال دیا۔ اور میرے سر کو کھینچ کر اپنے خوش ترکیب اُبھرے ہوئے سینے سے لگایا مُسکرائیں۔ اپنی ٹھوڑی میرے سر پر رکھی اور دایاں ہاتھ لمبا کرکے اُنگلی اُٹھائی اور کہا "اب دیکھو ممٹی کے اوپر دیکھنا!"

میں نے چاند دیکھ لیا۔ دیکھا تو پہلے بھی تھا۔ مگر اب کے زیادہ نمایاں اور روشن تر نظر آیا!

میں نے کہا "ہاں ہاں دیکھ لیا۔ مگر اس میں کیا رکھا ہے۔ اس چاند کی طرف کیوں نہ دیکھوں جو ہمیشہ روشن اور کامل رہتا ہے"۔ اسی قسم کے اور ٹوٹے پھوٹے فقرے کہہ کر میں بے خود ہو گیا۔ اور اپنے پُر اشتیاق لب جن میں تمنائیں تھرتھرا رہی تھیں۔ اس رخسار پر رکھ دئیے جس میں شباب کا خون جذبات محبت کی لہریں لے رہا تھا!

وہ کیف و سرور۔ وہ محویت نشاط۔ وہ استغراق انبساط پھر آج تک نصیب نہ ہوا۔ آہ!

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

گمنام کہکشان

کہسار کی رقاصہ

چاندنی راتوں میں جب وہ اپنے مرمریں جسم کی عریانی کو رقص کی سرشاریوں کے حوالے کر دیتی تو اس کے ساق بلوریں کے نیچے تمام کوہسار دھڑک دھڑک کر اس کے ناچ کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا تھا۔

وہ نہ جانتی تھی کہ اپنے شباب کی دلفریبیوں کو کیا کرے۔ اس کی معصومیت۔ اس کی جوانی کی قیامت کو۔ اس کے حسین اعضا کے جوش کو رقص کی حرکات سے مطمئن کرنا چاہتی تھی۔ بس وہ ناچتی ناچتی اپنے لذت و درد سے ناآشنا شباب کو آسودہ کرنے کے لئے گھنٹوں ناچتی۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر کبھی آہستہ کبھی تیز۔ ایک عُریاں شعلے کی طرح بے قرار۔

اس کے متناسب حسن کے دلکش انداز فضا میں اپنے غیر فانی نقش چھوڑ چھوڑ جاتے تھے۔ یہاں تک کہ چاند کی دلفریب خاموشی اور رات کی سنسان ساعتیں۔ اس کے رقص سے معمور ہو جاتیں۔ یہاں تک کہ نقرئی روشنی اور شگفتہ پھول شفاف پانی اور معطر فضا سب اس کے ناچ کے خمار سے چور ہو جاتے تھے اور پھر جب اس کے رقص کا طوفان اُترتا اُترتا اسے پھولوں کے ڈھیر پر بے حس و حرکت پڑا ہوا چھوڑ جاتا۔ تو اس بلا کے سکوت میں معلوم ہوتا تھا کہ اس کا رقص ہنوز بیدار ہے اور وہ پھولوں کے کھلنے۔ چاند کی روشنی کے زمین پر اُترنے۔ ندی کے محوِ خواب پانی کے بہنے میں ایک ہلکی آواز ایک مدھم موسیقی پیدا کر رہا ہے۔

لیکن کچھ عرصہ بعد تابش خورشید کے پروردہ ممالک کا ایک شعلہ مزاج باشندہ کہسار میں پہنچا اور اس نے رقاصہ کے مضطرب شباب کو اپنی گرم اور کانپتی ہوئی آغوش میں لے کر اس کے تازہ تازہ ہونٹ ایک ایسی تیز و تند شراب سے لذت آشنا کئے کہ رقاصہ کے حواس۔ اس کا تخیل اور وہ خود ایک رنگین اور معطر کہر میں کھوئی گئی۔ ایک تپتے اور لرزتے ہوئے جسم کی سنسنی نے اس کے نرم و نازک اور مست بدن کے روئیں روئیں کو غیر محدود

تمنّاؤں کی آگ سے بھر دیا۔ وہ تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں کے مس سے اس کے شباب کی تشنگی جاگ اٹھی اور اس کا اعماق قلب تراہ تراہ پکار اٹھا۔ اس کی نمناک آنکھوں کی چمک عجیب و غریب خمار انگیز لذتوں کے تصور کی حسرت بن گئی۔ اس کے کانوں میں ایک سائیں سائیں رہ گئی کسی کے کھولتے ہوئے خون کی گردش کی آواز۔

لیکن جب برف باری نے پہاڑ کے حسن کی پردہ پوشی شروع کر دی تو نوجوان نے رقاصہ کو اپنی گرفت آغوش سے نوچ کر علیحدہ کر دیا اور رقاصہ کے حسرت زدہ باز و پھیلے کے پھیلے رہ گئے۔ میدان کا رہنے والا یہ کہتا ہوا چلا گیا کہ "جب پہاڑوں پر سے برف پگھل جائے گی تو وہ گرم میدانوں کی تمام لذتیں اپنے شباب میں جمع کر کے پھر اس کی نذر کرے گا۔"

میدان کا رہنے والا چلا گیا۔ برف نے تمام کوہسار کو ڈھانپ لیا۔ ندیوں کی روانی کا شور برف سے ڈھپنے ہوئے کوہستان کے سکوت میں فنا ہو گیا۔ پھولوں کی رنگین پتیاں اور بلند درختوں کے لہلہاتے ہوئے پتے بکھر بکھر کر برف کے نیچے دفن ہو گئے۔ خوش آواز طائروں نے اس سفید برفستان سے سورج کی صد رنگ زمین کی طرف پرواز کی اور تمام کوہستان پر سکوت مزار طاری ہو گیا۔ نہ کوئی حرکت تھی نہ رنگ۔ کوئی آواز تھی نہ خوشبو۔ ایک سفیدی تھی میلوں تک پھیلی ہوئی۔ اداس سفیدی۔ خنکی تھی ہڈیوں تک میں سردی کی سنسنی پیدا کرنے والی خنکی۔ یا اس سکوت و جمود کے تسلسل میں پہاڑی ہواؤں کے ملول جھونکوں کی سرد آہیں تھیں۔

مگر راکھ میں چھپی ہوئی چنگاری کی طرح حسین رقاصہ کے دل میں وہ آگ تھی جس کے شعلے باد و باراں اور برف باری کے درمیان لحظہ بلحظہ بلند ہوتے جاتے تھے۔ اس کے شباب کی نیندیں راحت سے محروم ہو گئی تھیں اس کی روح کا کوئی حصہ کھو گیا تھا جسے وہ برف سے ڈھپنے ہوئے درختوں کے درمیان پہاڑ کی سنسان چوٹیوں پر ڈھونڈھتی اور نہ پا سکتی۔

اب اس کا مضمحل جسم رقص کا متحمل نہ تھا۔ اسے اپنے تشنہ جسم کی پیاس رقص سے فرو ہوتی نظر نہ آتی تھی نہیں اب اس کے دل میں وہ طوفان ہی نہ اٹھتا تھا جس کی فنا اس کے قدموں کی حرکت میں تھی۔ اب اس کے دل پر ایک بوجھ۔ ایک بھاری اور جامد بادل تھا جو کسی طرح اپنی جگہ سے نہ سرکتا۔ کسی طرح اس کے سینے سے نہ اٹھتا تھا۔

آخر یہ بوجھ جو آنسوؤں سے بھی تحلیل نہ ہوا تھا۔ اس رمنہ اپنی جگہ سے ایک لرزاں غبار کی طرح اوپر اٹھا جب اس نے پہاڑ کی ایک بلند چوٹی پر کھڑے ہو کر تھرتھراتی ہوئی آواز میں میدان کے رہنے والے کو پکارا۔ وہ بار بار اسے پکارتی رہی۔ اس کا نام ایک عجیب لوچ کے ساتھ اس کے منہ سے نکل نکل کر پہاڑوں میں گونجتا رہا یہاں تک کہ اس کی روح کی موسیقی بیدار ہو گئی اور اسے معلوم ہوا کہ وہ اعماق قلب سے نکلنے والا نغمہ ہے۔ جو اس کی فراق کی بیتابیوں اور پہاڑ سی ساعتوں میں اس کا رفیق و ہمدم بن سکتا ہے۔

رقاصہ مغنیہ بن گئی۔ شاعری جسم سے نکل کر روح میں سما گئی اور برفانی کوہستان کسی فراق زدہ دل کے دردناک گیتوں سے قطرۂ اشک بن گیا۔

جب سورج کی گرم اور نرم شعاعوں نے برفستان کو گدگدا۔ گدگدا کر آخر ہنسا دیا۔ تو ندیاں چلنے لگیں۔ درختوں پر پتے نکل آئے۔ پھول کھل پڑے۔ طیور نے کوہستان کی دلفریبیوں میں طرۂ ترنم مستزاد کیا اور جب رقاصہ نے ایک بلند پہاڑی پر کھڑے ہو کر منظر کا جائزہ لیا اور کوہستان کو میدان سے آنے والے کے استقبال میں قبائے رنگارنگ پہنے ہوئے دیکھا تو اس کے دل میں خوشی کا غیر محدود طوفان اٹھا۔ وہ دوڑی اور ایک پھولوں کے ڈھیر پر گر کے اس زور سے انھیں اپنے سینہ سے چمٹا لیا کہ اس کی طبیعت کے جوش اور بے قراری کو ایک اور رنگین اور معطر کرنے کے بعد پھول مرجھا گئے۔

ایک مسرت بے پایاں۔ اس کے دل پر مسلط ہو گئی۔ اس کا حسین و نفیس جسم جو طولانی انتظار سے پژمردہ ہو رہا تھا۔ اب پھر کسی نوجوان شاعر کے خواب کی تخلیق بن گیا۔

لیکن اس کے دل کا۔ اس کی روح کا عشق کم ہوتا گیا۔ اس کی طبیعت سوز و درد سے بیگانہ ہوتی گئی اور ایک خمار۔ ایک جسمانی بے قراری۔ اس پر تسلط جماتی گئی۔ آنے والے کی آمد کے اشتیاق نے اس میں ایک از خود رفتگی۔ ایک دیوانگی پیدا کر دی تھی۔ اس کی روح کی بے چینی پھر جسم میں عود کر آئی۔ اور اس کے ننھے ننھے عریاں پاؤں جن کے گھنگرو صرف خاموشی کے اثرات تھے۔ ایک بار پھر کہسار کی رونق میں رنگین لرزشیں پیدا کرنے لگے۔

مگر کوہستان کی بہار مرجھانی شروع ہو گئی۔ برف باری کے ویران دن پھر چاروں طرف منڈلانے لگے۔ سورج کی روشنی مدھم پڑتی گئی اور میدان کا رہنے والا واپس نہ آیا۔

حسین رقاصہ کے ساتھ تمام پہاڑوں کی چوٹیاں میدان کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہیں۔ بارہا اس کے دیکھتے دیکھتے آفتاب شفق مغرب میں غرق ہوا۔ اور مشرق سے شہاب پاشی کرتا ہوا برآمد ہو گیا۔ مگر میدان کا افق اسی طرح ویران کا ویران رہا۔ ستاروں کی آنسو بھری آنکھیں اس کے ساتھ رات کے سناٹے میں کسی کے آنے کا انتظار کرتی رہیں۔ مگر میدان کے رہنے والے نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا۔

اس کے مایوس و مضمحل جسم کے ساتھ تمام کہسار افسردۂ انتظار تھا۔ اس کے دردناک گیتوں کے ساتھ پہاڑوں کی حسرت بھری گونج ہمنوائی کرتی تھی لیکن اس مرتبہ رقاصہ کو نغمہ بن کر بھی درد و کرب اور بے چینی و بیقراری سے نجات نہ ملی۔

آخر جب کہسار نے پھر برف کا کفن پہننے کی تیاری کی تو ایک رات حسین رقاصہ نے آسمان سے اور زمین سے۔ پہاڑوں سے اور درختوں سے۔ پھولوں سے اور ندیوں سے کہا کہ آج میں تم کو فنا کا رقص دکھاؤنگی اور فنا کا نغمہ سناؤں گی اور پھر میں اور تم اور یہ کوہستان ہم سب برف میں فنا ہو جائیں گے۔

وہ ایک اونچی پہاڑی پر۔ ایک نو طلوع چاند کی طرح جا کھڑی ہوئی اور اس نے ناچنا شروع کیا۔ وہی قیامت کا ناچ جو اس کے آغاز شباب کا بے فکر مشغلہ تھا اور تمام کائنات اس رقص کیف و مستی کے ساتھ محو ہوتی گئی۔

رفتہ رفتہ اس کے قدموں کی حرکت آہستہ اور اس کے نغمہ کی آواز بلند ہوتی گئی۔ اس نے گانا شروع کیا کہ "پھر گرم میدانوں کا فرزند کوہسار کی دختر کے پاس آیا"

اور جب اس نے یہ بیان کیا کہ کس طرح میدان کے رہنے والے نے کوہسار کی رقاصہ کو اسکی آغوش کی رنگینیوں اور شباب کی قیمت سے آگاہ کیا۔ تو پہاڑ۔ دریا۔ پھول اور روشنی ایک عجیب از خود رفتگی کے ساتھ ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے معلوم ہونے لگے۔

لیکن جب وہ فراق کے درد و کرب اور تنہائی کے رنج والم کو بیان کرنے پر آئی تو اس کا سینہ جذبات کی کثرت سے اس طرح اُبھر گیا۔ کہ اس وقت اگر سوز دروں سے بیتاب ہو کر وہ اس ویرانے میں ایک چیخ مار دیتی تو دنیا پھٹ جاتی۔ الٹ جاتی۔ وہ بتاتی رہی کہ پھر وہ نہ آیا۔ اپنے وعدہ پر واپس نہ لوٹا۔ افسردہ آرزو دن اور مایوس انتظار راتیں کس طرح کٹیں اور فراق اور تنہائی کی مصائب کس طرح برداشت سے باہر

ہوتی گئیں۔ وہ اپنی روح کی تمام بے قراریاں نغمہ کے اتار چڑھاؤ میں، رقص کے توڑ مروڑ میں نکال رہی تھی۔ آہستہ آہستہ نکال رہی تھی کہ یک لخت اس کے اضطراب کا طوفان اس کے قابو سے باہر ہو گیا اور رقص و نغمہ آزاد ہوتے ہی ایک وحشیانہ اشتیاق سے ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی روح اور اس کا جسم نغمہ، رقص میں تحلیل ہو رہا ہے۔ مگر وہ اسی شدت سے ناچے جاتی تھی وہ مہیب رقص فنا۔ گائے جاتی تھی وہی جاں گسل نغمہ فنا۔

تمام دنیا۔ فنا کا رقص۔ ناچ اور نغمہ فنا گا رہی تھی اور کائنات پر رفتہ رفتہ ایک افسردہ تاریکی۔ ایک ملول ویرانی مسلط ہوتی جاتی تھی۔

بہت دور میدانوں کے پاس سے کوہستان کی سب سے بلند چوٹی پر سنسان اندھیری رات میں ایک مرمری جسم دکھائی دے رہا تھا جس کا رقص کسی ٹمٹماتے ہوئے چراغ کے شعلے کی طرح لمحہ بلمحہ مدھم پڑتا جا رہا تھا۔

سید امتیاز علی تاج

اے سرشام مطالعہ کرنے والے! تجھے غالباً معلوم نہیں کہ کوئی تیرے دریچے کے باہر کھڑا ہے۔ ورنہ تیری نگاہوں میں حجاب کی وہ بے پروائی اور تیرے اعضا میں وہ ساختہ بے ساختگی ہوتی جو صرف تیرا ہی حصہ ہے۔

میرا دل تجھ سے یہ نہیں چاہتا کہ تو اپنے اعضا کے اس بے تکلف آرام کو ذرا بھی تکلیف دے میں اس کا آرزومند نہیں کہ تو اپنی نظروں کی آسودگی کو مجھ سے آنکھیں چار کر کے مضطرب بنا لے۔ میری تمنّا یہ نہیں کہ تو ان نازک ہونٹوں کے خاموش سحر کو مجھ سے گفتگو کر کے توڑ دے۔ میری تمنّائیں تو اتنا وسیع ہونا جانتی ہی نہیں۔

ہاں میری ایک خواہش ہے تو اپنی منہمک نگاہوں کو کتابوں پر سے اٹھا لے۔ تو مجھ کو نہ دیکھ خاموشی کو دیکھ تو کچھ بھی نہ دیکھ۔ مجھ کو صرف اتنا اطمینان دلا دے کہ تیرا تخیل کسی ایسے شغل میں مصروف نہیں۔ جہاں تک میری آرزوؤں کی حسرت نہیں پہنچ سکتی۔ تیرا شہپر تخیل اگر آزاد ہو تو مجھے اپنے پژمردہ دل کو فریب دینے کے لئے اتنی امید ہی کافی ہے کہ شاید کبھی وہ تھک ہار کے اپنی بلند پروازی سے۔ بادلوں کی رنگین سرزمین سے اس مایوس انتظار وادی میں بھی اتر آئے جہاں اس کے لئے ایک خاموشی۔ ایک ویرانی کے سوا کچھ نہیں۔ مگر وہ خاموشی جو گویائی سے زیادہ بلیغ ہے۔ وہ ویرانی جو اک محشر اضطراب ہے۔

تاج

بادۂ دوشیں کے دو ساغر

طوطئ ہند علامۂ شبلی نعمانی کے میخانے سے

مرا کشت است و از اندیشه آزاد است پنداری　　چناں بیباک خوں ریزد که جلاد است پنداری

نه بس کز سینه تا لب گشت لبریز شکایت‌ها　　نوائے کز لبم برخاست فریاد است پنداری

نه بس ہر شیوه اش جوید به آئین دگر باشد　　نوازشہائے خاصش نیز بیداد است پنداری

نه بس کز بیم افشای وصفت او در پرده میگویم　　حدیثم از گل و نسرین و شمشاد است پنداری

چنیں کز کوئے او قاصد گراں رفتار مے آید　　ز دستش نامه ام در راه افتاد است پنداری

دو زلفش دام بر دوش و دو چشمش در کمیں سازی　　بداں ساماں ہمی آید که صیاد است پنداری

جہاں برزمی است برہم گشته از آشوب خیزیہا　　ہنوز آں چشم پر فن بر سر کار است پنداری

فریب لطف گفتارست خود کام را نازم　　سخن میگوید از انکار و اقرار است پنداری

تو اے قاصد بایں شکر فشانی ہا نمے ارزی　　به لبہائے تو حرفے از لب یار است پنداری

محبت را بود ہر شیوه آئینے ز جاں بازی　　بمژگاں اشک خوں منصور بر دار است پنداری

خیال بوسه آں لعل نوشیں دوش مے بستم　　ہنوزم لب ز ذوق آں شکر بار است پنداری

بسویم چوں گذر افتاد دوش آں ترک پرفن را　　بگفت ایں خسته جاں جائے گرفتار است پنداری

حریفاں از نگاہِ شوخ او زانگونه بدمستند　　که محفل سر بسر یک بزم خمار است پنداری

بآب و رنگ نظم خویشتن نازد چناں شبلی
که در تعلیم معنی کہنه استاد است پنداری

اصطلاحاتِ علمی

علم کیمیا کی نسبت اہل علم کا بالعموم یہ خیال ہے کہ اس کا تسمیہ اصطلاحات سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ اس اشکال میں اتنا مبالغہ کیا گیا ہے کہ تسمیہ کیمیائی کا نام سنتے ہی ہمارے نوجوانوں کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ اور وہ اور علوم میں بھی جو اس باب میں علم کیمیا کی سی دقتیں نہیں رکھتے وضع اصطلاحات کے نام سے کانپتے ہیں۔ اور ضرورت کے وقت اصطلاحات انگریزی سے ٹوٹا پھوٹا گذارہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو ابتدائی اردو کتابیں طلبہ کے لئے لکھی گئی ہیں ان میں علم نباتات اور علم حیوانات کی نہایت بھدی اور سخت سخت اصطلاحیں داخل کر دی گئی ہیں یہ اصطلاحیں ہمارے بچوں کے مخارج حروف کے لئے ایسی غیر مانوس اور کرخت و کریہ ہیں کہ دلچسپ سے دلچسپ کتابیں بھی محض اس کڑوی آمیزش کی وجہ سے بدذائقہ اور نامرغوب سمجھی جاتی ہیں اور بجز طلبا کے جو امتحان کی ناگزیر حتمی مجبوریوں سے پڑھتے ہیں۔ کوئی پرائیویٹ شخص ان کتابوں کو چھوتا تک نہیں۔

یہ بات اصطلاحات کی خوبیوں میں سے ہے کہ الفاظ اور ان کے مفہوم میں فی الجملہ کوئی مناسبت ہو تاکہ اس مناسبت و تعلق سے ذہن کو ان الفاظ کے محفوظ رکھنے میں مدد ملے لیکن جس صورت میں پڑھنے والے ان الفاظ کے سمجھنے سے ہی عاری ہوں تو ان الفاظ کے مفہوم نحوی و اصطلاحی میں مناسبت تلاش کرنے کی کب نوبت آسکتی ہے۔ مثلاً ہم نے ایک شکل خاص کا نام مثلث قرار دیا تو اس میں یہ سہولت ہے کہ ہم پڑھنے والوں کو اول مثلث کے معنے بتلائیں گے۔ اور پھر الفاظ تثلیث۔ ثلث۔ ثالث وغیرہ کا ذکر کر کے اور یہ جتلا کر کہ ان سب الفاظ کو تین کے عدد سے تعلق ہے۔ لفظ مثلث کا مفہوم مبتدی کے ذہن پر نقش کر سکیں گے لیکن اگر مثلث کی بجائے لفظ ٹرائنگل اختیار کیا جائے تو اول تو یہ مشکل کہ مبتدی کو اس کا صحیح تلفظ کرنے کے لئے منہ کو بہت کچھ ٹیڑھا ترچھا کرنا پڑے گا اور غالباً پھر بھی حق صحت تلفظ ادا نہ ہوگا۔ دوم یہ کہ اگر وہ ادا ہو بھی جائے تو اس کے مفہوم کو ذہن میں منقوش و محفوظ رکھنے کے لئے اسے کوئی مناسبت نہ ملے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسے الفاظ کے یاد کرنے کا تمام تر بوجھ حافظہ پر جا پڑے گا جو بچوں کے دماغوں کے لئے ایک صعوبت شاقہ کا موجب ہوگا۔

مختصر یہ کہ الفاظ اصطلاحات کا قابل فہم ہونا ایک ایسا ضروری امر ہے کہ سوائے شدید مجبوری کے اسے کسی حالت میں نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ تاہم بعض وجوہ سے جن کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں۔ ہندوستانی زبان میں اصطلاحات [illegible] شاید غیر ضروری سمجھا گیا اور انگریزی اصطلاحات کو بے ترجمہ ہندوستانی زبان میں داخل کر دیا [illegible] اور انگریزی کے رنگ ڈھنگ نے خیالات کو بدل دیا ہے ہر شخص آزادی اور خود مختاری [illegible] اس پر قیاس کر کے یہ خواہش رکھتا ہے کہ ہماری مادری زبان بھی اسی قسم کی خود مختاری اور مستقل کا دم کیوں نہ بھرے، اور ہر صیغہ میں عدم تعاون جاری ہو جانے کے بعد ہماری مادری زبان انگریزی کی غلامی میں کیوں پڑی رہے۔ ان حالات میں میں نے مناسب جانا کہ جس طرح محبان وطن لٹھے اور ململ کو چھوڑ کر کھدر ساور دھوتر استعمال کر رہے ہیں اور ان غریبانہ کپڑوں کے استعمال میں انہیں کوئی شرم یا عار نہیں تو اسی طرح ہم اپنی زبان سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ جوڑ جاڑ کر اصطلاحات علمی کا ایک ڈھانچہ کیوں نہ کھڑا کر لیں مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ اگر کوشش کی جائے تو ہماری اس گئی گذری ویسی زبان میں علوم جدیدہ کی ہر قسم کی اصطلاحیں وضع کی جا سکتی ہیں گو وہ عربی کے متانت پسندوں اور انگریزی فیشن کے دلدادہ نوجوانوں کو مرغوب و پسند خاطر نہ ہوں۔

ہم ہندوستانی اصطلاحات جدید کی مثال کے لئے علم کیمیا کو ہی لیتے ہیں جس کا قسمیہ اصطلاحی سب سے مشکل خیال کیا گیا ہے۔ اس علم میں سب سے اول فہرست عناصر مٹی آتی ہے جن کے نام تجویز کرنا وضع اصطلاحات کیمیائی کا پہلا مرحلہ ہے۔ یہ مشکل اس طرح حل ہو سکتی ہے کہ اصطلاحات انگریزی پر غور کر کے ان کی وجہ تسمیہ معلوم کی جائے۔ اس امر پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ عناصر کے نام بالعموم۔ رنگت۔ بو۔ ذائقہ وغیرہ خواص وصفات کی مناسبت سے قرار دیے گئے ہیں۔ مثلاً کلورین ایک وزنی گیس کا نام ہے جس کا رنگ سبزی مائل ہوتا ہے۔ اسی سبزی کی وجہ سے اس کا نام کلورین رکھا گیا ہے۔ کیونکہ اس کے لغوی معنی بھی یہی ہیں۔ بس اس مناسبت سے ہم اپنی زبان میں کلورین کا نام ہریار رکھ سکتے ہیں۔

برومین کے لغوی معنی بو دار کے ہیں اور یہ نام اس کی شدید بو کی وجہ سے تجویز کیا گیا ہے۔ ہم اپنی زبان میں اس کا نام گندنا تجویز کرتے ہیں۔ آیوڈین ایک بحری نباتاتی چیز ہے جس کا رنگ نیلگوں یا سوسنی ہوتا ہے اور یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ ہم اس کا نام بنفشک تجویز کرتے ہیں۔

آکسیجن کے لغوی معنی ہیں کھٹاس پیدا کرنے والی چیز۔ ایک زمانہ میں اہل کیمیا کا یہ یقین تھا کہ ترشی کی

تولید میں آکسیجن کا ہونا لابدّ ہے۔ اس لئے اس کا نام اس خیال کے مطابق آکسیجن رکھا گیا تھا لیکن اب یہ خیال غلط ثابت ہو گیا ہے۔ اس لئے اس کے ترجمے میں ہمیں غلط خیال کی پیروی نہیں کرنی چاہئے۔ آکسیجن کے متعلق جو صحیح بات ہے وہ یہ ہے کہ اس کے بغیر کوئی چیز جل نہیں سکتی یعنی وہ آگ پیدا کرنے والی ہے۔ اس لئے میری رائے میں اسے اگنیجن کہنا بہت ٹھیک ہے۔ اس نام میں یہ بھی خوبی ہے کہ انگریزی اصطلاح کی طرح اس کے نام کے آخر میں علامت جن بھی موجود ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ یہ جن انگریزی اصطلاح کا بقیہ نہیں ہے بلکہ یہ ہندی مصدر جننا کے مشتقات سے ہے یعنی آگ جننے والی یا آتش زا۔

علیٰ ہذا القیاس نائٹروجن کے لئے شورجن۔ ہیڈروجن کے لئے پیجن۔ کاربن کے لئے جو حقیقت میں کوئلہ ہے کولن نام تجویز کرنا بالکل مناسب ہے۔

انھیں امور کو مدنظر رکھ کر باقی عناصر کے لئے مناسب مناسب نام قرار پا سکتے ہیں۔ مثلاً سوڈا کے لئے کھار۔ پوٹاس کے لئے سجیا۔ فاسفورس کے لئے چمکنی وغیرہ وغیرہ۔

وضع اصطلاحات کیمیائی میں دوسرا مرحلہ عناصر کے مرکبات کے تسمیہ کا ہے۔ ان مرکبات کی یہاں تفصیل کرنا کہ سلفیورس سلفیورک سلفنٹ سلفائٹ سلفائڈ میں کیا کیا فرق ہے ایک کیمیائی بحث ہے جس کا ذکر اس جگہ فضول ہے۔ یہاں بطور نمونہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ ان علامات کے مقابل میں اسی قسم کی علامات ہندوستانی زبان میں بھی تجویز کی جا سکتی ہیں۔ ہندوستانی زبان میں ایسے حروف و کلمات بکثرت پائے جاتے ہیں جن کے الحاق سے ایسی اصطلاحات بآسانی بن سکتی ہیں۔ مثلاً سلفر کے لئے گندھک نام تجویز کرکے ایسڈ سلفیورک کو تیزاب گندکی سلفیورس کو گندکیہ سلفیٹ کو گندگین سلفائٹ کو گندکیہ سلفائیٹ کو گندکان کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح کلورین کا نام ہریا تجویز کرکے کلورک کو ہردی۔ کلوریٹ کو ہردین۔ ہیڈروکلورک کو پنہردی کہہ سکتے ہیں۔ کاربن کا نام کولن فرض کرکے کاربانک کے لئے کوبی اور کاربنٹ کے لئے کولین بائی کاربانٹ کے لئے دکولین نام تجویز ہو سکتے ہیں۔ دکولین میں عنصر کاربن کی مقدار دگنی ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا نام دگ کولین رکھا گیا ہے اور سہولت تلفظ کے لئے اسے دکولین کر دیا گیا ہے۔۔۔

علم طبعیات میں بجلی کے متعلق انگریزی کی پازیٹو اور نیگیٹو کی بہت مشہور اصطلاحیں ہیں۔ جن کا ترجمہ پہلے برق موجبہ اور برق سالبہ کیا جاتا تھا۔ پھر بعض مترجمین نے ان کی بجائے مثبت اور منفی الفاظ

تجویز کئے ۔ اس کے بعد انگریزی اصطلاحیں بے ترجمہ اختیار کر لی گئیں ۔ میں اپنے سودیشی اصول کے مطابق ان کے نام اُڑتی بجلی اور اُجڑتی بجلی رکھنا زیادہ مناسب سمجھتا ہوں ۔

ہماری تجویز کی ہوئی ان اصطلاحوں پر بعض اہل فیشن ہنسیں گے خصوصاً وہ جن میں ضاحک ہونے کے سوا باقی فضائل بدنصیبی سے مفقود ہیں ۔ یا وہ جنھوں نے زندگی کے ہر سامان آسائش میں انگریزی وضع اختیار کرنی پسند کی ہے اور جنھیں ہر دیسی چیز سے نفرت ہے ۔ مگر ہمیں ایسے اوچھوں اور ناسمجھوں کی ہنسی کی کچھ پروا نہیں ۔ ہم نے اپنی دانست میں جو بات صحیح اور اہل وطن کے لئے مفید پائی ہے وہ بلا خوف ملامت لکھدی ہے ۔ اب اس پر چاہے کوئی روئے یا ہنسے ۔

شاہ عالم کے زمانے میں سید انشاءاللہ خان انشاء نے مختلف علوم کی اصطلاحات کو ہندوستانی زبان میں لانے کی کوشش کی تھی ۔ ان کی کتاب دریائے لطافت کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی ذہانت اور طباعی سے کیسی مختصر اور موزون و پُر معنی اصطلاحات عروض و منطق کے لئے وضع کی تھیں وہ زبان اردو کے فروغ کا ابتدائی زمانہ تھا ۔ اس وقت کے لوگ سید صاحب ممدوح کی راہ پر پڑ جاتے تو ادب اردو کی ترقی کی ایک نہایت مفید راہ کھل جاتی ۔ مگر افسوس ان دنوں آفتاب علم برسر اوج نہ تھا اور سرکار وقت مشاغل علمی کی مساعد نہ تھی ۔ وہ خیال رنگیلوں کی ظرافت اور لطائف کے رنگ میں رنگا گیا اور اس سے بجز تفنن طبع اور نُقل مجلس کے کوئی مفید کام نہ لیا گیا ۔ مگر اب زمانہ متانت و تحقیق و تدقیق کا ہے ۔ ہم اہل فکر سے امید رکھتے ہیں کہ وہ مسئلہ تسمیہ اصطلاحات علمی میں داد انتقاد دیں گے اور ہماری تجویز میں اصولاً یا فروعاً اگر کوئی سقم ہوں تو ان سے ہمیں آگاہ فرما دیں گے یا اگر کوئی صاحب اس طریق سے بہتر کوئی طریق تسمیہ ایجاد کر سکتے ہیں تو وہ براہ عنایت اس کو پیش کر کے دکھائیں ۔ تا کہ علم دوست اہل وطن کو اس مسئلہ کے ہر پہلو پر بخوبی غور کرنے اور بہترین طریق تسمیہ اختیار کرنے کا موقع ملے ۔

میں نے سنا ہے کہ حیدرآباد کی جدید یونیورسٹی نے اس طرف کچھ توجہ کی ہے اور بعض اصحاب ذی علم سے اس باب میں مشورہ بھی لیا ہے ۔ مگر مجھے معلوم نہیں کہ کن بزرگوں سے مشورہ لیا گیا ۔ اور ان صاحبان نے یونیورسٹی کو کیا مدد دی ۔ بہرحال یہ ایسا کام ہے جس کی طرف اس سودیشی کی تحریک کے زمانے میں اہل ملک کو خاص توجہ کرنی چاہیئے ۔

خاکسار سید ممتاز علی لاہور

ایطاء

محقق طوسی علیہ الرحمتہ معیار الاشعار کے فن دوم کی فصل اول میں نسبت قافیہ تحریر فرماتے ہیں (۱) ہو سکتا ہے کہ بلحاظ تمامی ہر بیت قافیہ کا اطلاق پورے قصیدہ پر کریں۔ یہ اطلاق بطور توسع و مجاز ہوگا (۲) یہ بھی ممکن ہے کہ کلمات متشابہ الاواخر کو جو آخر ابیات میں آئیں قافیہ کہیں کیونکہ یہ کلمات مشتمل بر قافیہ ہوتے ہیں (۳) یہ بھی درست ہے کہ صرف ایک حرف کو جو اصل قافیہ ہے اور جس کو روی کہتے ہیں قافیہ کہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ خلیل واضع علم عروض اور دیگر علمائے لغت عرب نے جنھوں نے قافیہ کو نظر دقیق سے دیکھا ہے تعریف قافیہ یوں لکھی ہے قافیہ ان کل حرکات اور حروف کو کہتے ہیں جو حرف ساکن آخر بیت سے لے کر ایک اور ایسے ساکن مقدم تک آتے ہیں جس پر ایک حرکت مقدم ہوتی ہے۔ مثلاً صبا یا اور کا تبا میں الف آخر ساکن ہے اور اس سے مقدم ایک الف اور ساکن ہے۔ اور ان الفوں کے درمیان دو دو حرف متحرک ہیں اور حرکات صاد و کاف اس مجموع کا نام قافیہ ہے"۔ پھر کچھ آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں "اگر کوئی تعریف قافیہ مقرون بہ تحقیق چاہتا ہے تو یہ تعریف ہو سکتی ہے۔ "قافیہ بحسب اصطلاح اس مجموعہ کا نام ہے جو مرکب ایک یا کئی حروف سے ہو جن کا آخر ابیات یا مصاریع کے کلمات متشابہ میں مکرر یا بحکم مکرر لانا واجب ہو۔ اور وہ حرف جو ان حرفوں کے درمیان آتا ہے اور وہ حرکتیں جو اس حرف یا حروف سے تعلق رکھتی ہیں یہ بھی داخل قافیہ ہیں۔

علمائے فن قافیہ میں سے کچھ نے تاسیس و دخیل و ردف و روی و وصل و خروج چھ حرف قافیہ بتائے ہیں جن میں سے جو میں نے لفظ روی سے پہلے لکھے ہیں وہ حرف روی سے پہلے آتے ہیں اور جو بعد میں لکھے ہیں وہ روی کے بعد آتے ہیں اور کچھ نے تاسیس و دخیل و ردف و قید[^1] و روی و وصل و خروج و مزید و نایرہ نو حروف قافیہ لکھے ہیں اور چھ حرکتیں رس و اشباع و حذو و توجیہ و مجری و نفاذ بتائی ہیں جن میں سے توجیہ و مجری کا ذکر میرے اس مضمون میں آئے گا۔ اس لئے ان کی تعریفیں لکھتا ہوں توجیہ حرکت ماقبل روی اور مجری حرکت

[^1]: قید کا نام روف غیر اصلی رکھنا زیادہ مناسب ہے۔ ورنہ حرکت ماقبل قید کا نام اور ایجاد کرنا پڑے گا ۱۲ شاداں

روی متحرک کو کہتے ہیں۔

(اب جو لکھتا ہوں اس بیان میں لحاظ قوانی عربی گویا نہیں ہے) چونکہ قافیہ علاوہ روی و حرکت توجیہ باقی حروف و حرکات قافیہ سے خالی بھی ہوتا ہے جیسے قافیہ خنجر و نشتر و گل و دل اس سے ثابت ہے کہ تحقق نفس قافیہ توجیہ و روی ہی پر مبنی ہے اور دیگر حروف قافیہ کا آنا ایک امر عارضی ہے۔ لہذا تعریف ذات شے میں امر عارض کا لحاظ کرنا کچھ ضروری نہیں پس تعریف قافیہ یوں ہونا چاہئے" قافیہ نام مطابقت حرکت ماقبل روی اور حرف روی کا ہے جس کو آخر یا بحکم آخر ابیات و مصاریع میں مختلف از روئے لفظ یا معنی مکرر لاتے ہیں" یہی وجہ ہے کہ جب قوم کی تقسیم قافیہ باعتبار حروف قافیہ محقق طوسی نے دیکھی تو انھیں لکھنا پڑا کہ" اگر اس تقسیم قافیہ کو بطور مانعۃ الخلو مانیں یعنی قافیہ ان اقسام سے خالی نہیں ہوتا تو صحیح ہے اور اگر بطریق مانعۃ الجمع کہیں تو غلط ہے"

پھر اگر روی سے پہلے حروف روف اصلی یا غیر اصلی ہوں جو ساکن ہوا کرتے ہیں تو حرکت توجیہ کا بھی وجود نہیں رہتا اور جب خود روی متحرک ہو تو اس کے ماقبل کی کسی حرکت یا حرف کی مطابقت کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ لہذا تعریف قافیہ یوں ہونا چاہئے۔ قافیہ روی اور اس کے ماقبل حرکت و سکون میں موافق ہونے کا نام ہے جس کو الخ

فن دوم کی فصل دوم میں جناب محقق نے تعریف روی اس طرح لکھی ہے" روی وہ حرف مکرر ہے جس پر بنائے قافیہ منحصر ہے" اور فصل سوم میں تحریر فرماتے ہیں" کوئی شعر مقفیٰ روی سے خالی نہیں ہوتا" میں نے جو تعریف قافیہ لکھی ہے اس میں ضمناً تعریف روی بھی آگئی ہے اور بیانات مختلفہ اہل فن سے بالتبعیت پائی جاتی ہے۔ مگر بعض تشریحات ضروریہ اہل فن سے یا تو فرو گذاشت ہو گئے ہیں یا ایک جگہ نہیں پائے جاتے اس لئے ان کا اظہار فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

بہترین روی وہ ہے۔ جو حرف اصلی یا جزو مستقل کسی لفظ کا ہو۔ جیسے قوانی نشتر و خنجر میں رے۔ اور مال و حال میں لام لیکن حرف غیر اصلی اور غیر مستقل کو بھی روی قرار دے سکتے ہیں۔ اس صورت میں حرف روی اصل لفظ کے جزو زائد میں ہوگا۔ یہ جزو زائد کلمہ ثنائی و ثلاثی و رباعی و خماسی بھی ہوتا ہے جیسے الفت و حسرت میں صرف ایک حرف تائے مصدری زیادہ ہے اور روی اور خرابات میں الف و تائے جمع اور پاسبان میں کلمہ بان اور بوستان میں ستان اور ہندوستان میں وستان حروف و کلمات زوائد ہیں۔ حروف زوائد یا

حصل میں سے جس حرف کو جی چاہے۔ شاعر روی قرار دے سکتا ہے اور تعیین روی شاعر کے تیسرے چوتھے اور پانچویں قافیہ کے لانے سے ہوتی ہے۔ مثلاً کوئی قافیہ آزار اور بازار نظم کرے تو ہم زائے معجمہ اور رائے مہملہ میں سے ہر ایک کو روی کہہ سکتے ہیں۔ اگر تیسرا اور چوتھا قافیہ راز آراور ساز آر لایا جائے تو زائے معجمہ ہی روی ہوگی اور کلمہ آر داخل ردیف ہوگا۔ اور اگر گفتار و کردار قوافی لائے جائیں تو رائے مہملہ روی ہو جائے گی اور اگرچہ ازار و گیار زار قوافی ان کے ساتھ لائے جائیں تو الفات اول روی ہوں گے اور کلمات بواقی داخل ردیف اور اس قسم کے قوافی کو قافیہ مرکب کہنا انسب ہے۔

بعد تعریف قافیہ و روی ایطا کی طرف رجوع کرتا ہوں جس کے واسطے یہ مضمون لکھا گیا ہے محقق نے معیار کے فن دوم کی فصل پنجم در بیان عیوب قوافی میں تعریف ایطا یوں تحریر فرمائی ہے "ایطا و آن اعادۂ قافیہ بود چندانکہ تکرار قافیہ بیکبار گرچہ نزدیک تر بود قبحش زیادہ باشد" پھر فصل ہشتم میں لکھتے ہیں "جب قافیہ مرکب کا جز و زائد مکرر ہو اور سب جگہ تکرار ایک ہی معنی میں ہو تو ایسے قافیہ کو شایگان کہتے ہیں مثال قافیہ شایگان کی اسپان و مردان میں الف و نون جمع ہے اور نگران و جویان میں بمعنی فاعل اور سرہا و دستہا میں الف و ہائے جمع اور اسپے و مردے میں یائے مجہول برائے وحدت یا تنکیر اور گوید و کند میں دال استقبال قافیہ میں استعمال شایگان جائز نہیں اور تحقیق کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ایک قافیہ شایگان کا استعمال جائز ہو مثلاً ایسے قصیدہ میں جس کے قوافی نہان، کران، جہان ہوں۔ ایک قافیہ اسپان بھی لے آئیں مگر دوسرا قافیہ الف و نون جمع والا مثلاً خران لانا ناروا ہے کیونکہ الف و نون اسپان و خران دونوں میں جمع کا ہے۔ لہذا قافیہ مکرر ہو جائے گا اور علت قبح ایطا میں تکرار قافیہ بیک معنی ہے لیکن شعرا نے شایگان سے احتراز کیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک قافیہ بھی نہیں لاتے جس کا لانا جائز ہے۔ کیونکہ قبح ایطا بہت مشہور ہے مگر شعر مردف میں لے آتے ہیں۔ کیونکہ ردیف سے عیب قافیہ چھپ جاتا ہے اور شعر مردف میں بھی ایک سے زیادہ نہیں لاتے ہیں۔ زبان عربی میں بھی لحاظ ایطا چاہئے جیسا کہ مسلمات و مومنات و ضربت و نصرت اور ضمائر وغیرہ میں۔ مگر قدما اس سے غافل تھے اور متاخرین جو شعر آراستہ کہتے ہیں۔ ایطے کا اعتبار کرتے ہیں"

اس بیان سے مجھے کچھ اختلاف نہیں صرف کچھ تشریح چاہتا ہوں۔ تعریف ایطا میں فرمایا ہے "و آن اعادۂ قافیہ بود" اعادہ کے دو ہی معنی ہو سکتے ہیں (۱) جبکہ روی حرف اصلی لفظ قافیہ کا ہو تو اعادہ سے مراد تکرار لفظ قافیہ بعینہ ہوگی خواہ یہ تکرار مطلع کے دونوں مصرعوں میں ہو یا بغیر بعد مسافت پھر وہی قافیہ

لفظاً و معناً مکرر لایا جائے۔ اردو میں اب سوائے مطلع کے اور کسی شعر میں اعتبار ایطا نہیں کیا جاتا بلکہ ایک ہی قافیہ میں پوری غزل کہنا ہنر سمجھا جاتا ہے۔ بحالت روی اصلی اور کوئی صورت اس کے سوا وقوع ایطا کی نہیں ہے۔ (۲) جبکہ روی حرف غیر اصلی کسی لفظ کا ہو اور وہ حرف زائد ایک سے زیادہ بھی نہ ہو تو اعادہ کے معنی تکرار روی غیر اصلی بیک معنی ہوں گے اور اگر روی غیر اصلی ایسے کلمہ غیر مستقل میں ہو جو ثنائی ثلاثی رباعی یا خماسی ہے تو تکرار بیک معنی کا اعتبار پورے کلمہ غیر مستقل میں کیا جائے گا۔ کیونکہ ایسی حالت میں تنہا روی کو نہ متحد المعنی کہہ سکتے ہیں اور نہ مختلف المعنی۔ اس لئے کہ وہ جزو کلمہ غیر مستقل ہے اور وہ پورا کلمہ غیر مستقل کسی معنے کے لئے آیا ہے نہ روی تنہا۔ مثلاً کہا اور سنا کے قوافی میں صرف بلحاظ الفات ماضی ایطا رہے اور اسپان و خران میں الف و نون دونوں کا اعتبار کیا جائے گا۔ کیونکہ اتحاد معنوی بلحاظ الف و نون جمع ہے نہ بنون تنہا۔

تعریف ایطاء میں دوسرا لفظ قابل غور قافیہ ہے۔ اگرچہ بیان مذکورہ بالا میں تحدید معانی لفظ قافیہ ضمناً ہو گئی ہے۔ مگر علیحدہ بھی لکھے دیتا ہوں (۱) جبکہ روی حرف اصلی کسی لفظ کا ہو تو قافیہ سے مراد پورا لفظ قافیہ ہو گا (۲) اور اگر روی غیر اصلی ایک ہی حرف ہو تو قافیہ سے مراد صرف یہی حرف روی غیر اصلی ہو گا (۳) اور اگر روی ایسے کلمہ زائد میں ہو جو ایک سے زیادہ حرف سے مرکب ہے تو قافیہ سے مراد یہ پورا کلمہ زائد ہو گا۔

ایطا کی ایک شناخت بھی ہے جو اس فن کی کتابوں میں تو نظر سے نہیں گذری۔ مگر سینہ بہ سینہ چلی آتی ہے جس کو میں نے اپنے استاد جناب مولوی سید محمد مصطفیٰ صاحب خورشید لکھنوی المعروف بجناب میر لوی لڈن صاحب اعلی اللہ مقامہ سے سنا ہے اور وہ یہ ہے "روی حذف کرنے کے بعد اگر لفظ بامعنی رہے تو ایطا ہے ورنہ نہیں"۔ میں نے اس شناخت میں کچھ قیود بڑھا دئے ہیں تاکہ اس میں جامعیت پیدا ہو جائے اور وہ یہ ہے۔ جبکہ روی[۱] غیر اصلی ایک ہی حرف ہو تو صرف اسی کو۔ اور اگر ایک[۲] سے زیادہ والے کلمہ میں روی غیر اصلی ہو تو اس پورے کلمہ زائد کو حذف کرو۔ اگر بعد حذف دونوں الفاظ قافیہ بامعنی رہیں تو ایطا ہو گا۔ اور اگر ایک بھی بعد حذف بے معنی ہو جائے تو ایطا نہ ہو گا۔ اور اگر تعداد[۳] حروف کلمات زوائد غیر مساوی ہو تو وقت حذف تساوی حذف کا لحاظ نہایت ضروری ہے۔ مثلاً داتا اور بینا میں الف فاعلی ایک ہی حرف زائد روی غیر اصلی ہے۔ اس کو حذف کیا تو دان اور بین الفاظ بامعنی باقی رہے۔ لہذا الف آخر کو روی قرار دینے سے ان قوافی میں ایطا ہے اور بوستان و گلستان میں سے کلمہ زائد ثلاثی ستان حذف کیا جائے کا جس میں نون

روی ہے تو بو اور رنگ الفاظ بامعنی باقی رہیں گے۔ لہذا ان قوافی میں بھی ایطا رہو گا۔ حکیم ابوالحسن زلالی نے اپنی مثنوی کی توحید اوّل میں یہ شعر کہا ہے ؎

فلک گرد سے ز راہ پاسبانش	گہر آبے ز اشک مفلسانش

اس شعر میں پاسبان مرکب از پاس۔ بان۔ اور مفلسان مرکب از مفلس ان۔ الفاظ قوافی ہیں اور نون روی ہے۔ بنا بر تعریف ایطا اس میں ایطا نہیں۔ کیونکہ بان کلمہ حفاظت ہے جس میں روی نون ہے۔ اور دوسرے مصرع میں الف و نون جمع ہے جس میں روی نون ہے۔ لہذا اختلاف معنی کی وجہ سے ایطا نہ ہوا۔ چونکہ روی کلمات غیر مستقل میں ہے۔ اس لئے شناخت مذکور بھی ان قوافی پر منطبق ہونی چاہیئے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اگر پاسبان میں سے کلمہ ثلاثی بان کو جو زائد ہے حذف کریں تو پاس باقی رہے گا۔ چونکہ اس میں سے تین حرف حذف کئے ہیں۔ لہذا مفلسان میں سے بھی تین ہی حرف حذف کریں گے تو مفل باقی رہے گا مفلسان میں سے جو باقی رہا وہ بے معنی ہے اور ایک قافیہ بعد حذف بے معنی ہو گیا۔ لہذا ایطا نہیں اور اگر مفلسان میں سے کلمہ ثنائی۔ آن زائد کو حذف کریں تو اس کی مطابقت کے لئے پاسبان میں سے بھی دو ہی حرف حذف کرینگے یوں پاسب لفظ بے معنی باقی رہے گا۔ پھر بھی ایطا نہ ہو گا۔ یہ وجوہ ہیں جو شناخت میں کچھ قیود بڑھانے کی ضرورت لاحق ہوئی ورنہ شناخت مشہور ہر جگہ منطبق نہیں ہوتی ہے۔ غرضکہ بعد ان قیود و شرائط کے یہ شناخت کامل العیار رہے اور بلا تامل ہر جگہ منطبق ہوتی ہے۔

بعد حذف لفظ کے بے معنی ہو جانے کے یہ معنی یہ ہیں کہ اصل لفظ قافیہ جن معنوں میں مستعمل ہوا ہے بعد حذف زوائد اسی سے مشتق اور ماخوذ معنے باقی نہ رہیں۔ بعد حذف اگر کسی معنی غیر کا کوئی لفظ پیدا ہو جائے تو اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ ایسی حالت میں بھی ایطا نہ ہو گا مثلاً سما گیا اور بہا گیا قوافی نظم کئے جائیں سما جانے کے معنے کسی شئے کا کسی شئے میں اس طرح آ جانا کہ بڑھے نہیں اور بہا جانے کے معنے پسند آنا نظم کئے جائیں اور تطبیق شناخت ایطا کے لئے دونوں سے الف حذف کئے جائیں تو سما میں سے سم باقی رہے گا جس کے معنی ایک قسم کی تال کے ہیں اور عربی میں زہر کو کہتے ہیں اور بہا سے بعد حذف الف روی بہ رہتا ہے جو بہنا بمعنی ریختن و سیلان سے اس امر کا صیغہ ہے لیکن یہ معانی معنی مقصود سے غیر ہیں اسلئے باوجود بامعنی باقی رہنے کے ان قوافی میں ایطا نہیں اور اگر کہا۔ رہا بہا اور بہا بہا باہمد گر قوافی کئے جائیں تو ایطا نہیں۔

اب میں وہ تعریف ایطاء لکھتا ہوں جس کو صاحب احسن القواعد نے لکھا ہے اور ایک معزز مہربان کی تحریر سے ایسا مترشح اور متبادر ہوتا ہے کہ جناب مفتی سعد اللہ صاحب شارح معیار الاشعار بھی اسی تعریف کے قائل ہوئے ہیں (اس مضمون کے لکھتے وقت میزان الافکار پاس نہیں) اور یہی تعریف اس مضمون کے لکھنے کی محرک ہوئی ہے۔ وہ تعریف ایطاء یہ ہے "بعد حذف زوائد روی کا نام ایطاء ہے"۔ بعض ہمعصر ماہرین علم قافیہ سے بھی یہ تعریف میرے سننے میں آئی۔

مجھے اس تعریف سے ادنیٰ موافقت نہیں۔ مخالفت کے بعض اسباب حسب ذیل ہیں (۱) دار مدار اس تعریف ایطاء کا اختلاف روی پر ہے اور تعریف اکفاء یوں بتاتے ہیں "و آں اختلاف حرف روی باشد بے اعتبار قرب مخرج" (معیار) لہذا ایطاء و اکفاء دونوں ایک ہوگئے۔ ان کو دو عیب الگ الگ کیوں قرار دیتے ہیں (۲) مصنفین فن قافیہ میں سے اکثر نے دانا و بینا میں ایطاء رکھا ہے۔ اس تعریف کو مان کر دانا و بینا میں ایطاء کیونکر ہوگا۔ کیونکہ ان دونوں کے الف فاعلی جو زائد ہیں اگر حذف کریں تو دونوں میں نون باقی رہتے ہیں جو متحد ہیں مختلف نہیں۔ جب شرط تعریف ایطاء اختلاف روی نہ پائی گئی تو ایطاء نہ ہوا۔ اگر عیب اختلاف ردف بالفرض پیدا بھی ہو جائے تو وہ قابل اعتنا نہیں۔ کیونکہ قوم تو ان قوافی میں ایطاء بتاتی ہے اور میں کہتا ہوں کہ نون کو روی مان کر ان قوافی میں کوئی عیب ہی نہیں ہوتا کیونکہ جب روی متحرک ہے تو اس سے ماقبل کے حروف و حرکات قافیہ ہی نہیں جیسا کہ فن دوم کی فصل دہم میں محقق تحریر فرماتے ہیں "اگر قوافی اختر و عنصر و شاعر کی راے روی کو متحرک کر کے اختری و عنصری و شاعری قوافی کردیں تو یہاں حرکات ماقبل راے مہملہ حرکات توجیہ نہیں بلکہ حساب قافیہ سے خارج ہیں۔ لہذا ان قوافی سے عیب اختلاف توجیہ برطرف ہو جائے گا" (۳) کسی مطلع کے دونوں مصرعوں میں لفظ عین بمعنی چشم یا منبع بمعنی پسندیدہ قافیہ کریں تو سب کے نزدیک ایطاء جلی ہے۔ مگر اس تعریف زیر بحث سے ایطاء نہیں قرار پاتا۔ اگر یہ جواب دیا جائے کہ تعریف میں حذف زوائد کے بعد اختلاف روی کو ایطاء کہا گیا ہے اور یہاں زوائد ہی نہیں یہ جواب کافی نہیں اس لئے کہ تعریف ایسی ہونی چاہیے جو ہر ایطاء والے قافیہ پر صادق آئے۔ حالانکہ یہ تعریف ایطاء یعنی "اعادۂ قافیہ" یہاں بھی صادق آتی ہے اور میں نے اپنے بیان میں اعادہ قافیہ کو ہر ایطاء کی تعریف کہا ہے اور حذف روی کے بعد لفظ بامعنی رہنے کو شناخت ایطاء بتایا ہے جبکہ روی غیر اصلی ہو۔ لہذا مجھ پر یہ اعتراض عائد نہیں ہوتا (۴) اکثروں نے تقسیم ایطاء جلی و

خفی سے کی ہے۔ اس تعریف کو مان کر یہ تقسیم کیونکر ہو سکتی ہے۔ کیونکہ زوائد تو حذف کر دئیے جاتے ہیں اور جلاء وخفاء ترکیب جو کچھ ہے وہ انھیں زوائد میں ہے اور اس تعریف کا دارومدار اختلاف روی پر ہے۔ اعادہ وتکرار قافیہ بیک معنی اس تعریف میں علت ایطاء نہیں (۵) قوافی پاسبان ومفلسان میں سے اگر زوائد بان اور ان کو اس تعریف کی بنا پر حذف کریں تو بوائی پاس اور مفلس آپس میں قافیہ نہیں ہو سکتے پھر اختلاف حرف مابعد روی ناجائز ہے۔ یہاں سین روی کے بعد ایک میں با سے موحدہ اور دوسرے میں الف ہے۔ پھر ایک میں بعد روی تین حرف اور ایک میں دو حرف ہوتے ہیں۔ ان تین نقصانات عظیم کی وجہ سے یہ قوافی کیونکر صحیح ہوں گے۔ حالانکہ ان کی صحت کا انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ تعریف کے غلط ہونے کا سبب ہے جو نتائج غلط وبرعکس برآمد ہوتے ہیں۔

فائدہ کوئی دو لفظ باہم گر قافیہ ہو ہی نہیں سکتے جب تک کہ ان میں تکرار۔ روی نہ پائی جائے۔ کیونکہ تحقق ذات قافیہ کم از کم روی پر مبنی ہے جیسا کہ تعریف روی "حرفیست مکرر کہ بنائے قافیہ براوست" و ہیچ شعر مقفی خالی از روی نتواند بود۔ سے ظاہر ہے۔ پھر عیب اکفاء میں تو بوجہ اختلاف روی تحقق قافیہ ہی نہیں ہوتا۔ لہذا اسے قافیہ معیوب کیوں کہتے ہیں۔ پہلے تو تحقق ذات ہونا چاہئے۔ اس کے بعد عیب ہنر کچھ بتایا جائے۔ یہاں تو ذات ہی ندارد ہے۔ لہذا اکفاء والے شعر کو شعر غیر مقفی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

فائدہ - ایطاء کی تقسیم اکثروں نے خفی وجلی سے کی ہے اور خفی الترکیب وجلی الترکیب سے تعریف کی ہے وضوح وخفائے ترکیب کا انحصار علم اشخاص پر ہوگا۔ تعریف میں جب علم اشخاص کو دخل ہوگیا تو ممکن ہے کہ کوئی شخص لفظ واضح الترکیب کی ترکیب کو جانتا ہو۔ اس لئے جو ایک کے نزدیک واضح الترکیب ہو۔ وہ دوسرے کے نزدیک خفی الترکیب ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ کوئی مصنف دانا وبینا میں ایطاء جلی کہتا ہے اور کوئی ایطاء خفی۔ اسی بنا پر محقق طوسی نے ایطاء کی تقسیم جلی اور خفی سے نہیں کی۔ یہ قسمیں بعد میں بربنائے توسع میدان شاعری نکالی گئی ہیں +

شادان بلگرامی

حالی کی کہانی حالی کی زبانی

(جو نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین صاحب بلگرامی کی فرمائش سے لکھی گئی)

میری ولادت تقریباً ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں بمقام قصبہ پانی پت جو شاہجہان آباد کو جانب شمال ۵۳ میل کے فاصلہ پر ایک قدیم بستی ہے واقع ہوئی۔ اس قصبہ میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ جس سے راقم کو تعلق ہے آباد چلی آتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں جبکہ غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر متمکن تھا شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ پیر ہرات کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام جو علوم متعارفہ میں اپنے عام معاصرین سے ممتاز تھے۔ ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے جن کا سلسلہ نسب ۲۶ واسطہ سے حضرت ابو ایوب انصاری تک اور ۱۸ واسطہ سے شیخ الاسلام تک اور ۱۰ واسطہ سے ملک محمد شاہ [illegible] ملقب بہ آل خواجہ [illegible] تک پہنچتا ہے۔ چونکہ غیاث الدین اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا ہے۔ اور اس کا بیٹا سلطان محمد علماء و شعراء و دیگر اہل کمال کا حد سے زیادہ قدردان تھا۔ اس لئے اکثر اہل علم اور عالی خاندان لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان میں چلے آتے تھے۔ اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفر ہندوستان پر آمادہ کیا تھا چنانچہ سلطان غیاث الدین نے [illegible] دیہات پرگنہ پانی پت میں اور بہت سی اراضی سواد قصبہ پانی پت میں بطور معاش کے [illegible] آبادی قصبہ پانی پت وجہ سکونت کے ان کو عنایت کی اور منصب قضا و صدارت و خطابت [illegible] ان سے متعلق کر دی۔ پانی پت میں جو ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ [illegible] اولاد سے منسوب ہے۔ میرا باپ کی طرف سے اسی شاخ [illegible] ایک [illegible] گھرانے کی جو سادات شہداپور کے نام سے مشہور [illegible]

میری ولادت کے بعد میری والدہ کو دماغی خلل ہو گیا تھا [illegible] میں نو برس کا تھا۔ اس لیے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہ پایا [illegible]

مجھکو قرآن حفظ کرایا۔ اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا۔ ایک بزرگ سید
جعفر علی مرحوم جو میر ممنون دہلوی کے بھتیجے اور نبیرۂ داماد بھی تھے اور بوجہ تعلق زنان شوئی کے پانی پت میں مقیم تھے اور فارسی لٹریچر اور تاریخ و طب میں
ید طولیٰ رکھتے تھے ان سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک گونہ مناسبت پیدا ہو گئی۔ پھر عربی کا شوق ہو گیا۔ انہیں
دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے اجازت کی سند لے کر آئے ہوئے تھے ان سے صرف و نحو پڑھنی
مگر چند روز بعد بھائی اور بہن نے جن کو میں بمنزلہ والدین کے سمجھتا تھا تاہل پر مجبور کیا۔ اس وقت میری عمر ۱۷ برس کی تھی
اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گذارہ تھا کہ یہ بوجھ میرے کندھے پر رکھا گیا۔ اب بظاہر تعلیم کے رستے چاروں
طرف سے مسدود ہو گئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکا
آسودہ حال تھا۔ میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ
ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے پڑھیں۔ اگرچہ اس وقت
قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا مگر جس سوسائٹی میں میں نے نشوونما پائی تھی وہاں صرف عربی اور فارسی زبان میں منحصر
سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم کا خاصکر پانی پت میں اول تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہ آتا تھا اور اگر اس کی نسبت لوگوں کا
کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے۔ نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے بلکہ برخلاف
اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علما جہلا کہتے تھے۔ دلی پہنچکر جس مدرسہ میں مجھکو شب و روز رہنا پڑا وہاں کے
مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں
نہ گذرتا تھا۔ ڈیڑھ برس دلی میں رہنا ہوا۔ اس عرصہ میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ ان لوگوں سے
کبھی ملنے کا اتفاق ہوا جو اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے جیسے مولوی ذکاء اللہ۔ مولوی نذیر احمد۔ مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ

میں نے دلی میں شرح سلم ملا حسن اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے
چار ناچار مجھکو دلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر سنہ ۱۸۵۵ء کا ہے۔ دلی سے آکر برس ڈیڑھ برس تک پانی پت
سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ سنہ ۱۸۵۶ء میں مجھے ضلع حصار
میں ایک قلیل تنخواہ کی آسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی لیکن سنہ ۵۷ء میں جبکہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں
برپا ہوا۔ اور حصار میں بھی اکثر سخت واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عملداری اٹھ گئی تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا
اور قریب چار برس کے (پانی پت میں) بیکاری کی حالت میں گذرے۔ اس عرصہ میں پانی پت کے مشہور فضلاء
مولوی عبدالرحمن، مولوی محب اللہ اور مولوی قلندر علی مرحوم سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ کی

حدیث کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاصکر علم ادب کی کتابیں شروح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم و نثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا۔ مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا۔ میری عربی اور فارسی تحصیل کا منتہا صرف اسی قدر ہے جس قدر اوپر ذکر کیا گیا۔

جس زمانہ میں میرا دلی جانا ہوا تھا مرزا اسد اللہ خان غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر ان کے اردو و فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے معنی اُن سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے انھوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔ مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو دکھائی تو انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔ مگر اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بیکاری کی حالت میں گذر گئے تو فکر معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا حسن اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجہ کا مذاق رکھتے تھے شناسائی ہوگئی اور آٹھ سات برس تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔ نواب صاحب جس درجہ کے فارسی اور اردو زبان کے شاعر تھے۔ اس کی نسبت ان کا مذاق شاعری بمراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اردو کلام مومن خاں کو دکھایا تھا۔ مگر ان کے مرنے کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورہ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے ان کا پرانا شعر و سخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا تازہ ہوگیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اُٹھا۔ اسی زمانہ میں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انھیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا۔ مگر درحقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔ نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک روز

انیس کا ذکر ہو رہا تھا انھوں نے انیس کے مرثیہ کا یہ مصرع پڑھا ع

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے

اور کہا کہ انیس نے ناحق مرثیہ لکھا یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیہ کے برابر تھا۔ ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔

نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو میں ایک آسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے ان کی اردو عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاصکر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔ لاہور ہی میں کرنیل ہالرائڈ ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔ میں نے بھی اسی زمانہ میں چار مثنویاں ایک برسات پر۔ دوسری امید پر۔ تیسری رحم و انصاف پر اور چوتھی حب وطن پر لکھیں۔

اس کے بعد میں لاہور سے دہلی میں اینگلو عربک سکول کی مدرسی پر بدل آیا۔ یہاں آ کر اول میں نے ایک آدھ نظم بطور خود اسی طرز کی جس کی تحریک لاہور میں ہوئی تھی لکھی پھر سرسید احمد خاں مرحوم نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی و تنزل کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو مفید ہو گی چنانچہ میں نے اول مسدس مدوجزر اسلام اور اس کے بعد اور نظمیں جو چھپ چھپ کر بار بار شائع ہو چکی ہیں لکھیں۔

نظم کے سوا نثر اردو میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں سب سے پہلے غالباً ۱۸۶۶ء میں ایک کتاب تریاق مسموم ایک نیٹو کرسچن کی کتاب کے جواب میں جو میرا ہموطن تھا اور مسلمان سے عیسائی ہوا تھا لکھی تھی جس کو اسی زمانہ میں لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں شائع کر دیا تھا۔ اس کے بعد لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو جیولوجی میں تھی اور فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا کاپی رائٹ بغیر کسی معاوضہ کے پنجاب یونیورسٹی کو دیدیا چنانچہ ڈاکٹر لائٹنر کے زمانہ میں اس کو یونیورسٹی نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا۔ مگر اول تو وہ اصل کتاب پچاس ساٹھ برس کی لکھی ہوئی تھی جبکہ جیولوجی کا علم ابتدائی حالت میں تھا۔ دوسرے مجھ کو اس فن سے محض اجنبیت تھی اس لئے اصل اور ترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے۔ لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لئے قصہ کے پیرایہ میں موسوم بہ مجالس النساء

لکھی تھی جس پر کرنیل ہالرائڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی مجھے لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے چار سو روپیہ کا انعام دلوایا تھا اور جو اودھ اور پنجاب کے مدارس نسواں میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو۔ پھر دہلی میں سعدی شیرازی کی لائف اور ان کی نظم و نثر پر ریویو لکھ کر شائع کیا جس کا نام حیات سعدی ہے اور جس کے دس بارہ ایڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں پھر شاعری پر ایک مبسوط آرٹیکل لکھ کر بطور مقدمہ کے اپنے دیوان کے ساتھ شائع کیا۔ اس کے بعد مرزا غالب مرحوم کی لائف جس میں ان کی فارسی اور اردو نظم و نثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور نیز اُن کی شاعری پر ریویو بھی لکھا گیا ہے یادگار غالب کے نام سے لکھ کر شائع کی۔ اور اب سر سید احمد خان مرحوم کی لائف موسوم بہ حیات جاوید جو تقریباً ہزار صفحہ کی کتاب ہے لکھی جو امید ہے کہ مارچ یا اپریل میں شائع ہو جائے گی۔ اس کے سوا اور بھی بعض کتابیں فارسی گریمر وغیرہ میں لکھی ہیں جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ہیں اس کے علاوہ تیس پینتیس مضمون بھی مختلف عنوانوں پر مختلف اوقات میں لکھے جو تہذیب الاخلاق۔ علی گڑھ گزٹ اور دیگر اخبارات یا رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ نیز اردو کے علاوہ فارسی میں کسی قدر زیادہ اور عربی میں کم میری نظم و نثر موجود ہے جو ہنوز شائع نہیں ہوئی جب سے ان دونوں زبانوں کا رواج ہندوستان میں کم ہونے لگا ہے۔ اس وقت سے ان کی طرف توجہ نہیں رہی میری سب سے اخیر فارسی نظم وہ ترکیب بند ہے جو سر سید کی وفات پر میں نے ۱۸۹۸ء میں لکھا تھا۔ اور اردو میں سب سے اخیر وہ نظم ہے جو حال میں ایمپرس وکٹوریا کی وفات پر لکھی ہے اور علی گڑھ گزٹ میں شائع ہو چکی ہے۔

۱۳۰۵ھ میں جبکہ میں اینگلو عربک سکول دہلی میں مدرس تھا۔ نواب سر آسمان جاہ بہادر مرحوم مدار المہام سرکار عالی نظام اثنائے سفر شملہ میں علی گڑھ محمدن کالج کے لئے سر سید احمد خاں مرحوم کی کوٹھی واقع علی گڑھ میں فروکش ہوئے تھے اور میں بھی اس وقت علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ نواب صاحب ممدوح نے بصیغہ امداد مصنفین ایک وظیفہ تعدادی پچھتر روپے ماہوار کا میرے لئے مقرر فرمایا اور ۱۳۰۹ھ میں جبکہ میں سر سید مرحوم کے ہمراہ بشمول دیگر ممبران ڈیپوٹیشن ٹرسٹیان محمدن کالج علی گڑھ حیدر آباد گیا تھا۔ اس وظیفہ میں پچیس روپے ماہوار کا اضافہ کر کے سو روپے سکہ حالی کا وظیفہ میرے لئے مقرر کر دیا جو اب تک مجھ کو ماہ بماہ سرکار عالی سے ملتا ہے اور اسی وقت سے میں نے اینگلو عربک اسکول کا تعلق قطع کر دیا ہے ✦

(مرسلہ) شیخ عبدالقادر بی۔ اے

مرزا عبدالرحیم خانخانان

زمانہ ترقی کر رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ احساس اسلاف پرستی بھی ترقی کر رہا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جس قدر یہ احساس مستحکم و استوار ہوتا جاتا ہے اسی قدر ترقی کے میدان میں بھی وسعت پیدا ہو رہی ہے۔ دنیا کا ہر تہذیب یافتہ ملک اپنی تاریک سے تاریک تاریخ کو روشن سے روشن بنا کر دکھا رہا ہے مگر ہندوستان ہے کہ اپنی روشن سے روشن تاریخ کو "نقش و نگار طاق نسیاں" بنا کر اغیار پرستی میں مصروف ہے۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایسے نامور بہت ہو گذرے ہیں کہ اگر وہ یورپ کے حصہ میں آتے تو ان کی شہرت کے جھنڈے آج بام عرش پر لہراتے نظر آتے۔ مگر ہندوستان میں ان کو اس شہرت و عظمت کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں جس کے وہ واقعی مستحق تھے۔ اگر دیگر ممالک کے مشاہیر سے ان ہندی عظام کا موازنہ کیا جائے تو نامورانِ ہند کسی طرح کم نہ اتریں گے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ ان کو پلۂ میزان تک لایا ہی نہ جائے۔ تمام تاریخ ہند عموماً اور دور اکبری خصوصاً ان عدیم النظیر شخصیتوں سے معمور ہے۔ فیضی و ابوالفضل گر افلاطونِ زماں و ارسطوئے دوراں ہونے کا دعویٰ کرتے تو ہرگز ادعائے باطل نہ ہوتا۔ ایسی قابل فخر شخصیتوں کے سامنے بھی خان خانان کی ذات میں وہ جاذبیت ہے کہ دور اکبری کا خیال آتے ہی خان خانان کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

* میرزا عبدالرحیم پسر بیرم خاں ہندوستان کے امرائے جلیل القدر میں سے تھا ۔ ۱۵۵۶ء میں لاہور میں پیدا ہوا جب سن شعور کو پہنچا تو اکبر نے مرزا خان خطاب دیا اور اس کے کچھ عرصہ بعد گجرات کی حکومت سپرد کی ۔ ۲۸ سال کی عمر میں شہزادہ سلیم (جہانگیر) کا اتالیق مقرر ہوا ۔ اور اسی سال مظفر گجراتی کی بغاوت رفع کرنے کے واسطے بھیجا گیا ۔ شہنشاہ اکبر نے تاکید کی تھی کہ شاہی کمک کے پہنچے بغیر حملہ نہ کرے ۔ مگر ایک عمر خیر خواہ نے اسے سمجھایا کہ مر جانے یا خانخانان بننے کا یہی موقع ہے ۔ چنانچہ عبدالرحیم

نے حملہ کیا اور فتحمند رہا جس کے صلہ میں پنجہزاری منصب اور خان خانان خطاب عنایت ہوا۔ بعد ازاں کئی سلطنت کے نادر خطاب سے ممتاز ہوا۔ صوبجات احمد آباد۔ جون پور۔ ملتان۔ سندھ وغیرہ کا علی الترتیب حاکم رہا اور دکن کے جنگ و جدل میں اعلیٰ خدمات انجام دیں اس کی لڑکی کی شادی شہزادہ دانیال سے ہوئی اور جہانگیر کے عہد حکومت میں اس کو وہی عروج[1] واقتدار حاصل رہا۔ شاہجہان کے ہمراہ قندھار بھیجا گیا ۱۶۲۶ء میں بہتّر سال کی عمر میں وفات پائی" (لائف آف بابر مصنفہ ارسکن)

مصنف مآثر الامرا خانخانان کی جنگی خدمات کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"خانخانان از اعاظم امرائے ایں سلطنت بودہ۔ نام نامی او بر صفحۂ ایام نقش دوام گرفتہ در عہد سلطنت عرش آشیانی (اکبر) مصدر خدمات شائستہ گردید از انجملہ سہ کار نمایاں کرد فتح گجرات و تسخیر سندھ و شکست سہیل خاں بیجاپوری"

اسی طرح سب مورخ و مصنف اس کی مدح و ثنا میں یکزبان نظر آتے ہیں یہاں تک کہ خود جہانگیر بھی جس نے توزک میں مرزا عبدالرحیم کی نسبت "بغاوت پیشہ و گرگ زادہ" وغیرہ الفاظ استعمال کئے ہیں اتنا لکھے بغیر نہ رہ سکا۔ "در شجاعت و شہامت و سرداری رایتے بلند آیتے بود" ان حوالجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا عبدالرحیم نے اکبری دربار میں ایک فوجی افسر اور سردار لشکر کی حیثیت سے رتبۂ اعلیٰ حاصل کیا تھا۔ اس لئے سوانح نگاری کے فرض کو انجام دیتے ہوئے اس کے جنگی کارناموں کو شرح و بسط سے بیان کرنا ضروری بلکہ لازمی معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خانخانان کی تاریخی اہمیت اس کی جنگی خدمات کی نسبت اس کے فضل و ادب کے اعتبار سے زیادہ ہے پس اس کی بزرگی آخرالذکر نقطۂ نظر سے زیادہ دلنشین ثابت ہوگی۔ خانخانان نے اپنی عمر کا کثیر حصہ جدلوں۔ یورشوں اور فوجوں کی کمان میں صرف کر دیا ان مصروفیات پیہم کے باوجود بھی اس کا کمال علم و ادب مسلم و مستند رہا اور یہی اس کی حقیقی عظمت کی بنیاد ہے۔ تاریخ انگلستان میں ایسی روشن مثال سر والٹر ریلے کی ہے لیکن اگر انصاف کو ہاتھ سے نہ دیا جائے تو ہمارے خان خانان کی شخصیت

---

[1] مصنف کتاب نے یہ ایک فاش تاریخی غلطی کی ہے۔ مرزا عبدالرحیم سے جہانگیر مہابت خان کے معاملات میں بہت بدگمان ہوا۔ اور خانخاناں عرصہ تک معتوب رہا چنانچہ جہانگیر نے خطاب خانخاناں بھی واپس لے لیا اور جہانگیر ہی کے ایما سے مرزا عبدالرحیم کے بیٹے داراب نامی کو قتل کیا گیا۔ آخر کار جہانگیر حقیقت حال سے آگاہ ہوا اور مرزا عبدالرحیم نے سر دربار جبین نیاز زمین پر رکھی بادشاہ بھی اپنے کئے پر پشیمان ہوا۔ اور قصور معاف کر کے اعزازات بحال کئے۔ مرزا عبدالرحیم نے یہ شعر کہکر مہر میں کھدوا دیا ؎

مرا لطف جہانگیری بتائیدات یزدانی
دوبارہ زندگی دادو دوبارہ خانخانانی

فرزند انگلستان سے بالاتر ہے۔

صاحب سیف ہونے کے ساتھ ساتھ خانخاناں عالم متبحر بھی تھا۔ سب مورخین نے اس کے ہفت زبان ہونے کا اقرار کیا ہے۔ عبدالباقی مصنف مآثر رحیمی لکھتا ہے کہ خانخاناں نے اکبر کے ایماء سے یورپین زبانوں میں بھی واقفیت حاصل کی تھی۔

چوں اکثر بنادر ہندوستان در تصرف مسیحیہ است و مکاتبات و مراسلات درمیانہ سلاطین افرنجیہ و خواقین ہندوستان بسیار واقع مے شود بادشاہ ظل اللہ اکبر ایں سپہ سالار را بہ فرا گرفتن زبان علیحدی فہم رسانیدن سواد و خط ایں قوم فرماں داد بہ اندک اختلاط و صحبتے کہ با خاصان آں قوم کہ در پایۂ تخت بادشاہی بودند و تجار و متردین ایشان نمود بہ دستورے تتبع آں خط و زبان آں قوم کرد کہ بے شائبہ ریا بہتر از آں قوم مے داند۔

عربی و فارسی و ترکی و ہندی را وا دانستہ شعر خوب مے فہمید و مے گفت رحیم تخلص مے کرد۔ گویند کہ بہ اکثر زبانہا کہ در عالم رائج است بہ خوبی حرف مے زد۔ (مآثر الامراء)

جہانگیر تزک میں لکھتا ہے۔

"خانخاناں در قابلیت و استعداد یگانۂ روزگار بود [illegible]

و از اقسام دانش عقلی و نقلی و علوم ہندی بہرہ وافی داشت و بزبان فارسی و ہندی شعر نیکو گفتے"

آثر رحیمی میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ شریف مکہ کا ایک مراسلہ بزبان عربی آیا جس میں مغلق و غیر مستعمل الفاظ کی بھرمار تھی۔ ابوالفضل نے اس خیال سے کہ ترجمہ کرتے ہوئے لغت دیکھنے کی ضرورت پیش آئے گی وہ مراسلہ علیحدہ رکھ لیا کہ دربار ختم ہونے پر اس کی طرف متوجہ ہو۔ بادشاہ نے خانخاناں کو اس کے دیکھنے کا حکم دیا اور خانخاناں نے مراسلہ دیکھتے ہی لفظ بلفظ ترجمہ فارسی میں پڑھ دیا۔ اس واقعہ کے درست و نادرست ہونے کے متعلق کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس واقعہ سے ابوالفضل کی سطحی قابلیت معرض بحث میں آتی ہے۔ تاہم یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ خانخاناں اس زمانے کے اعلیٰ و مہذب طبقہ میں فاضل اجل شمار ہوتا تھا۔

اکبر کا عہد حکومت فنون علم و فن کے لئے عدیم المثال زمانہ گذرا ہے۔ شاعری، مصوری، موسیقی، نقاشی، فن تعمیر اور فن کتابت کے چمن کچھ اس طرح آراستہ ہوئے کہ اس دور کے ختم ہو جانے کے بعد سرزمین وطن پھر وہ طوفان شادابی نہ دکھا سکی۔ خانخاناں نے ان سب کی طرف توجہ کی اور اپنی استطاعت اور حوصلہ کے مطابق تمام فنون لطیفہ

کی تدریج و ترقی میں سعی بلیغ صرف کی لیکن چونکہ اس کی ذات کا تعلق شاعری کے ساتھ خاص طور پر ہے اس لئے اس مضمون کو ہم فی الحال شاعری تک ہی محدود رکھیں گے - ابوالفضل نے اس زمانہ کے شعرائے مشاہیر کی طویل فہرست لکھی ہے اور ہر ایک کے کلام کا نمونہ بھی دیا ہے لیکن ابوالفضل نے بہت سے ایسے باکمالوں کو دربار اکبری کے نقش و نگار بنادیا ہے جو درحقیقت خانخاناں یا میر ابوالفتح کے دربار سے متعلق تھے اور شاہی دربار سے ان کو کچھ سروکار نہ تھا۔ نظیری نیشاپوری خانخاناں کے وابستگان دامن دولت میں سے تھا۔ عرفی شیرازی پہلے میر ابوالفتح کے دربار میں تھا۔ اس کے مرنے کے بعد خانخاناں کا دامن پکڑا۔ اور پھر کسی سرکار و دربار کا رُخ نہیں کیا۔ چنانچہ فخریہ کہتا ہے ؎

یک منعم و یک نعمت و یک منت و یک شکر		صد شکر کہ تقدیر چنیں راندہ قلم را	

اصل یہ ہے کہ اس زمانہ کے فارسی لٹریچر کی نمایاں ترقی کا انحصار بہت کچھ ان ہی دو امیروں پر تھا۔ شعر و ادب کی قدردانی - انعام و اکرام اور داد و دہش میں یہ دونوں بزرگ بادشاہ وقت اور شہزادگان والا تبار سے بھی بڑھ گئے تھے۔ یوں تو خانخاناں کی عام فیاضیاں بھی بے پایاں تھیں۔ مگر شعرا کے حق میں خصوصاً اس نے وہ دریا دلی دکھائی کہ آج ذکر سن سن کر بہت سے بوالہوس ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتے ہیں۔ نتیجہ جو ہونا تھا وہ ہوا یعنی شاعری کچھ سے کچھ ہوگئی۔ شعرا کے دماغوں میں تازگی اور جدت آگئی اور طبیعتوں پر ان محیر العقول بخششوں کا ایسا رنگ چڑھا کہ شتاب زندگی کے مضمون کو ادا کرنے کے لئے عرفی کو تمثیل بھی اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی سوجھی ؎

بره فتادم و گشتم چناں شتاب زده		کہ دست اہل کرم در نثار گوہر و سیم	

شعر و سخن کے نقد و نظر میں خانخاناں کو اجتہاد کا درجہ حاصل تھا۔ چنانچہ عرفی و نظیری وغیرہم نے اپنے اپنے قصائد میں جابجا اس کو ایک بےنظیر نقاد تسلیم کیا ہے اور بعض جگہ اس سے کلام میں اصلاح پانے پر فخر کیا ہے۔ تقی تلندر نے خانخاناں کی شان میں ایک قصیدہ لکھا ہے جس میں اس نے خانخاناں کی تربیت شعرا کا مفصل ذکر کیا ہے۔ رحیمی لکھتا ہے کہ عرفی۔ نظیری۔ شکیبی۔ حیاتی۔ نوعی کے شہرۂ آفاق کمالات صرف تیرے (خانخاناں) فیضان علمی اور بذل کے ممنون ہیں۔ بڑی وجہ اس امر کی ہے کہ جیسے پُرزور قصائد ان شعرا نے خان خاناں کی مدح میں لکھے ہیں ویسے کسی اور امیر بلکہ خود اکبر کی شان میں بھی نہ لکھ سکے۔ خانخاناں کے لئے کچھ لکھتے ہوئے ان کو انتہائی تفکر و غور سے کام لینا پڑتا تھا اور اسی سے کلام کا پایہ بلند ہو جاتا تھا۔ عرفی شیرازی کا ایک مشہور قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے ؎

بیا کہ با دلم آں مے کند پریشانی		کہ غمزۂ تو نکردہ است با مسلمانی	

یہ قصیدہ خانخاناں کی مدح میں ہے اور حکیم ابوالفتح گیلانی کی فرمائش پر لکھا گیا ہے۔ عرفی نے اس قصیدہ

میں دونوں امیروں کی مدح کو ایک پرلطف امتزاج دے کر کامل الفن ہونے کا ثبوت دیا ہے ؎

تو چوں گذر گئی آنجا بہ نظم رنگینم	کہ مصر عش چمپنے کر دو بیت بستانی
ضمیر وے بمن اینجا نشاں دہد ہر جا	کہ ناقضے بزنی یا سرے بجنبانی

خانخاناں سے خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب تو میرے گلستان سخن کی سیر کو تشریف لاتا ہے تو حکیم ابوالفتح کا ضمیر مجھے یہاں مطلع کر دیتا ہے کہ اس مقام پر تو نے اعتراض کیا ہے اور اس مقام پر تعریف کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان اشعار سے ممدوحین کی باہمی یکجہتی و ربط معنوی کا اظہار مقصود ہے۔ لیکن ایک نکتہ اور بھی ملحوظ رکھنے کے قابل ہے ان اشعار میں عرفی نے اپنے کلام کے متعلق اعتراض وایراد کے امکان کو تسلیم کیا ہے اور یہ وہی عرفی ہے جس نے اپنے کلام کی اتنی تعریف کی ہے کہ شاید کسی اور نے نہ کی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ تفاخر شاعرانہ ایشیائی شاعری میں حسن کلام اور زیور سخن ہے لیکن اپنے کلام کی تائید میں ذاتیات پر حملے کرنا نہایت مذموم ہے اور عرفی کا یہ خاص شیوہ ہے۔ اس کے قصائد شروع سے آخر تک دیکھے جائے مشکل سے کوئی قصیدہ پاؤ گے جس میں اساتذہ عرب عجم پر نام نام لے لے کر چوٹیں نہ کی گئی ہوں۔ پس ایسے شخص کا اپنے باب میں اپنی زبان سے سوء ظن ظاہر کرنا۔ گویا خانخانان کا بلند پایہ سخن سنجی کا معترف ہونا ہے۔

خانخانان کی علم پروری اور ادب نوازی کے متعلق اس مضمون میں اس سے زیادہ گنجائش نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ چند بحث طلب امور ابھی باقی ہیں۔ اس کے سوانح نگار کا اس کو شاعر کی حیثیت سے روشناس کرانا بھی ایک نہایت خوشگوار فرض ہے۔ خانخاناں بہت موزوں طبع اور خوش فکر شخص تھا طبیعت ایسی ہمہ گیر پائی تھی کہ دنیا کی بہت سی زبانوں میں شاعری اور انشا پردازی کا حق ادا کرتا تھا۔ اس کے متعلق تاریخی حوالے اوپر گذر چکے ہیں۔ فارسی میں کلام کثیر نہیں ہے معلوم ہوتا ہے کہ فکر سخن گاہے گاہے کرتا تھا۔ مگر جو کچھ کہتا استادانہ کہتا تھا۔ ذیل میں ہم خانخاناں کی دو رباعیاں نقل کرتے ہیں جن سے اس کی موزونی طبع کا اندازہ ہوتا ہے ؎

سرمایۂ عمر جاودانی غم تو	بہتر ز ہزار شادمانی غم تو
گفتی کہ چنیں دہاں و شیدات کہ کرد	دانی غم تو و گر نہ دانی غم تو

دیگر

زنہار رحیم از پئے دل نہ روی	بیہودہ بہ آرزوئے دل در گردی
گفتم سخنے و باز ہم مے گویم	خواہش کاری ہمیشہ خواہش دردی

یہ مطلع بہت مشہور و مقبول ہوا ہے۔ دیکھئے کس قدر پر کیف ہے ؎

بجرم عشق توام میکشند و غوغائیست	تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

فارسی میں چند است بند است کی زمین میں صرف ایک غزل ملتی ہے اسی کو سب مؤلفین درج کرتے چلے آئے ہیں۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ عرفی و نظیری کے دواوین میں ان کی ہم طرح غزلیں موجود ہیں۔ مگر عرفی کے دیوان میں غزل تلاش کرنے پر نہیں ملتی۔ البتہ نظیری کی غزل ملتی ہے۔ ذیل میں ہم خان خاناں کی غزل درج کرتے ہوئے نظیری کی غزل سے بھی ہم قافیہ اشعار انتخاب کرتے ہیں۔

مرزا عبدالرحیم

شمار شوق ندانستہ ام کہ تا چند است	جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزومند است
نہ دام دانم و نہ دانہ ایں قدر دانم	کہ پائے تا بسرم ہر چہ ہست در بند است
بکیش صدق و صفا حرف عہد بیکار است	نگاہ اہل محبت تمام سوگند است
ادائے حق محبت عنایتیست ز دوست	وگرنہ خاطر عاشق بہیچ خرسند است
مرا فروخت محبت ولے نمی دانم	کہ مشتری کہ کدام است و بہائے من چند است
ازاں خوشم بسخن ہائے دلکش تو رحیم	کہ اندکے بادا ہائے دوست مانند است

محمد حسین نظیری نیشاپوری

ازاں دمے کہ بچشمم تو آشنا شدہ دل	اگر بگوشۂ چشمم نہی دردمند است
نظیری از تو بجان آمد از عتاب بترس	بایں قدر کہ نگوئی بمیر خرسند است
بکینہ جوئی افلاک عشق نہ رازم	کہ ہر کہ دشمن باشد بدوست مانند است

نظیری جیسے مسلم الثبوت استاد کے کلام کے سامنے ہر کس و ناکس کا کلام پیش نہیں کیا جا سکتا لیکن انصاف یہ ہے کہ خانخاناں اس موقع پر بہت بڑھ گیا ہے۔ بلندی خیالات۔ چستی۔ بندش۔ سوز و گداز۔ سلاست و طرز ادا کے لحاظ سے خانخاناں نے اپنے آپ کو استاد ثابت کیا ہے۔ خانخاناں کا ہندی کلام بھی نہایت اعلیٰ پایہ کا ہوتا تھا۔ افسوس ہے کہ یہ کلام ضائع ہو گیا۔ عجیب و غریب جواہرات ہوں گے جو زمانہ کی لاابالیوں کا شکار ہو گئے۔ تبرکاً و تیمناً چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

جب رحیم تن من لیو کیو ہردے میں بھون	تاسے دکھ سکھ کہن کی رہی کتھا اب کون

یعنی اے رحیم جسم و جان جس کی نذر کر چکا ہے اور جس کو تو نے اپنے دل میں جگہ دے دی ہے اب اس سے دکھ درد بیان کرنا کیا ضرور ہے۔ خیال نہایت پاکیزہ ہے اور اس لئے ہماری تعریف سے مستغنی۔

نین سلونے ادھر مدھو کہو رحیم گھٹ کون	میٹھا بھاوے لون پر اور میٹھے پر لون

یعنی آنکھیں نمکین ہیں اور لب شیریں ہیں۔ رحیم بتاؤ دونوں میں کون افضل ہے۔ یہاں استفہام انکاری ہے۔ دوسرے مصرعہ میں خود جواب دیتا ہے کہ میٹھے کے بعد نمک اور نمک کے بعد میٹھا بھلا معلوم ہوتا ہے پھر فیصلہ ہو تو کیونکر۔ وہ ہاں پڑھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ان کے سینہ میں دنیا کے علوم اور السنہ مشرقیہ مغربیہ

کے دریا لہریں لے رہے ہیں۔ غور سے دیکھیے تو چند بات خیالات اور مذاق شاعری تک ہندی ہے۔ خانخاناں کے تمام ہندی کلام سے خالص ہندی کا رنگ جھلکتا ہے۔ ہندی لکھتے ہوئے اس کے دل و دماغ پر کسی غیر زبان کے ادب کا سایہ تک نہیں پڑتا اور یہی اس کا سب سے بڑا کمال ہے۔

تصنیفات۔ اکبر کی فرمائش پر تزک بابری کا ترجمہ ترکی سے فارسی میں کیا۔ ترجمہ ترجمہ نظر نہیں آتا۔ بلکہ مصنف کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ صرف اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ دونوں زبانوں پر اس کو کس قدر عبور حاصل ہوگا۔ اس کی ایک اور تصنیف مثنوی جوتش آج کل نایاب ہے۔ اس کا ایک مصرع سنسکرت اور دوسرا فارسی ہے۔ اسی طرح اور بہت سا کلام خصوصاً ہندی اشعار اب دستیاب نہیں ہو سکتے۔

مختلف صوبجات کی حکومتوں کے دوران میں رفاہ عام کے اچھے اچھے کام کیے۔ عمدہ عمدہ عمارتیں بنوائیں۔ کہا جاتا ہے کہ تالابوں پر گھاٹ اور مکانات کی تعمیر اسی کی ایجاد ہے۔ گجرات کی حکومت کے زمانے میں احمد آباد میں ایک عظیم الشان کتب خانہ کی تاسیس کا فخر حاصل کیا۔ اس کتب خانے کو نہایت نایاب کتابوں سے مزین کیا۔ اپنے دربار کے شعرا کے دواوین خود ان ہی کے قلم سے لکھوا کر اس میں رکھے۔ مشاعروں کی بنیاد ڈالی اور شعر و شاعری کے چرچوں سے بازار سخن کی رونق بڑھاتا رہا۔ غرضکہ عمر بھر جدت پسندی اور نفاست طلبی کے کرشمے دکھاتا رہا۔ بہت سے پھول پھل اور درخت ہندوستان میں لگائے جو پہلے موجود نہ تھے۔ منجملہ ان کے ایک انار بھی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ایسی ہمہ گیر طبیعتیں اور جامع کمالات ہستیاں دنیا میں بہت کم آتی ہیں۔ ہماری تاریخ میں بڑے آدمیوں کی کمی نہیں۔ ہاں تحقیق و تدقیق کی ضرورت ہے۔ اس مضمون میں خانخاناں کو صرف ایک روشن مثال کے طریق پر پیش کیا گیا ہے۔ "علاؤالدین محمد تغلق۔ بابر۔ اکبر۔ اورنگ زیب کی بوقلموں شخصیتیں (سخت افسوس ہے کہ ابھی تک ان کے نام اپنے نامانوس ہیں) یورپ کے ہر تصویر خانہ کا مقابلہ کر سکتی ہیں اور ایسے رہنماؤں کے سوانح حیات۔ نظام عمل۔ جنگ و جدل۔ مشاغل علمی اور عادات و اطوار میں قوت خیال عجیب عجیب مصور مواقع تلاش کر سکتی ہے" (لین پول) جس قدر ہمارا تاریخی مطالعہ اور وسعت نظر ترقی کرتے رہیں گے۔ اسی قدر یہ شخصیتیں ہمارے لیے سرمایہ ناز ہوتی رہیں گی۔

سرفراز حسین بی اے (علیگ)

گنگا اشنان

گنگا کے کنارے تم اشنان کئے جاؤ　　مشتاق نگاہوں پر احسان کئے جاؤ

منظر لب دریا کا تھا یونہی بہت پیارا　　سونے پہ سہاگہ ہے یہ صبح کا نظارا

مذہب کی یہ پابندی اور اپنا یہ سِن دیکھو　　یہ وقت سحر دیکھو جاڑوں کے یہ دن دیکھو

او حسن سے بے پروا اور دھرم کی متوالی　　ہٹ جائے نہ سردی سے رخسار کی یہ لالی

بخشا تجھے خالق نے ہر عضوِ بدن پیارا　　غنچہ سا دہن پیارا اندازِ ذقن پیارا

آنکھیں جلی جاتی ہیں کیا حسن کی گرمی ہے　　غیرت دہ برگِ گل رخسار کی نرمی ہے

یہ فتنہ محشر ہیں یا بانکی ادائیں ہیں　　یہ گیسوئے پرخم ہیں یا کالی بلائیں ہیں

گو شانِ تقدس بھی چہرے سے نمایاں ہے　　شوخیِ ادا لیکن غارت گرِ ایماں ہے

مشتاق تماشا ہے ہر اک رخِ تاباں کا　　سورج نے بھی چپکے سے دیکھو تجھیں جھانکا

ارمان بغلگیری اب حد سے زیادہ ہے　　دریا کی بصد حسرت آغوش کشادہ ہے

مستغنی از آرائش کیا وضع نکالی ہے　　ٹیکہ ہے نہ جھومر ہے پتے ہیں نہ بالی ہے

یہ سادگی بہتر ہے ہر ایک بناوٹ سے　　اچھا ہے یہ بھولا پن ہر ایک لگاوٹ سے

ستار تنِ نازک کو ہلکی سی ساری ہے　　ہے قول نزاکت کا پھر بھی کہ یہ بھاری ہے

بھیگے ہوئے کپڑے سے ہے رنگ بدن پیدا　　یا ہلکے سے بادل سے سورج کی کرن پیدا

اس کو بھی پسند آئی یہ شکل ہی پیاری ہے　　تصویر جو یوں دل میں دریا نے اتاری ہے

جب پانی چڑھ جائے گی یہ صورت نورانی　　ڈر ہے کہ نہ سورج پر پڑ جائے گھڑوں پانی

اوپر کو اٹھاؤ تو تم بہر خدا آنکھیں　　یہ سحر بھری آنکھیں تصویر حیا آنکھیں

تم یونہی نہانے آن پر بھی کھڑی ہوتیں　　اے کاش مری آنکھیں تجھ میں جڑی ہوتیں

گنگا میں تمھیں پیاری اشنان مبارک ہو

اس دل کو محبت کا ارمان مبارک ہو

سعید دہلوی

کلامِ محو

میکش بھی حظ اٹھائیں شب ماہتاب سے
ساقی بجھائے پیاس اگر آفتاب سے

مقصود اس طرف ہے ترا دیکھنا ہمیں
چشم کرم سے ہو کہ وہ چشم عتاب سے

لیتے ہیں دور بیٹھے ہوئے دل میں چٹکیاں
گو دیکھتے نہیں ہیں ادھر کو حجاب سے

جلوے نے لطف دید سے محروم کر دیا
برق جمال کم نہیں ان کی حجاب سے

نیرنگیٔ خیال کے قربان جائیے
شب بھر میں ہم کنار رہا مست خواب سے

اے شیخ مست بادہ پسندار تم نہیں؟
مدہوش بادہ خوار اگر ہیں شراب سے

ظالم کے منہ پہ کب عرق انفعال ہے
شبنم ٹپک رہی ہے رُخ آفتاب سے

اللہ رے شوخیٔ نگہٗ فتنہ زائے دوست
جس کو صبا سے شرم ہے پردہ حجاب سے

بے چین ہو کے نالۂ شبگیر سے مرے
وہ بوئے گل کی طرح اُٹھے فرش خواب سے

اے یاس کر مقام کہ موزوں ہے یہ جگہ
اے آرزو نکل دل خانہ خراب سے

یا بے قراریوں کی شکایت نہ کیجئے
یا منہ دکھائیے مجھے طرف نقاب سے

لینا ہے واعظوں کو اگر دخت رز کا نام
پہلے وضو کریں وہ خم آفتاب سے

دیکھا جو ٹوٹ ٹوٹ کے بنتے عجب ہوا
مضبوطی اساس طلسم حباب سے

اے محو اب چھپانے کی کوشش فضول ہے
ہے راز دل عیاں مرے چشم پر آب سے

مرسلہ محمد حسین شاکر پیلی بھیتی

آئینِ محبت

یہی رو رو کے کہتا ہے حریفِ آتشِ فرقت — کوئی للہ کہہ دے جا کے اتنا میری جاناں سے
دمِ فریاد سے اپنی یہاں تک ہو گئی حالت — بہا کرتا ہے یہ دل خونِ حسرت چشمِ گریاں سے

غم و اندوہ و درد و کاہش و بیتابی و حرماں — رہا کرتے ہیں مدت سے مرے اجڑے ہوئے دل میں
یہ ننھا سا جگر ہے اس قدر زخمی کہ اے جاناں — تڑپتی ہیں ہزاروں آرزوئیں خونِ بسمل میں

چراغِ داغِ دل جلتا ہے اپنی گورِ حسرت پر — بہا جاتی ہے جس پر چار آنسو بےکسی میری
کفِ افسوس ملتا ہے فلک بھی میری حالت پر — مگر صد حیف تم [illegible] خبر اب تک نہ لی میری

کبھی تو عاشقِ مہجور کے پرساں تم ہوتے — کبھی تو کلفتوں کو دور کر دیتے گلے مل کے
اگر آ جاتے آنسو تم مرے احوال پر روتے — نکلتا خارِ حسرت پھوٹ جاتے آبلے دل کے

تعجب ہے کچھ ایسے محوِ استغنا رہے ہر دم — کسی رنجور کا تم کو نہ بھولے سے خیال آیا
مجھے دیکھو کہ میں ہوں تختۂ مشقِ جفا پیہم — مگر ہرگز نہ میرے قلبِ محزوں پر ملال آیا

مرے شیون سے تم رسوا نہ ہو جاؤ یہی ڈر تھا — وگرنہ کیا مجھے فریاد کرنا کوئی مشکل ہے؟
علاوہ اس کے اے رشکِ قمر مسلک ہے یہ میرا — رضا جوئی جاناں فی الحقیقت عشق کامل ہے

تسکین سورونوی

فہرست مضامین "مخزن" بابت ماہ اگست ۱۹۲۱ء

شذرات

"مخزن" کا دور حاضر ارباب نظر کی کن قدر افزا ۔ حوصلہ پرور نگاہوں سے دیکھا گیا ہے ۔ اس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوسکتا ہے کہ آئے دن ملک کے ممتاز اور مایہ ناز انشا پردازوں کے خطوط تحسین ہمیں بکثرت موصول ہو رہے ہیں ۔ ہندوستان کے معتبر و مستند ارباب قلم کی ہمت آفرینیاں ہمیں روز فخر و مباہات کا موقع دے رہی ہیں تو بیان ادب کی بزرگانہ دلجوئیاں سرپرستی کا یقین دلاتے ہوئے ہمارے شوق سعی میں لطف حاصل کی لذت پیدا کرا دینے میں نہایت فیاضی سے کام لے رہی ہیں ۔

ہم ان تمام خطوط کی نقل تو ہدیہ ناظرین کرنے سے بخوف طوالت معذور ہیں لیکن بعض کو بجنسہٖ پیش کر دینا ہمارے حسن عمل کی جزا رسید ہے ۔ چنانچہ اس دفعہ حضرت ناظم الملک مولانا سید معشوق حسین صاحب اطہر ہاپوڑی کا نامۂ گرامی نذر ارباب نظر ہے ۔

"مولانا سچ تو یہ ہے کہ آپ کے اعجاز قلم نے "مخزن" کے مردہ جسم میں از سر نو روح پھونک دی ہے آپ کی ادبی آبیاریوں سے پژمردہ گلوں کی تازگی میں بھی ایک خصوصیت امتیازی ہو گئی ۔ یہ آپ ہی کے مذاق ادب کی مسیحا نفسی ہے کہ یک خاک نشین عدم ۔ مکرر عالم وجود میں جلوہ فروش نظر آ رہا ہے ۔

تدوین و ترتیب میں بھی اس بالغ نظری سے کام لیا گیا ہے جس کی توقع آپ کی اور صرف آپکی ممتاز علمی حیثیت سے ہو سکتی تھی ۔ خدا شاہد ہے آپ نے مخزن کو من اولہ الی آخرہ ایسا ہر صفت کیا ہے کہ بے اختیار زبان پر آ جاتا ہے" ؎

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم — کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

دعا ہے اللہ تعالیٰ "مخزن" کو آپ کی ادب نوازیوں سے توفیق بہرہ وری دے اور آپ کو اس کی ادارت سے کامل نام آوری مرحمت فرمائے ۔ مجھے کاہلی اور کہولت نے اسیر دام آرام طلبی خوگر خاموشی کر دیا ہے ۔ تاہم میں اس کی خدمت کو اپنی ضروریات زندگی کا جزو جاننا فرض حیات سمجھتا ہوں والسلام

اطہر ہاپوڑی

معاصر محترم "معارف" نے صحیفۂ "مخزن" کا تعارف عصری کراتے ہوئے ۔ اگرچہ خلاف امید تنگ دلی سے کام لیا مگر ہمیں افسوس نہیں ۔ ہم خوش ہیں کہ "معارف" کی اس خصوصیت تطاول سے صرف "مخزن" ہی کی توقعات مجروح نہیں ہیں بلکہ عام حامیان ادب لطیف خواہ ارباب علم و قلم ہوں یا صحائف انشا و ادب اس موضوع خاص میں بالاتفاق شکوہ سنج استغنا و گلہ مند کم نگہی ہیں ؎

اک میں ہی کیا جہان کو شکوہ ہے اے اجل — تیغ جفا سے تیرے کوئی مطمئن نہیں

ہم ذیل میں اپنے معاصر کی زریں رائے شکریہ کے ساتھ نقل کرتے ہوئے مستدعی ہیں کہ "مخزن" اس خلوص ارتباط اور خصوصیت اتحاد کو (جو قدیم سے صاحب "مخزن" اور صاحب "معارف" کے مابین وجہ مابہ الامتیاز ہے) سفارشی بنا کر حب و الفت سے نمناک مدح و ثنا کا متمنی نہیں ۔ بلکہ اس رائے کا خواہشمند ہے جو درحقیقت حق نقد سے معمور اور لب کشائے صدق و حق ہونے کے ساتھ صحیح معنوں میں تنقید ہو ۔

"مخزن" اردو کے قدیم ترین رسالوں میں ہے ۔ اپنے ابتدائے زمانۂ اشاعت سے لے کر آج تک اس نے مختلف قالب بدلے ہیں اور ہر قالب میں اس کی خاص خصوصیت یعنی ادبی روح جھلکتی رہی ہے موجودہ تغیر و تبدل میں اب اس کی عنان ادارت مولوی ابوالبیان بسمل شاہجہانپوری کے ہاتھ میں آئی ہے

یہ وہی بیدل ہیں جن کے لئے مولانا شبلی مرحوم کا یہ مصرع ہے ۔ ع چہ توان کرد کہ فرمودۂ بیدل باشد[۱]
مخزن کی خوش قسمتی ہے کہ وہ آیندہ سے تمام تر فرمودۂ بیدل ہوگا ٭

ہمیں افسوس ہے کہ "مخزن" اس دفعہ اصطلاحات علمی کے مفید سلسلہ کی قسط پیش خدمت کرنے سے قاصر ہے اگرچہ یہ تقصیر خدمت محض ہماری مساعی کی کوتاہی کا نتیجہ نہیں ۔ زیادہ تر محترمی مولانا سید ممتاز علی صاحب قبلہ کا تبدیل قیام ہے جو آج کل موسمی تحریکات کی بنا پر منصوری کی رونق افزا ہیں ٭

کتب مندرجہ ذیل بغرض ریویو دفتر میں موصول ہوئی ہیں ۔ خیال تو یہی تھا کہ ہم اسی نمبر میں اپنی ناچیز رائے دے کر فرض ادارت سے سبکدوشی حاصل کریں اور احباب کی زحمت انتظار کے باعث نہ ہوں ۔ مگر چونکہ اس دفعہ بوجوہ معذور رہیں ۔ اس لئے آیندہ اس خدمت کی انجام دہی کو ضروری سمجھا جائے گا ۔ امید ہے کہ مرسل ہدایا حضرات معاف فرمائیں گے ٭

آئینۂ حرم ۔ ثالث بالخیر ۔ سرور انبیاء ۔ شیخ حسن ۔ وضع اصطلاحات پریم بتیسی ۔ خونہا بۂ عشق ۔ لمعات روحانی ۔ جذبات احمد

تصحیح

عام اس سے کہ اعتراف فروگذاشت اور تصحیح اغلاط بمعاشرت انسانی کے آداب و اصول میں کسی درجہ تک معیوب نہیں ۔ مگر چونکہ یہ عمل اپنی لغزشوں اور کمزوریوں کے اظہار کا مرادف ہے ۔ اس لئے فطرت انسانی کی جبلی خود پسندیاں جھجکتی ضرور ہیں ۔ لیکن بسا اوقات ضرورتیں مجبور بھی کر دیتی ہیں ۔

ماہ مئی کے مخزن میں جو نظم "کیف وطن و خمار غربت" کے عنوان سے چھپی تھی اس میں چند اشعار لسان العجم حضرت قاآنی کے ہیں ۔

قارئین "مخزن" اس التباس ہوی اور مغالطہ اتفاقی کو میری محدود وسعت نظری کا سوء عمل خیال فرمائیں کہ شریک سبد گل کر کے احباب سے تعارف نہ کرا سکا ۔ ورنہ درحقیقت حضرت نگہت شاہجہانپوری کا تو ایک محب و مخلص دوست کی جدائی اور آغوش وطن کی خوشی کے ولولے جذبات سے متاثر ہو کر تضمیناً ان سے فائدہ اٹھانا ۔ اور تیمناً استبراک مقصود تھا ۔ اس لئے وہ قطعاً اپنے اس شعر کی داد کے مستحق ہیں جسے قاآنی کی ہم نشینی نے قابل فخر جمال دے دیا ہے ؎

زاں ہمی زارم خمار غربتم بمود زار
زاں ہمی بالم کہ در کیف وطن بالا شباب

جولائی نمبر میں جو نظم "گنگا اشنان" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے ۔ وہ فی الحقیقت "مخزن سبھا" کے خوشگو شاعر ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی کے جذبات لطیف کا شیرازہ ہے ۔ میری عدم موجودگی میں غلطی سے "سعید دہلوی" لکھا گیا ہے ۔ قارئین "مخزن" درست فرمالیں اور ڈاکٹر صاحب اسے انسانی خطا پر محمول کر کے معاف فرمائیں ٭

---

[۱] یہ مصرع علامہ شبلی نعمانی کی اس رباعی کا ہے جو "دستۂ گل" یعنی علامہ مرحوم کے مرقع تغزل کا عنوان اشاعت ہے

هرزه چند بهم بافتن و پیش کسان ‌‌‌‌   عرضه دادن نه پسندیدهٔ عاقل باشد
من هم این کار نمی خواستم از دل اما   چه توان کرد چو فرمودهٔ بیدل باشد

سبد گل

فرضِ محبت جناب "رازدار" کا یہ افسانہ نہ صرف اپنی محض دلفریبیوں کے لحاظ سے اچھوتا ہے۔ بلکہ اکثر مقامات پر مصنف کی جذبات نویسی میں اصلی فطرت انسانیہ کی جھلک رونما ہو جانے سے واقعہ نویسی کی بھی کامیاب مثال ہے۔ لیکن "علیم" مصور ہونے سے زیادہ فلسفی ظاہر ہوتا ہے۔ گو صاحب مضمون کے نزدیک صرف اس کا ذوقِ مصوری نقش امتیاز ہے +

تو نے مجھے پھر یاد آ گئی حضرت "گہر جائسی" کی شوخ نگاریاں بزم انشا میں روپوش گمنامی نہیں۔ اربابِ ادب کی ذوق آشنا نگاہیں آپ سے متعارف ہیں۔ آپ نثر و نظم دونوں شعبہائے لطیف پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ اس نمبر کے آخری صفحات پر "تخیلات گہر" کے عنوان سے جو غزل ہدیہ ناظرین ہے۔ وہ حضرت "گہر" ہی کے سلک جذبات اور نظم جواہر کی کشتی زر ہے۔ ہم آپ کی اس مرحمت کے شکر گذار ہیں کہ باوجود ابتلائے افکار اور بغایت مصروفیت کے ہماری استدعا کو مجروح ناکامی نہیں فرمایا۔ امید ہے آیندہ بھی یہ سلسلہ عنایت یونہی جاری رہے گا +

معاشقۂ عرب دورِ حاضر کی بادہ پیمائیوں سے خمخانۂ مشرق کی سرجوشیاں اور خوش مستیاں نہ صرف وقفِ خمارِ خمیازہ ہو گئیں۔ بلکہ ہماری تنک ظرفیاں اس کے نشۂ نو آفرین کے عدم کو بھی مجہب استداد کر چکیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ عرب کے ذرہ ذرہ کا حسن میں بھی وہ ہوشربا ذخائر برق و شرر مدفون ہیں جن کی خزاں رسیدہ تجلیاں خوارق مغرب کی گلبار بہاروں سے خرمن سوز و فتنہ ریز ہونے میں کم نہیں۔ یہ مضمون اسی بحر ذخار کی سطحی غواصی ہے جو ارتباط حسن و عشق کی جلوہ افروزیوں کے ساتھ اتحاد وصل و وصال کا بہترین ظہور ہے

ہم "جناب شاکر" کے صرف اس لئے ممنون ہیں کہ انھوں نے ادب مشرق سے اس افسانہ کو اخذ کیا اور ہمارے سازِ زندگی کے زنگ آلودہ تاروں کو زخمہ ہوسے چھیڑ کر ایک مرتعش وارفتگی پیدا کر دی۔ کاش دلدادگان ادب اردو کا ذوق تلاش گلستان مغرب کی گلچینی کرتے ہوئے ریگستان عرب کے گرد آلود ذروں کی ٹٹول کو بھی اپنا حسن عمل قرار دے لیکن مگر موجودہ بے تعلقی کو دیکھتے ہوئے یہ امید کم ہے +

بدحواسی نثر لطیف کی اصناف عالیہ میں "ہیومر" (تفنن) بھی عجیب دلکش انداز تحریر ہے۔ ادبستان مغرب میں تو یہ بہت مقبول ہے۔ ملک کی حوصلہ افزائیاں اس کی روز افزوں قدر و منزلت میں کافی حصہ لے رہی ہیں لیکن ہندوستان میں بھی اردو کا کوئی عہد تمدنی اس کی خدمت پرورش سے کبھی بہرہ بے نیازی نہیں رہا۔ ہر دور ادب کا ذوق سلیم کچھ نہ کچھ اس کی دستگیری ضرور کرتا رہا۔

چنانچہ ایک زمانے میں مرحوم "اودھ پنچ" نے اس کے نخل زندگی کی آبیاری کی۔ اب اللہ رکھے "نقیب" کی مساعی جمیلہ اسے پروان چڑھانے میں سرگرم کامیابی ہیں اور آیندہ بھی اس کا مستقبل آسمان ترقی پر معراج ارتقائی حاصل کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ ادیب گوشہ نشین "میر محفوظ علی صاحب بی۔ اے (علیگ)" اور "سید سلطان حیدر صاحب جوش" جیسے قادر اہل قلم کی معجز نگاریاں۔ اس کی بقائے حیات کا بیڑا اٹھائیں۔

ہم "حضرت ؟" کی امانت قلمی کے شکر گذار ہونے کے ساتھ شکوہ سنج بھی ہیں کہ انھوں نے باوجود متعدد وعدوں کے ابھی تک "مخزن" کو کسی ایسے احسان سے ممنون نہیں بنایا جو ان کی قدرت ادب کے اعجاز و خوارق میں سے ہو اور "مخزن" کی افسردگی میں جدت اور زندگی کی روح پھونک دے +

ولی عہد فرانس کی موت

گو بظاہر تو یہ کسی انگریزی کتاب سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے مگر "اسکیچ" یعنی گذشتنی واقعات کی نقاشی کا اجمالی خاکہ ہے۔ اس طرز بیان کی یورپ میں بہت قدر ہے لیکن اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ انداز تحریر بھی دلفریبی میں اور اپنی ہم نوع قدرتوں سے کم نہیں ہے۔ کیا اچھا ہو کہ ادب اردو کے اہل حضرات ادھر بھی اپنی توجہ کو مبذول کریں۔ ہم "مخزن" کے قدیمی معاون چودھری ظفر اللہ صاحب بی۔اے بیرسٹر کے بے حد ممنون احسان ہیں کہ انھوں نے یہ چھوٹا سا نمونہ ادب پیش کر کے ملک کی توجہ سے اپیل کی ہے +

صہبائے گرامی

یوں تو فخر زمانہ نظیری ہند "حضرت گرامی" مدظلہ کا ہر نتیجہ فکر دور حاضر کیلئے مایۂ ناز ہے۔ مگر اس غزل کی خصوصیات سے وہی اشخاص لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ جنھوں نے انکی ہم قافیہ اور غزلیں بھی دیکھی ہیں۔ ہم چونکہ اس سے پہلے نمبر میں نظیری اور خانخاناں کی مقابلی غزلیں ایک مضمون کے تحت میں نذر ناظرین کر چکے ہیں۔ اس وجہ سے مجبور رہیں۔ ورنہ جی تو یہ چاہتا تھا کہ تینوں گلدستوں کو ایک ہی سبد میں سجا کر ہدیۂ احباب کرتے +

خالدہ خانم ادیبۂ ترکی

سلطان عبدالحمید خان کی معزولی اور نوجوانان ترکی کے اقتدار کا قیام و دوام جن فرزندان اسلام کی جانفروشانہ کوششوں کا ممنون احسان ہے۔ ان میں جہاں اور محبان وطن ہیں وہیں ترکی کی مایۂ ناز خاتون خالدہ خانم کا نام بھی اس وقت دنیائے اسلام میں زبان زد عام ہے۔

خالدہ خانم کی زندگی کے مفصل واقعات اس وقت تک ہندوستان کے لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ مگر جناب سالک صاحب نے چند مختلف مضامین سے جو انگریزی رسالوں میں شائع ہوئے خاتون محترم کے مختصر حالات اخذ کر کے اردو قارئین "مخزن" کی خدمت میں پیش کر کے بے حد شکریہ کا موقع دیا ہے نیز وعدہ کیا ہے کہ اگر اس عظیم الشان خاتون کی ادبی زندگی کے کارنامے اور کسی ذریعے سے معلوم ہو سکے تو وقتاً فوقتاً نذر "مخزن" کرتے رہیں گے۔ بہرحال اس مضمون کو کسی حالت میں جامع و مانع تصور نہ کیا جائے۔ کیونکہ یہ محض اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ اردو خواں حضرات کے سامنے اس ترکی ادیبۂ جلیلہ کی زندگی کا صرف ایک دھندلا سا خاکہ پیش کر دیا جائے +

جذبات لطیف

محترمہ خاتون ز۔خ۔ش بیگم ہندوستان کی قابل اعتراف خاتونان اسلام سے ہیں۔ آپ کے کلام میں تبحر علمی۔ نازک خیالی کی جھلک کے رونما ہونے کے ساتھ جذبات لطیف کا بھی سرمایہ عنصر ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ نظم تو آپ کی قابلیت کی بہترین نظیر نہیں لیکن اس سے پہلے "کہکشاں" اور "زمیندار" میں آپ کی بہت سی نظمیں قدرت شعر کی اعلیٰ مثالیں مل سکتی ہیں +

اکلوتی بیٹے کی موت

حضرت ابو نعیم عبدالحکیم خان صاحب نشتر جالندھری پنجاب کے خوشگو شعرا میں سے ہیں۔ آپ کا کلام۔ بندش الفاظ اور نزاکت خیال کے ساتھ جذبات فطرت اور سوز و گداز کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ پھر زبان نہایت شستہ اور سلیس۔ ہم آپ کی عنایات کے سپاس گذار ہیں کہ "مخزن" کو بسلسلہ لطف ممنون احسان کرتے رہتے ہیں +

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مخزن

جلد ۲۱ اگست ۱۹۲۱ء نمبر ۴

فرضِ محبّت

علیم آج تنہا اپنے تصویرخانہ میں بُت بنا ہوا بیٹھا ہے ہندوستان کی برسات کا شورش انگیز موسم ہے اور شام کا وقت ۔کھڑکی سے ہلکی ہلکی ہوا آ رہی ہے اور علیم کے بالوں سے کھیلتی ہوئی نکل جاتی ہے علیم کے قریب ہی وہ تصویر رکھی ہے جس کو دو ہفتے کی مسلسل محنت کے بعد اس نے اسی وقت تکمیل کو پہنچایا ہے۔ یہ تصویر ایک چوکھٹے میں لگ رہی ہے اور سامنے ایک اونچی تپائی پر (جو تصاویر رکھنے کیلئے خاص طور سے بنائی جاتی ہیں) رکھی ہے ۔تصویر کے پاس ایک چھوٹی سی میز پر چند برش اور رنگ رکھنے کے کچھ برتن بھی رکھے ہیں۔ کمرہ نہایت سادگی کے ساتھ تصویروں سے سجا ہے اور دیکھتے ہی معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ کسی مصور کا تصویرخانہ ہے +

اس تصویر کو ختم کرنے کے بعد علیم نے جب اس وقت اس پر آخری نگاہ ڈالی تو اس کا سلسلۂ خیال اسے اپنی زندگی کے ایک ماسبق حصہ کی طرف لے گیا اور علیم ایک دریائے تخیل میں غوطہ لگانے لگا +

تصویر اچھی خاصی بڑی ہے ۔اس میں ایک سلسلہ کوہ بنا ہوا ہے اور اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک نہایت دلچسپ مقام ہے جو صاف طور سے نمایاں نہیں ہے اور عمداً دھندلا سا بنایا گیا ہے ۔نیچے کے حصّہ

میں جو پہاڑ کی گھاٹی کہی جا سکتی ہے۔ ایک نہایت پرلطف اور شاداب باغ بنا ہوا ہے جس میں بہت سے خوبصورت درخت نہایت خوبصورتی سے آراستہ ہیں اور گو اس باغ میں بہت صاف اور پورے طور سے ہر چیز علیحدہ علیحدہ نہیں دکھائی دیتی تاہم مجملاً اس کا اثر نہایت دلکش اور دلفریب ہے +

وسط باغ میں ایک آدمی کی شکل ہے جو نہایت حریص نگاہوں سے اس منظر کو دیکھ رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص پر اس باغ کا جادو پورے طور سے کام کر گیا ہے اور اب اس کا دل اس باغ کو چھوڑ دینے پر کسی طرح رضامند نہیں ہے۔ مصوّر کی قابلیت کا اندازہ اسی شخص کا چہرہ دیکھنے سے ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جذبات انسانی کو چہرے سے تصویر میں ظاہر کر دینا اس فن کا ایک نہایت دشوار اور اہم کام ہے +

اس شخص کے بعد ایک اور شخص کی تصویر ہے جو اس چمن کو طے کر کے پہاڑ پر کچھ چڑھ گیا ہے۔ مگر اس کا رُخ ابھی باغ ہی کی سمت ہے اور وہ تھوڑا سا اوپر جا کر پھر پلٹ کر اسی باغ کو دیکھ رہا ہے۔ اس شخص کے چہرے پر تذبذب کے آثار نمایاں ہیں۔ پہاڑ کے دشوار گذار راستہ کی تکلیف اور سامنے والے باغ کی دلکش تصویر دونوں اس کے ارادے کو ڈانواں ڈول کر رہے ہیں +

لیکن اس تصویر میں ایک تیسرا شخص بھی ہے جو اپنی منزل کی راہ کا ایک بہت بڑا حصہ طے کر چکا ہے اور اپنی جگہ سے ان دھندلی چوٹیوں کے منظر کو دیکھ سکتا ہے جس کے دیکھنے سے ابھی وہ اور دونوں عاجز ہیں۔ اس کا چہرہ اسی چوٹی کی جانب جھکا ہے اور وہ نہایت انہماک کے ساتھ اپنے سفر کے تمام کرنے کی کوشش میں منہمک ہے +

آیندہ خوشی کی امید میں موجودہ آرام سے منہ پھیر لینا واقعاً نہایت دشوار امر ہے کیا یہ انسانی خلقت کا مقتضا نہیں ہے کہ وہ موجودہ نفع کے خیال سے آیندہ کی غیر معلوم خوشی کو بھول جائے۔ یونانی فلسفیوں کا وہ گروہ جو زندگی کے فرائض میں صرف ان کاموں کو نیک سمجھتا تھا۔ جن سے حظ نفس حاصل ہو۔ وہ ایک ایسے اصول پر تھے جو طبیعت انسانی کے بالکل مناسب تھا۔ لیکن اگر ایسی زندگی صحیح زندگی کا نمونہ سمجھ لی جائے اور ذاتی راحت کو اچھائی یا برائی کا معیار مقرر کر لیا جائے تو دنیا کے تمدن میں خلل پڑ جائے اور وہ تمام باتیں جو آج گناہ عظیم سمجھی جاتی ہیں۔ جائز قرار دے دی جائیں اپنے نفع کی غرض سے اور حظ نفس کے واسطے اخلاقی جرائم کے ارتکاب کا فلسفہ ایک زمانہ تک رائج رہا ہے اور گو اس قدر

حد سے گذری ہوئی شکل میں نہیں۔ مگر پھر بھی اس کے پیرو کثیر تعداد اور مدت مدید تک رہے۔ اس میں تغیر ہوتا رہا اور آخر کار انگلستان کے مشہور فلسفیوں نے اس میں ایک بہت بڑا تغیر یہ پیدا کیا کہ انھوں نے سوسائٹی کی راحت کو ذاتی راحت سے مقدم سمجھا اور ان افعال کو قابل تحسین سمجھنے لگے جو صرف ذاتی خوشی کو نہ بڑھائیں بلکہ سوسائٹی کے لئے باعث راحت اور نفع مند ثابت ہوں۔ اس پر بھی بہت کچھ اعتراضات ہوئے مثلاً بعض لوگوں نے کہا کہ اگر ہر شخص بطور خود اپنی راحت کا سامان کرے اور اپنے نفع کی باتیں خود ہی انجام دے لے تو چونکہ سوسائٹی انھیں افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس لئے لازمی طور سے سوسائٹی کو بھی فائدہ پہنچے گا۔

تو پھر آخر اس دنیا میں انسان کس طرح زندگی بسر کرے کہ اس کی زندگی کامیاب کہلائے۔ اچھا اگر ہم ان لوگوں کی زندگی کو اپنا معیار زندگی بنائیں جو تمام لذات دنیوی کو ترک کر دیتے ہیں اور ہر وہ کام جو حظ نفس کے واسطے کیا جائے حرام خیال کرتے ہیں تو کیا ہماری زندگی کامیاب اور نیک زندگی کہی جاسکتی ہے؟ میں تو اس زندگی کو ایسی کامیاب زندگی نہیں سمجھتا جو دنیا کا نصب العین بن سکے۔ اس کی خرابیاں بہت نمایاں ہیں۔ کیونکہ اگر ہر شخص اس قدر خشک زندگی اختیار کرلے اور تمام لذات کو اپنے اوپر حرام سمجھ لے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر ایسی زندگی کی وقعت نگاہ سے جاتی رہے گی اور لذات جب مر جائینگی تو ان کے اوپر حاوی ہونے کی وہ خوشی باقی نہ رہے گی جو اب ہوتی ہے۔

علیم کے خیالات یہاں تک تو فلسفہ کے راہ پر چلے مگر اس کے بعد اس کو اپنی زندگی کے ذاتی تجربات یاد آنے لگے۔ انسانی فطرت کا اقتضا ہے کہ جب پرانی باتیں یاد آتی ہیں تو دل میں کچھ رنج اور خوشی کا ایک مخلوط جذبہ پیدا ہوتا ہے یہی حالت علیم کی بھی ہوئی۔ پہلے تو اس کے چہرے پر کچھ مسکراہٹ سی آئی اس کے بعد وہ اٹھ کر اس کھڑکی کے پاس چلا گیا جو باغ کے حسن و شگفتگی کو نظارہ افروز کرتی تھی۔ باغ کے دوسری طرف ایک کمرہ تھا جس میں علیم کے پڑھنے لکھنے کا سامان تھا۔ اس کی نگاہ اس کمرہ پر پڑی اور چونکہ متذکرہ بالا خیالات مجتمع تھے۔ اس لئے ایک خاص واقعہ کی یاد نے اس کے دل کو بے چین کر دیا اور علیم ایک خیال میں مستغرق ایک صورت آنکھوں کے سامنے لئے ہوئے بیتابی سے پلٹا اور اپنے تصویر خانے سے نکل کر باغ کی جانب روانہ ہوا۔

علیم باغ میں ہوتا ہوا۔ اس کمرے کی جانب چلا تو راستے میں دفعتاً اس کی نگاہ گلاب کی ایک سفید کلی پر پڑی۔ وہ رک گیا اور اس نے اس کلی کو توڑ لیا۔ اس کو سونگھا۔ مگر اس میں خوشبو نہ تھی اس کے نکہت

ابروؤں پر شکن پڑ گئی۔ مگر وہ چند ہی قدم گیا ہوگا۔ وہ شکن رفع ہو گئی اور اس نے اس پھول کو لبوں کے قریب لاکر چوم لیا۔ چومنے کی آواز یکایک جو کان میں آئی تو چونک پڑا۔ اور اپنی اس بے تکی حرکت پر خود ہی نادم ہو گیا!

علیم کلی لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ اور جیب سے کنجی نکال کر بکس کے پاس گیا۔ اور اسے کھول کر اس میں سے چند خطوط نکالے چونکہ کمرے میں اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ ایک ہاتھ میں انہیں لئے ہوئے اور ایک ہاتھ سے ایک چھوٹی کرسی اٹھا کر باہر چبوترے پر لے گیا اور باغ کی سمت رُخ کر کے بیٹھ گیا +

گو بظاہر ان خطوط کے لفافے بہت خوشنما نہ تھے مگر پھر بھی ان میں ایک ایسی سادگی تھی جو صدہا آرائیشوں سے زیادہ خوشنما تھی۔ علیم چونکہ اپنے خطوط ایک کاغذ تراش چاقو سے کھولنے کا عادی تھا۔ اس لئے اس کے خطوط کی ہیئت کھل جانے کے بعد بھی کچھ بدنما نہیں ہوئی +

پہلا خط

۱۴ مارچ ۱۹۱۰ء

از . . . .

میرے پیارے علیم . . . .

گو میں یہ خط لکھنے بیٹھی ہوں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں کیا کیا لکھوں اور کیوں کر لکھوں۔ آپ سے اگر میری کبھی پہلے کی ملاقات ہوتی تو شاید اس بات کی شکایت ہی لکھتی کہ آپ مجھے بھول گئے اور خط نہ بھیجا مگر ایسی حالت میں کہ جب آپ نے مجھے دیکھا تک نہیں تو میں کیسے اس بات کا گلہ کر سکتی ہوں کہ آپ میری حالت سے بالکل غافل ہیں اور میری تمناؤں کا خون کر رہے ہیں"

علیم نے اتنا پڑھا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر ایک مردہ تبسم نمودار ہوا۔ اتنے میں نوکر کمرے میں لیمپ جلانے کو گیا۔ مگر علیم کو اس کی خبر نہ ہوئی روشنی کر کے نوکر باہر آیا اور دریافت کرنے لگا کہ "اگر ضرورت ہو تو روشنی باہر رکھ دی جائے"۔ اس کا جواب علیم نے سر کی جنبش سے دیا اور نوکر نے ایک چھوٹی میز پر روشنی لاکر رکھ دی۔ علیم پھر پڑھنے لگا +

"اس وقت بدقت مجھے یہ چند گھڑیاں خط لکھنے کو ملی ہیں۔ اس لئے میں اس قلیل وقت کا بڑا حصہ معافی مانگنے میں صرف کرنا نہیں چاہتی۔ اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ میں دل سے مجبور ہو کر لکھ رہی ہوں۔ اور نہ معلوم ایسے ایسے کتنے خط لکھ کر جلا چکی ہوں۔ دیکھوں اس کا حشر کیا ہوتا ہے +

پیارے علیم آج غالباً ایک مہینہ سے بھی کچھ دن زیادہ ہو گئے میں نے اس درد کو سینہ میں چھپائے رکھا، مگر تا بکے۔ دل کانپتا تھا۔ اسی کے ساتھ تمھارا بھی خیال تھا۔ اپنے سے زیادہ اپنے اعزہ کی عزت کا پاس تھا۔ مگر آہ! کیا کروں۔ اے دل تو گواہ رہنا کہ میں مجبور تھی۔ اور اے شوق! تو اپنے جرم کا اقرار کرلینا تاکہ میں ملزم نہ قرار دی جاؤں تمھیں میں نے کہاں دیکھا اور کب دیکھا اور کس حالت میں دیکھا۔ یہ قصہ ایسا نہیں کہ زبان قلم دہرا سکے ؎

نہ کرتی کاش نالہ مجھکو کیا معلوم تھا ہمدم ۔۔۔ کہ ہو گا باعث افزائش درد دروں وہ بھی

جب تک اس خط کا جواب نہ آئے گا۔ اضطراب سانس لینا دشوار کر دے گا۔ تم مجھ سے کیسے ملو یہ حامل رقعہ ہذا تمھیں بتا دے گا۔ (نیم بسمل زاہدہ)

علیم نے یہ خط پڑھا۔ گو اس کو آئے ہوئے تقریباً پانچ برس گذر گئے تھے۔ مگر اس کے دل میں آج بھی وہی جذبات موجزن ہونے لگے جو پانچ برس قبل پیدا ہوئے تھے جس وقت علیم کو یہ خط یکایک ایک اجنبی لڑکے نے لا کر مع ایک خوبصورت پان کی ڈبیہ کے دیا تھا۔ اس وقت علیم کا سن ۱۹ برس کا تھا۔ مگر چونکہ اس نے ایک پاکیزہ زندگی بسر کی تھی اور فرقہ اناث کی نسبت اس کا علم صرف ناولوں کا ممنون احسان تھا۔ اس لئے وہ دل ہی دل میں شرما گیا اور خط کو پڑھ کر اس نے پان کی ڈبیہ کو ہاتھ سے رکھ دیا۔ ایک دفعہ اس کے جی میں آیا کہ یہ سب کچھ واپس کر دے مگر چونکہ اس کے سادہ دل پر خط کا بہت اثر ہوا تھا اس لئے وہ چپ ہو رہا اور نہایت ہی بیقراری کے ساتھ اپنے اس نئے تجربے پر غور کرنے لگا لیکن جب تھوڑے عرصہ کے بعد اس لڑکے نے جواب مانگا تو اس کی گھبراہٹ کی کچھ انتہا ہی نہ رہی اور اس نے ایک وحشت کے عالم میں لڑکے سے کہا کہ اگلے دن جواب لے جانا +

یہ سب باتیں علیم کو اس قدر صاف طور سے یاد تھیں کہ جیسے کل کا قصہ ہو اور اسی وجہ سے اس کو ان خطوط کے پڑھنے میں نہایت لطف آرہا تھا +

علیم کا خیال اس وقت ان خطوط کی جانب یوں پہنچا کہ جب اس نے زندگی کا ایک معیار قرار دیدیا تو اس نے اپنی زندگی پر ایک نگاہ ڈالی کہ آخر اس نے کہاں تک اس معیار کی پابندی کی ہے اور کہاں تک اپنی زندگی کے اہم فرائض کو انجام دیا ہے۔ ان تصورات کے ساتھ اس کا خیال قدرتاً اپنی زندگی کے اس حصہ تک جا پہنچا جب وہ نفسانی خواہشات کی پیروی سے بالکل آزاد تھا +

"ایک زمانہ تھا کہ مجھے محبت کے نام سے الجھن ہوتی تھی اور چونکہ اکثر کتابوں میں میں نے عورت کی محبت اور اخلاقی جرائم کو ساتھ ساتھ دیکھا تھا۔ اس لئے محبت کو میں گناہ سمجھتا تھا۔ زاہدہ کا خط جب مجھے پہلے پہل ملا تو میں سخت حیران تھا کہ کیا کروں۔ دل چونکہ ایک نئے تجربہ کا خواہشمند تھا اور اس طرح خط کا آنا بالکل ایک انوکھی بات تھی اس لئے میں نے اس خط کا جواب دیا مگر نہایت مجمل الفاظ میں .... ہاں میرے اس خط کے جواب میں یہ خط آیا تھا"

علیم نے خطوں کے پلندے میں سے ایک دوسرا خط نکالا اور اسے پڑھنے لگا۔

از آ ....

میرے پیارے

تمھارا خط ایک زہر میں بجھا ہوا نشتر تھا۔ اے کاش تمھیں اس درد کا کچھ بھی احساس ہوتا جو تمھارے یاس افزا خط نے میرے دل میں پیدا کر دیا۔ اگر تم مجھے صرف تخاطب میں تقدیم کا ملزم سمجھتے ہو تو سرِ تسلیم خم ہے مگر پہلے میری داستان سن لو تب تمھیں اختیار ہے جو چاہے سمجھنا اور جیسی رائے جی چاہے قائم کرنا۔

پیارے علیم! آج میرے والدین کہیں باہر گئے ہیں اور میری یہ رات بالکل تنہائی میں بسر ہو گی اس وجہ سے مجھے موقعہ ہے کہ میں تم کو اپنی آپ بیتی لکھوں ممکن ہے کہ تمھارے نام یہ میرا آخری خط ہو۔ مگر میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے اپنے خیال میں اس قدر ذلیل نہ سمجھو جتنا اس وقت سمجھ رہے ہو۔ دیکھوں مجھے اس مقصد میں کہاں تک کامیابی ہوتی ہے *

سنو۔ مگر ذرا غور سے میں جب سات برس کی تھی جس کو اب تقریباً نو برس ہوئے تو میرے والدین نے مجھے چند احباب کے اصرار سے ایک عیسائیوں کے اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کو داخل کیا۔ اور وہاں میں نے انگریزی پڑھنا شروع کی اور کامل دو برس تک پڑھتی رہی۔ اردو وغیرہ مکان پر پڑھ چکی تھی مگر اس زمانہ میں چونکہ اس اسکول میں بجائے تعلیم کے مذہبی وعظ اور نصیحتیں زیادہ ہوتی تھیں۔ اس لئے اس اثنا میں میں نے کچھ زیادہ ترقی نہ کی۔ آخر کار وہاں سے اٹھا کر میرے والدین نے مجھے شہر کے باہر ایک اسکول میں تعلیم کے لئے بھیج دیا۔ گو یہ عیسائیوں کا اسکول نہ تھا۔ مگر یہاں بھی اکثر استانیاں عیسائی ہی تھیں اس اسکول میں چار برس تک رہی۔ اس اثنا میں مجھ پر ایک عیسائی استانی خاص طور سے مہربان ہو گئی۔ اور اس کا یہ دستور تھا کہ راتوں کو میٹھ بیٹھ کر مجھ سے باتیں کیا کرتی کبھی کبھی مذہبی چرچے بھی جن سے میرے کان

ناآشنا نہ تھے) ہوا کرتے تھے لیکن اکثر اوقات عیسائیوں کی طرز زندگی کا ذکر ہوا کرتا تھا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ مجھ سے بارہا کہا کرتی تھی کہ ہم لوگوں میں لڑکیوں کا شریف لڑکوں سے ملنا برا نہیں سمجھا جاتا۔ اور لڑکیاں چونکہ پردہ نہیں کرتیں اس لئے انھیں اختیار ہوتا ہے کہ جس سے چاہیں ملیں +

ایسی حالت میں ایک ہندوستانی لڑکی جو مکان کی چار دیواری میں مقفل رہتی ہے۔ وہ کیا کرے میں جانتی ہوں کہ اکثر ایسی ملاقاتیں ذلیل ارادوں سے کی جاتی ہیں۔ مگر پیارے علیم کیا محبت کے چہرے پر ایک نما داغ نہیں کہ مرد اور عورت کی ملاقات کا نتیجہ ہی جرم سمجھ لیا جائے +

پیارے علیم تم نے اپنے خط میں مجھ سے ملنے کی کئی دشواریاں لکھی ہیں جن سے تمھاری طبیعت کی نیکی اور پارسائی ظاہر ہے۔ اگر تم خط و کتابت جاری رکھنے اور ملنے سے بالکل انکار کر دیتے یا فوراً ملاقات پر آمادہ ہو جاتے تو میں تمھاری اتنی قدر نہ کرتی جس قدر اب کر رہی ہوں اور نہ تمھاری خوبیوں کی اس قدر معترف ہوئی جتنی اب ہوں۔ اس حالت میں مجھے یقین ہو جاتا کہ تمھیں اپنے اوپر اعتماد نہیں اور تم اپنے جذبات پر حاوی نہیں ہو۔ گو یہ میں بھی جانتی ہوں اور تم بھی واقف ہو کہ وہ وجوہات جو تم نے مجھ سے نہ مل سکنے کی لکھی ہیں وہ بالکل بے اصل ہیں۔ مگر پیارے علیم اگر تم مجھ سے صرف انھیں کی بنا پر نہ بھی ملو تو میں تمھاری شکایت مند نہیں ہو سکتی ؎

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی مصیبت کا گلہ — اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

میرے دل کے جذبات تھوڑے عرصے کے لئے میرے قابو میں نہ تھے اور میں مجبور تھی میں نے پہلا خط تمھیں ایک بیخودی کی حالت میں لکھا تھا۔ اچھا کیا تم نے اس کا جواب ایک ہفتہ بعد بھیجا۔ کیونکہ اس عرصہ میں مجھے بہت کچھ ہوش آگیا اور امید و یاس کے جھونکوں نے مجھے اس خواب پریشاں سے بیدار کر دیا تھا جس وقت سے ہوش آیا تھا نادم تھی اور اپنی اس حرکت پر پیچ و تاب کھاتی تھی تم خود انصاف سے دیکھو۔ اگر ایک شریف لڑکی سبقت کر کے کسی غیر شخص کو اس طرح کا خط لکھے اور اس کا جواب ایک حقارت آمیز سکوت سے دیا جائے تو اس کے دل پر کیا گذرے گی؟ لیکن خیر شکر ہے کہ میری قسمت میں اتنا ذلیل ہونا نہیں لکھا تھا اور جتنی ذلت میں نے عمداً اختیار کی اس سے زیادہ ذلیل نہ ہوئی +

اب میں یہ خط ختم کرتی ہوں۔ دو بجنے میں کچھ منٹ باقی ہیں لکھنے کو تو اگر میں صبح تک لکھا کرتی تب بھی مجھ پر کچھ گراں نہ گزرتا۔ مگر اب زیادہ کیا لکھوں اور کہاں تک دردِ دل کہوں۔ پیارے علیم! اب رخصت

ہوئی ہوں۔ دیکھوں قسمت میں کیا لکھا ہے۔ اور اس محبت کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ تم سے صرف اس قدر استدعا ہے کہ آیندہ جب کبھی میرا خیال آئے تو مجھے بہت زیادہ حقیر اور ذلیل مت سمجھنا۔ میری محبت کا صرف خدا شاہد ہے اور میرا نفس مجھ پر اس قدر لکھنے یا کسی ایسے غیر مرد سے ملاقات کی خواہش کرنے پر نفرین نہیں کرتا جس کے افعال اور جس کی خصلتوں اور خوبیوں پر میں فریفتہ ہوں۔ محبت اگر محض محبت ہی کے لئے ہو تو قابل شرم نہیں ہو سکتی بلکہ انسان کی فطرت کو ارفع و اعلیٰ بنا دیتی ہے اور ہزارہا ایسے گناہوں سے بچاتی ہے جو دنیا کی نگاہ میں جرم محبت سے کہیں زیادہ بدتر اور قابل سزا سمجھے جاتے ہیں۔

(گرفتار محبت زاہدہ)

علیم جتنی دیر تک یہ خط پڑھتا رہا اس نے ایک دفعہ بھی گردن نہیں اٹھائی۔ جب ختم ہو گیا۔ تو نگاہ بلند کی۔ دیکھا بالکل اندھیرا ہو گیا ہے۔ لیمپ جل رہا ہے اور باغ میں بالکل سناٹا ہے۔ چاندنی رات تھی۔ باغ کا منظر نہایت دلفریب تھا۔ علیم ہاتھ میں ایک تیسرا خط بھی لئے ہوئے تھا۔ مگر اس نے اس کو نہیں پڑھا۔ بلکہ اپنے خیالات کو مجتمع کرنے کے لئے اٹھا اور باغ میں ٹہلنے لگا۔

علیم ہمیشہ سے غور و فکر کا عادی تھا اور بچپن ہی سے اس کو ہر چیز پر گھنٹوں غور کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔ اور وہ کوئی کام بھی بلا سوچے سمجھے کبھی نہ کرتا تھا۔ جس وقت اسے زاہدہ کا یہ دوسرا خط ملا تھا۔ تو اس نے اس سے ملنے کا مصمم قصد کر لیا۔ اور ایک مہینہ کی کوشش کے بعد ان دونوں کی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ علیم جو غائبانہ زاہدہ کا مداح ہو چکا تھا اس کی باتیں سن کر اور اس کے مزاج اور طبیعت کی کیفیت دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو گیا۔ اس کے اپنے گھر میں بھی عورتیں تھیں اسے قریب کے عزیزوں کی لڑکیوں کو بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان میں اکثر کچھ نہ کچھ پڑھی ہوئی بھی تھیں اور بعضوں نے تو ایک حد تک انگریزی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ مگر علیم جب زاہدہ سے ملا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں وہ سمجھا کہ صرف تعلیم انسان کو اس قدر شستہ اور مہذب نہیں بنا سکتی جتنا تربیت کا دخل ہے۔ زاہدہ فطرتاً بے انتہا ذہین تھی اور چونکہ مقابلتاً ایک روشن خیال گھرانے میں پلی تھی۔ اس لئے اس کی حالت ان لڑکیوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اچھی تھی۔ اس کے ماسوا زاہدہ بورڈنگ ہوس میں بھی رہ چکی تھی اور اس سبب سے اس کے خیالات ان لڑکیوں کے مقابلہ میں جنھوں نے گھر کے باہر قدم نہیں رکھا تھا وسیع تھے۔

علیم کو جب زاہدہ کا پہلا خط ملا تو اس نے اس کے متعلق کوئی اچھی رائے قائم نہ کی اور سچ یہ ہے

کہ پردے میں رہنے والی لڑکیوں کے لئے اتنی بیبا کی قابل اعتراض معلوم ہوتی ہے اور ہندوستان کی سوسائٹی میں ابھی اس قسم کی آزادی کچھ اچھے نتائج کبھی پیدا نہیں کرسکتی۔ مگر جب علیم ملا اور وہ زاہدہ کے خیالات سے پورے طور پر آگاہ ہوا تو اس کی قابلیت اور ذہانت پر عش عش کرنے لگا اور اس قدر متاثر ہوا کہ وہ اپنے شروع شروع کے اس خیال کو بالکل بھول گیا کہ یہ ملاقات کوئی گناہ ہے ✤

علیم کو حیرت تھی کہ کیا واقعی یہ ایک ہندوستانی عورت ہے جس نے اپنے چہرے پر سے کبھی پردہ نہیں اٹھایا۔ گھر اور بورڈنگ کے سوا کہیں نہیں گئی! وہ ابھی تک سمجھتا تھا کہ بالعموم ہندوستانی عورتیں پردے میں رہ کر سوا اچھے یا برے خانہ داری کے کاموں کے اور کسی قابل نہیں ہوسکتیں اور نہ ان کے خیالات اس قدر وسیع ہوسکتے ہیں جتنے عموماً اور ملکوں کی عورتوں کے ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ تعلیم ان عورتوں کو کسی قدر بہتر بنا سکتی ہے۔ مگر اتنا نہیں کہ انہیں اور ممالک کی عورتوں کے مقابل کھڑا کر کے مگر جب وہ زاہدہ سے ملا اور اس سے واقف ہوا تو اسے اس حقیقت کے انکشاف سے بہت خوشی ہوئی کہ اس کے پہلے خیالات غلط تھے ✤

آج پانچ برس بعد جب علیم پھر ایک دفعہ اسی عالم محبت میں پہنچا تو اسے آرزوؤں کے درد کے ساتھ اس بات کا احساس ہوا کہ اس کے دل میں زاہدہ کی الفت اس وقت تک ویسی ہی موجود ہے جیسی پہلے تھی۔ اور آج بھی وہ زاہدہ سے ملنے کا اسی قدر متمنی ہے جتنا کہ پہلے ہوا کرتا تھا ✤

"انسان کے خیالات میں کیا کیا انقلابات ہوا کرتے ہیں۔ میں پہلے سمجھا کرتا تھا کہ عورت کی محبت اور اخلاقی جرائم ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ مگر چند مہینے کے تجربے سے مجھے معلوم ہو گیا کہ اگر انسان میں اخلاقی قوت ہو اور وہ پہلے سے اپنے جذبات کا مطیع نہ ہو تو محبت سے ایک بلند درجہ پر پہنچ سکتا ہے" محبت محبت کے لئے ہے" مجھے ایک بے معنی فقرہ معلوم ہوا کرتا تھا لیکن اب میں ان کے معنی ولطف سے خبردار ہو گیا ہوں محبت آدمی کو انسان بنا سکتی ہے۔ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف کسی قانون کے مطابق شادی ہو جانے سے کسی غیر عورت کے ساتھ حقیقی ومقدس محبت ہوسکتی ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ صرف چند الفاظ پڑھ دینا کسی طرح کافی نہیں ہے۔ اس وقت تک وہ غیر مرد اور عورت میں محبت نہیں ہوسکتی جب تک وہ دونوں اپنا اپنے جذبات پر حاوی نہ ہوں اور اگر حاوی ہوں تو ایسی محبت چاہے غیر شادی شدہ مرد و عورت میں کیوں نہ ہو وہ بھی حقیقی ومقدس محبت" کہے جانے کی مستحق ہے ✤

میں زاہدہ کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہوسکتا کیونکہ وہی وہ عورت ہے جس نے مجھے اس محبت کا پہلا سبق دیا۔ فی الاصل اس کا مجھ سے ملنا میرے لئے امرت ثابت ہوا۔ اس سے ملنے کے بعد زندگی کے بہت سے اہم فرائض جو مجھے پہلے ناگوار معلوم ہوتے تھے اور جنھیں میں ایک تکلیف بیجا سمجھا کرتا تھا سہل معلوم ہونے لگے اور بہت سے فرائض جنھیں میں پہلے فرض سمجھتا ہی نہ تھا اچھی طرح جان گیا۔ اور اب تو میری یہ رائے ہے کہ عورت کو اگر اپنے اوپر اس قدر اعتماد ہو جتنا زاہدہ کو تھا تو وہ جس سے چاہے ملے اور جس سے چاہے ملاقات کرے۔ اس کو کبھی کسی سے کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ گو زاہدہ کو مجھ سے جدا ہوئے اندازاً پانچ برس کے قریب ہوئے ہوں گے اور ممکن ہے کہ اس اثنا میں اس کی شادی بھی ہوگئی ہو۔ مگر مجھے اس کا یقین ہے کہ اس کے دل میں بھی آج میری اسی قدر محبت ہوگی جتنی میرے دل میں اس کی محبت ہے۔ مگر میں حیران ہوں کہ آخر اس کی خاموشی کا سبب کیا ہے ....

جب زاہدہ جا رہی تھی تو اس نے مجھے جاتے وقت ایک خط لکھا تھا جس میں اس نے اپنے قیام کی جگہ سے مطلع کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اس نے ایسی خاموشی اختیار کی کہ باوجود کوشش کے مجھے اس کا کسی طرح پتہ نہ چل سکا +

علیم عرصہ تک ٹہلا کیا اور اسی قسم کے خیالات میں غرق رہا۔ اس کے بعد اس نے باغ سے ایک سُرخ گلاب کا پھول توڑا۔ اور کمرے کے اندر چلا گیا۔ باہر رکھے ہوئے لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی کمرے میں جا رہی تھی۔ وہاں اسے وہ سفید پھول دکھائی دیا جو اس نے اپنے خیال کی دُھن میں توڑ لیا تھا اور جسے پیار کرکے وہ شرمندہ ہوگیا تھا +

"زاہدہ کا دل اس گلاب کے پھول سے کہیں زیادہ صاف اور پاکیزہ تھا۔ مگر چونکہ لوگ اس پھول کو عفت کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اور سُرخ گلاب کو عشق کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں۔ اس لئے میں اس واقعہ کی یاد ان دونوں پھولوں سے قائم رکھوں گا۔ اور ان سے اپنی بیقرار دل کو تسکین دیا کروں گا"

علیم نے پھر ان دونوں پھولوں کو پیار کیا اور خطوں کے ہمراہ بکس میں بند کر دیا۔ گھڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ آٹھ بج چکے ہیں۔ اس وقت اسے یاد آیا کہ ایک دوست سے آٹھ بجے ملنے کا وعدہ تھا۔ اس لئے فوراً لباس پہنکر غمگین دل اور سست قدموں کے ساتھ مقام موعودہ کی طرف روانہ ہوگیا +

"رازدار"

آہ تو کہاں ہے؟

چشمہ کے کنارے پر جہاں آبِ رواں کی متبسم موجیں آفتاب کی شعاعوں سے کھیلتی ہوتی ہیں اور جہاں سبزۂ خودرو کی تازگی بخش جنبش تمناؤں میں شورش پیدا کر دیتی ہے میں خلوت سے تنگ آجاتا ہوں اور آب مصفیٰ کے روشن آئینہ میں اپنے جذباتِ باطنی کے لرزاں عکس کو لہروں کی بے قراریوں سے ہم آغوش ہوتے دیکھ کر پکار اُٹھتا ہوں +

آہ۔ تو کہاں ہے؟

بہار کی رنگ آفرینیاں ترے قدموں کی مستانہ جنبشوں کو بوسہ دینے کے لئے پھولوں کی رنگینیوں کی آغوش سے مچل مچل کر باہر نکلی پڑتی ہیں اور بادِ صبا کے راحت پرور جھونکے غنچوں کی مسکراہٹ سے ہم کنار ہونے کے لئے بے تابانہ پریشانیوں میں گرفتار پھولوں کے نازک اور لطیف پردوں میں محوِ جستجو ہیں۔

زمین کی پتھریلی بلندیوں کی سفید نورانی چوٹیوں پر جہاں قدرت خاموشی کی وسعتوں میں انگڑائیاں لے رہی ہوتی ہے اور آفتاب نور کی تیز کرنیں برف کی پھسلا دینے والی سطح پر روشنی کی بارش کرتی ہوتی ہیں۔ جہاں تنہائی اپنی بے شمار دلفریبیوں سمیت دنیا کے شور و شغب پر خندہ زن ہوتی ہے اور جہاں برودت کی کارفرمائیاں حرارت کی عملداریوں سے مصروف پیکار ہوتی ہیں میں باطنی جذبات کی شور انگیز بے تابیوں سے مجبور ہو جاتا ہوں اور بے اختیار چیخ اُٹھتا ہوں +

آہ۔ تو کہاں ہے؟

شیریں پانی کی تیز اور مدھم بہتی ہوئی ندیوں کی روانی میٹھے راگ گاتی ہوئی تری تلاش میں محو تگ و دو ہے کہ ترے گورے گورے پاؤں کی نزاکتوں کو چھوئے۔ چمکدار سنگریزوں کی بے حسی مدتوں سے انتظار کش ہے کہ۔ تری حنائی انگلیوں سے برکت حاصل کرے +

چاندنی رات کے دلربا سکوت میں جب چرخ نیلوفری کی دائمی گردشیں ستاروں کی لرزاں حرکتوں سے

مصروفِ گفتگو ہوتی ہیں اور کہکشاں کی پریشانیاں نہ جانے کیوں ٹھنڈی آہیں بھر رہی ہوتی ہیں۔ جبکہ دنیا خاموشی کی سنسانیوں میں محوِ خواب ہوتی ہے۔ اور خلوت کی اطمینان بخش لذتیں زمین کو اپنی دولتوں سے مالا مال کر دیتی ہیں تو خواہشوں کے پے در پے تقاضوں کے ہجوم سے گھبرا کر کہہ اٹھتا ہوں +

آہ۔ تو کہاں ہے؟

مہتاب اپنی روشن چادر سے سبزے کو منور کئے ہوئے ہے کہ تیرے جاں بخش تبسم سے شیرینی حاصل کرے۔ اور تنہائی کی رازداریاں نہار رہے حسنِ بے پردہ کے جلووں سے کامیاب ہونے کے لئے بے تابی کی کروٹیں لے رہی ہیں۔ مگر تو نہ جانے کہاں ہے۔ بے تاب دل کی شورو غل کی پہنچ سے باہر حسن روح پرور کن نورانی پردوں میں روپوش ہے۔ استغنا کی خوابِ شیریں کے پُر سکون نظارے تیرے آرام کے محافظ ہیں اور بے اعتنائی کی خاموشیاں پہرہ دار +

صحرا کی وحشت افزا تنہائی میں جہاں پاؤں کے آبلے میری مجنونانہ کیفیتوں پر حسرت اور افسوس کا رونا روتے ہیں اور گریبان کی الجھنیں جوشِ جنوں کی دست درازیوں سے تنگ آ کر بے بسی کے عالم میں منتشر ہو جاتی ہیں جب قوتِ گویائی کی مجبوریاں بند ہونٹوں کی قید میں گرفتار ہوتی ہیں تو آرزوؤں کے ہجوم سے پریشان ہو کر گنگنا اٹھتا ہوں +

آہ۔ تو کہاں ہے؟

میری تمنائیں بے تاب ہیں اور آرزوئیں بے چین میرا اشتیاق ڈھونڈتا ہے کہ تیری محبت بارنگاہوں سے تسکین پائے۔ اور میرے شوقِ آرزو کی فراوانیاں منتظر ہیں کہ تیرے حسن بے نقاب کے نورانی منظر پر فدا ہو جائیں +

امیر حسن ناز از سیالکوٹ

حسن۔ انسانی تمناؤں کا مخرج ہے +

احساسِ درد عشق کی پہلی منزل ہے +

اشتیاق کا وفور وقت کا غلط اندازہ کرتا ہے +

محبت میں وہ درویشانہ بے نیازی ہے کہ دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی +

اہلِ محبت گوشۂ تاریک میں بھی سیر چمن کا لطف اٹھاتے ہیں +

(پریم چند)

گلابی ساڑھی

(۱)

جمشید کو خلاف معمول ملول و متفکر دیکھ کر شیریں کے بیتاب جذبۂ شوق نے خودداری کے مصنوعی بندھنوں کو توڑ ڈالا اس نے اپنی سانولی کلائی جس کا زیور صرف اس کی حسن پاش عریانی تھی جمشید کے گلے میں ڈال دی اور دوسرے ہاتھ سے اس کی جھکی ہوئی ٹھوڑی کو اوپر اٹھا کر اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا ؛

جمشید کی رنج و غم کے بار سے دبی ہوئی پلکیں ایک کشمکش کے بعد بے کسی سے اوپر کو اٹھیں۔ اور اس کی مایوس نظریں شیریں کی نشۂ محبت سے چور آنکھوں کے تحیر افروز عمق میں ڈوب گئیں۔ ایک مسحور کی طرح اس کا چہرہ شیریں سے قریب تر ہوتا گیا اور جب دو لعل ریز ہونٹوں کے قرب نے اس کے بدن میں ایک سنسنی پیدا کر کے اس کا رواں رواں کھڑا کر دیا تو وہ جھجک کر پیچھے ہٹا اور گرم گرم آنسو اس کی آنکھوں سے ابل کر رخساروں پر بہ آئے ؛

وہ یکلخت سوفے پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور شیریں کی طرف دیکھے بغیر وہاں سے رخصت ہونے لگا لیکن شیریں کا اٹھ کر اپنا ہاتھ آہستہ سے اس کے کندھے پر رکھ دینا اس کے عزم کی شکست کے لیے ضرورت سے زیادہ تھا اس نے آہستہ مڑ کر شیریں کو۔ اس کی خاموش نظروں کو دیکھا اور مجبوری سے سوفے پر گر پڑا ؛

شیریں کے بے حد اصرار پر اس نے نیچی نظروں اور ٹوٹے پھوٹے فقروں میں بتایا کہ اس کے بے حس اور ظالم چچا کاؤس جی جو اس کے مربی اور سرپرست بھی ہیں اس کے مستقبل کو شیریں سے آباد دیکھنے پر رضامند نہیں اور اس کی ازدواجی زندگی کو تباہ و برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس نے کہا کہ بعض معاملات کے متعلق وہ عجیب و غریب رائے رکھتے ہیں اور مضبوط سے مضبوط دلائل اور اعلیٰ سے اعلیٰ نظائر بھی ان کی رائیں متزلزل نہیں کر سکتیں۔ جذبات عشق کو وہ نہ صرف نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں بلکہ ان کا سدراہ ہونا وہ اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں" ؛

کو دیکھ کر اس نے بمشکل اپنے غصہ کو ضبط کر لیا اور دیکھا تو کاؤس کسی نئے تخیل کے پراسرار عمق میں مستغرق تھا۔
تینوں خاموش تھے۔ بے حس و حرکت تھے لیکن ان کے دلوں میں عجیب و غریب جذبات بادلوں کی طرح گھر گھر کے جدا۔ اور جدا ہو ہو کر گھر رہے تھے اور سینما کا تماشہ زندگی کے کسی معمے کو اور زیادہ الجھا رہا تھا۔

(۴)

اگلے روز دوپہر کے قریب ایک کار شیریں کی کوٹھی کے دروازے پر ٹھیری اور اس میں سے کاؤس باہر نکلے۔ وہ کوٹھی کے صدر دروازے کی طرف چلے لیکن روش کے ایک طرف پام کے گملوں کے افسردہ سائے میں انھیں ایک عورت سلائی کے کام میں مستغرق دکھائی دی اور وہ ٹھٹک کر رہ گئے۔ کچھ دیر اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے بعد وہ روش پر سے اتر کر جھجکتے قدموں سے اسی طرف روانہ ہو گئے۔ اور اس عورت کے قریب پہنچکر اعماق قلب سے نکلنے والی آواز میں کہا "فیروزہ"!

فیروزہ کرسی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور جب اس کی نظریں کاؤس جی سے دوچار ہوئیں تو وہ اپنی جگہ پر سن کی سن ہو کر کھڑی رہ گئی۔ اس کا دماغ اس نظارہ کو تخیل کا کوئی شعبدہ سمجھ رہا تھا اور اس کا دل اسے خواب ہی سمجھ کر بے حد مسرور تھا لیکن جب کاؤس نے بڑھتے بڑھتے اسے اپنی بازوؤں میں لے لیا اور فیروزہ کے سینے نے ایک خمار انگیز آغوش کی حرارت میں ایک بیقرار دل کی دھڑکن بھی محسوس کی تو تمام موجودات ایک دیوانہ رقص ناچ کر صفحۂ عالم پر سے محو ہو گئیں اور ان دونوں کے حواس ایک نہایت پُر لطف اور رنگین بیہوشی میں ڈوب گئے۔

کاؤس نے کہا "فیروزہ میں ایک بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہوا جب میں تم سے جدا ہو کر تجارت کی غرض سے یہاں سے روانہ ہوا تو پردیس میں میں نے یہ دلشکن خبر سنی کہ میرے بعد تم نے میرے رقیب نوشیرواں جی سے شادی کر لی ہے اس کے بعد میرے مایوس دل کو اتنی جرأت ہی نہ ہوئی کہ میں ہندوستان واپس آؤں۔ چنانچہ میں نے یہ تمام عرصہ مارشیس میں بسر کیا۔ وہاں ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ نوشیرواں جی اور مسز نوشیرواں جی کا انتقال ہو گیا۔ اب کچھ عرصہ ہوا کہ میں بمبئی واپس آیا ہوں اور کل رات سے پہلے۔ میں تمھیں زندہ نہ سمجھتا تھا"۔

فیروزہ بولی "میں نے تم سے کئی بار کہا تھا کہ تم خواہ مخواہ نوشیرواں جی کو اپنا رقیب سمجھتے ہو۔ وہ

میری بہن کے خواستگاروں میں سے ہے"*

کاؤس نے شرمندہ ہوکر جواب دیا "شاید اسی وجہ سے تم نوشیرواں سے بے تکلفی سے ملتی تھیں اور مجھ سے کھنچی کھنچی رہتی تھیں اور یہی تفاوت تھا جو ہر وقت میرے دل میں رقابت کی آگ بھڑکاتا رہتا تھا۔ حقیقت میں میں اپنی غلطی پر بے حد پشیمان ہوں اور اس کا کافی خمیازہ بھگت چکا ہوں۔ فیروزہ تمھاری یاد میرے دل سے کبھی فراموش نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ میں تمھاری اس گلابی ساڑھی کو بھی نہیں بھولا۔ جو ہماری آخری ملاقات کے وقت تم نے پہن رکھی تھی۔ رات میں نے تمھاری بھانجی کے جسم پر اس ساڑھی کو فوراً پہچان لیا"*

فیروزہ نے تعجب سے پوچھا "تو کیا جمشید کے بے حس چچا تم ہی ہو"؟

کاؤس نے کہا "ہاں جمشید میرا ہی بھتیجا ہے لیکن جس محبت کی ناکامی نے مجھے بے حس بنا دیا تھا۔ اس میں کامیاب ہوکر میں اب پھر ذی حس ہو جاؤں گا"*

یہ کہہ کر کاؤس نے ایک بوسۂ محبت سے اپنی محبت کا کامیاب دور شروع کیا*

اوپر کھڑکی میں سے ایک آواز آئی "نہیں نہیں ہم اس جذبے کو نفرت اور حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں" اور انھوں نے اپنی محویت سے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو جمشید اور شیریں ایک کھڑکی میں کھڑے قہقہے لگا رہے تھے*

سید امتیاز علی تاج

پھول

جب میں زمین کے سخت و کرخت سینے پر کسی تنہا پھول کو اپنی شگفتگی میں سرشار دیکھتا ہوں تو ٹھٹک کر رہ جاتا ہوں۔ مجھے گئے گذرے زمانے کی دھند میں سے وہ منظر جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جب ایک باپ کے کانپتے ہوئے ہاتھوں نے اپنی زندگی کی مسرتوں کے خزینہ دار ننھے بچے کے زرد و سرد جسم کو قبر کی تنہا تاریکی میں چھوڑ کر مٹی سے ڈھانپ دیا تھا*

میں سوچتا ہوں کہ اس شگفتہ پھول کا ان ننھے ننھے سفید ہاتھوں ہی میں ہمیشہ کے لئے چھپ جانے والے نازک ہاتھوں سے تو کچھ تعلق نہیں ہے۔ یہ اسی کی پاک روح تو نہیں جو اپنی یاد کا حق مانگنے کے لئے زمین کے سکوت میں سے اپنے حسن معصوم کے ساتھ باہر جھانک رہی ہے*

تاج

تو مجھے پھر یاد آگئی

میں سمجھا تھا کہ رات کی سترا کم ظلمت تیرے خیال کو مجھ سے پوشیدہ کر دے گی اور تیری یاد کو دبا دے گی — مگر نہیں اس کا سواد تیرے گھنیرے گیسوؤں سے ملتا جلتا ہے۔ اس کا طول تیری زلفوں سے مشابہ ہے — تو مجھے پھر یاد آگئی۔

میں نے خیال کیا تھا کہ اس وقت جب علیل نسیم اپنا مشک پاش دامن اٹھائے۔ درختوں کی شاخوں کے سہارے خراماں نظر آئے گی جب شب بیدار ستارے اپنی خواب آلود آنکھیں بند کرتے ہوں گے جب جاتی ہوئی ظلمت نور سحر سے گلے مل کر رخصت ہو رہی ہوگی میرا خیال بٹ جائے گا اور میرا دل بہل جائیگا — مگر نہیں رات نے اپنا دامن سمٹایا تیرے بیاض گردن سے سواد زلف سرکا — تو مجھے پھر یاد آگئی۔ نور سحر میں نہائے ہوئے افق پر آفتاب داغ پیکر کا تدریجی عروج مجھے اپنے میں جذب کر چکا ہوتا۔ اگر میرا خون شدہ دل جو تیری محض تیری بیمار نگاہوں کا فدیہ تھا نہ یاد آتا — دل کہاں — تو مجھے پھر یاد آگئی ✣

میں سمجھتا تھا کہ چمن کی طراوت میرے زخمی دل کے لئے ایک مرہم لطیف ہوگی مگر توبہ — شاخوں میں تیری لچک ہے، اور گلوں میں تیرا رنگ — کلیوں میں تیرا تبسم ہے اور کانٹوں میں تیرے مژگاں دراز کی تصویر — تو مجھے پھر یاد آگئی

مجھے یقین تھا کہ موسم برشگال کی خنک ہوائیں چمن کے دوش پر برق لسبل کا بستر ہوتا ہے میرے دماغ حیات کو تسکین دیں گی۔ اور میرے مد اشک میں جزر پیدا کریں گی — مگر کہاں — تیرہ گھٹاؤں میں تیرے چشم سرمگین کی تعبیر تھی اور جلوہ برق میں تیرے نگاہوں کی تفسیر — تو مجھے پھر یاد آگئی ✣

سطح فلکی پر ماہ نور بار کی سیر اور اس کا وسیع دامن ضیا میری تسلی کے لئے کم نہ تھا۔ اس کی ہمہ گیر جاذبیت میرے خیال کو محو کرنے کیلئے کافی تھی۔ اگر میرا پہلو ویران نہ ہوتا۔ آہ نہ تو تھی نہ دل — تو مجھے پھر یاد آگئی۔ ✣

دریا کے آغوش میں ایک جسم سیال و لطیف کی رفتار میرے لئے کیسی دلچسپ ہوتی اگر تو — اے میری موج پا! مجھے نہ یاد آتی — موجوں کی کشش میں تیرے قد ابرو کی تصویر ہے اور حبابوں کے وجود فنا میں میرے دل آبلہ سامان کا نقشہ — تو مجھے پھر یاد آگئی ✣

گہر جائسی

معاشقۂ عرب
یا
وصالِ حسن و عشق

خدائے قادر نے حسن اور پھر عورت کے حسن کو بھی کیا قوت تاثیر اور جاذبیت ودیعت کی ہے۔ آگ کو پانی اور پتھر کو موم کر دینا۔ اس کی برق ریز تجلیوں کا ایک معمولی کرشمہ اور آئے دن کا معمول ہے۔

ایک سخت سے سخت اور جذبات سے بری دل رکھنے والا انسان بھی اس کے سحر افروز شعلوں اور الفت آفریں شراروں کی تابش سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک سرکش مغرور جو کسی بڑی سے بڑی ہستی کے آگے بھی سر جھکانا اپنے لئے ذلت سمجھتا ہو جس کی خود بینیاں حوادث عالم کے غیر معمولی سے غیر معمولی انقلاب اور اتفاق سے بھی چشم ملتفت کو ملوث کر لینا اپنے استغنا رکبر اور شان عظمت کی توہین جانتی ہوں جس کی خود داریوں کے نزدیک دنیا کے موثر سے موثر واقعہ سے بھی اثر پذیر ہونا مذہب شجاعت کا گناہ عظیم ہو۔ مگر ایک حسین عورت کی جادو فریب آنکھیں اس کو بھی اپنا مسحور محبت کرنے اور اس کا غرور توڑنے میں ہمیشہ فاتحانہ کامیابی حاصل کر سکتی ہیں۔ اس کے خنجر ابرو اور تیغ ادا کی ادنیٰ سی جنبش بھی بڑے بڑے سورماؤں اور بہادروں کو چشم زدن میں دنیا سے ناپید کر دینے میں کافی سے زیادہ کارگر ثابت ہوئی ہے۔ عالم علم و فضل کے جید سے جید ماہر، دنیائے زہد و اتقا کے اعلیٰ سے اعلیٰ کامل اس کے خاموش مجسمے کے حضور میں رو زاس عاجز برہمن کی طرح سربسجود نظر آتے ہیں جو باوجود انتہائی عقل و ہوش کے بھی ایک پتھر کی مورتی کے آگے زانوئے ادب تہ کئے سر ٹیکے۔ دونوں ہاتھ جوڑے گڑ گڑا۔ گڑ گڑا کے ڈنڈوت کر رہا ہو اور اس کا یقین۔ اسکی عقیدت اس حسن عمل کو فرضِ ایمانی جان کر مسرور ہو۔

نوجوان ذرعہ کی زندگی حسین و شکیل ہونے کے ساتھ علم و فضل کے کمال سے بھی آراستہ تھی۔ وہ

شباب کی بے نیاز خوش مستیوں کے ساتھ شجاعت اور بہادری کی بیش بہا صفات سے بھی متصف تھا۔ اس کا لہو و لعب بھی قتل و خون تھا۔ وہ کھیل بھی کھیلتا تو مردانہ۔ شکار کا بہت شوقین تھا جب کبھی علم و شجاعت کے مشاغل سے اُکتا تا تو کسی جنگل کی طرف نکل جاتا تھا۔ صبح سے شام تک اپنی تیر اندازی۔ تیغ آزمائی میں دن کاٹتا۔ بیسیوں بے زبان جانوروں کا خون پانی کرتا اور چلا آتا۔ اس کے کبھی وہم میں بھی نہ آیا تھا کہ کوئی طاقت دنیا میں اس کے شوق۔ اس کی خوشی کی بھی مزاحم ہو سکتی ہے۔ وہ مطلقاً بے خبر تھا کہ مخلوقات عالم میں کوئی ہستی اس کے بہادر دل پر بھی فتح پا سکتی ہے۔ یا اس کے عشق سے نا آشنا جذبات بھی کسی حسن عالم سوز کی پرستش پر مجبور ہو سکتے ہیں۔

ایک دن وہ اپنے سمند باد رفتار گھوڑے پر سوار کسی جنگل میں مشتاقان شہادت آہوان صحرا کے کشت و خون میں مشغول تھا۔ دھوپ تیز ہو چکی تھی۔ ریگستان عرب کے چٹیل میدان گرم ہو چکے تھے۔ زمین تپ رہی تھی۔ رقص بسمل کے تماشے اس کے دل کو سیر کر چکے تھے اور وہ موسم کی ناقابل برداشت تحریک سے متاثر ہو کر کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھا۔ جہاں گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر دم لے بکایک اسے دور سے اس سفید ریت کے غیر محدود میدان میں ایک گہری سی سیاہی نظر پڑی۔ وہ اُسے گھنی چھاؤں سمجھ کے جلد جلد اس کی طرف بڑھا۔ قریب جا کر دیکھا تو واقعی ایک نخلستان ہے اور کھجوروں کے گھنے اور سایہ دار درختوں کے جھنڈ میں ایک چھوٹا سا صاف اور شفاف پانی سے لبالب چشمہ اپنے تشنگان دیدار کی سیرابی کے لیے چشم منتظر کی طرح دقف امید ہو کے جس کے پانی کی مضطرب موجیں دور دور تک کے آنے جانے والے مسافروں کی تواضع مہمانی کے لیے آغوش خیر مقدم کھولے بڑھی چلی جا رہی ہیں۔ ذرعہ نے اس خلاف توقع جگہ کو اپنے لیے غنیمت جانا۔ گھوڑے سے اترا لگام ایک درخت سے اٹکائی اور چشمہ کے کنارے بیٹھ گیا۔ صحرائے عرب میں اس قسم کے مقامات مغتنم سمجھے جاتے ہیں اکثر تھکے ماندے مسافر خستہ حال رہرو۔ شدت گرما اور طوالت سفر سے تنگ آ کر ان سے مستفیض ہونے کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔ خانہ بدوش قبائل مہینوں انھیں اپنا مامن بناتے ہیں خیمے ڈیرے ڈال کر قیام گزین ہو جاتے ہیں۔ اس وقت بھی ایک قبیلہ اس نخلستان اور چشمہ کے کنارے مقیم تھا۔ اس کے نوخیز بچے نخلستان میں کھیل رہے تھے۔ دوشیزہ لڑکیاں آزادی اور تنہائی کو حجاب عریانی بنائے چشمہ میں نہا رہی تھیں۔

ذرعہ۔ جو ابھی تک ساحل کی ضعیف الحزنا تو ان ہلکی ہلکی لہروں کو ٹھکرا ٹھکرا کر ناز و نیاز کے ارتباط فطری کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر اُٹھ گئی۔ اس نے دیکھا کہ بہت سی لڑکیاں تو پانی میں موجوں سے چہلیں کرنے اور

نہانے دھونے میں مشغول ہیں اور ایک مہ جبین پانی کی طرف منہ کئے گورے گورے ہاتھوں کی نازک نازک انگلیوں سے اپنے سیاہ اور لمبے۔ گھنے اور گھونگروالے بالوں کو کھڑی نچوڑ رہی تھی*

نوجوان زرعہ کی عمر میں یہ سب سے پہلا واقعہ تھا کہ اس کے دل میں کسی عورت کو دیکھ کر گدگدی پیدا ہوئی ہو۔ وہ بہت متاثر ہوا۔ اٹھا اور اس طرف کو چل دیا لڑکیوں نے دیکھکر ایک دوسری کو مطلع کر دیا۔ جو پانی میں تھیں وہ پانی میں چھپ گئیں۔ مگر اس آفتاب لب جو سے گھبراہٹ میں اور تو کچھ نہ بنا۔ جلدی سے اپنے آپ کو بالوں کے سیاہ اور لمبے برقعے میں چھپا لیا۔ یا یوں کہئے کہ ایک لمبی سی سیاہ چادر پھیلا کر اوڑھ لی۔ اس وقت اس کا حسین چہرہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے شب تار میں ماہ تمام نمودار ہو گیا ہو*

نوجوان زرعہ جوں جوں اس کے قریب ہوتا جاتا تھا۔ اس نظر سوز حسن بے حجاب کی تابش۔ اور تمازت سے رگ رگ میں عذری خون ابلتا اور کھولتا جا رہا تھا۔ آخر سیلاب شباب کی روانی میں جوش اور تلاطم پیدا ہو گیا۔ دریائے زندگی میں ایک اور نئی لہر موجزن ہوئی جس کے برقی اثر سے سینہ کی انگیٹھی روشن ہو گئی۔ دل میں الفت کی آگ کے شعلے بھڑکنے لگے اور زرعہ بیخود اور بیہوش ہو کر منزل مقصود تک نہ پہنچنے کی تمنا دل میں لئے ہوئے اس کے قدموں سے کچھ دور زمین پر گر پڑا۔ حسین دوشیزہ کے الھڑ پنے کی سادگی کے لئے یہ منظر نہ صرف نیا بلکہ عجیب و غریب تھا۔ وہ دیکھ کر جھجک گئی مگر عربی نسل کے متواضعانہ اخلاق اور بدوی خون کی غیرت سے اس طرح ایک راہ چلتے مسافر کو گرتے دیکھ کر نہ رہا گیا۔ انسانی ہمدردی متحرک ہوئی اور وہ بیتابانہ ایک ہاتھ سے اپنے بھیگے تہبند کو اٹھاتی سنبھالتی اور دوسرے سے بالوں کو سمیٹتی سنوارتی آگے بڑھی اور اپنے انجان بیہوش کے سرہانے بیٹھ کے پانی سے بھیگے بالوں کے ٹپکتے ہوئے قطروں اور ہمدردی سے نمناک آنکھوں کے اشکوں سے چھینٹے دینے لگی۔ اللہ اللہ ؎

مر کر بھی کامیاب ہے پروانہ عشق میں (بیدل) معشوق اور لاش پہ یوں اشک بار ہو

نوجوان زرعہ کی طبیعت میں جب ذرا سکون و اطمینان پیدا ہوا۔ جب امتداد زمانہ کے لخلخے اسے ہوش میں لا چکے تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ اس کے رحم و ترس سے ناآشنا آنکھوں نے نہایت حیرت سے دیکھا کہ جس غارت گر عقل و ہوش نے ابھی اس کے دل و جگر کو زخمی کیا تھا۔ وہی اب اس کے سرہانے بیٹھی مرہم پٹی کی ناکام کوشش میں مصروف ہے۔ اس نے نہایت تعجب سے پوچھا۔

"کیا قاتل قتل کے بعد مقتول کے زندہ کرنے کی بھی تدبیر کیا کرتے ہیں "

نازنین نے ہمدردی کے نہایت نرم لہجہ میں جواب دیا

معاف فرمائیے مجھے خود شرمندگی ہے کہ میں جلدی میں کوئی آپ کی ایسی خدمت نہ کرسکی - جو آپ کی صحت کے لئے مستقل طور پر مفید ہوتی - گو فوری شکایت تو رفع ہو گئی - امید ہے کہ آپ مجھے معذور جان کر معاف فرمائیں گے - اور میری مجبوریاں آپ کو شکایت کا موقع نہ دینگی

نازنین کا جواب گو بظاہر تو سوائے تلطف آمیز چند مہربانیوں اور انسانی ہمدردیوں کے اپنے اندر کچھ اثر نہ رکھتا تھا - مگر نوجوان ذرعہ کے نزدیک اس کے جواب کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک جملہ خدا جانے کونسے جذبات محبت سے لبریز تھا جس سے اس کے مضطرب دل کو بہت کچھ تسکین ہو گئی - اس کی مضطر اور بے قرار روح جو تمام عمر کو اسے خیرباد کہہ رہی تھی - پھر اپنی جگہ واپس آ گئی - وہ اٹھا - اس کی نگاہ دید میں اس چاند سے چہرے کے ارد گرد نثار ہوئی اور وہ ایک آخری نظر ڈالتا اور یہ کہتا ہوا رخصت ہو گیا

خرجت اصید الوحش صادت قانصا ۔ من الربیع صادتنی سریعا حبائلہ

"میں وحشی اور جنگلی جانوروں کا شکار کھیلنے کے ارادے سے گھر سے نکلا تھا - ناگہ میں نے سفید چال والی ہرنی کو دیکھا اور (قبل اس کے کہ میں شکار کھیلوں) اس نے اپنے جالوں سے خود مجھے پھانس لیا اور اپنا شکار کر لیا"

فلما رمانی بالنبال مسارعا ۔ رقانی وهل مست مد او ه قاتله

"جب اس تیزی کے ساتھ وہ میرے دل و جگر پر تیر مار چلی تو اس امید میں کہ میں اچھا ہو جاؤں مجھ پر افسوں پڑھنے لگی (لیکن) کیا کوئی قاتل قتل کے بعد مقتول کی چارہ سازی بھی کرتا ہے "

الا انی سبیل الرهب قد انقضی ۔ و لم یبلغ مراد ا تجا و له

"آگاہ رہ کہ ایک سرگشتہ و مجنون کو محبت کے راستہ سے بہت جلد گذر گیا - مگر سچ یہ ہے کہ وہ اپنے مقصود کو ابھی تک نہیں پہنچا"

نازنین کچھ دیر تو محو حیرت بنی جانے والے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی - مگر جب اس کی ساتھی سہیلیوں نے مونڈھا ہلا کے واپس چلنے کو کہا تو اٹھی اور ساتھ ہو لی -

آہ! ظریفہ گو نسوانی ضبط - نسوانی شرم و حیا سے چپ تھی - عزت نسوانی نے اس کے منہ پر مہر لگا دی تھی

مگر اس کا دل تیرِ عشق سے محفوظ نہ تھا۔ اس کے سینہ میں بھی سچی اور پاک محبت کا دریا لہریں مار رہا تھا ہمراہیوں کی آنکھیں بچا بچا کے مُڑ مُڑ کر دیکھ لیتی تھی اور دل ہی دل میں چپکے چپکے حضرت عشق کے مقتولوں میں اضافہ کرنے کو اس کُشتہ ناز کی گمنامی کے ساتھ اپنا نام بھی پیش کرتی چلی جاتی تھی +

عذرا گھر آیا تو حالت ہی غیر تھی۔ اس کا دل اب وہ پہلا سا دل نہیں رہا تھا۔ اور نہ اس کی صورت اب اگلی سی وہ صورت تھی عشق کے جادو نے اس کی تمام باتوں میں انقلاب پیدا کر دیا تھا اب اسے اپنے مکان کے گوشے میں پڑے رہنے اور کبھی کبھی اشعار پڑھنے کے سوا کوئی شغل نہ تھا۔ اس کی ماں نے جب اس کی حالت میں یکایک یہ تغیر دیکھا۔ اس کے چہرے پر حزن و اضمحلال کے آثار نمایاں محسوس کئے۔ تنہائی میں عشقیہ اشعار پڑھتے سنا تو سمجھ گئی کہ ضرور کسی غزال چشم نے شکار میں اسے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ اسے قسمیں دلائیں کہ صحیح واقعہ۔ اور گذری ہوئی مصیبت سے اطلاع دے۔ ماں کے اصرار پر اس نے اپنے درد دل اور دل و جگر پر گذری ہوئی کیفیت کا اظہار کر دیا +

بیٹے کی فریفتگی کا حال معلوم کر کے اسے فکر پیدا ہوئی۔ وہ اس سفید ہرنی کی جس کے لانبے لانبے بالوں اور مخمور و مریض آنکھوں نے اس کے لختِ جگر کے عیش و آرام کو مختل کر دیا تھا جستجو میں گھر سے نکلی اور پتہ لگانے لگی۔ کہ ان دنوں اس حسینہ کے کنارے کون قبیلہ مقیم تھا +

حسن اتفاق سے وہ حسین نازنین بھی خود اس کے قبیلہ "بنی عذرہ" کی لڑکی تھی اس کا نام ظریفہ بنت صفوان تھا۔ ذرعہ کی ماں کو جب اس کا علم ہو گیا تو وہ ظریفہ کے پاس گئی اور خلوت میں اپنے بیٹے کی حالت زار سے اسے مطلع کیا۔ اس کے آگے ہاتھ جوڑے اور پاؤں پر گر کر عجز کے ساتھ کہا۔ اے حسینۂ عرب! ایک مقتول ناز کی زندگی تیرے اور محض تیرے ہاتھ ہے۔ اگر تو اسے زندہ دیکھنا چاہتی ہے۔ اگر تو چاہتی ہے کہ اس کے مرض عشق میں تخفیف ہو جائے تو اس کی صرف ایک ہی تدبیر ہے کہ اپنے جمال سوز حسن سے اسے متمتع کر........"

نازنین نے اس کے جواب میں کہا۔ آپ جو کچھ فرما رہی ہیں میری خود بھی تمنّا اور آرزو یہی ہے لیکن آپ جانتی ہیں کہ ملک میں نمام اور چغلخور بہت ہیں۔ اگر کسی کے کان میں یہ بات پڑ گئی تو مخالف ہو جائیں گے۔ اگر میری محبت کا راز افشا ہو گیا تو دشمن تو درکنار دوست بھی بدخواہ ہو جائیں گے۔ مناسب یہ ہے کہ میرے سر کا بال لیجا کر آپ انھیں دے دیں۔ اگر انھیں میرے ساتھ پاک و بے لوث محبت ہے اور عشق سچا ہے تو اس کو پاس

رکھنے سے انھیں یقیناً شفا ہو گی"

یہ کہکر اس نے سر سے ایک بال توڑا اور ذرعہ کی ماں کو دے دیا۔ وہ اس سوغات۔ اس ارمغان محبوب کو لے کر بیٹے کے پاس گئی۔ ذرعہ نے اس ہدیۂ محبت کو لے کر سینہ سے لگا لیا۔ انتہائے شوق میں جذبات محبت سے بے خود ہو کر اسے بوسے دیئے اور منہ پر پھیرنے لگا۔ جوں جوں وہ اسے دل سے لگاتا۔ اس کے مضطرب دل کی بے چینیاں لمحہ بہ لمحہ سکون و اطمینان سے تبدیل ہو تی جاتیں اب دن رات اسے سوائے اس شغل کے کچھ نہ تھا۔ رفتہ رفتہ اس کے چہرے سے غم و الم کے آثار بالکل مفقود ہو گئے۔ بھوک۔ پیاس جو بالکل تھک چکی تھی پہلے کی طرح عود کر آئی۔ وہ نہایت خوش عیش زندگی بسر کرنے لگا۔ اس کے دل نے اس بال سے جو باہمی عشق و محبت کی مجبوریوں اور معذوریوں کا ایک باریک کنایہ تھا صبر و قناعت تسلیم و رضا کا کافی سبق حاصل کر لیا۔ وہ اب دل ہی دل میں اس کی یاد سے شادکام رہتا اور اپنے ظاہری زخموں کو اس بال سے روز کسی کونے میں بیٹھ کے خود سی لیا کرتا۔ اس کے جذبات الفت نے اپنے محبوب کی زلف سیاہ سے خیالی رشتہ داری کے حصول آرزو کا اس بال کو ذریعہ بنا لیا تھا وہ ہر وقت خوش رہتا اور دنیا کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔ اس کی ماں اب روز اس کے سامنے دسترخوان بچھاتی اور وہ خوب سیر ہو کر کھانا کھاتا مرض کی زیادتی وضعف کی فراوانی سے وہ کمزور ہو کر اٹھنے بیٹھنے سے معذور ہو گیا تھا۔ اب بے تکلف کھڑا ہو کر چلنے پھرنے لگا۔ اب اس میں اتنی سکت بھی آ گئی تھی کہ کچھ دور کھڑے ہو کر دزدیدہ نگاہوں سے اپنی معشوقہ کے گھر کو دیکھ آتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بھی دیکھ لیتی تھی اور اس طرح دو ہجراں نصیب بیماران الفت آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کے وصال سے متمتع ہو جاتے تھے ؎

نہ بولیں منہ سے لیکن کہہ گئیں سب کچھ اشاروں میں   بلا کی ترجمان دل تھیں ان کی پر خمار آنکھیں

مگر آہ! یہ حالت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ محبت و الفت کا یہ سربستہ راز کسی نہ کسی طرح اہل قبیلہ پر منکشف ہو گیا۔ نازنین کے عزیز و اقارب ذرعہ کے درپے آزار ہو گئے۔ انھوں نے اس کے قتل کا تہیہ کر لیا۔ ظریفہ کو اطلاع ہوئی تو اس نے کسی ذریعے سے اسے کہیں چلے جانے کا پیام بھیجا اور مجبور کیا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے یہاں سے روپوش ہو جائے۔

ذرعہ حکم محبوب سے مجبور تھا۔ یمن کی جانب چلا گیا۔ وہ آب حیات کا جام بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ

روز اپنے مینائے دل سے اس جام کو لبریز کرتا اور نغمے میں چور ہو کر اپنی آنکھوں میں انڈھا لیتا۔ اس سے اس کے قلب کو یقیناً سکون ہو جاتا اور آرام سا آجاتا۔

ایک دن اپنی قیام گاہ سے اُٹھ کر چلا کر کسی جنگل میں چل کر دور مے پرستی سے دل بہلاؤں گا۔ بدقسمتی سے راستہ میں بال نہ معلوم کہاں غائب ہو گیا۔ اس نے بہت تلاش کیا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ ایسی مصیبت کے عالم میں بال کا گم ہو جانا اس کے لیے دنیا کی تمام ناگہانی آفات سے زیادہ تھا۔ اس پر مایوسی چھا گئی اس کی حالت متغیر ہونی شروع ہو گئی۔ جذبِ عشق نے ترقی کی اور اس نے جوشِ جنوں میں جان کی پروا نہ کر کے معشوق کے پاس جانے کی ٹھان لی۔ ابوشراعۃ اس کے واقف اور ندیم غربت نے اس کے مجنونانہ ارادے کی اطلاع پائی تو زبردستی روکنا چاہا۔ خوف دلایا اور خطرے سے آگاہ کیا۔ مگر اس نے ایک مائی اور یاس آمیز الفاظ میں کہا:-

خدارا مجھ پر رحم کرو مجھے میری حالت پر چھوڑ دو۔ اس وقت مجھے صرف دو ہی باتوں کی خواہش ہے۔ یا تو میں اپنی آرزوئے وصال میں کامیاب ہو جاؤں یا میری آرزوؤں کی طرح میرا بھی خون کر دیا جائے۔ بس "

ذرعہ آنکھوں میں آنسو بہاتا سفر کرتا چلا جاتا تھا۔ رستہ میں جو ملتا اس سے پیغام بری کی توقع کرتا۔ مگر ناکام رہتا۔ آخر اسے ایک لڑکا ملا۔ اس نے اپنے کندھے پر کی دو چادروں میں سے ایک چادر کا لالچ دے کر اسے راضی کر لیا۔ اور کہا کہ جب تو نازنین کے گھر کے قریب پہنچے تو ان اشعار کو بلند آواز سے پڑھنا۔ اگر تو کامیاب آیا تو ان میں سے ایک چادر میں تجھے دونگا۔" لڑکا یہ سن کر ظریفہ کے مکان کی جانب روانہ ہو گیا۔ ابوشراعۃ بھی پوشیدہ طور پر اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ قریب پہنچا اور بآوازِ بلند اس نے یہ اشعار پڑھے ؎

مریض بأفناء البیوت مطرح   به ما به من لاعج الشوق یبرح

ایک مریضِ عشق گھر کی چہار دیواری میں پڑا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ وہ چیز ہے کہ جس کی وجہ سے آتشِ شوق سوزاں ہے

وقالوا اجل الیأس عن ذی بعل ما   تشکاه من الامر جلالہ یمسخ

اور لوگوں نے کہا لوٹ آ۔ ایسا نہ ہو کہ حالت یاس میں جس چیز کی تو شکایت کرتا ہے وہ دیا لکل ہی فنا ہو جائے"

ولیس دواء الداء الا بحیلۃ   اخو بثنا منھا عزا ام یترح

اور کسی مرض کی دوا بجز حیلہ کے کچھ نہیں اور اسی حیلہ میں جذب عشق کی زیادتی نے ہمیں نقصان پہنچایا ''

و اذا ما سالنا لا نو الا متنیلہ و صم الصفا منہا بذا الک اسمح

جب میں نے اس سخی بخشش کا سوال کیا جو اس کے اختیار میں ہے۔ مگر آہ اس سے تو پتھر بھی زیادہ سخی نکلا ''

لڑکے نے ان اشعار کو ختم کیا ہی تھا کہ قریب کے گھروں میں سے ایک نہایت دردناک آواز آئی۔

رعی اللہ من ھام الفواد بحبہ و من کدت من شوقی الیہ یطیر

خدا اس شخص کی حفاظت کرے جس کی محبت سے میرا دل مضطرب ہو گیا۔ اور قریب ہو گیا کہ زیادتی شوق کی وجہ سے اس کی طرف اڑ جاؤں ''

لئن کثرت بالقلب اتراح لوعۃ فان لو شاۃ الحاضرین کثیر

اگر کہیں شدائد محبت کی زیادہ ہو گئیں۔ تو بلاشبہ یہاں چغلخور بہت ہیں ''

فیمشون لینشروا ن غیظا و شرۃ و ما منہم الا اب و غیور

بلاشبہ یہی چغلخور (عزیز و اقارب کے پاس) جاتے ہیں اور سختی کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور جنھیں یہ مشورہ دیتے ہیں) وہ بجز باپ اور چند غیور شخصوں کے اور کوئی نہیں ''

فان لم ازر بالجسم خیفۃ معشر فللقلب اتی نحوکم لیزور

پس گو میں نے لوگوں کے خوف سے جسمانی ملاقات نہیں کی۔ مگر تمہاری خیالی تصویر میرے دل میں آتی ہے اور میں اس سے (آزادی کے ساتھ) شوق وصال کو پورا کر لیتی ہوں ''

لڑکے کا مقصد حاصل ہو گیا۔ اس نے فوراً واپس جا کر ذرعہ کو یہ دردناک اشعار سنائے ذرعہ پر غشی طاری ہو گئی۔ کچھ دیر بعد افاقہ ہوا تو دردناک اشعار پڑھتا ہوا مایوس دنا کام اپنی جگہ چلا گیا اور پھر پہلے کی طرح گوشہ نشین ہو گیا +

ابو شراعۃ کا بیان ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ بعد ظریفہ کو اس کے باپ نے اسی قبیلہ کے ایک شخص ثعلب سے بیاہ دیا۔ ذرعہ کو اس افسوسناک واقعہ کی خبر ملی تو وہ اضطراب ہم و انتہائے سکوت کی تصویر بن کر رہ گیا۔ خاموشی جمود بن گئی اور حس و حرکت مغائر زندگی۔ لوگوں نے دیکھا تو جان سے خالی ایک مٹی کا تودا تھا۔ مرغ روح قفس عنصری سے پرواز کر چکا تھا اور ایک خاک کا ڈھیر وقف بربادی ہونے کو

ہوا کے تیز جھونکوں کا منتظر تھا۔

ہجراں نصیب ظریفہ کو بھی اس دردناک اور مایوس کن حادثہ کی خبر پہنچی تو اس کی حالت بھی غیر ہو گئی۔ حرماں نصیب عاشق کے غم میں اس کے بے اختیار آنسو نکلنے لگے۔ رات دن خون کے آنسو رونے اور غم کھانے کے سوا دوسرا کام نہ تھا۔ اس کی حرماں نصیب زندگی اس کے خاوند پر بھی بار ہو گئی۔

ایک دن آدھی رات گذرنے پر جبکہ قریب قریب سارا عالم محو راحت تھا۔ ظریفہ بے قراری کی حالت میں اپنے مکان سے اٹھی اور اسی چشمہ کے کنارے پہنچکر اپنے آپ کو اس میں گرا دیا اور یوں اپنے معبود محبت سے وصال دوامی حاصل کر لیا۔

محمد حسین پیلی بھیتی

نازونیاز

یہ مجھ سے نہ پوچھو کہ میں اس قدر جاں گسل مصائب۔ اتنی پر الم کڑیاں برداشت کرنے کے بعد بھی میں کیوں زندگی کا آرزومند ہوں۔ ....

یہ تم اپنے حسن کی رنگینی اور شباب کی شوخیوں سے پوچھو کہ وہی میری حیات کا مقصد اور میری زیست کا حاصل ہیں۔

ہاں! ہاں ہیں دنیا میں صرف تمہارے حسن کی بہار سے لطف اندوز ہونے کے لئے زندہ ہوں اور ابھی بہت دنوں تک رہوں گا۔

تمہارے مژہ ہائے دلنواز کی قسم اب صرف تمہارے جلوۂ جاں بخش کے دیدار کی حسرت ہی میری حیات کا سبب ہے ورنہ میں ناکام زندگی دنیا اور دنیا کی سرد مہریوں سے تنگ آکر اب تک کب کا اس نابودہستی کو لحد کی پر از عافیت آغوش کی نذر کر چکا ہوتا۔ میں جانتا ہوں اور مجھے اچھی طرح یقین ہے کہ تمہیں میری محبت کا باور آنا محال ہے اور اگر یقین ہو بھی جائے تو آہ تمہیں تمہارا غرور حسن اس کے اعتراف کی اجازت بھی نہ دے گا۔ لیکن میں کیا کروں مجبور ہوں۔ .... یہی کہوں گا اور ہمیشہ کہونگا کہ صرف تمہارے دیکھنے کیلئے زندہ ہوں (ر زمی بھو)

"بدحواسی"

تقریباً بارہ سال ہوئے جب الہ آباد میں "سلطان لاج"[1] کی ایک دیوار پر "مطبع احمدی پریس" لکھا ہوا دیکھ کر احباب کو اس نوع کی غلطیوں پر غور اور بحث کرنے کا خیال پیدا ہوا +

مجھے غالباً اس کا حق نہ ہونا چاہیے کہ اس کی مکمل تاریخ پیش کر کے ان صحبتوں اور خلوتوں کی بے معصوم لذتیں وقف عوام کر دوں جن کی یاد اور اس یاد کی پر لطف کیفیتیں اسی طرح قائم ہیں جس طرح زمانۂ ماضی کی واقعیت لیکن اب جب کہ تمام گذشتہ صحبتیں عدم تناسخ کی تلخ حقیقت کو دہراتی ہوئی نظر آتی ہیں میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اس عہد کے کسی ایک ہی پہلو کو مستقبل کے لئے "کالمجز" بنا جاؤں اور اس طرح اس فرض سے سبکدوش ہو سکوں جو بحیثیت "زاویہ نشین" ہونے کے مجھ پر عائد ہوتا ہے +

جس وقت سب سے پہلے اس مسئلہ پر گفتگو ہوئی تو اسی صحبت میں اس کا نام "بدحواسی" قرار دیا گیا اور غالباً اس افتتاح کو ناکام نہ کہا جائے گا۔ کیونکہ شام ہونے سے پہلے کافی ذخیرہ فراہم ہو گیا اور پورا ایک صفحہ رؤف و ریاض[2] کی کاپی سے پھاڑ کر اس کے لئے وقف کیا گیا (مجھے خوب یاد ہے کہ ان اقتصادیات کے طلبا نے خدا جانے کن کن مصالح کو پیش نظر رکھ کر صرف ایک ہی کاپی کو مشترک طور سے اپنا معمول بنانا ضروری قرار دیا تھا۔ تفریق صرف یہ تھی کہ جس صفحہ پر کوئی ایک شخص ان میں سے لکھ لیتا تھا تو دوسرا پھر اسی پر سُرخی سے لکھ کر اپنا کام نکال لیتا تھا۔ جب رؤف و ریاض نے الہ آباد میں اپنی تعلیم ختم کی تو رؤف نے مجھے حساب کر کے بتایا تھا کہ اس طرز عمل سے دو سال کے اندر پورے سات روپے آٹھ آنے چھ پائی کا کاغذ بچ گیا) +

اس کے بعد ایک زمانہ حد درجہ انہماک کے ساتھ اسی فن کی تدوین میں صرف ہوا لیکن انقلاب حقیقت ہو گا اگر عارف[3]

---

[1] دائرہ شاہ اجمل میں سلطان علی صاحب کا ایک مکان جو صرف طلبہ کے قیام کے لئے وقف تھا +

[2] عبدالرؤف بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی (علیگ) جو اب اپنے اور میرے وطن فتحپور میں اصول ترک موالات کے خلاف وکالت کر رہے ہیں۔ ریاض سینئر بی۔ اے (فتحپوری) ہمیرپور گورنمنٹ اسکول میں ملازم ہیں۔ ان دونوں کو میرے ساتھ دوستانہ شاگردی کے تعلقات حاصل ہیں +

[3] کانگرس و انقلاب کے سابق ایڈیٹر۔ ترک موالات کے زبردست حامی اور باوجود حد درجہ نحیف و نزار ہونے کے سیاسی مسائل میں غیر معمولی عزم و ثبات کے مظہر جمیل۔ فتحپور ہسوہ۔ نیاز الدہلوی +

کے جذبات کا نمایاں طور سے اعتراف نہ کیا جائے۔ کیونکہ انھوں نے نہ صرف اس کی اشاعت ہی میں زیادہ حصہ لیا۔ بلکہ خود اپنی زبان سے ایسے ایسے خوارق پیش کئے جنھیں اس فن میں باونیائے بدحواسی میں "اعجاز" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے
اسی سلسلہ میں مجھے خلیقی[1] ضیائی[2] حبیب[3] دلگیر[4] اور لطیف[5] کا بھی علیحدہ علیحدہ شکریہ ادا کرنا چاہئے۔ جن میں سے ہر ایک نے متعدد بار کسی نہ کسی طریق پر اس فن کو کافی مدد پہنچائی اور آج مجھے اس قابل بنایا کہ ایک مضمون اس بحث پر لکھ سکوں۔ مجھے امید ہے کہ یہ حضرات شاید میرے اس اعتراف خدمات پر نہ شاعرانہ انکسار سے کام لیں گے اور نہ شکریہ کا اظہار کریں گے۔ کیونکہ حقیقتاً ان کی خدمات اسی تحسین کی مستحق ہیں اور ان میں سے بعض تو واقعی مجتہد کہلائے جانے کے قابل ہیں۔ کیونکہ اگر وہ چاہیں تو بہت جلد لٹریچر میں معقول اضافہ ہو سکتا ہے۔

قبل اس کے کہ میں چند واقعات پیش کروں۔ یہ بتا دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ بدحواسی کی دو قسمیں ہیں ایک حالی اور دوسری مقالی ایک تیسری قسم اور ہے جو ان دونوں پر مشتمل ہے اور اس کا وقوع بہت کم ہوتا ہے تاہم میں آئندہ ایک آدھ مثال سے اسے بھی سمجھانے کی کوشش کروں گا۔

اب میں نہ صرف اپنے دماغ بلکہ بقیہ ریکارڈ کی مدد سے نہایت صحیح صحیح چند مثالیں درج کرتا ہوں لیکن یہ نہیں بتاؤں گا کہ کن حضرات کی طرف سے یہ مواد فراہم ہوا۔

(۱) الہلال کا عروج شباب پر ہے اور اسی جوش و ولولہ کے سلسلہ میں جو ہر جگہ نظر آتا تھا بسوہ کی مسجد میں بھی بعد نماز جمعہ ...... "حزب اللہ" کے لئے کچھ ممبر پیدا کرنا چاہتے ہیں اور کھڑے ہو کر وعظ کے سلسلہ میں قیامت کے بیان سے لوگوں کو ڈرانا چاہتے ہیں۔ چونکہ قیامت کی ابتدا "نفخ صور" سے ہوگی اس لئے انھوں نے نہایت بلند آہنگی کے ساتھ فرمایا کہ "برادران ملت تم نے قرآن مجید میں بارہا پڑھا ہوگا کہ اذا نفخ فی الصور یعنی جب سونک یا جائیگا بھو" "صور کا پھونک دیا جانا" گو اس کا صحیح ترجمہ ہو۔ لیکن جو زور کلام جو شوکت بیان "اذا سونک یا جائیگا بھو"

---

[1] مولوی محمد الدین خلیقی (ابو المعالی) مشہور اہل قلم۔ دلی میں چاندنی چوک کے معروف تاجر۔ اور ادب لطیف کا بہترین ذوق رکھنے والے۔

[2] یعنی ضیا عباس ہاشمی بدایونی جو بحال گورنمنٹ گوالیار میں ایک معزز عہدہ پر ممتاز ہیں اور باوجود نباتاتی ہونے کے شعر و ادب کا نہایت گرم ذوق رکھتے ہیں۔

[3] ملک حبیب احمد خاں جالندھری اسسٹنٹ ملٹری سکرٹری گورنمنٹ پنجاب۔ میرے نہایت عزیز دوست۔ اور فرزندان پنجاب میں اپنی تمام خصوصیات کے لحاظ سے ایک بے نظیر مثال۔

[4] سید نظام الدین شاہ دلگیر۔ اکبرآبادی۔ اڈیٹر نقاد۔

[5] لطیف الدین احمد اکبرآبادی جو اپنی نظری خصوصیات کے لحاظ سے ہم سب میں ایک خاص امتیاز رکھتے ہیں۔

سے پیدا ہے یقیناً وہ کسی اور ترجمہ سے ظاہر نہیں ہو سکتی بھرائی کے ساتھ اگر غور کیا جائے تو زبان اردو میں ایک جدید مصدر کا بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ جو باوجود مختصر ہونے کے وسیع معنی کا حامل ہے یعنی "سونک دینا" بمعنی "صور پھونک دینا"

(۲) شام کا وقت ہے اور سخت انتظار کے بعد تیز ہوا کے ساتھ افق سے سیاہ ابر اٹھتا ہے . . . . صاحب جو ایسے مناظر کے غیر معمولی قدر شناس ہیں۔ درویش پرس سے اٹھ کر مجھے بھی مجبور کرتے ہیں کہ ان کے ساتھ زینت المساجد تک چلوں۔ وہاں پہنچ کر مسجد کے دروازے پر ایک اس پوش مکان نظر آیا جو بالکل خالی تھا باوجود قیاس اور پوری کوشش کے نہیں معلوم ہو سکا کہ یہاں کون رہتا ہے جب نماز مغرب کے بعد واپس ہوئے تو اس جھونپڑی کے سامنے ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ چنگی کی چوکی ہے اور وہ چنگی کا چپراسی ہے یہ معلوم کر کے . . . . صاحب نے اس علم و حقیقت کو بے اختیارانہ طریق پر زبان سے ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ "اچھا یہ چنگراسی ہے" ممکن تھا کہ وہ اس فقرے کی تکمیل یوں کرتے کہ "یہ چنگراسی ہے چپڑی کا" لیکن میری بے اختیار ہنسی نے انھیں روک دیا۔ اور زمانہ اس فقرے کی تکمیل سے محروم رہ گیا۔ ہر چند وہ یہ کہہ کر بہت خفیف ہوئے۔ اور انتہائے ندامت سے فوراً اسی وقت کچھ گنگنانے لگے لیکن میں نے انھیں یقین دلایا کہ اس بدحواسی سے انھوں نے زبان پر بڑا احسان کیا ہے۔ کیونکہ چپراسی ایک عام لفظ ہے جو ہر محکمہ کے چپراسی کے لئے بولا جاتا ہے لیکن آج سے کم از کم محکمۂ چنگی کے چپراسی کے لئے ایک خاص لفظ چنگراسی وضع ہو گیا اور اگر دنیا اسے تسلیم نہ کرے تو اس کی انتہائی بدذوقی ہے۔ ہاں میں یہ لکھنا بھول گیا کہ مسٹر یعقوب بی۔ اے۔ نبوری بھی ساتھ تھے۔ وَمَنْ شَاءَ تَصْدِيقَهُ فَلْيَرْجِعْ إِلَيْهِ

(۳) انھیں حضرت کی اور بھی بہت سی بدحواسیاں ہیں۔ مثلاً خنا کی پداہ (خدا کی پناہ) چٹنے کی گھوٹ یعنی (گھٹنے کی چوٹ) وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ماسٹر پیس (اختراعات فائقہ) وہی تھے جو ابھی درج کر دیئے گئے ہیں

(۴) دہلی کے ایک صاحب جو آمد سخن سے مجبور ہو کر مبتدا و خبر کے فکر سے بے نیاز ہو جاتے ہیں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے بحمد اللہ بہت کافی مدد پہنچائی لیکن "چنگراسی" اور "سونک دیا جائے گا پھور" کا جواب ان سے بھی نہ بن آیا۔ ان کی بدحواسی صرف اس نوع کے فقروں تک محدود رہی کوچوں کا چیلہ (چیلوں کا کوچہ) نوم کی ماک (موم کی ناک) درد کا دانت (دانت کا درد) وغیرہ وغیرہ

(۵) آگرہ کے حضرات میں ایک ہستی زیادہ قابل ستائش ہے جس نے ایک دن حد درجہ روانی کلام کے

دوران میں بجائے کانٹا چھری کے "چانٹا گھری" کے استعمال کی جدت فرمائی اور ریل کے "پن کو پیل کا رمن" بنادیا دوسرے صاحب کی طرف سے بھی متعدد بدحواسیاں ظہور میں آئیں لیکن سب کی سب لطیف تھیں۔ مثلاً ایک دن آپ نہایت لطف سے داغ کا یہ شعر گنگنا رہے تھے ؎

کچھ زہر نہ تھی شراب انگور کیا چیز حرام ہو گئی ہے

پہلی بار تو بالکل صحیح کہہ گئے لیکن دوسری مرتبہ شعر کی لذت سے متاثر ہو کر فرماتے ہیں کہ

کچھ زہر نہ تھی حرام انگور کیا چیز شراب ہو گئی ہے

(۶) اسی قسم کی بدحواسی ہمارے ایک اور دوست سے سرزد ہوئی جو بھوپال کے ایک ہوٹل میں شام کو چاء پیتے ہوئے بیدل کے اس مصرعہ کو ادا کرنا چاہتے تھے۔ ع

چشم ہر جا کہ پر د مژدهٔ دیدارے ہست

میں نہیں کہہ سکتا کہ دل ہی دل میں انھوں نے اس کو کس طرح ادا کیا لیکن جب آواز نکلی ہے۔ تو وہاں کی فضا اس مصرعہ سے گونج رہی تھی :۔

پ شم ہر جا کہ چر د مژدهٔ دیدارے ہست

(۷) بمبئی میں چند احباب کا اجتماع ہو گیا تھا۔ اتفاق سے سب کا ایسی جگہ گذر ہوا جہاں پہلے بڑا میدان تھا لیکن اب وہاں مکانات بن گئے تھے۔ ایک صاحب کو یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا۔ اور بجائے یہ کہنے کے کہ "یہاں تو بڑا کھلا وسیع میدان تھا"۔ یوں گہرافشاں ہوئے کہ "ایں یہاں تو بڑا ادھلا کسیع میدان تھا"۔

(۸) گوالیار میں ایک دوست کسی شخص کے گرنے کا واقعہ بیان کرنے لگے۔ اصل فقرہ یہ تھا کہ "سیڑھی سے جو پھسلا تو پھسلتا ہی گیا"۔ لیکن وہ ادا یوں ہوا کہ "پھسلی سے جو سیڑھا تو سیڑھتا ہی چلا گیا"۔ +

(۹) بھوپال کے مہمان خانہ میں انبالہ اسلم ہائی اسکول کا ڈیپوٹیشن موجود تھا۔ شام ہو گئی تھی۔ جائے قیام پر جانے کی فکر تھی یہاں کے ایک معزز صاحب نے گاڑی خانہ کو ٹیلیفون دیا کہ گاڑی جلد بھیج دی جائے۔ پندرہ منٹ کے سخت انتظار کے بعد جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو یہ صاحب سمجھے کہ گاڑی خانہ سے کوئی شخص اطلاع دے رہا ہے۔ چنانچہ گھبرا کر وہیں دور ہی سے یہ کہتے ہوئے دوڑے کہ "اچھا" . . . . . +

(۱۰) اس سے زیادہ دلچسپ بدحواسی گوالیار کی ہے جب ایک فوجی کرنل نے ٹیلیفون پر اپنے ماتحت جمعدار سے گفتگو کرنی چاہی۔ جمعدار غریب واقف نہ تھا کہ ٹیلیفون پر کون شخص ہے لیکن جونہی

معلوم ہوا کہ کرنل صاحب ہیں تو اس نے وہیں گھبرا کر آلۂ ٹیلیفون کو ہاتھ سے چھوڑ دیا اور جھٹ فوجی قاعدے سے سیلوٹ کرتے ہوئے "جی حضور" کی آواز دو میل کے فاصلہ پر ٹیلیفون ہی کو سنا دی ✣

(۱۱) حضرت خلیقی کی دوکان پر جب ایک صاحب نے نہایت جوش میں اپنے کسی وعدے کی صداقت کا یقین دلاتے ہوئے تنک کے کہا "اللہ (کلام اللہ) کی قسم کھائی ہے تو میں نہانا تھا۔ ہمارے عزیز دوست مولوی سید حامد حسین بیدل ایڈیٹر مخزن بھی شریک احباب تھے۔ غالباً انھیں یہ تو ضرور یاد ہو گا کہ جائے ابو الکلام کی بجائے عبد الکلام کہہ جانا سہو ہو گیا ہو ✣

فتحپوری

التجائے ناکام

"پیارے تم کب تک میرے ارمانوں کو پامال کرو گے اور میری اُمنگوں کو ٹھکرا دو گے ✣"

جب وہ یہ کہہ رہی تھی تو چودھویں رات کا چاند اپنا روشن چہرہ نکالے ہوئے تمام دنیا کو منور کر رہا تھا۔ بدلیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نظر بد کے خیال سے اس کے رُخِ روشن پر نقاب ڈالنے کی کوشش میں مصروف تھے لیکن وہ چنچل بار بار ان کی آغوش سے نکل کر دنیا کو مسخر کرنے کے لئے سامنے آ جاتا تھا جبکہ رات پر نثار ہو رہی تھی آسمانی مخلوق نے اس کو حلقہ میں لے لیا تھا ایسے ہی وقت تھا جب وہ پہلی مرتبہ دل کی ٹیس سے عاجز ہو کر اظہارِ محبت پر مجبور ہو گئی ✣

ایک باغ کی سرخ روش پر جہاں جوہی کی بھینی بھینی خوشبو دماغ کو معطر کر رہی تھی جہاں فوارہ کی مہین مہین پھوار ایک عجیب فرحت بخش آواز پیدا کر رہی تھی۔ ہاں وہیں وہ ایک پیکر التجا بنی کھڑی تھی۔ اس کی نازک اور مرمری کلائیاں اس کے پیارے کی گردن میں پڑی تھیں اس کی نگاہ اپنے محبوب کے چہرے کی بلائیں لے رہی تھی اس کی آنکھوں کے ساغر دل سے گلابی شراب چھلکی پڑتی تھی اس کے ہاتھوں میں ایک تھرتھری پیدا ہوئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا جب اس نے آہستہ سے کہا "تم نے کیا کہہ رہی ہوں" ہوا سرسرا رہی تھی۔ مشک مالک کے سیاہ بال ہلتے ہوئے ننھے وہ اڑنے لگے اور اس کے دل کے مالک کے شانہ پر جا جھکنا تو تنزے لگے اسنے ارادہ کر لیا کہ اسکے پاؤں پر گر پڑے اور اسوقت تک چھوڑے جبتک اس سے اقرار نہ کرا لے اُسنے ہاتھ ڈھیلے کئے مگر وہ بجلی کی طرح یہ کہتا ہوا غائب ہو گیا "دیکھو ہوش میں آؤ" وہ بجائے پاؤں کے اسکے نقش پا پر گر پڑی۔ روئی اور روتی رہی ✣ ارانز

ولیعہد فرانس کی موت

فرانس کا ننھا ولیعہد بیمار ہے اور بستر مرگ پر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہے۔ ملک کے تمام کلیساؤں میں شمعیں روشن ہیں اور شہزادے کی صحتیابی کیلئے دعائیں کی جا رہی ہیں شہر کے گلی کوچوں میں خاموشی اور سناٹا طاری ہے گھنٹوں کا بجانا موقوف کردیا گیا ہے۔ گاڑیاں قدم قدم چلتی ہیں محل کے گرد شہر کے لوگ جمع ہیں اور لوہے کے جنگلوں میں سے حاجبان شاہی کو جو سنہری وردیاں پہنے آہستہ آہستہ ٹہلتے اور ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشیاں کرتے پھرتے ہیں متجسس نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں +

ایوان شاہی میں تہلکہ مچا ہوا ہے۔ ملازمان بارگاہ عالی سنگ مرمر کی سیڑھیوں پر جلدی جلدی چڑھتے اترتے ہیں۔ دالانوں میں درباریوں کا ہجوم جمع ہے جو ایک دوسرے سے دبی زبان میں خبریں دریافت کر رہے ہیں۔ فراخ زینوں پر حریان حرم کی مغموم حسرت میں آبدیدہ نگاہوں سے ایک دوسرے کے منہ کو تک تک کر جویائے خیریت ہیں اور چھوٹے چھوٹے اطلسی پھولوں والے رومالوں میں گرم گرم آنسو خشک کر رہی ہیں۔ صدر دالان میں حاذق اطبا کا ایک بڑا مجمع موجود ہے اور کھڑکیوں میں سے ان کی لمبی لمبی مفتخر پوشاکیں اور مخصوص وضع کی ٹوپیاں ہلتی اور چمکتی نظر آ رہی ہیں۔ دالان کے دروازے کے باہر ولیعہد کا اتالیق اور اسپ سوار پہرہ داروں کی طرح ایک جانب سے دوسری جانب بےچینی سے ٹہل رہے ہیں اور اطبا کے فیصلے کے منتظر ہیں اصطبل سے ولیعہد کی سواری کے گھوڑے کے ہنہنانے کی پرحسرت آواز آتی ہے جو اپنے تھان پر سر نیوڑھائے کھڑا ہے لیکن شاہ فرانس اس وقت کہاں ہے؟ +

بادشاہوں کے دلی جذبات ہر کس و ناکس کے لئے تماشہ نہیں بن سکتے۔ اس لئے بادشاہ سلامت محل کے ایک کونے میں تنہا پڑے ہیں۔ مگر ملکہ کی حالت دگرگوں ہے وہ ننھے ولیعہد کے سرہانے تصویر غم بنی بیٹھی ہے۔ اس کا خوبصورت چہرہ مصیبت کا مرقع ہے اور اس کے آنسو اس کے وقار اور خودداری کو شکست دے رہے ہیں۔

ننھا ولیعہد ایک سنہری پر پڑا ہے جس کے پردے لیس دار ہیں اور جس پر جھالریں ٹنکی ہیں۔ اس کے چہرے کا رنگ تکیوں سے زیادہ سفید ہے اور آنکھیں بند ہیں کہیں اس کی آنکھ جھپک تو نہیں گئی؟ نہیں وہ دیکھو وہ اپنی ماں کی طرف مڑتا ہے اور اسے اشکبار دیکھ کر کہتا ہے۔

"پیاری اماں آپ کیوں رو رہی ہیں۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ میں مر جاؤں گا؟"

ملکہ جواب دینے کی کوشش کرتی ہے۔ مگر شدت غم سے اس کی آواز حلق میں رک جاتی ہے۔

"اماں پیاری۔ آپ روتی کیوں ہیں آپ کو یاد نہیں رہا کہ میں فرانس کا ولیعہد ہوں اور فرانس کے ولیعہد یوں نہیں مرا کرتے"

ملکہ کی بیقراریاں ضبط سے باہر ہو جاتی ہیں اور آنسوؤں کا ایک طوفان آنکھوں سے بہ نکلتا ہے۔ ولیعہد کچھ متفکر ہوتا ہے اور کہتا ہے:

"میں موت کے فرشتے کے ساتھ نہ جاؤنگا دیکھئے میں ابھی انتظام کئے دیتا ہوں کہ اسے یہاں آنے سے روک دیا جائے۔ حکم دو کہ چالیس بہادر جوان ہمارے پلنگ کے گرد پہرے پر کھڑے ہو جائیں اور سو بڑی توپیں ہمارے کمرے کی کھڑکیوں کے نیچے لگا دیجائیں اُن کو فلیتے ہر وقت تیار رہیں۔ اگر ملک الموت نزدیک آئے تو ابھی کو موت کا شکار بنا دیا جائے"۔ شہزادے کو خوش کرنے کیلئے ملکہ اشارہ کرتی ہے پل بھر میں محل کے باہر توپوں کے کھینچ کر لائے جانے کی آواز سنائی دیتی ہے اور چالیس جوان تلواریں سونت کر ولیعہد کے کمرے میں آتے ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ سب کے سب بہادر اور تجربہ کار سپاہی ہیں۔ انھیں دیکھ کر ننھا ولی عہد خوشی سے تالیاں بجاتا ہے اور ان میں سے ایک کو پہچان کر اسے بلاتا ہے۔ "لورین! لورین!"

سپاہی پلنگ کے قریب آتا ہے "لورین مجھے تم سے بہت محبت ہے۔ ذرا مجھے اپنی بڑی تلوار تو دکھاؤ۔ اگر موت کا فرشتہ مجھے لے جانے کے لئے آیا تو تم اسے قتل کر دو گے نا؟

"بیشک حضور" اور دو بڑے بڑے گرم آنسو اس کے رخساروں پر سے بہ کر گر پڑتے ہیں۔

اتنے میں پادری صاحب مسہری کی جانب بڑھتے ہیں اور ایک ننھی سی صلیب ولیعہد کو دکھا کر اس کے ساتھ آہستہ آہستہ باتیں شروع کر دیتے ہیں ننھا ولیعہد بڑی حیرت سے ان کی باتیں سنتا ہے۔ اور ذرا دیر بعد ان کی بات کاٹ کر کہتا ہے۔

پادری صاحب آپ جو کچھ فرما رہے ہیں میں سمجھتا ہوں لیکن آپ تو بتائیں اگر میں اپنے چھوٹے دوست بیبو کو بہت سا روپیہ دوں تو کیا میری جگہ وہ نہیں مر سکتا؟

پادری صاحب اسی طرح اپنی باتیں جاری رکھتے ہیں اور ولیعہد کی حیرت بڑھتی جاتی ہے جب پادری صاحب کی تقریر ختم ہوتی ہے تو ولیعہد گہرا سانس لیکر جواب دیتا ہے

"پادری صاحب آپکی باتیں بہت غمگین کرنے والی ہیں لیکن ان باتوں سے مجھے تسکین ہوتی ہے کہ اوپر ستاروں کی دنیا میں بھی میرا درجہ فرانس کے ولیعہد ہی کا ہوگا۔ مجھے معلوم ہے اللہ میاں میرے بڑے بھائی ہیں اور وہ ضرور میری شان کے مطابق میری مہمان نوازی کریں گے"۔ پھر ماں کی طرف مڑ کر کہتا ہے۔

اماں جان میری سب سے قیمتی پوشاک منگوائیے میرا سفید ریشم کا کوٹ اور مخملی سلیپر۔ میں چاہتا ہوں کہ فرشتوں کے سامنے عمدہ نفیس لباس میں جاؤں اور جب بہشت میں داخل ہوں تو میرا ملبوس فرانس کے ولی عہد کی شان کے مطابق ہو۔

تیسری بار پادری صاحب پھر ولی عہد کی طرف بڑھتے ہیں اور بہت دیر تک دبی زبان میں تقریر کرتے رہتے ہیں۔ دوران تقریر میں شہزادہ برہم ہو کر کہتا ہے۔

واہ! تو پھر فرانس کا ولی عہد ہونا کوئی معنی ہی نہیں رکھتا! یہ کہکر ننھا ولی عہد دیوار کی طرف منہ موڑ لیتا ہے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے۔

(ظفر اللہ)

صہبائے گرامی

(از خمخانہ نظیریِ ہند استاذی مولانا گرامی مدظلہ العالی)

ز ذوقِ بیخودی از من مپرس تا چندست — کہ سینہ چاکِ نظرہائے فتنہ پیوندست

رخِ تو عیدِ نظرہاست چند زیرِ نقاب — درآ بجلوہ کہ یک شہر آرزومندست

تو آرزوئے دلِ من ز من چہ مے پُرسی — ز دل بپرس کہ چونست و آرزو چندست

وصال گر ہمہ عمرست عمرِ یک نفس ست — فراق گر سرِ موئیست کوہ الوندست

قدح تو با دگراں میزنی و من مُردم — ز وعدہائے دروغے کہ راست مانندست

تو مفت از کفِ من بردۂ چہ میدانی — کہ قدرِ گوہرِ دل چیست قیمتش چندست

چہ کہنہ رندِ نظربازم و ندانستم — کہ در نگاہ و تغافل بہم چہ پیوندست

خدنگِ آں نگہِ ناز در ازل خوردم — ہنوز برلبِ زخمِ جگر شکرخندست

عتابِ غمزہ بلا در بلا بہم چیدست — کتابِ صبر ورق در ورق پراگندست

بسے بگشتم و جز ملکِ عشق کم دیدم — ولایتے کہ دراں بندہ بے خداوندست

ز ہم دو یکدلِ دیرینہ بگسلند آخر — خبر دہید کہ در جسم و جاں چہ پیوندست

بلاکشان ز گرامی خبر کہ می آرد
اجل گرفتۂ زنجیرِ بیکسی بندست

خالدہ خانم ادیبۂ ترکی

(از ابو رشید عبد المجید خان سالک)

سلطان عبد الحمید خان کے عہد میں یہ امر خلاف قانون تصور کیا جاتا تھا کہ کسی ترک لڑکی کو غیر مذہب درسگاہ میں تعلیم دلائی جائے۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ خالص ترکی مدارس میں تعلیم نسواں کا انتظام نہایت ناکافی اور بے قاعدہ تھا۔ چونکہ خالدہ خانم کی طبیعت میں خدائے تعالیٰ نے غیر معمولی ذہانت و فراست اور عجیب و غریب دماغی قابلیت ودیعت کر رکھی تھی۔ اس لئے ان کے روشن خیال باپ نے جو سلطان المعظم کے شعبہ خزانہ عامرہ کا سکرٹری تھے یہی مناسب سمجھا کہ خواہ کچھ بھی ہو خالدہ خانم کو اعلیٰ تعلیم ضرور دلائی جائے۔ چنانچہ انھوں نے حضور سلطان المعظم سے اس امر کی اجازت طلب کی کہ خالدہ خانم قسطنطنیہ کے امریکن مدرسۂ نسواں میں داخل کر دی جائے۔ بہت سی قیود و شرائط کے بعد اجازت تو مل گئی لیکن خالدہ کے والد کو اپنی پیاری بچی کی تعلیم و تربیت پر اپنی آیندہ ترقی قربان کر دینی پڑی۔

خالدہ نے پندرہ سال کی عمر میں ایک امریکن مصنف جیکب ایبٹ کی ایک پرانی کتاب کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ کتاب حقوق و فرائض مادری کے موضوع پر لکھی گئی تھی خالدہ نے اس کا ترجمہ ایسے دلآویز اور سلیس انداز میں کیا کہ اُمرا و شرفا کے طبقے میں خالدہ کی ادبی ہونہاری کا شہرہ عام ہو گیا اور حضرت سلطان المعظم نے خالدہ کو اپنے حضور میں طلب فرما کر ایک تمغہ عطا فرمایا۔ روشن خیال باپ کو بیٹی کی علمی شہرت پر جس قدر ناز اور فخر ہوتا بجا تھا۔ چنانچہ اس نے اس کتاب کی ایک ہزار جلدیں چھپوا کر ترکی سپاہیوں کی بیبیوں میں تقسیم کیں۔

سترہ سال کی عمر میں اگرچہ خالدہ تمام مضامین مثلاً ادب۔ تاریخ فلکیات وغیرہ میں ماہر ہو چکی تھی لیکن علم ہندسہ یعنی جیومٹری میں کمزور تھی۔ کیونکہ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ادب و انشا سے دلچسپی رکھنے والا دماغ ریاضی کی خشکی سے اکثر بیگانہ ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ باپ نے قسطنطنیہ کی شاہی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کو خالدہ کا اتالیق مقرر کیا۔ تاکہ اسے جیومٹری کے مضمون میں خاص طور پر محنت کرائے۔

۱۹۱۶ء میں خالدہ نے بی اے کی ڈگری حاصل کی اور تمام ٹرکی کے طول و عرض میں یہ واقعہ حیرت و تعجب کی نظروں سے دیکھا گیا۔ چند دنوں کے بعد اس اتالیق پروفیسر سے خالدہ کی شادی ہو گئی لیکن تھوڑے ہی عرصے میں پروفیسر مر گیا اور خالدہ اپنے ملک و ملت کی خدمت کے لئے از سر نو کمربستہ ہو گئی ٭

خالدہ خانم چھریرے بدن کی نازک اور حسین خاتون ہیں۔ خوبصورت کھچے ہوئے ابرو۔ بڑی بڑی میگوں آنکھیں۔ جو چہرے کے نازک و لطیف خط و خال کے تناسب سے کسی قدر بڑی معلوم ہوتی ہیں پتلے پتلے سرخ لب۔ چھوٹا سا دہن جوان کے جذبات و احساسات لطیفہ کا مظہر ہے۔ یہ ترکوں کے حسن کی خصوصیات ہیں اور سب خالدہ خانم میں موجود ہیں لمبے لمبے سرخ سنہری بال ہیں جس وقت محترمہ اپنے چہرے پر سے باریک ریشمین نقاب اٹھا لیتی ہیں تو وہ بال کسی قدر نظر آجاتے ہیں۔ ترکوں کے بال بالعموم سیاہ ہوتے ہیں لیکن یہ بال خالدہ نے اپنی والدہ سے ترکہ میں پائے ہیں جو نسلاً یہودن تھیں۔ اور بعد میں مسلمان ہو گئی تھیں ٭

خالدہ خانم کا اصلی حسن و جمال یہ ہے کہ وہ اظہار خیالات کے وقت جذبہ اور احساس میں سراسر ڈوب جاتی ہیں۔ آپ کی زبردست قوت ارادی اور شخصیت اس قدر پُر رعب اور موثر ہے کہ ہر شخص کو آپ کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہی بن پڑتی ہے۔ آپ کا ایک امتیاز خصوصی یہ ہے کہ آپ کسی موقع پر ممتاز اور نمایاں نظر آنا نہیں چاہتیں۔ اوضاع و اطوار میں نہایت خاموش طبع اور عجیب متین ہیں۔ لباس میں ہلکے اور ایک جیسے رنگ پسند کرتی ہیں۔ مذاق سلیم اور حیثیت عالی رکھنے والی عورتیں بالعموم سادگی پسند ہوتی ہیں لیکن ان کی یہ سادگی بھی مُسرفانہ ہوتی ہے۔ یہی حال خالدہ خانم کا ہے۔ آپ ایسا لباس پہنتی ہیں جو بظاہر سیدھا سادہ لیکن فی الحقیقت قیمتی ہوتا ہے ٭

ہندوستانی لڑکیاں چونکہ صحیح اصول کے ماتحت تعلیم نہیں پاتیں۔ اس لئے ان کی تحریر و تقریر حرکات و سکنات میں کچھ مردانہ پن سا آجاتا ہے۔ لیکن خالدہ خانم کا یہ حال نہیں۔ وہ اپنی ہر بات میں عورت ہیں اور ان کے ایک ایک لفظ۔ ایک ایک سطر۔ ایک ایک حرکت میں نسوانیت کی دلفریبیاں اور نزاکتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں ٭

جب ٹرکی میں انقلاب کی ہوائیں چلنے لگیں اور عبدالحمید خان کی شخصی حکومت کے پرنسے فضائے آسمانی

میں اڑنے لگے تو تمام قلمرو عثمانیہ میں اخباروں اور کتابوں کی بھرمار ہونے لگی۔ اس زمانے میں خالدہ خانم نے ایک ولولہ انگیز نظم لکھی جس میں یہ خیال باندھا گیا تھا کہ ترکوں کی موجودہ سلطنت اور خلافت حاضرہ کے بانی عثمان کی روح ترکی فوج کے چوتھے دستے کو خطاب کر رہی ہے۔ یہ فوج کا چوتھا دستہ ہی تھا جس نے انقلاب میں نوجوانان ترکی کا ساتھ دیا۔ اور آئینی سلطنت قائم کرنے میں طلعت۔ انور اور جمال کی امداد و اعانت کی۔ چونکہ اس نظم میں وہی جذبات و خیالات ظاہر کئے گئے تھے جو اس زمانے میں تمام ترکی نوجوانوں کے دلوں میں لہو رہے تھے اس لئے خالدہ کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ گیا اور ہر طرف سے اس قومی شاعرہ کی حرارت ایمانی پر تحسین و آفرین کے پھول برسنے لگے۔

شادی کے زمانے میں حرم کی چاردیواری کے اندر بھی خالدہ ادب و انشا کے شغل سے غافل نہ تھی چنانچہ اس نے متعدد ناول لکھ رکھے تھے۔ جب اخباروں اور کتابوں کے شائع ہونے کا زمانہ آیا تو وہ ناول ترکی کے مشہور روزانہ و ماہوار اخباروں اور رسالوں میں بالاقساط شائع ہونے لگے۔ ترکی نوجوانوں کے سب سے بڑے اخبار "طنین" نے خالدہ کو مضمون نگاری کی خدمات پر آمادہ کر لیا۔ چنانچہ خالدہ نے اس پرچہ میں تحریکات قومی کے متعلق موثر و مدلل مضامین لکھنے شروع کئے۔ بس پھر کیا تھا۔ ادبی قابلیت کا شہرہ تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اب سیاست ملکی میں بھی خالدہ کو ایک بلند حیثیت حاصل ہو گئی اور نہ صرف ترکی میں بلکہ تمام یورپ کے ممالک میں اس خاتون کی غیر معمولی لیاقت اور زور تحریر کے چرچے ہونے لگے۔ یہ شہرت اس حد تک پہنچی کہ انگلستان کی ایک عظیم الشان سیاسی کانفرنس میں تقریر کرنے کے لئے خالدہ خانم خاص طور پر طلب کی گئیں۔ خالدہ نے وہاں ایسی دلآویز اور جوش انگیز تقریر کی کہ بڑے بڑے انگریز ماہرین سیاست نقش بدیوار ہو کر رہ گئے۔ چونکہ امریکہ آزاد خیالی اور جمہوریت کا گھر ہے اور خالدہ خانم نے امریکن استانیوں کے آغوش شفقت میں تعلیم و تربیت پائی تھی۔ اس لئے اسے آئینی نظام حکومت سے بے انتہا دلچسپی تھی۔ اس دلچسپی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی کے اعلیٰ رہنمایان قوم۔ انور پاشا طلعت پاشا اور جمال پاشا کو خالدہ خانم کی قابلیت سے فائدہ اٹھانے کی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ خالدہ کے مکان پر بہترین سیاست داں جمع ہونے لگے۔ اور اس خاتون کے حیرت انگیز اقتدار کے ماتحت ترکی کے مسئلہ آزادی کی گتھیاں بہت آسانی سے سلجھنے لگیں۔

آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینے والے رہنما اور آزاد نگار اخباروں کے ایڈیٹر ہمیشہ خطرے کی زندگی

بسر کرتے ہیں - قید اور پھانسی کا اندیشہ ان کی ہمتوں کو پست نہیں کر سکتا - چنانچہ خالدہ نے بھی انقلاب کی تحریک میں حصہ لے کر اپنے لئے بہت سے خطرات پیدا کر لئے انقلاب کے ایک سال بعد عبد الحمید خاں نے اپنی کھوئی ہوئی طاقت از سر نو حاصل کرنے کے لئے اچانک کوشش شروع کر دی اور دو سو فوجی افسروں اور تین سو دیگر ملکی عہدے داروں اور انقلاب پسندوں کو پھانسی پر لٹکا دینے کا ارادہ کر کے ان کی فہرستیں تیار کیں - ان فہرستوں میں دو عورتوں کے نام بھی مندرج تھے جن میں سے ایک خالدہ خانم تھیں - اس وقت ترکی میں خوف و دہشت کا زمانہ طاری تھا - نوجوانان ترکی کے اخبار "طنین" کے دفتر کو عبد الحمید خاں کے طرفدار سپاہیوں نے تباہ و برباد کر دیا اور تمام مضامین اور دیگر تحریروں کو آگ لگا دی +

خالدہ خانم جان بچانے کی کوشش میں تدبیریں کرنے لگیں - اپریل ۱۹۰۹ء میں وہ اپنے دو بچوں کو ساتھ لے کر امریکن کالج میں پہنچیں اور کالج کے کارپردازوں سے کہا کہ میرے ان دو بچوں کی حفاظت کرو جب خطرے کا زمانہ گذر جائے گا تو میں ان کو لے جاؤں گی - چنانچہ کالج والوں نے خالدہ کے بچوں کو نہایت محبت و شفقت سے اپنے پاس رکھ لیا اور خالدہ اپنے چند خیر خواہوں کی مدد سے مصر کو بھاگ گئیں +

کچھ مدت کے بعد جب خوف و دہشت کے بادل پھٹ گئے - ترکی نوجوانوں کی عملداری نہایت انتظام سے قائم ہو گئی اور ترکی کا مطلق العنان بادشاہ عبد الحمید خان نہایت ذلت اور کس مپرسی کی حالت میں تخت خلافت پر سے اتار دیا گیا تو خالدہ خانم مصر سے ترکی میں پہنچیں اور از سر نو خلافت اسلامیہ کی خدمت میں مصروف ہو گئیں +

عبد الحمید خاں کے عہد میں حریت نسواں کی سخت مٹی خراب ہو رہی تھی اور عورتوں کے حقوق نہایت جابرانہ طور پر پامال کئے جاتے تھے - جب ترکوں نے اس عجیب و غریب سلطان کی حکومت کا جوا اپنی گردنوں سے اتار پھینکا اور ہر طرف ترقی اور آزادی کے خوشگوار جھونکے چلنے لگے تو عورتیں بھی قید خانہ حرم سے باہر نکلیں اور اپنی اس حریت کے لئے جد و جہد کرنے لگیں جو مذہب مقدس اسلام نے نہایت فیاضی سے ان کو دے رکھی ہے - خالدہ خانم سب سے پہلے اس کام میں سرگرمی سے مصروف ہوئیں بیسیوں نسوانی انجمنوں کی بنیاد ڈالی اور عورتوں کے تعلیمی اور معاشرتی حقوق کے لئے روز افزوں کوششیں کرنے لگیں بہت سے نسوانی اخبار جاری ہو گئے اور ان کی اشاعت روز بروز بڑھنے لگی - ان اخباروں میں عورتوں کے ملکی - تمدنی اور تعلیمی مسائل پر نہایت زور و شور سے بحث کی جاتی تھی اور عام قومی اخبار حریت نسواں کی تائید میں

لمبے لمبے مضامین لکھتے تھے ۔

اس دوران میں ترکی کے ملکی حالات پھر بگڑنے لگے ملک میں مختلف جماعتیں پیدا ہوگئیں جن کے درمیان کشمکش اور اختلاف رونما ہونے لگا۔ بیرونی طاقتوں نے ترکوں کی اس باہمی مخالفت سے فائدہ اٹھانا چاہا چنانچہ ۱۹۱۲ء میں پہلی جنگ بلقان کی آگ کے شعلے آسمان کی خبر لانے لگے۔ اگرچہ بظاہر اس جنگ کا مستقبل خوفناک نظر آتا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ بلقان کی ریاستوں کا اس طرح جمع ہو کر ترکی پر چڑھ آنا ترکوں کے لئے باعث رحمت ہو گیا۔ انھوں نے اپنی باہمی عداوتوں کو بالائے طاق رکھا سب ایک ہو کر اپنے ملک کو بچانے کی کوشش میں سرگرم ہو گئے اور حب وطن کا جوش ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گیا ترکوں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ عورتوں نے بھی قومی کاموں میں حصہ لینا شروع کیا شہزادی نعمت خانم کی صدارت میں "انجمن ہلال احمر" قائم کی گئی اور ترک عورتیں بھی دیگر ممالک یورپ کی خواتین کی طرح میدانوں اور ہسپتالوں میں مجاہدین اسلام کی مرہم پٹی کا مبارک اور مقدس فرض ادا کرنے لگیں ۔

قسطنطنیہ کی شاہی یونیورسٹی میں عورتوں کے دو عظیم الشان جلسے منعقد ہوئے جن میں کم و بیش پانچ چھ ہزار عورتیں شریک ہوئیں۔ ان جلسوں میں قومی اتحاد و اتفاق اور حب وطن کے موضوع پر بہت پُر زور تقریریں کی گئیں۔ خالدہ خانم کا انداز تقریر اور اس کی موثر خطابت تمام یورپ سے خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ چنانچہ اس خاتون محترم نے بھی ان جلسوں میں ایسی پُر جوش اور ولولہ انگیز تقریریں کیں کہ ترکی کی تمام دنیائے نسواں کو حرارت قومی سے لبریز کر دیا۔ خالدہ خانم کی ان شاندار تقریروں میں سے ایک تقریر کا اقتباس ذیل میں درج ہے :-

> اسلام کی بیٹیو! اور محمد رسول اللہ کے مقدس نام پر کٹ مرنے والوں کی ماؤں بہنوں اور بیبیو! صدہا برس گذرے ایک ترک بادشاہ نے پتھر کی سل پر ایک کتبہ لکھوایا تھا جس کے الفاظ آج بھی اپنے اندر اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ ترکی قوم کو زندگی اور بیداری عطا کریں اس بادشاہ نے لکھا تھا کہ" خدا نے مجھے اس لئے سلطنت کی نعمت سے مالا مال فرمایا ہے کہ ترکوں کی عظیم الشان قوم کا نام و نشان زمانے کی گردشوں سے مٹنے نہ پائے۔ میری قوم دولتمند نہیں۔ میں ان غریب لوگوں کا بادشاہ ہوں جن کے پاس کھانے کو ٹکڑا نہیں۔ تن ڈھانکنے کو چیتھڑا نہیں۔ میں نے ترکی قوم کی بقا کے لئے رات کی نیند اور دن کا آرام حرام کر رکھا ہے۔ میں مرتے دم تک اپنی

قوم کی خدمت میں مصروف رہا ہوں۔ میری زندگی کو اپنے راستے کا چراغ بناؤ کہ کبھی سیدھے راستے سے بھٹکنے نہ پاؤ"۔

پیاری بہنوں! آؤ اپنے قدیم بادشاہ کی اس وصیت کو اپنے لئے دلیل راہ بنائیں اور قوم کے لئے وہ کچھ کر دکھائیں جو اسلام کے قرون اولیٰ میں مسلمان عورتوں نے کر دکھایا تھا ہماری سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ حب وطن کے نشے میں چور اور اعلائے اسلام کی شراب سے سرشار ہو جائیں۔

ترکوں کو حب قومی کے جذبے ہی نے دنیا کی عظیم الشان قوم بنایا تھا لیکن آج ہم میں وہ جذبہ باقی نہیں رہا اور نتیجہ یہ ہے کہ ہماری تاریخی شہرت برباد ہوگئی اور ہم دنیا میں ذلت کی زندگی بسر کرنے لگے بلغاریا کے لوگوں کی طرف دیکھو آج سے پچاس سال پہلے یہ لوگ ہمارے گوالے تھے۔ ہمارے لئے دودھ دوہا کرتے تھے لیکن حب قومی نے انہیں کچھ کا کچھ بنا دیا اور آج سارا یورپ اس قوم کو وقعت کی نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ شرم اور غیرت سے ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ نوکر تو دنیا میں عزت کی زندگی بسر کریں اور آقا ذلیل و خوار ہو جائیں۔ یہ کس کا قصور ہے۔ یہ ہم عورتوں کا قصور ہے۔ ترکی ماؤں کا فرض تھا کہ اپنے بچوں کے دلوں اور دماغوں میں مادر وطن کی محبت اور اسلام کی عقیدت کا نقش بٹھاتیں اور ان کو قومی عزت کی خاطر کٹ مرنے کی تعلیم دیتیں لیکن ہم نے اپنے فرض سے غفلت کی اور ساری قوم کے حق میں کانٹے بوئے لیکن مایوس و نا امید ہونے کی ضرورت نہیں ابھی کچھ نہیں گیا۔ اگر آج بھی قوم کی خدمت پر آمادہ ہو جاؤ تو بہت کچھ کر سکتی ہو۔

فرانس اور اس کے باشندوں کے حالات سے عبرت حاصل کرو۔ آج سے چالیس سال پیشتر فرانسیسیوں کو جرمنوں کے ہاتھوں شکست فاش کھانی پڑی اور اپنے علاقے کا بہترین حصہ کھو دینا پڑا لیکن حب قومی کی آگ ان کے دلوں میں برابر مشتعل رہی اور انھوں نے امید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ دیا۔ چنانچہ پچیس سال کے عرصے میں اپنے ملک کی کھوئی ہوئی طاقت دوبارہ حاصل کرلی اور دنیا کی بہترین قوموں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ دور کیوں جاؤ یونانیوں کی طرف دیکھو۔ یہ لوگ صدہا سال سے ہمارے محکوم رہے آزادی کے نام سے

بھی ناآشنا تھے اور ان کا سب سے بڑا شہر ایک گندے اصطبل سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا آج ایتھنز میں جاؤ تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ وہی اصطبل آج ایسا مصفا، پاکیزہ اور مہذب شہر ہے کہ استنبول سے پہلو مارتا نظر آتا ہے +

ہم پر کتنی مصیبتیں ٹوٹیں۔ آندھیاں آئیں جھکڑ چلیں۔ طوفان اٹھیں لیکن یاد رکھو کہ ترکی قوم فنا ہونے والی نہیں۔ کیونکہ اس کے گذشتہ کارناموں نے اس کے شاندار مستقبل پر مُہر کر رکھی ہے۔ بلقان کی ریاستیں تو کیا حقیقت رکھتی ہیں۔ اگر ساری دنیا بھی ہماری مخالف ہو جائے تو ہمت نہ ہارو۔ اور اپنی اُن غریب بہنوں کی مدد کئے جاؤ جو چھوٹے چھوٹے چراغوں کی دُھندلی روشنی میں سوئی تاگا لئے ہوئے بہادران ترکی اور مجاہدین اسلام کے لئے کام کر رہی ہیں +

آؤ۔ خدا تعالیٰ کے حضور میں اور قومیت کی قربانگاہ پر قسم کھا کر یہ عہد کریں کہ جب تک ہم اپنی قوم اور اپنے پیارے اسلام کی عزت برقرار نہ کر لیں گے اور دنیا کی دوسری قوموں کے مقابل میں اپنی عظمت کو بڑھا چڑھا کر نہ دکھا لیں گے اس وقت تک کسی قسم کی قربانی سے پہلو تہی نہ کریں گے۔ تاکہ جب زندگی کی آخری گھڑی آئے تو ہمارا ایمان سلامت ہو اور ہمارا ضمیر اندر سے پکار پکار کر وہی کچھ کہے جو ہمارے قدیم بادشاہ نے کہا تھا کہ" ہم نے اپنی قوم کے لئے دن کا آرام اور راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی +

خالدہ خانم کی جانفروز تقریر کے ہر فقرے پر اللہ اکبر کے ولولہ انگیز نعرے بلند ہوتے تھے۔ اور ترک عورتوں کے حسین و جمیل چہرے حب اسلام کے پاکیزہ جذبے سے سرخ ہو رہے تھے۔ تقریر کے خاتمہ پر خالدہ نے اپنے تمام جواہرات، اپنے ایررنگ۔ اپنی انگشتریاں۔ اپنا بیش قیمت ہار اور کنگن اور اپنی کلائی کی گھڑی غرض تمام زیور اتار کر میز پر رکھ دئیے اور کہا:۔

"میرے پاس یہی چند ہزار روپے کا اثاثہ ہے جو آج مجاہدین اسلام کی امداد کے لئے نذر کرتی ہوں قوم اسے قبول فرمائے "!

بس پھر کیا تھا پانچ ہزار ترکی خواتین اُٹھ کھڑی ہوئیں اور اپنا تمام زیور اتار اتار کر قوم کے لئے دینا شروع کیا۔ کہتے ہیں کہ اس دن خالدہ خانم کی ایک تقریر سے ترکوں کے قومی سرمائے کو لاکھوں پونڈ وصول ہو گئے

جنگ یورپ کے آغاز میں خالدہ خانم نے ایک لائق ترکی ڈاکٹر صالح بک سے شادی کر لی۔ اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ ملک شام میں لڑکیوں کے لئے صدہا مدارس کھول دیئے اور آرمینیا اور ایشیائے کوچک کے علاقوں میں بھوکے ننگے یتیموں کے لئے عالیشان یتیم خانے قائم کر دیئے خود زیادہ تر بیروت میں رہتی تھیں اور وہیں سے دمشق اور دیگر مقامات کے مدارس کی نگرانی کیا کرتی تھیں۔ جنگ کے زمانے میں تعلیم کی اس حیرت انگیز ترقی سے صاف ظاہر ہے کہ ترکی حکومت نے اپنے ملک کا انتظام کس خوبی و خوش اسلوبی سے قائم کیا تھا۔ غازی طلعت پاشا وزیر اعظم ٹرکی نے عہد کر رکھا تھا کہ خالدہ خانم کی کوئی تجویز مسترد نہ کی جائے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس خاتون کا کوئی کام ملک و قوم کی بھلائی اور اسلام کی عزت و عظمت سے خالی نہیں ہوتا۔ چنانچہ غازی موصوف نے دو گاڑیوں میں صدہا اُستانیاں قسطنطنیہ سے ایشیائے کوچک میں بھیج دیں تاکہ خالدہ خانم ان سے مناسب کام لیں +

بیروت میں فرانسیسیوں نے ایک عظیم الشان نسوانی کالج قائم کر رکھا تھا۔ جب جنگ چھڑ گئی۔ تو فرانسیسی اس کالج کی خوبصورت عمارت اور اس کا سارا ساز و سامان چھوڑ کر بھاگ گئے۔ خالدہ خانم نے بیروت پہنچتے ہی سب سے پہلے اس کالج پر قبضہ کیا۔ یہ عمارت ایک نہایت دلکشا پہاڑی پر واقع تھی جہاں سے کوہ لبنان کا خوشنما نظارہ ہر وقت آنکھوں کو فرحت دیتا تھا۔ خالدہ خانم نے جمال پاشا حاکم شام کی مدد سے کالج کے ساز و سامان کو اور بھی زیادہ وسعت دی اور اسے تمام قلمروِ عثمانیہ کا بہترین مدرسہ بنا دیا۔ اس مدرسے میں نصاب تعلیم مغربی اصول کے ماتحت تھا اور خالدہ خانم نے اپنی قوم کی ضروریات کے مطابق بہت سی باتوں کو چھوڑ کر کچھ نئی چیزیں بھی نصاب میں داخل کر لی تھیں۔ اس کالج میں اور تمام دیگر مدارس میں مذہبی آزادی اور رواداری کا بہت خیال رکھا جاتا تھا اور مسلمان اور عیسائی لڑکیاں ایک ہی جگہ رہتی۔ ایک ہی جگہ پڑھتی لکھتی اور ایک ہی جگہ ہنستی کھیلتی تھیں تعصب مذہبی کا کہیں نام و نشان بھی نہ تھا اور سب لڑکیاں آپس میں بہناپے اور سہیلپن سے بسر کرتی تھیں +

خالدہ خانم کی دو تین بہنیں بھی ایشیا کوچک اور شام میں اشاعت تعلیم کا کام کر رہی تھیں۔ ان سب خواتین کی قابلیت اور سرگرمی نے اس ملک میں عجیب و غریب زندگی کی روح پھونک دی اور حریت نسواں اور تعلیم نسواں کے غلغلے چاروں طرف بلند ہونے لگے۔ چنانچہ پچھلے ہی سال کا ذکر ہے۔ شام کی تاریخ میں پہلی دفعہ یہ واقعہ پیش آیا کہ صدہا مسلمان خواتین بیروت کی عورتوں کے لئے انجمن قائم کرنے کی غرض سے قسطنطنیہ

سے امریکن کالج میں آکر جمع ہوئیں جب مسلمانوں کے ایک صنعتی مدرسے کے لئے چندہ جمع کرنے کی غرض سے ایک عام جلسہ منعقد کیا گیا تو جلسہ گاہ کی گیلری میں کوئی ڈھائی سو خواتین موجود تھیں تین چار سال کی مدت میں تعلیم کا اس قدر وسیع اثر پھیلا دینا صرف خالدہ خانم ہی کا کام تھا +

اپریل ۱۹۱۸ء میں یہ اطلاع عام طور پر مشہور ہو گئی کہ انگریز شام پر حملہ کرنے والے ہیں۔ خالدہ خانم پر اس وقت بہت بڑی ذمہ واری عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے کوئی پچاس ترکی استانیوں کو اسی وقت قسطنطنیہ واپس بھیج دیا۔ اور خود بھی ارادہ کر لیا کہ بیروت کی سکونت چھوڑ کر دار الخلافہ اسلام میں پہنچ جائے لیکن انگریزوں نے موسم خزاں کے آغاز تک شام پر کوئی حملہ نہ کیا اور اس تذبذب کی حالت میں سکولوں۔ اور یتیم خانوں کی حالت نہایت خراب ہو گئی۔ ایشیا کوچک سے روانہ ہوتے وقت خالدہ خانم نے امریکن ریلیف سوسائٹی سے استدعا کی کہ آپ لوگ اس علاقے کی مسلمان اور عیسائی عورتوں اور ان کے بچوں کا خیال رکھیں چنانچہ امریکہ والوں نے نہایت شرافت و دیانت سے اس کام کو انجام دیا +

جنگ کے بعد یورپ کی ناانصاف سلطنتوں نے قسطنطنیہ پر اپنا قبضہ جما لیا۔ اور تمام ترکی کے طول و عرض میں غم و غصہ کے جذبات پھیل گئے قسطنطنیہ میں آئے دن ترکوں کے بارونق جلسے منعقد ہونے لگے جن میں یورپین سلطنتوں کی غیر منصفانہ روش کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جاتی اور ترکوں سے اپیل کیا جاتا تھا کہ وہ ترکی کو پارہ پارہ ہونے سے بچالیں۔ انہی دنوں قسطنطنیہ کے گھوڑ دوڑ کے وسیع میدان میں ایک لاکھ ترکی محبان وطن کا عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں ملک کی بہترین ادیب۔ اعلیٰ درجے کی شاعرہ مشہور فسانہ نگار اور ماہر تعلیمات خالدہ خانم نے ایک آتشبار تقریر کی اور ترکوں کو ان الفاظ میں غیرت دلائی +

> تم ہمیشہ سے فاتح قوم رہے ہو اور ہمیشہ تمھارا جھنڈا تمام قوموں سے بلند تر نظر آتا رہا ہے کیا آج تم یہ ذلت چپ چاپ برداشت کرو گے کہ اسلام کے آخری پایہ تخت پر غیر مسلم کا قبضہ ہو اور تمھاری ماؤں۔ بہنوں اور بہو بیٹیوں کی عزت پر حملے کئے جائیں؟ اٹھو اور دنیا کو بتادو کہ ابھی ترکوں میں جان باقی ہے اور تاتاری خون غلامی قبول نہیں کر سکتا!

خالدہ خانم کی تقریر سے تمام قسطنطنیہ میں آگ لگ گئی اور قومی جذبہ پورے زور سے بھڑک اٹھا اُدھر سمرنا پر یونانیوں کے تسلط نے اور بھی جلتی آگ پر تیل چھڑک دیا۔ اگر ایک دو ایسے ہی جلسے اور ہو جاتے تو خدا جانے کیا قیامت بپا ہو جاتی اور قسطنطنیہ میں کتنی خون کی ندیاں بہ جائیں لیکن اتحادیوں نے فوراً اس قسم

کے جلسوں کی ممانعت کر دی۔ اور اس کے بعد آج تک کوئی ایسا جلسہ منعقد نہیں ہوا ✤

خالدہ خانم کا خیال ہے کہ ٹرکی کو بیرونی ممالک کی امداد کی سخت ضرورت ہے اور چونکہ انہیں امریکہ کی حریت پسندی اور انصاف پر بھروسہ ہے اس لئے وہ چاہتی ہیں کہ امریکہ والے اس مصیبت میں ٹرکی کی مدد کریں ✤

ابھی خالدہ خانم قسطنطنیہ ہی میں تھیں کہ اخباروں کے ایک نمایندے نے ان سے ملاقات کی اور مختلف سوالات پوچھے۔ خالدہ خانم نے جواب میں کہا "ٹرکی کو امن و امان چاہئے زراعتی ترقی چاہئے اور کھوئے ہوئے علاقے چاہئیں جن میں مسلمانوں اور عیسائیوں کو مساوی حقوق دئے جائیں گے۔ ان چیزوں کے علاوہ ترکوں کو تعلیم کی سخت ضرورت ہے" ✤

اسی اثنا میں غازی مصطفیٰ کمال پاشا نے انگورہ میں عظیم الشان ترکی حکومت قائم کرلی۔ اور ٹرکی کے بہترین مصنف۔ انشا پرداز۔ شاعر۔ جرنیل۔ سپاہی۔ علما اور انتظامی قابلیت کے آدمی اپنے گرد جمع کرلئے۔ جس وقت غازی موصوف نے وزارت حکومت کا خاکہ کھینچا تو اس میں ایک خالدہ خانم کی کمی نظر آئی سب نے یہی کہا کہ جب تک خالدہ قسطنطنیہ سے انگورہ میں نہ آئیں گی وزارت مکمل نہیں ہوسکتی چنانچہ اسی وقت غازی ممدوح نے ایک جماعت مقرر کر دی اور سنا گیا ہے کہ ایک چھوٹا سا ہوائی جہاز رات کی تاریکی میں پرواز کرتا ہوا قسطنطنیہ پہنچا اور اتحادیوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر خالدہ خانم اور ان کے شوہر کو اڑا لے گیا چنانچہ آج کل "خالدہ خدیجہ صالح خانم ادیب بی۔ اے" غازی مصطفےٰ کمال کی حکومت میں وزیر تعلیمات کے فرائض انجام دے رہی ہیں ✤

یورپ کے ملکوں کو یہ دعویٰ ہے کہ انھوں نے عورت کی عزت کو اپنا شعار بنا رکھا ہے اور وہ عورت کو "نصف بہتر" کے نام سے موسوم کرتے ہیں لیکن عورت کی عزت یہ نہیں کہ اس کے پاس سے گذرتے ہوئے اپنی ٹوپی اتار کر سلام کر دیا جائے۔ یا گاڑی میں چڑھنے اترنے میں مدد دی جائے۔ یا کھانے پر کوئی اچھی سی تشتری اس کی طرف بڑھا دی جائے۔ یا صحبت احباب میں اسکی خوشی و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی خودداری کو اس کی دلجوئی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ بلکہ عورت کا احترام اس کے حقوق کا احترام ہے۔

یورپ عورت کے ساتھ نہایت ذلیل مذاق کر رہا ہے اور اس کو ظاہری و لفظی عزت سے بہلانا چاہتا ہے۔ انگلستان میں عورتوں نے حقوقِ نیابت حاصل کرنے کے لئے سالہا سال تک جدوجہد کی لیکن اب تک پوری کامیابی نہیں ہوئی۔

باوجودیکہ انگلستان۔ امریکہ۔ فرانس اور جرمنی کی عورتیں ٹرکی کی خواتین سے زیادہ تعلیم یافتہ معاملہ فہم اور لائق ہیں لیکن اب تک ان مہذب ترین ممالک میں وزارت کا عہدہ ایک عورت کو بھی نصیب نہ ہوا لیکن اسلام تو مرد و عورت کی مساوات کا حامی ہے۔ فرزندان اسلام نے جب دیکھا کہ ایک عورت سیاست میں مردوں کی سی قابلیت رکھتی ہے تو اسے فوراً وزیرِ حکومت بنا کر حقوقِ نسواں کے احترام کا عملی ثبوت دیا۔ ترکوں کی قومی حکومت میں وزیرِ تعلیم کے جلیل القدر عہدے پر خالدہ خانم کا مقرر ہو جانا فی الحقیقت انسانی تاریخ کا ایک عظیم الشان واقعہ ہے۔ یورپ کے ممالک اپنی تہذیب و شائستگی کے مدعی تو ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج دنیا میں صرف ترک ہی ایسی قوم ہے جس کے افراد نے ایک عورت کے حق میں وزارت کے لئے رائے دی ہے۔

خالدہ خانم نے ترکی۔ انگریزی اور فرانسیسی اخباروں میں بیسیوں معرکتہ الآرا مضامین مشرقِ قریبہ کی سیاسیات پر لکھے ہیں اور پیچیدہ ترین مسائل کو اپنے ناخن تدبیر سے سلجھایا ہے۔ اس کے علاوہ ادبِ لطیف میں خالدہ خانم کی تحریریں معجزاتِ ادب اور خوارقِ انشا کا حکم رکھتی ہیں محترمہ کے متعدد فسانے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ ہندوستان میں جو حضرات خوش نصیبی سے زبان ترکی جانتے ہیں ان کو چاہئے کہ ان ادبی جواہر پاروں سے اردو کی دکان ادب کو بھی آراستہ کریں۔ جناب سید سجاد حیدر صاحب اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ کاش انہی کا بہار آفریں قلم اردو کی اس بے نظیر خدمت پر آمادہ ہو جائے۔

سالک

اگر حقیقتاً تہدیہ نیاز۔ اور جرأت سعی کامیابی مقصود کا ذریعہ ہو سکتی ہے تو ہمیں یقین ہے کہ عنقریب سید سجاد حیدر صاحب" ہندوستان کی رفاہ سے بھی اچھا کوئی نمونہ خالدہ خانم کے ادبِ لطیف کا "مخزن" کو مرحمت فرما کر شکریہ کا موقع دیں گے۔ خدا انھیں موجودہ علالت عارضی سے مطمئن افاقہ دے۔

(ایڈیٹر)

اُجڑا دیار
اور
اُس کے آثارِ قدیمہ کے بانی

دلی کو ویران ہوئے ایک زمانہ گذر گیا۔ مگر ابھی تک اس شہر میں بعض ایسی بڑی بڑی سربفلک اور فوجی عمارتیں موجود ہیں جو اپنے بانیوں کی مجسم یادگار متصور تھیں ؛

غدر کے بعد کچھ تو امتدادِ زمانہ اور اپنے اصلی مالکوں کی اس وقت کی ناداری کی وجہ سے مسمار اور منہدم ہوگئیں اور کچھ اپنے نئے قابضوں کے لالچ کی وجہ سے ایسی شکل وصورت میں تبدیل کردی گئیں جو اب پہچانی بھی نہیں جاسکتیں۔ جہاں عالیشان محلسرائے اور حویلیاں تھیں۔ وہاں اب بجائے محلوں کے محلّے تعمیر کردئے گئے۔ چنانچہ انھیں محلوں میں سے چند محلوں کے نام یہ ہیں۔ حویلی شیرافگن۔ حویلی کالے صاحب۔ حویلی عزیز آبادی۔ حویلی نواب وزیر وغیرہ۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے محلے اس قسم کے ہیں ؛

بعض کے پھاٹک جو کسی نہ کسی وجہ سے منہدم ہونے سے بچ گئے ہیں اور موجود ہیں۔ وہ بجائے حویلی کے پھاٹک کے نام سے موسوم ہیں۔ چنانچہ ایک محلے کا نام پھاٹک حبش خاں ہے۔ یہ اس قدر مشہور محلہ ہے کہ دلی کا بچہ بچہ اس سے واقف ہے۔ مگر شہر بھر میں شاید ہی کوئی شخص ہو جسے حبش خاں کے حالات سے بھی پوری آگاہی ہو ؛

پھاٹک حبش خاں کے بانی کے حالات حبش خاں کا اصلی نام مفتاح تھا۔ اصل میں یہ ایک حبشی غلام تھا جو احمد نگر کے نظام شاہی خاندان میں بڑھتے بڑھتے سپہ سالار ہوگیا تھا اور جس وقت شاہجہان نے سلطنت احمد نگر پر چڑھائی کی ہے تو شیدی مفتاح اُدگیر کے قلعہ کا حاکم تھا۔ اس نے نہایت جرأت اور بہادری سے شاہجہان کی فوج ظفر موج کا مقابلہ کیا۔ جب قلعہ میں محصور ہوگیا تو جس وقت تک گولہ بارود و دیگر سامان جنگ نے جواب نہ دے دیا۔ شیدی مفتاح برابر ہمت واستقلال سے لڑتا رہا لیکن جب ایک طرف سامان حرب

ہو چکا اور خوراک ختم ہو گئی ۔ دوسری طرف کمزوری سے تاب مقاومت نہ رہی تو اس کے سوا چارہ نہ دیکھا کہ قلعہ دشمن کے حوالے کر دیا جائے +

شیدی مفتاح حسب دستور شاہی قیدی ہو کر زیر حراست کر لیا گیا ۔ شاہان مغل مردم شناسی میں بڑے ماہر تھے اور ہمیشہ قابل ترین دشمن کو اپنا دوست بنانے کی کوشش کیا کرتے تھے ۔ چنانچہ شاہجہان نے شیدی مفتاح کی بہادری کی تعریف کی اور اس کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر تو لشکر شاہی میں ملازمت اختیار کرنا چاہے تو تجھکو رہائی دے دی جائے گی شیدی مفتاح نے موقع کو غنیمت جانا چنانچہ وہ حبش خان کے خطاب اور [illegible] سوار اور سہ ہزاری منصب سے سرفراز کر دیا گیا +

جس دروازے کا نام آج کل حبش خاں کا پھاٹک ہے وہ شیدی مفتاح کی حویلی کا پہلا دروازہ تھا حبش خان اورنگ زیب کے عہد تک زندہ رہا ۔ اس کی نسل میں سے ایک شخص فولاد خاں نامی محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں دلی کا کوتوال تھا اور نادر کے حملے کے وقت زندہ تھا ۔ فولاد خاں نے حبش خاں کے پھاٹک کی مرمت بھی کرائی تھی +

اسی طرح ایک محلے کا نام ہے چھتہ بھوانی شنکر ۔ یہ ایک بڑا رفیع الشان دروازہ ہے جس میں ہاتھی مع عماری کے بآسانی گزر سکتا ہے ۔ اصل میں یہ دروازہ اس عمارت کا دروازہ تھا جو کچہری بھوانی شنکر کہلاتی تھی +

بھوانی شنکر کے حالات بھوانی شنکر کے حالات بھی خالی از دلچسپی نہیں منشی صاحب موصوف ذات کے کھتری تھے ۔ تحریر و تقریر میں بہت ہشیار تھے ۔ مروجہ فارسی کے خوب ماہر تھے +

مہاراج سیندھیا کا اقتدار شاہ عالم کے دربار میں اس قدر بڑھ گیا تھا کہ نظام حیدرآباد ۔ اور نواب اودھ جیسے مقتدر وزرا بھی اس مرہٹے سردار سے خائف رہتے تھے ۔ سیندھیا کا قیام زیادہ تر دلی میں رہا کرتا تھا اور دلی کے اکثر لائق اشخاص سیندھیا کی ملازمت میں چلے گئے تھے منشی بھوانی شنکر بھی سرکار گوالیار میں بخشی کے معزز عہدے پر ممتاز ہو گئے ۔ تقدیر سے یہ وہ زمانہ تھا کہ دربار دہلی میں سیندھیا کا طوطی بول رہا تھا ۔ اور شہر میں مرہٹوں کی عملداری تھی بھوانی شنکر کو یہ دور راس آیا ۔ اوج قسمت حصول عروج کے لئے زینہ تو ڈھونڈھ ہی رہا تھا ۔ مساعدت نے لالہ صاحب کو شاہی ملازمت میں داخل کرا دیا اور رفتہ رفتہ پولٹیکل معاملات میں دخیل ہو گئے +

جب انگریزوں نے دلّی کا محاصرہ کیا اور مرہٹوں کو وہاں سے بے دخل کرنا چاہا تو بھوانی شنکر نے مرہٹوں کے خلاف جاسوسی کرنی شروع کی جس کے صلہ میں فتح کے بعد انگریزوں نے بھوانی شنکر کو ایک ممتاز عہدے پر سرفراز کر دیا۔ چنانچہ اس وقت تک وہ حویلی بھوانی شنکر کی کھڑکی کے نام سے مشہور ہے یہ عمارت چاندنی چوک کے نکڑ پر سڑک کے اس گھماؤ پر واقع ہے جو کھاری باولی اور مسجد فتح پوری کی طرف ہے اور ایک ہوٹل کا کام دیتی ہے۔ گو اس کی ظاہری شان وشوکت تو اب بھی اس کے مالک کے رتبے کا پتہ دیتی ہے لیکن بدقسمتی سے یہ عمارت نمک حرام کی حویلی کے نام سے مشہور ہے +

بھوانی شنکر کو نمک حرام کا خطاب اہل ملک نے [illegible] جاسوسی کی بنا پر دیا۔ اور یہ نام اب اس قدر شہرت پکڑ گیا کہ بھوانی شنکر نے انگریزوں کے پاس شکایت کی کہ اس کا تدارک کرنا چاہیے۔ دلی پر اُس وقت انگریزوں کا قبضہ تھا۔ چنانچہ سرکار انگریزی کی طرف سے ایک اعلان شائع ہوا کہ جو شخص منشی بھوانی شنکر کو نمکحرام یا ان کی حویلی کو نمکحرام کی حویلی کہے گا گرفتار کیا جائے گا۔ اس اعلان کا اس وقت کیا اثر ہوا۔ اس کا تو تاریخ میں کوئی ذکر نہیں مگر یہ واقعہ ہے کہ بھوانی شنکر کی حویلی آج تک نمک حرام کی حویلی کہلاتی ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار

کوچہ گھاسی رام نمکحرام کی مشہور ومعروف حویلی سے ذرا آگے بڑھ کر چاندنی چوک میں ایک محلہ ہے جو کوچہ گھاسی رام کہلاتا ہے۔ گھاسی رام کی نسبت ایک لطیفہ مشہور ہے جو نہایت دلچسپ ہے +

گھاسی رام بادشاہ دہلی کے دربار میں جوتشی تھا اور طرح طرح کی پیشین گوئیاں کر کے درباریوں کو خوش کیا کرتا تھا۔ ایک دن بادشاہ نے سوال کیا کہ بھلا پنڈت جی اپنے حساب سے یہ تو معلوم کرو کہ آج میں کس دروازے سے شہر کے اندر داخل ہوں گا۔ پنڈت جی نے اپنے دل میں وچار کیا کہ اگر میں نے کسی خاص دروازے کا نام بتا دیا تو ضرور ہے کہ میری بات رد کرنے کو بادشاہ سلامت قصداً دوسرے دروازے سے شہر میں داخل ہوں گے۔ اس لئے دست بستہ عرض کی کہ جہاں پناہ اس دروازے کا نام میں ایک کاغذ کے پرزے پر لکھ کر رکھے دیتا ہوں۔ اس کو اس وقت تک کوئی نہ بانچے جب تک جہاں پناہ شہر میں داخل نہ ہولیں جب جہاں پناہ شہر میں داخل ہولیں اس وقت اس کاغذ کو پڑھا جائے۔ بادشاہ راضی ہو گئے۔ پنڈت جی بڑے تجربہ کار تھے۔ سوچا کہ بادشاہ شاید کسی موجودہ دروازے کو استعمال نہ کریں اور کسی نئے دروازے سے داخل ہوں۔ چنانچہ پنڈت جی نے کاغذ پر لکھدیا کہ آج بادشاہ ایک نئے دروازے سے داخل ہوں گے اُدھر

بادشاہ نے سوچا کہ آج پنڈت جی کو نیچا دکھاؤ۔ چنانچہ اجمیری دروازے اور لاہوری دروازے کے بیچوں بیچ میں سے فصیل شہر کو ایک جگہ سے مسمار کرایا گیا اور اس راستے سے بادشاہ شہر میں داخل ہوئے۔ اس دروازے کا نام کھڑکی فراشخانہ رکھا گیا۔ جب بادشاہ نے پنڈت جی کی پیشین گوئی پڑھی تو عش عش کرنے لگے اور خوش ہو کر پنڈت جی کو ایک قطعہ زمین مرحمت فرمایا جس پر پنڈت جی نے ایک مکان تعمیر کرایا۔ اس مکان کا تو اب نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔ مگر جہاں وہ مکان تھا۔ وہاں ایک محلہ آباد ہے۔ اور اس محلے کا نام اب تک پنڈت جی کے نام پر کوچہ گھاسی رام ہے ✦ (باقی آیندہ)

(مشتاق احمد زاہدی دہلوی سابق پروفیسر تاریخ بھاولپور کالج)

عیدِ غربت

(از سید اخلاق حسین صاحب اخلاق دہلوی مقیم برما)

گر ہلال عید غربت میں نظر آیا تو کیا
عید کا پیغام یہ پیغامبر لایا تو کیا

عید اُن کی ہے جو ہیں اپنے وطن میں بامراد
عید اُن کی ہے کہ جن کے دل کے ہیں ارمان شاد

مجھ سے بدقسمت کو ہو کیونکر مسرت عید کی
کم محرم سے نہیں غربت میں صورت عید کی

کیا خوشی ہو عید کی قید قفس میں ہمنوا
کر دیا جورِ فلک نے ہائے گلشن سے جدا

رکھتی ہے یاد وطن ہر وقت دل کو بیقرار
مضطرب ہوں ہجر میں احباب کے سیماب وار

شام غربت خون کے آنسو رُلاتی ہے مجھے
اور قسمت دیکھئے کیا کیا دکھاتی ہے مجھے

وہ ہوں اپنے عزیزان وطن سے دور ہوں
عیش سے ناشاد ہوں مغموم ہوں رنجور ہوں

نے قفس میں قید ہوں میں نے اسیر دام ہوں
ہاں مری ناکامیاں شاہد ہیں میں ناکام ہوں

قوت پرواز ہے لیکن چمن سے دور ہوں
اپنی بے بال و پری سے کس قدر مجبور ہوں

یا الٰہی دستگیر بیکساں ہے تیری ذات
حامی و غمخوار دورافتادگاں ہے تیری ذات

بس تجھی پر عالم غربت میں پڑتی ہے نظر
اے مرے مولیٰ مری امداد کر۔ امداد کر

جذبات لطیف

(از نتیجۂ افکار۔ خاتون محترم ز۔ رخ۔ ش صاحبہ آف علی گڑھ)

جہان فقر و گدائی کی شہریار ہوں میں
فلک ہے گرد نظر میں وہ خاکسار ہوں میں

نگاہِ لطف کی یارب امیدوار ہوں میں
کرم۔ کرم۔ ہمہ تن چشم انتظار ہوں میں

نہاں ہے دل میں مرے سوز شمع و پروانہ
تعلق گل و بلبل کی رازدار ہوں میں

جو میں نے بزم میں کی شرح راز قربانی
اثر سخن سے یہ بولا "ترے نثار ہوں میں"

مکین عرش پکارا کہ "خانۂ خانۂ قسمت"
کہا جو فکر نے "رفعت کی خواستگار ہوں میں"

جدا ہے شیخ ریائی سے اپنی شان گناہ
کہ منفعل ہوں۔ مقر ہوں گناہگار ہوں میں

مقرجبر ہیں طفلی و شیب مجبور ہے
مگر ہے شور شباب "اہل اختیار ہوں میں"

جو دیکھ لے دل حاسد کی آگ اے زرخ!
زبان شعلہ سے دوزخ کہے "شرار ہوں میں"

اکلوتے بیٹے کی موت

(عمر رسیدہ ماں کی آنکھوں کے سامنے)

اے میرے لال بات تو کر۔ خامشی ہے کیوں؟ کیوں لال ہو گئی ہے زباں جیسی ہے کیوں؟
تاب و تواں کہاں گئی۔ ناطاقتی ہے کیوں؟ ٹھنڈا ہے جسم کس لئے۔ رنگت اڑی ہے کیوں؟

بیہوش تو ہے آہ! میں وقفِ ملال ہوں
تجھ کو نڈھال دیکھ کے میں بھی نڈھال ہوں

کیا جانے نیند کونسا جادو چلا گئی بس جاگنا ختم ہوا۔ ایسا سلا گئی
ہاں ہاں یہ بھید تاڑ گئی۔ رمز پا گئی غفلت کی آڑ لے کے اجل پاس آ گئی

بیٹھی ہوں میں سرہانے مجھے بے قرار دیکھ
نورِ نظر خدا کے لئے ایک بار دیکھ

کیا ایڑیاں رگڑتا ہے۔ کیسا تنگ حال ہے ان ہچکیوں سے جان کا بچنا محال ہے
اٹھارھویں برس میں ابھی میرا لال ہے۔ اے موت رحم کر کہ بہت خورد سال ہے

وہ سانس اکھڑ گئی وہ ڈھلا نیل۔ اے موت
ننھی سی جان پر ہوئی نازل بلائے موت

اے وائے آج باغ تمنا اجڑ گیا سینچا تھا خونِ دل سے جو پودا اکھڑ گیا
بن بن کے آرزوؤں کا نقشہ بگڑ گیا بیدل میں رہ گئی کہ دل آرا بچھڑ گیا

آنکھوں کے آگے آنکھ کے تارے کی لاش ہے
دل لخت لخت ہے تو جگر پاش پاش ہے

میرے سیاہ خانے کا گُل ہو گیا چراغ بے بادۂ سرور ہے دل اک تہی ایاغ

سینہ ہے زخم زخم کلیجہ ہے داغ داغ مسکن ہوا جنوں کا مرا خانۂ دماغ
تخت جگر کا ساتھ ہمیشہ کو چھٹ گیا
ڈاکا پڑا اجل کا تو گھر بار لٹ گیا

تھی آرزو کہ بیٹے کو دولھا بناؤں گی پیاری سی اک دلھن سے گھر اس کا بساؤں گی
کہتی تھی موت ہیں ہی دلھن بن کے آؤں گی لے کر بلائیں اس کو گلے سے لگاؤں گی
ہلنے نہ دوں گی اس کو جگہ سے یہ مان لو
ملنے نہ دوں گی اس کو کسی سے یہ جان لو

ڈھانکو ابھی نہ چہرۂ یوسف جمال کو جی بھر کے دیکھنے دو مجھے اپنے لال کو
زانو و سر کو پیٹنے دو خستہ حال کو تلقین کرو نہ صبر کی مجھ پیرزال کو
منہ اس جہاں سے موڑ چلا ہائے ہائے ہائے
بڑھیا کو کس پہ چھوڑ چلا۔ ہائے ہائے ہائے

لو آ گئے جنازہ اٹھانے کو اقربا کرتے ہیں آہ! پیر و جواں نالہ و بکا
شق ہو رہے ہیں قلب و جگر وا مصیبتا وہ درد اٹھا۔ وہ منہ سے کلیجہ نکل پڑا
مینہ خون کا برستا ہے گلگوں زمین ہے
منظر ہے حشر خیز۔ قیامت کا سین ہے

لوگو وہ میرا موتیوں والا کدھر گیا بے داغ باغ حسن کا لالا کدھر گیا
اندھیر ہے وہ گھر کا اجالا کدھر گیا ہے ہے وہ میری گود کا پالا کدھر گیا
تنہا نہ میرے لال کو رکھ آئیں قبر میں
بچے کے ساتھ ماں کو بھی دفنائیں قبر میں

غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہائے کیا کروں چولھے میں جائے ہوش مجھے ہو گیا جنوں
اب رونے پیٹنے سے نہیں آنے کا سکوں بہتر ہے میری قبر یہیں ہو۔ یہیں مروں
اتنا جگر نہیں ہے کہ صدمے سہوں گی میں
سنگ لحد سے پھوڑ کے سر مر رہوں گی میں

ابو نعیم نشتر (جالندھری)

لمعاتِ مہر

(خورشید علی صاحب مہر بھوپالی)

بے نیازی نیاز ہے اپنا
حسن بے پردہ راز ہے اپنا

دیکھنا انتہائے جذب کہ اب
دوست وہ مست ناز ہے اپنا

تو وہ ـ تو وہ ہے حسرتِ دلِ زار
نقش عبرت طراز ہے اپنا

شامِ غربت کے لے رہا ہوں مزے
دوست بے کس نواز ہے اپنا

ان کے دل پر اثر نہیں ورنہ
نالہ آہن گداز ہے اپنا

رات کم اور سرگذشت طویل
ناشنو چارہ ساز ہے اپنا

باریابِ حضورِ انور ہول
یعنی یہ امتیاز ہے اپنا

کیا سنیں گے وہ داستانِ غم
مہر قصہ دراز ہے اپنا

(از جناب عرشی لدھیانوی)

اے فریب حسن اندازِ جنوں سکھلا مجھے
اے طلسم حسن اپنے شعبدے دکھلا مجھے

اے غرورِ حسن جاناں رات دن تڑپا مجھے
ڈھنگ اظہارِ تمنا کا کوئی بتلا مجھے

کس قدر ہے دلکشا اے حسن تیرا گلستاں
واقعی ہے ترے دم سے رونقِ کون و مکاں

صحن گلشن میں ہو تو یا وسعت صحرا میں ہو
نوک خار دشت میں ہو یا گلِ رعنا میں ہو

خانۂ درویش میں یا محفلِ کسرا میں ہو
ہو شبِ یلدا میں تو یا صبح نور افزا میں ہو

ذرہ ذرہ میں نظر آتی ہے رعنائی تری

ہے نمایاں ہر جگہ شان مسیحائی تری

حسن لیلیٰ دیدۂ مجنوں سے دیکھا چاہئے
کوہکن سے رازِ جوئے شیر پوچھا چاہئے

داستان وامق و عذرا کو سوچا چاہئے
"نل" "دمن" کی زندگی سے عشق سیکھا چاہئے

معترف تری فسوں‌سازی کے خاص و عام ہیں

دلفریبی دلکشی! اے حسن تیرے کام ہیں

کیوں فدائے روئے گل بلبل ہے اتنا تو بتا
کیوں چکور آخر ضیاء مہر کا شیدا ہوا

سرو قمری کی حکایت بھی مجھے سمجھا ذرا
کس لئے پروانہ ہے شمع فروزاں پر فدا

سب کرشمہ سازیاں ہیں تری اے اعجاز حسن

اور ہے خلوِ خدا مست مے شیرازِ حسن

سر بھلا وہ سر ہی کیا جس میں نہ ہو سودا ترا
آنکھ وہ کیا آنکھ ہے جس میں نہ ہو جلوہ ترا

دل وہ کیا دل ہے کہ جس دل میں نہ ہو نقشہ ترا
اور وہ انسان ہی کیا ہے گر نہ ہو شیدا ترا

ہیں ہزاروں قدرتیں روشن شہود حسن سے

ظاہر اسرار حقیقت ہیں نمود حسن سے

اے خیال دید روئے حسن جاناں دل میں رہ
اور کبھی جلوہ کناں امید کی محفل میں رہ

آرزو بن کر سراپا سینۂ بسمل میں رہ
اور لیلائے وفا ہو عشق کے محمل میں رہ

تو فسوں کاری سے اپنے بیخود و دیوانہ کر

اور فکر بیش و کم سے سر بسر بیگانہ کر

تخیلاتِ گہر

(از جناب ...... صاحب گہر جائسی)

مزارِ کشتۂ غم ہے بخارِ دل نکلنے دے
بھلا ہو گا ترا بجھتی ہوئی شمعوں کو جلنے دے

ہے میری ناتوانی آئینہ زورِ جوانی کا
نظر سے حسن گر جائے اگر مجھکو سنبھلنے دے

بہت محبوب ہوں ہیں ساتھ ہو لینا جنازے کے
ہجوم نامرادی! اک ذرا دم تو نکلنے دے

اساس گردش گردوں ہے میرے ضعف پر قائم
زمانہ کو پلٹ دوں ہیں جو یہ کروٹ بدلنے دے

زمانہ ہوگیا اے دل سواد زلف ہجراں میں
یہ تصویر وصالی ہے کف افسوس ملنے دے

ابھی سے دل نہ بیٹھے سامنے ہے آستاں اُن کا
مجھے اے ناتوانی اور دو اک گام چلنے دے

مری آہوں سے دل کا داغ رہ رہ کر دہکتا ہے
ہوا کیسی یہ چلتی ہے نہ بجھنے دے نہ جلنے دے

ہے اک طرز ستم یہ بھی پس و پیش اے اجل کیوں ہے
تو اپنا کام کر ان کو کف افسوس ملنے دے

ذرا سے رحم میں بیمار اچھا ہو نہ جائے گا
نہیں تھمتا جو درد دل تو اک لحظہ سنبھلنے دے

چمن میں آگ کیسی ہو نہ ہو میرا نشیمن ہے
قفس میں سن رہا تھا میں کوئی کہتا تھا جلنے دے

گھر صحرا کے ویرانے سے گلشن کی طراوت سے
میں بہلوں لاکھ لیکن دل بھی تو مجھ کو بہلنے دے

جذبات ربط

(سید امانت حسین ربط شاہجہان پور)

بڑھا جوش جنوں ایسا بہار آتے ہی گلشن میں
چلا ہوں پھونکنے صحرا کو لے کر آگ دامن میں

خدا کی شان یہ جذب ادا اس بت کی چتون میں
سمٹ کر حسن عالم آ رہا ہے روئے روشن میں

گلوں کی آتش افروزی سے دل کو جلاتی ہے
کہیں یہ آگ رفتہ رفتہ لگ جائے نہ گلشن میں

اسیری میں بھی رنگ اپنا جمایا آہ سوزاں نے
کہ چھالے پڑ گئے ہیں جا بجا زنجیر آہن میں

ہوئیں جب وسعتیں دشت جنوں کی مجھ کو ناکافی
گریباں پھاڑ کر کچھ سی دیا صحرا کے دامن میں

قفس میں نالہ کرنا آشیاں پر بجلیاں گرنا
اثر اُلٹا یہ کیسا ہے الٰہی اپنے شیون میں

جو دیکھیں دست گلچیں میں کبھی ٹوٹی ہوئی کلیاں
عنادل کے کلیجے آ گئے منہ کو نشیمن میں

طلوع صبح نے کر ہی دیا افشائے راز آخر
نہیں تو اشک شبنم چھپ رہے تھے گل کے دامن میں

رنگے کیوں بیکسوں کے خون میں ہاتھ اپنے گلچیں
یہ کلیاں ہیں کہ دلہائے عنادل تیرے دامن میں

ہوا تھا سامنا چشم خمار آلود ساقی کا
کہ مے خمیازہ بن کر آ گئی مینا کی گردن میں

ہوا اسے ربط بعد ذبح جو قسمت میں ہونا تھا
کہ دل ہے دست قاتل میں تو سر ہے دست دشمن میں

افکارِ مہدی

(از جناب سید مہدی صاحب مچھلی شہری)

وحشت بتا رہی ہے دل بے قرار کی
آمد بہت قریب ہے فصل بہار کی

اللہ رے شوق مٹ کے بنا ہوں غبار راہ
مرنے پہ بھی ہوس نہ گئی کوئے یار کی

کوئی شہید ناز ہے اس میں ضرور دفن
حسرت بتا رہی ہے چراغ مزار کی

آئی مری قضا تو یہ دل نے کہا کر آہ
کچھ قدر کی نہ زندگی مستعار کی

پیری میں وہ شباب کی سرمستیاں کہاں
اک کیفیت ضرور ہے مہدی خمار کی

غزل

حال یہ ہے تپ غم سے ترے بیماروں کا
گوشہ دل میں اک انبار ہے انگاروں کا

کوئی سنتا نہیں افسانۂ بیتابیٔ دل
ہو گیا سخت کلیجا مرے غمخواروں کا

دل پریشاں ہے جگر چاک کلیجہ ٹکڑے
ہے برا حال ترے عشق کے بیماروں کا

دیکھ کر آپ کو شرمائے ہوئے ہیں دلمیں
منہ تو دیکھے کوئی یوسف کے خریداروں کا

کس سے ہم شکوۂ بیداد کریں ان کا فروغ
ہو خدا ہی جو طرفدار ستمگاروں کا

(غلام احمد فروغ)

فہرست مضامین مخزن بابت ماہ ستمبر ۱۹۲۱ء

جلد ۲۱ | جملہ حقوق محفوظ ہیں | نمبر ۵

شذرات

"مخزن" ہمیشہ اپنے معاصرین مفتخر کے زریں اور صائب آرا کے لئے چشم براہ رہتا ہے اور اسی شوق انتظار کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھتا ہے۔ یہ امر آخر ہے کہ اس کے ہم زمانہ اور ہم زبان جرائد کی بے اعتنائیاں اسے غریب راہ جان کر دستگیری منظورت کو بھی اپنے حصول مرام اور طے مراحل کے خوش کامیوں کی کسر شان سمجھیں۔

ہم جریدۂ "دین و دنیا" کی قدر افزائی کے تہ دل سے سپاس گزار ہیں کہ اس نے "مخزن" کے دور اولین کی شان عروجی کا اعتراف کرتے ہوئے دور جدید کے خیر مقدم میں بھی حوصلہ آفرین فراخ دلی سے کام لیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ "مخزن" کی درماندۂ ارادت سست گامیاں ابھی اس اوج تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔ جو اس کے عہد عروجی کی کبھی معراج و منتہا تھی۔ لیکن اس کا سبب صرف اصلاحات جدید کے مطمح نظر کا کسی معین نظام عمل سے بے نیاز اتباع ہونا نہیں ہے۔ بلکہ نامساعدت وقت کے عناں گیر ہونے کے ساتھ کچھ ارباب بصیرت کے اختلاف وجدان کو بھی دخل ہے۔

رہا محاسن معنوی کے فقدان کا شکوہ توقع۔ یہ ممکن ہے کہ بعض ذاتی اور شخصی رائے میں یہ کسی حد تک صحیح ہو۔ لیکن مشاطہ حسن ادب کا حقیقت شناس اور لطافت آشنا ذوق و کیف۔ اس کے عدم پر اتنا سوگوار تاسف نہیں۔ کیونکہ ایک ادبی رسالہ کا محاسن لفظی سے معمور ہونا ہی محاسن معنوی کا مرادف ہے۔ لازم کا وجود ملزوم کے حصول کی دلیل راہ ہے السعی منی والاتمام من اللہ

ارادہ ہے کہ "مخزن" کے اولوالعزم مقاصد میں آیندہ سے رنگین تصاویر بھی شریک افزائش حسن ہوا کریں یہ تصویریں یا تو مظاہر قدرت کے دلفریب مناظر کا دلفریب مرقع ہوا کریں گی۔ یا صنم خانہ فطرت کے متلون حسن کا محرک پرستش مظہر۔

ہم ہندوستان کے مایۂ ناز نقاش و مصور بابو موہن لال صاحب کے الطاف خصوصی کے بیحد ممنون ہیں کہ آپ نے حتمی وعدہ کیا ہے کہ فی الحال ہمارے اس ارادے کی تکمیل کے لئے وہ "عمر خیام" کی رباعیوں کے عکس باطنی کو لباس صوری پہنا کر عالم ظہور میں لائیں گے۔ اور اس روشناسی خیال کے لئے انھوں نے "مخزن" کو بخصوصیت خلوص منتخب کر لیا ہے ؎

کاش اتر آئے کسی شکل پہ تصویر خیال	درد دل اُن کو دکھانے کی نئی صورت ہے

بعض ہمارے اہل قلم احباب مطالبۂ مضامین کے جواب میں صرف سکوت و خاموشی کو اپنی بربت کا حسن عمل سمجھے ہوئے ہیں۔ اس لئے جواب خط سے بھی سبکدوشی ضروری نہیں سمجھے۔ شاید یہ کلیہ فطرت ان کے پیش نظر نہیں ہے کہ تغافل تو افزائش شوق کا محرک اصرار ہے نہ کہ آسودگی خواہش کا سبب۔ اس لئے اس استغناء بے نیازی سے ہماری ضرورتیں اور بیباک تقدیہ ہیں۔

اس دفعہ پھر بعض کتابت و طباعت کی ناقابل علاج مشکل کی بنا پر رسالہ کی اشاعت میں غیر معمولی تعویق پیش آگئی جس سے خطرہ ہے کہ ناظرین کرام مخزن کے نظام عمل سے ضرور دل برداشتہ ہوں گے۔ مگر ہم بادب معذرت خواہ ہونے کے ساتھ یہ حتمی وعدہ کرتے ہیں کہ آیندہ معاونین مخزن کو یہ زحمت انتظار نہ ہوگی۔ امید ہے کہ یہ تاخیر چشم عفو سے دیکھی جائے گی۔

ایڈیٹر

سبدِ گل

بلبل اور گلاب آسکر وائلڈ کی یہ کہانی اس سے پیشتر بھی "نقاد" میں حضرت "عکاس" کے ترجمہ سے ملبوس ہو کر ظہور پذیر ہو چکی ہے۔ لیکن نہ معلوم کیوں غیر مکمل رہی تھی۔ نیز ترجمہ میں بھی اتنی انگریزیت رو نما تھی جس سے ادب اردو کے حلقہ میں کسی قدر اجنبی اور غیر مانوس سمجھی گئی۔ اس لئے اب "مخزن" دوبارہ اسے مکمل اور صحیح۔ ادبی دلفریبیوں سے معمور۔ اور پر لطف ترجمہ میں پیش کر کے مترجم کی اعلیٰ قابلیت اور سلامتی مذاق کا داد طلب ہے۔ ہم سید امتیاز علی صاحب تاج کے منت کش خلوص ہیں۔ آپ موجودہ حلقہ ادب کے ایک سحر طراز ادیب ہیں۔

باپ کا گناہ اعلیٰ ڈراموں کے لٹریچر میں اردو بہت مفلس واقع ہوئی ہے۔ "ڈرامہ" کا تعلق جس قدر حسن فطرت کے نقائص اور جذبات انسانی کے مصور علم ادب سے ہے۔ اس سے بہت زیادہ اسٹیج سے ہے۔ اور حقیقت میں ایک ڈراما نویس کے آرٹ کے ذوق و شوق کی تکمیل اسی وقت ہوتی ہے جب وہ اپنے ڈرامے کو اسٹیج پر دیکھتا ہے۔

ہمارے ہاں اب تک اسٹیج ایسے نااہل ہاتھوں میں ہے جن کے دلوں میں حصول زر کے سوا اور حوصلہ و امنگ ہی نہیں۔ چنانچہ بیہودہ سے بیہودہ ڈرامے رونق محفل ہیں۔ اس سے قابل اہل قلم کو اس طرف توجہ کرنے کی جرأت ہی نہیں ہوتی۔ گو آغا محمد شاہ حشر کاشمیری کے فلسفیانہ احساس نے اس فن لطیف کے حسن عمل کو نہایت ذلیل حالت سے اٹھا کر ایک خاص بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ لیکن اسٹیج کی مہلک فن قیود و پابندیوں کے خیال سے وہ بھی اپنے جی بھر کے ارمان نکال لینے سے مجبور رہے۔ اور ان کی کامیاب اور معجز نگار مشاقی اسے اس عام پسند اور بخصوصیت لغو ہر و لعو بزی سے بے نیاز نہ کر سکی۔ جو یقیناً ڈرامہ کے عالم فریب حسن کے لئے ایک بدنما داغ ہے۔

مخزن کے نامہ نگار خصوصی اور اردو کے مایہ ناز ادیب حکیم احمد شجاع صاحب بی۔ اے۔ نہ صرف مغربی ڈرامے کے غواص اور اس فن کے کما حقہ ماہر ہیں۔ بلکہ ڈرامہ نویسی کی قابلیتیں آپ کو فطرت سے ودیعت ہوئی ہیں۔ چنانچہ آپ نے حال میں ایک نہایت دلفریب ڈرامہ "باپ کا گناہ" تصنیف کیا ہے جس میں حرکت، جذبہ اور حسن، ڈرامہ کے یہ تینوں ارکان بوجہ احسن موجود ہیں۔ اس کے ساتھ عوام و خواص کے مذاق کی آمیزش بھی اس میں خوش اسلوبی سے کی گئی ہے۔ جس سے ہر دو جماعتوں میں اسکی مقبولیت یقینی ہے۔

یہ ڈرامہ علمی اور عملی دونوں صورتوں سے عنقریب ملک میں پیش ہونے والا ہے۔ عملی صورت کے لئے تو ہندوستان کی ایک بہت مشہور کمپنی اسے بہت جلد اسٹیج پہ لانے کی مصروفیت میں سرگرم ہے اور علمی حیثیت سے روشناس کرنے کے لئے دارالاشاعت پنجاب لاہور کتابی صورت میں شائع کر رہا ہے۔ فی الحال ناظرین "مخزن" کی ضیافت طبع کے لئے ہم اس میں سے ایک منظر پیش کرتے ہیں۔ گو یہ جزو اپنے کل کے بہترین مناظر سے نہیں اور ان زبردست کیرکٹروں سے خالی ہے۔ جو در اصل ڈرامہ کی جان ہے۔ تاہم اس سے حکیم صاحب ممدوح کی اعلیٰ قابلیت۔ فلسفیانہ نکتہ سنجی۔ شاعرانہ نازک خیالی اور عمیق مطالعہ فطرت بخوبی ظاہر ہے۔

حکیم صاحب کے انداز تحریر میں۔ اگرچہ کہیں کہیں انگریزی اسٹائل کے تتبع سے غیر مانوس آمیزش

پائی جاتی ہے جس سے بظاہر ادب اردو گلہ مند اجنبیت ہو۔ لیکن حقیقت میں یہ بھی آپ کی قدرت ادب کا ایک اسلوب ہے۔ جو بادۂ مغرب کی سرجوشیوں کو مشرقی جام و ساغر میں ڈھال کر پیش کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہے۔ البتہ نظم میں کسی قدر بندشوں کی سستی سے استغنار فن کی جھلک ضرور رونما ہے۔ مگر یہ اس فن کے سیلاب لطف و کیف کو دیکھتے ہوئے نظرانداز کردینے کے قابل ہے۔ کیونکہ دراصل ڈرامہ نظم سے بے نیاز ہے۔ ڈرامہ آمد جذبات کے بلا تصنع اظہار کا نام ہے۔ اور نظم آورد و صنعت کا بدیہی حسن عمل ہے

ہم حکیم صاحب کے اس ڈرامے کے اسٹیج پر آنے اور کتابی شکل میں شائع ہونے کے لئے ہمہ تن انتظار ہیں۔

تنقید لطیف

جن ایام میں عرب کی فصاحت و بلاغت کا مہر عروج آسمان ہفتمیں پر ضوفگن تھا تو ادب عالیہ کی صنف لطیف شاعری کا ماہ شباب بھی۔ اس اوج دوہفتہ پر جلوہ افروز تھا جس کی کرشمہ کاریاں ہلال سے نازک اور لطیف منظر کو بدر کامل سے نامزد کرنا دادحسن جانتی ہیں۔

عہد بدویت اور دور جاہلیت کے اعراب کے پاس اپنے مقابل اعدا و اغیار سے لوہا منوانے کے لئے جہاں تیر و تلوار۔ آلات حرب تھے۔ وہیں شعر و شاعری بھی حیلۂ شجاعت اور ذریعہ فتح و ظفر سمجھی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ مذاق اس حد تک پہنچ گیا کہ اعراب اپنے زعم نسبیت کے ساتھ اس پر بھی ناز کرنے لگے۔ بازاروں۔ میلوں اور گھروں کی روزانہ صحبتوں میں جہاں مجادلوں اور مقاتلوں کے تذکرے افتخار تہوری تھے۔ وہاں شعری و نظمی مکالموں اور مناظروں نے وجاہت قومی اور عزت قبائل کے نشان امتیازی کی جگہ لے لی۔ ملک کے بڑے بڑے قادر الکلام شعرا قصائد لکھتے اور فخریہ میدان میں لاکر جوہر قابلیت کے دادخواہ ہوتے تھے۔ خانہ کعبہ چونکہ ہر دور متمدن اور غیر متمدن کی ذی حیات اقوام کا معبد رہا ہے۔ اس لئے یہ قصائد زیادہ تر اسی کے محراب و در میں لٹکائے جاتے تھے۔ اور اس وقت تک نہیں اتارے جاتے تھے جب تک کوئی دوسرا اس کے مقابل آکر اس کے ادعائے لمن الملک کو باطل نہ کردیتا تھا۔ چنانچہ "سبعہ معلقہ" اسی چوگان ادبی کے کسات گوئے سبقت کا شیرازہ اور اسی آسمان انشا کی بزم انجم کے سبع سیارہ کا جھومر ہے۔

اسی زمانے میں جب صحرائے عرب کا ذرہ ذرہ حسن شعریت سے معمور تھا اور ملک کے بچے بچے کی معاشرت ذوق نظم کی رسیا تھی۔ تو قدرت نے طبقہ اناث کے افراد کو بھی محروم ودیعت نہیں رکھا تھا۔ مردوں کی طرح عورتیں بھی۔ اس جوہر قابلیت سے آراستہ تھیں۔ چنانچہ خنسا اسی سلسلہ زریں

کی ایک آخری کڑی ہے۔ جو اپنی قوم میں اپنے وقت کی بہترین ادیب اور قادر الکلام شاعرہ مانی گئی ہے۔ اس نے ختم رسالت کے ابتدائے نبوت کے زمانے سے مستفیض ہونے کا فخر بھی حاصل کیا ہے۔ مگر چونکہ سرچشمۂ فصاحت و بلاغت صحیفہ الٰہی قرآن پاک نے فاتوا بسورۃ من مثلہ کے خوارق اعجاز سے مدعیان ادب کے دعاوی کو باطل کر دیا تھا۔ اس لئے تمدن اسلامی کے دور کے بعد سے یہ بھی اور اپنے معاصرین و ماقبل شعرا کی طرح سے روپوش گمنامی ہو گئی۔ اس لئے۔ اس سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔

ہم حضرت لمعہ صاحب کی وسیع النظری کے نہایت شکر گزار ہیں کہ اس تنقید لطیف کے ذریعہ احباب کی ضیافت کی۔ اور ادب قدیم کا ایک لطیف واقعہ پیش کر کے بزم اردو کو محظوظ کیا۔

اندلس اور اسلام یورپ میں بعض ایسے منصف مزاج مصنف بھی ہیں جن کی حمیت افسانی۔ واقعات عالم کا صحیح خاکہ کھینچتے ہوئے حمایت اسلامی بھی پیش نظر رکھتی ہے۔ ان میں سے "ایس پی اسکاٹ" کی شخصیت قابل ذکر ہے۔ اس مصنف نے یورپ میں سلطنتہائے اسلامی" کے نام سے تین بسیط کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں مسلمانان اندلس کے بالخصوص اور مسلمانان صقلیہ کے بالعموم نقوش ابھانی دکھلانے میں قطعاً بے تعصبی سے کام لیا ہے۔ مصنف نے یہ کتابیں ہمارے مخدوم محترم مولانا خلیل الرحمن صاحب کو اس شرط پر ترجمہ کرنے کو دی ہیں کہ وہ اردو کی قلب ماہیت کے ساتھ۔ عربی۔ اور فارسی کا لباس ادبی بھی پہنا کر ان مغتنم صحیفوں کو ممالک مشرقی سے روشناس کرائیں۔ چنانچہ مولانا ممدوح اردو میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ جو زیر تجویز اشاعت ہے۔ اور فارسی کے ترجمے میں مشغول ہیں۔ اور عربی کا اس کے بعد ارادہ ہے۔ خدا مولانا کے اس ارادے کو حسب مراد تکمیل کی نعمت سے سرفراز کرے۔ یہ اسی ترجمہ کے چند صفحات ہیں۔ ہم مولانا کے اس عطیہ کے نہایت شکر گزار ہیں۔

کسی کو جذبات عالیہ سے مبرہن اور سلاست زبان سے مملو ہونے کے ساتھ یہ نظم دور حاضر کے حقیقت جذبات کی مسرور کیفیات کا بھی آئینہ ہے۔ البتہ نظم الفاظ کی موزونیت کہیں کہیں اس جدت کی مظہر ضرور ہے۔ جس سے قدیم شعرا کا تجربہ فن شاید اجنبی اور غیر مانوس ہو۔ ہم حضرت خالد بٹالوی کی اس مرحمت کے مرہون منت ہیں اور آیندہ کے لئے بھی اس انعطاف توجہ کے ملتجی ہیں۔

تخمیس مانی حضرت مانی جائسی کی شخصیت کسی معرفی کی محتاج نہیں۔ آپ ادب اردو کے ان گرامی قدر اہل قلم میں سے ہیں جن سے بزم ادب کی صف اولین ممتاز ہے۔ آپ کا مذاق شعری نہایت صحیح و سلیم ہے۔ یہ نظم حضرت غالب مرحوم کی ایک مشہور و معرکتہ الآرا غزل کی تظمین ہے جو شکوہ الفاظ شوکت تراکیب میں غالب کی تحریر سے ہم انداز ہونے کے ساتھ پختگی کلام سے بھی مالا مال ہے۔ "مخزن" کو اپنی قسمت پہ ناز ہے کہ آج اسے جناب مانی کے مصور جذبات قلم کے نقش و نگار کی نمائش کا موقع ملا۔ کاش یہ سلسلۂ عواطف ہمیشہ صورت آفرین تعلق رہے۔

جلد ۲۱ ستمبر ۱۹۲۱ء نمبر ۵

بلبل اور گلاب

نوجوان طالبعلم آہ بھر کر بولا " اس نے کہا تھا کہ لال گلاب کے پھول تو میرے لئے لے آیا تو میں تیرے ساتھ رقص کروں گی " لیکن میرے تمام باغ میں تو لال گلاب کا ایک پھول بھی موجود نہیں " +

شاہ بلوط کے درخت پر بلبل نے اپنے آشیانے میں یہ بات سنی۔ وہ پتوں میں سے نیچے جھانکنے لگی اور حیران رہ گئی +

وہ بولا " میرے تمام باغ میں لال گلاب کا ایک پھول بھی موجود نہیں"۔ اور اس کی حسین آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ " آہ خوشی بھی کتنی ذرا ذرا سی چیزوں پر منحصر ہے۔ میں نے علما کی تمام تصانیف کا مطالعہ کیا ہے اور میں فلسفہ کے اسرار پر قادر ہوں لیکن صرف ایک لال گلاب کی ضرورت میری زندگی کو مصیبت ناک بنا رہی ہے" +

بلبل بولی " آخر مجھے ایک عاشق صادق مل گیا۔ گو میں اسے جانتی نہ تھی۔ مگر راتوں میں اس کے گیت گاتی رہی ہوں میں ہر روز رات کو اس کی کہانی ستاروں کو سنایا کرتی تھی اور آج وہ

میری نظروں کے سامنے موجود ہے۔ اس کے بال سنبل کے شگوفوں کی طرح سیاہ ہیں اور اس کے ہونٹ اس کے مطلوبہ گلاب کی مانند لال لیکن محبت نے اس کے چہرے کو کسم کی طرح زرد بنا دیا ہے اور غم و الم نے اس کی پیشانی پر اپنی مہر ثبت کر رکھی ہے +

نوجوان طالبعلم آہستہ آہستہ بولا "کل رات شہزادے کے ہاں جلسۂ رقص ہو گا اور میری محبوبہ اس مجمع میں شریک ہو گی۔ لال گلاب کا پھول میں اس کے لئے لے گیا تو وہ صبح نمودار ہونے تک میرے ساتھ رقص کرے گی + اگر میں اس کے لئے لال گلاب کا صرف ایک پھول لے گیا تو میں اسے اپنی آغوش میں لے لوں گا وہ میرے شانے پر اپنا سر رکھے گی اور اس کے ہاتھ میرے ہاتھوں میں ہوں گے لیکن میرے باغ میں تو لال گلاب کا کوئی پھول بھی موجود نہیں بس میں تنہا بیٹھا رہوں گا۔ وہ میری ذرا پروا نہ کرے گی اور میرا دل ٹوٹ جائے گا"+

بلبل بولی "حقیقت میں یہ عاشق صادق ہے۔ میں جو کچھ گاتی ہوں وہ اس پر گزر لی ہے جو میرے لئے مسرت ہے۔ اس کے لئے درد و کرب ہے۔ سچ مچ محبت عجیب چیز ہے یہ زمردوں سے زیادہ قیمتی اور ودھیا پتھروں سے زیادہ مہنگی ہے۔ جواہرات اور اناروں کے معاوضے میں بھی نہیں خریدی جاسکتی۔ نہ بازاروں میں پیش کی جاتی ہے۔ سوداگر اسے خرید نہیں سکتے اور نہ یہ سونے کے ساتھ تولی جاسکتی ہے"+

نوجوان طالبعلم بولا "سازندے اپنی اپنی جگہ بیٹھ کر اپنے باجوں کے تار تھرتھرائیں گے۔ اور میری معشوقہ رباب و بربط کی آواز پر رقص کرے گی وہ ایسا لطیف رقص ہو گا کہ اس کے قدم فرش کو چھونے بھی نہ پائیں گے اور خوش پوشاک درباری اس کے چاروں طرف جمع ہو جائیں گے لیکن وہ میرے ساتھ رقص نہ کرے گی۔ کیونکہ میرے پاس تو اس کو دینے کے لئے گلاب کا کوئی پھول بھی نہیں" وہ گھاس پر گر پڑا۔ اور اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگا +

ایک سبز چھپکلی اپنی دم ہلاتی ہوئی اس کے پاس سے گزری اور کہنے لگی "یہ رو کیوں رہا ہے؟"

ایک تیتری شعاع آفتاب پر تھرتھرا رہی تھی۔ وہ بولی "ہاں ہاں کیا بات ہے؟"

سورج مکھی کے پھول نے آہستہ سے ہلکی آواز میں اپنے ہمسائے کو کہا "ہاں ہاں کیا بات ہے؟"

بلبل بولی "یہ ایک لال گلاب کے لئے رو رہا ہے"!

وہ سب کے سب کہنے لگے "لال گلاب کے لئے! کیا ہنسی کی بات ہے" اور ننھی چھپکلی جو کسی قدر ٹھوس مذاق تھی قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی *

لیکن بلبل طالبعلم کا رازِ الم سمجھ گئی۔ وہ شاہ بلوط کے درخت پر خاموش بیٹھی تھی اور محبت کے اسرار پر غور کر رہی تھی *

یک بخت اس نے اپنے بھورے بازو پھیلائے اور اڑنے لگی۔ وہ سائے کی طرح کنج میں سے گذری اور سائے ہی کی طرح تمام باغ میں پھر گئی *

گھاس کے ایک قطعے کے درمیان گلاب کا ایک خوبصورت درخت کھڑا تھا اسے دیکھ کر وہ اسکی طرف اڑی اور ایک شاخ پر آ اتری *

وہ بولی "مجھے لال گلاب کا ایک پھول دے اور میں اپنا سب سے میٹھا گیت تجھے سناؤں گی"

لیکن درخت نے اپنا سر ہلا دیا *

وہ بولا "میرے گلاب سفید رنگ کے ہیں۔ ایسے سفید جیسے کف دریا اور پہاڑوں پر جمی ہوئی برف سے بھی زیادہ سفید لیکن میرا بھائی جو پرانی دھوپ گھڑی کے گرد کھڑا ہے تم اس کے پاس جاؤ جو کچھ تمھیں چاہیے۔ شاید وہ تم کو دے سکے *

چنانچہ بلبل گلاب کے اس درخت پر جا بیٹھی جو پرانی دھوپ گھڑی کے گرد کھڑا تھا *

وہ کہنے لگی "مجھے لال گلاب کا ایک پھول دے اور میں اپنا سب سے میٹھا گیت تجھے سناؤں گی"!

وہ بولا "میرے گلاب زرد ہیں۔ اس سمندری پری کے بالوں کی طرح جو زرد کہربائی تخت پر جلوہ افروز ہے اور نرگس کے ان پھولوں سے بھی زیادہ زرد جو سبزہ زار میں فصل کٹنے سے پہلے لہلہاتے ہیں لیکن تم میرے بھائی کے پاس جاؤ۔ جو طالبعلم کے دریچے کے نیچے کھڑا ہے۔ شاید وہ تمہاری ضرورت کو پورا کر سکے"*

چنانچہ بلبل اڑ کر گلاب کے اس درخت پر آئی جو طالبعلم کے دریچے کے نیچے لگ رہا تھا *

وہ بولی "مجھے لال گلاب کا ایک پھول دے اور میں اپنا سب سے میٹھا گیت تجھے سناؤں گی"!

لیکن درخت نے اپنا سر ہلا دیا *

اس نے جواب دیا "میرے پھول لال سرخ ہیں ایسے سرخ جیسے فاختہ کے پنجے اور اس شاخ مرجان

سے بھی زیادہ سرخ جو سمندر کے غاروں میں لہراتی رہتی ہے لیکن سردی نے میری رگوں کو منجمد اور پالے نے میرے شگوفوں کو برباد کر دیا ہے۔ آندھیوں نے میری ٹہنیاں توڑ ڈالی ہیں۔ چنانچہ اس سال مجھ پر ایک گلاب بھی نہ کھلے گا۔"

بلبل بولی: "مجھے صرف ایک سرخ گلاب چاہیے۔ صرف ایک۔ ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے جس سے مجھے ایک پھول مل جائے۔؟"

درخت نے جواب دیا "ہاں ایک ترکیب تو ہے۔ مگر وہ ایسی خوفناک ہے کہ تمھیں بتانے کی مجھے جرأت نہیں پڑتی۔"

بلبل نے کہا "تم مجھے بتاؤ میں ڈرتی نہیں ہوں۔"

درخت بولا "اگر تمھیں سرخ گلاب کی خواہش ہے تو تمھیں چاہیے کہ شب مہتاب میں اپنی موسیقی سے اس کو بناؤ اور خون دل سے اس کو رنگو۔ تم کسی کانٹے کو اپنے سینے میں پیوست کر کے مجھے ایک گیت سناؤ۔ تمام رات تم مجھے گیت سناتی رہو۔ کانٹا تمھارا دل چھید جائے اور تمھارا گرم خون میری رگوں میں بھر کر میرا خون بن جائے۔"

بلبل نے کہا "ایک زندگی تو سرخ گلاب کی قیمت میں بہت زیادہ ہے اور جان ہر ایک کو بہت پیاری ہے۔ سرسبز جنگلوں میں بیٹھ کر سورج کو اپنی طلائی رتھ اور چاند کو اپنی جواہر نگار رتھ میں آتے دیکھنا بہت خوشگوار ہے۔ پھولوں کی خوشبوئیں پُرلطف ہیں اور ان کی رنگینیوں کو وادیوں میں نیم پوشیدہ اور پہاڑوں پر لہلہاتے دیکھنا دلفریب منظر ہے۔ لیکن زندگی کی نسبت محبت بہتر ہے اور پھر ایک انسان کے دل کے مقابلے میں ایک چڑیا کے دل کی کیا حقیقت ہے۔"

چنانچہ اس نے اپنے بھورے بازو اڑنے کے لئے پھیلائے اور فضا میں صعود کر گئی۔ سائے کی طرح وہ باغ پر سے گذری اور سائے ہی کی طرح درختوں کے جھنڈ کو عبور کر گئی۔

نوجوان طالب علم اب تک گھاس پر اسی جگہ پڑا تھا۔ جہاں وہ اسے چھوڑ گئی تھی اور ابھی تک اس کی حسین آنکھوں میں آنسو خشک نہ ہوئے تھے۔

بلبل نے پکار کر کہا "خوش ہو جا۔ خوش۔ جو سرخ گلاب تجھے چاہیئے وہ تجھ کو مل جائے گا۔ میں چاندنی رات میں موسیقی سے اس کو بناؤں گی اور اپنے دل کے خون سے رنگوں گی۔ اس کے بدلے میں

مجھے صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تو بھی محبت کرنا۔ کیونکہ گو فلسفہ بھی دانشمندی سکھاتا ہے لیکن محبت اس سے بھی ارفع ہے اور گو قوت بھی بڑی چیز ہے لیکن محبت اس سے بھی قوی تر ہے۔ اس کے پر شعلہ رنگ ہیں اور اس کا جسم شعلوں کی طرح رنگین ہے۔ اس کے ہونٹ شہد کی طرح میٹھے ہیں اور اس کا سانس بخور کی طرح خوشگوار ہے"۔

طالبعلم نے گھاس پر سے سر اٹھایا اور بلبل کی باتیں سنتا رہا لیکن وہ سمجھ نہ سکا کہ بلبل اس سے کیا کہہ رہی ہے۔ کیونکہ وہ تو صرف ان باتوں سے واقف تھا جو کتابوں میں لکھی ہوتی ہیں۔ لیکن شاہ بلوط کا درخت سمجھ گیا اور اسے ملال ہوا۔ وہ اس ننھی بلبل کو جس نے اس کی ٹہنیوں میں اپنا آشیانہ بنا رکھا تھا بہت چاہتا تھا۔

درخت نے آہستہ سے کہا "تو چلی جائے گی تو میں اپنے کو بہت اکیلا اکیلا محسوس کروں گا تو مجھے ایک آخری گیت سنا دے"۔

چنانچہ بلبل نے شاہ بلوط کو گانا سنایا اور اس کی آواز ایسی تھی جیسے کسی ظرف سیمیں میں قلقل مینا کی طرب ریز آواز۔

جب وہ اپنا گیت ختم کر چکی تو طالبعلم اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس نے جیب سے ایک پنسل اور ایک کاپی نکال لی۔

درختوں کے جھنڈ میں سے گزرتا گزرتا وہ اپنے آپ سے کہنے لگا "اس میں تو کچھ شبہ نہیں کہ بلبل ایک خاص وضع رکھتی ہے مگر کیا یہ صاحب احساس بھی ہے؟ مجھے اندیشہ ہے کہ نہیں۔ درحقیقت یہ صناعوں کی مانند ہے صرف تصنع ہی تصنع اور خلوص نام کو بھی نہیں۔ دوسروں کی خاطر یہ کوئی قربانی تھوڑا ہی کر سکتی ہے۔ یہ صرف موسیقی کو سوچتی ہے اور سب کو معلوم ہے کہ فنون خودغرض ہوتے ہیں پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ اس کی آواز میں بعض نہایت پیارے سُر بھی ہیں لیکن کیسی افسوس کی بات ہے کہ وہ بے معنی ہیں اور ان میں کوئی عملی وصف نہیں ہے"۔ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا اپنے بستر پر لیٹ رہا اور اپنی محبت کے متعلق سوچنے لگا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد اسے نیند آ گئی۔

اور جب چاند وسیع آسمان پر درخشاں ہوا تو بلبل اڑ کر گلاب کے درخت پر پہنچ گئی۔ اور ایک کانٹا اپنے سینے میں پیوست کر لیا۔ تمام رات وہ اپنے خار پیوستہ سینے سے گاتی رہی اور سرد و بلوریں

چاند جھک جھک کر اس کا گانا سنتا رہا - تمام رات وہ گاتی رہی اور کانٹا اس کے سینے میں گہرا اترتا گیا اور اس کا خون حیات اس کے جسم سے بہ بہ کر نکلتا رہا +

پہلے اس نے ایک لڑکے اور لڑکی کے دل میں محبت پیدا ہونے کا گیت گایا اور درخت کی بالائی شاخ میں ایک عجیب وغریب پھول کی کلی نمودار ہوئی اور نغمہ کے تسلسل کے ساتھ پنکھڑی پر پنکھڑی نکلتی رہی پہلے وہ پھول ایسا زرد تھا جیسے کسی دریا پر چھائی ہوئی کہر یا جیسے صبح کے اولین قدم اور سحر کے سیمین پروں کی طرح سفید، وہ درخت کی بالائی شاخ پر کھلا ہوا پھول ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نقرئی آئینہ میں گلاب کا عکس پڑتا ہے - یا جیسے کسی شفاف چشمے میں گلاب کا سایہ دکھائی دیتا ہے +

لیکن درخت بلبل سے کہنے لگا کہ اپنا سینہ اور زور سے کانٹے پر دبا نہیں تو پھول تیار ہونے سے پہلے دن نکل آئے گا +

چنانچہ بلبل اپنا سینہ کانٹے پر اور زور سے دباتی رہی اور اس کا گیت بلند تر ہوتا گیا - کیونکہ وہ ایک مرد اور عورت کی روح میں جذبۂ محبت پیدا ہونے کا گیت گا رہی تھی +

اور پھول کی پتیوں میں ایک نازک سی شہابی جھلک نمودار ہوئی - ایسی جھلک جو نوشہ کے چہرے پر اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب وہ اپنی دلہن کے ہونٹوں کو پہلی بار چومتا ہے لیکن کانٹا ابھی اس کے دل تک نہ پہنچا تھا اور گلاب کا قلب بھی سفید رہا - کیونکہ کسی بلبل کا خون دل ہی پھول کے قلب کو قرمزی بنا سکتا ہے +

اور درخت بلبل سے کہہ رہا تھا کہ ننھی بلبل کانٹے پر اپنا سینہ اور زور سے دبا نہیں تو پھول تیار ہونے سے پہلے دن نکل آئے گا +

چنانچہ بلبل نے اور زور سے اپنا سینہ کانٹے پر دبا دیا - کانٹا اس کے دل تک پہنچ گیا اور انتہائی کرب کی ایک رو اس کے جسم میں سے گزر گئی - درد کی شدت کا کچھ ٹھکانا نہ تھا اور اس کی ساتھ ساتھ اس کے گیت کا جوش ایک وحشیانہ اشتیاق سے بڑھ رہا تھا - کیونکہ اب وہ اس محبت کا گیت گا رہی تھی جس کی تکمیل موت سے ہوتی ہے اور جس کی فنا قبر میں بھی نہیں ہے +

اور عجیب وغریب پھول کا رنگ مشرق کے شہاب پاش آسمان کی طرح سرخ ہو گیا پنکھڑیوں کے دور کا رنگ بھی قرمزی ہو گیا اور پھول کا قلب بھی یاقوت کی طرح قرمزی بن گیا -

لیکن بلبل کی آواز مدھم پڑ گئی - اس کے ننھے بازو نقاہت سے پھڑپھڑانے شروع ہو گئے اور اس کی آنکھوں کے آگے ایک دھندسا چھا گیا - اس کا گیت گرتا چلا گیا اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا - جیسا اس کے گلے میں پھندا پڑ گیا ہو +

تب اس کے گیت کا آخری جوش پھٹ پڑا - زرد رو چاند نے اسے سنا اور وہ صبح کی آمد کو بھول کر آسمان پر ہی ٹھہرا رہا - سرخ پھول نے اسے سنا اور وجد کے عالم میں اس کا بدن تھرتھرانے لگا اور صبح کی ٹھنڈی ہوا کے لئے اس نے اپنی پنکھڑیاں کھول دیں + گونج اس گیت کو پہاڑوں کے ارغوانی غاروں میں لے گئی اور محو خواب کسانوں کو بیدار کر دیا - گیت دریا کی موجوں میں مل گیا - اور وہ اس کا پیغام سمندر سے کہنے کو چل پڑیں +

درخت نے کہا "دیکھ دیکھ پھول تیار ہو گیا" +

لیکن بلبل نے کوئی جواب نہ دیا - وہ بھی گھاس کے درمیان مردہ پڑی تھی اور کانٹا اس کے سینے میں چبھا ہوا تھا +

دن چڑھے طالبعلم نے اپنا دریچہ کھولا اور باہر نظر ڈالی +

وہ چلا اٹھا " اخاہ! خوبیٔ تقدیر تو دیکھئے - یہاں کیسا سرخ گلاب موجود ہے - میں نے تو تمام عمر ایسا گلاب نہیں دیکھا - یہ تو ایسا خوبصورت ہے کہ اس کا نام بھی ضرور عجیب وغریب ہوگا"! اور اس نے جھک کر پھول توڑ لیا +

پھر اس نے ٹوپی پہنی اور پھول ہاتھ میں لے کر اپنی معشوقہ کے گھر کی طرف دوڑا دوڑا روانہ ہوا اس کی معشوقہ دروازے میں بیٹھی ریل پر نیلا ریشم لپیٹ رہی تھی اور اس کا چھوٹا کتا اس کے قدموں میں لیٹا ہوا تھا +

طالبعلم بولا " تم نے کہا تھا کہ اگر میں سرخ گلاب کا پھول لے آیا تو تم میرے ساتھ رقص کرو گی یہ لو - یہ دنیا کا سب سے زیادہ سرخ پھول ہے - آج رات تم اپنے دل کے اوپر اسے آویزاں کرنا اور پھر جب ہم رقص کریں گے تو اس کے دوران میں میں تمھیں بتاؤں گا کہ مجھے تم سے کتنی محبت ہے +

لیکن لڑکی کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں +

وہ بولی " مجھے اندیشہ ہے کہ یہ پھول میرے لباس پر زیب نہ دے گا - دوسرے وزیر کے بھتیجے نے

میرے لئے چند اصل جواہرات تحفتہً بھیجے ہیں اور سب کو معلوم ہے کہ جواہرات پھولوں کی نسبت بہت گراں ملتے ہیں" ۔

طالبعلم نے غصہ سے کہا" سچ سچ تم بہت ہی ناشکری ہو"۔

اور اس نے گلاب باہر سڑک پر پھینک دیا۔ ایک گاڑی اس پر سے گذری اور اس کے پہیے کے نیچے سرخ گلاب کچلا گیا ۔

لڑکی بولی" ناشکری! تم بہت ہی بدتہذیب ہو۔ آخر ہو کون صرف ایک طالبعلم مجھے تو یقین نہیں کہ وزیرزادے کی طرح تمہارے بوٹوں میں چاندی کا ایک بٹن بھی موجود ہو" اور وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر مکان میں چلی گئی ۔

طالبعلم رخصت ہو گیا اور کہنے لگا" محبت بھی کیا واہیات چیز ہے۔ فائدے میں منطق کی پاسنگ بھی نہیں۔ کیونکہ اس سے تو کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔ یہ ہمیشہ ایسے امور کا ذکر کرتی ہے جو کبھی وقوع میں نہیں آتے اور ایسی امیدیں بندھاتی ہے جو کبھی سچ نہیں نکلتیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس میں عمل پہلے ہی مفقود ہے اور چونکہ اس زمانے میں عمل کا دور دورہ ہے۔ اس لئے میں پھر فلسفہ اور مابعدالطبیعات کی دنیا کو جاتا ہوں ۔

چنانچہ وہ اپنے کمرے میں واپس آیا اور ایک ضخیم و گرد آلود کتاب الماری سے نکال کر اس کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا ۔

سید امتیاز علی تاج (از آسکر وائلڈ)

ایک صاحب نے مجھے ایک بیمار کی طرف سے متردد دیکھ کے پوچھا ——— آپ تو کسی کے مرنے کی بھی پروا نہیں کرتے۔ پھر آپ بیماری پر اس قدر فکرمند کیوں ہوتے ہیں ——— میں نے کہا مرنے کا علاج انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ اور بیماری کا علاج موجود اور ممکن ہے "لکل داءٍ دواءٌ" پھر جو بات لاعلاج ہو۔ اس کا فکر فضول ہے۔ اور جو قابل علاج ہو۔ اس کا فکر و تردد لازمی ہے ۔

پھر پوچھا۔ انسان کو دنیا میں سب سے پیاری چیز کونسی ہے ؟ میں نے کہا جو مشکل اور دشواری سے حاصل ہو ۔

(خواجہ حسن نظامی)

اگر خدا نہ ہوتا

اگر خدا نہ ہوتا۔ اور کارخانۂ عالم کا حسنِ عمل ایک مادی قوت کا ممنونِ احسان ہو سکتا۔
اشرف المخلوقات اپنی حرکات و سکنات اور افعال و اعمال میں کسی صورت ناکارہ و بیچارہ ثابت نہ ہوتے
اور انسان کا ضمیر اس زبردست ہستی کے احساس سے مستغنی ہوتا جس کے وہ مملوک و مقبوض ہیں تو نظامِ عالم
کسی طرح قائم نہ رہ سکتا اور دنیا کی حالت نہ جانے کیا ہوتی۔
انسان کا سینہ امید کی زندگی افروز اور جذبات افزا دھڑکن سے محروم رہتا محبت کے تیروں
میں نہ خلش ہوتی نہ درد۔ عزائم کسی دل کی حرکت کو تیز نہ کرتے اور کوئی تہذیب یا تمدن افقِ حیات کو
رنگین نہ بنا سکتی۔
اور کیا کائنات شگفتہ ہونے سے پیشتر ہی مرجھا کر نہ رہ جاتی۔
خدا کا وجود گو فلسفی کی دلیلوں کا شرمندۂ اثبات نہ ہو لیکن انسانی طبائع کی کمزوریاں فطرتاً
ایک ایسی ہستی کی محتاج ہیں جسے وہ اپنا معبود سمجھ کر مصیبت کے وقت پکار سکیں۔ دُکھ درد کے موقعوں پر
یاد کر سکیں اور جس سے مایوسیوں کے عالم میں طالبِ امداد ہوں جس طرح ساز کے تار میں نغموں کا
طوفان پوشیدہ ہے۔ اسی طرح انسان کے دل میں اس ہستی کا تیقن ودیعت ہے اور حالات و واقعات
اس عظیم الشان راز کی بیداری کے ذمہ دار ہیں۔
اپنی روزانہ زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہمیں معلوم ہو سکتا ہے کہ ہماری بیچارگیاں کس
طرح خدا کی ہستی کی محتاج ہیں۔ صرف خدا کے نام میں ہمارے لئے کیا کچھ معانی اور قوتیں پوشیدہ ہیں اور
اگر خدا نہ ہو۔ یا آج سب کے دل سے خدا کی ہستی کا یقین محو ہو جائے تو حیاتِ انسانی کتنی مصیبتناک
بن جائے۔

ایک خونخوار ڈاکو کسی معصوم کے سینے پر سوار اپنے خونی ہاتھوں میں برہنہ خنجر کی بجلیاں چمکا رہا ہے

اس کی آنکھوں کی سرخی آگ کی روشن مشعل ہے اور ہوا و حرص نے اس کے چہرے کے نقش و نگار کو مسخ کر دیا ہے۔ اس کی نگاہ میں انسان کی جان کی قیمت چند روپیہ یا ایک نہری پارچہ ہے بے گناہ شکار کی منتیں اور خوشامدیں اس کے لئے تضحیک کا سامان مہیا کرتی ہیں اور اس کا ہوشیار جذبۂ ہوس اور قدرت اختیار دردانگیز فریادوں میں ایک وحشیانہ دلچسپی لیتی ہے جب اس کا ناآشنائے درد دل تمام لجاجتوں اور طعنوں کا جواب اپنے بے رحم تبسم سے دے چکتا ہے تو وہ اپنا مضبوط ہاتھ فضا میں بلند کرتا ہے کہ اپنے خنجر کی بینا بیوں کو اس کے خون سے سیراب کرے۔ مگر دفعتاً مظلوم کے تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں سے ایک "خدا کا واسطہ" نکل کر اس کے قوی جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ اس کا خونی ہاتھ پہلی بار خنجر کے بار کا بھی تحمل نہیں ہو سکتا۔ اور اس کو اپنے دل میں ایک عظیم بیداری کا احساس ہوتا ہے۔

خدا کے نام میں کس قدر طاقت ہے۔

میاں بیوی کئی سالوں کے بعد شب و روز کی دعاؤں اور جبین فرسائیوں کا اثر ایک امید عظیم میں دیکھتے ہیں۔ وہ نو مہینے کا پر اسرار زمانہ جس کا ایک ایک لمحہ آرزوؤں اور تمناؤں کی ایک ایک عمر ہوتا ہے عجیب بیتابی سے کاٹتے ہیں اور جب قدرت کی رحم دل آنکھ سے ایک آنسو ان کی گود میں ٹپکتا ہے تو ان دونوں کی خوشیاں دیوانگی کی حد کو جا پہنچتی ہیں۔

لیکن ایک سال بعد جب ان کے نونہال کو قضا کا ظالم پیر کچل ڈالتا ہے تو جو لفظ ماں باپ کے جگر لخت لخت کر چھٹے۔ اور چشم خونبابہ فشاں کو خشک کر سکتا ہے "یہی خدا ہے"

بستر علالت پر ایڑیاں رگڑتے ہوئے بیمار کو جس کا مرض حکیموں اور ڈاکٹروں کی دوائیوں سے دونا ہوتا ہے۔ اگر کوئی شے اطمینان بخش سکتی ہے تو وہ یہی لفظ "خدا" ہے۔ جو خود بخود اس کے خشک ہونٹوں سے نکل نکل کر اس کی بے چینیوں اور بے قراریوں کے لئے باعث تسکین ہوتا ہے

اگر اس کے تپتے ہوئے دماغ کو یہ آرام جان نام بھول جائے تو اس کے درد و کرب کی شدت کا کیا ٹھکانہ ہو۔ الامان۔

ایک مفلس شخص جس پر سوسائٹی اپنے دروازے بند کر دیتی ہے جس کی عسرت پیٹ کے لیے ٹکڑا اور تن کے لیے چیتھڑا مہیا نہیں کر سکتی جس کا فرش پتھریلی زمین اور چھت تاریک آسمان ہوتا ہے وہ کیسے زندہ رہتا ہے؟ خدا کے نام میں کیا کچھ راز ہیں کہ اس کی فاقہ مست زندگی یہی نام ورد زبان کر کر کے تمام مصائب برداشت کرنے کا صبر و تحمل حاصل کر لیتی ہے۔

ایک ناکام طالبعلم یا تاجر جس کی محنتیں کبھی کامیابی کا منہ نہیں دیکھتیں اور جس کی تمام کوششیں اور شب بیداریاں اتفاق کے پر اسرار کرشموں کا شکار ہو جاتی ہیں از سر نو کر ہمت باندھتا ہے اس کی ہمت اور حوصلے ایک "نام" لے کر پھر بیدار ہو جاتے ہیں اور یہ وہی نام ہے جو مردہ تنوں کیلئے پیغام حیات ہے

میدان جنگ میں افواج باہم دست بگریباں ہیں معرکہ کارزار گرم ہے تلواروں بندوقوں بینیٹوں اور گولوں سے خوفناک لڑائی ہو رہی ہے۔ بنی نوع انسان کی خون کی پیاس کسی طرح نہیں بجھتی اور زمین نعشوں سے پٹی ہوئی جاتی ہے۔ ایک فوج غنیم کی طاقت سے مغلوب نظر آتی ہے دشمن کی کثرت ان کے پاؤں میدان سے اکھاڑنے کو ہوئی ہے کہ ایک بہادر کے ہونٹوں سے "اللہ اکبر" کا بلند نعرہ نکل کر عرصۂ جنگ کو لرزا دیتا ہے۔ خوابیدہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں۔ خون کی حرارت اس بلندی پر پہنچ جاتی ہے جہاں دماغ سوائے حال کے اور کچھ محسوس نہیں کر سکتا۔ سست ہاتھ از سر نو بجلی کی رفتار سے چلنے لگتے ہیں۔ ہر سپاہی اس طرح جیسے وہ گھنٹوں آرام لے چکا اپنے دشمن پر پل پڑتا ہے اور اس کے قدم میدان جنگ سے اکھاڑ دیتا ہے۔

خدا کا نام کامیابی کا پیغام ہے

مسجدوں میں جبین نیاز رگڑنے والے نمازی۔ مندروں میں مورتیوں کے سامنے گڑگڑانے والے پجاری جنگلوں۔ بیابانوں کی تنہائی میں عبادت کرنے والے صوفی کے قلب میں اس نام کی کیفیات پنہاں ہیں اور خدا ان کی زندگی کا ایک ایسا جزو ہے کہ اس نام کی فراموشی ان کے لئے موت کے برابر ہے۔

غذا حیات انسانی کا جزل لاینفک ہے اور ہماری زندگی میں اس کثرت اور خوبی سے رچا ہوا ہے۔ کہ اس کے بغیر ہمارے جسم حقیقت میں اس چیز کے محتاج ہوتے ہیں جسے روح کہتے ہیں جس طرح دل کی مسلسل حرکت حیات انسانی کے قیام کا باعث ہوتی ہے اور ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ ہمارے سینے میں دل کیا کر رہا ہے۔ اسی طرح خدا کی ہستی اپنی تمام برکتوں کے ساتھ ہماری روح پر حاوی ہے اور ہم اس کو فائدہ اٹھاتے وقت اس کی موجودگی سے لاعلم ہوتے ہیں۔

منازل حیات طے کرنے میں انسان کے کمزور قدموں کو جس "قوت" کی ضرورت قدم قدم پر پڑتی ہے اور جس کی حاجت ہر قدم کے ساتھ بڑھتی جاتی ہے انسان اس سے بے نیاز ہو کر زندہ نہ رہ سکتا ❖

حکیم محمد یوسف حسن

سلک گہر

میں نمود صورت کے عمق بحر میں صرف اس امید پر غوطہ زن ہوتا ہوں کہ وہ غیر مشکل موتی مجھے مل جائے

میں نے جو کچھ سیکھا اپنے انھیں نغموں سے جنھوں نے افق دل پر جگمگاتے تارے پیش نظر کردئے حسن کے اصلی خزینہ کی مخفی راہیں مجھے دکھائیں اور اس نور مطلق کا درس دیا۔

میں نے جو کچھ پایا انھیں نغموں سے جنھوں نے زندگی بھر میرا . . . تیرے پا لینے کی کوشش میں ساتھ دیا جن کی مدد سے میری تلاش میرے احساس نے چار دانگ عالم کی ہر سمت میں تجھی کو جلوہ افروز پایا۔

وہ دن گذر گئے جب میرا یہ کھیل تھا کہ چار پہر لہروں پر پھنکا پھنکا پھروں۔ اب تو اس فرسودہ موسم کشتی کے اس ساحل سے اس ساحل تک پہنچا دینے ہی پر بس سارے سفر زندگی کا انحصار ہے۔

تیری موسیقی کی روشنی تمام عالم کو منور کر رہی ہے اور تیری موسیقی کا نفس حیات ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک دوڑا دوڑا پھرتا ہے۔

میرا قلب آرزومند ہے کہ تیرے نغموں کا ہم نوا ہو جائے مگر ایک آواز کے لئے بیکار تڑپ رہا ہے میں بولتا ہوں لیکن بول نغمہ نہیں بنتے۔ ناچار عاجز ہو کر چیخ اٹھتا ہوں ؎

لبی کز گفتگو خوں شد نوائے ساز من　　بہر جا خامشی یعنی زبان راز من
شکست رنگ جرأت بکشاید بال الہام　　تپیدنہائے بسمل شوخی آواز من (بیدل)

(ٹیگور)　　　　(نیاز فتحپوری)

عورت کی محبّت

"باپ کا گناہ" میں سے ایک دلفریب منظر

تشریح

مسعود، ایک امیرزادہ، اپنی سوتیلی ماں کے غاصبانہ مظالم سے تنگ آکر اپنے بزرگوں کی وراثت اور باپ کے دامان شفقت سے دور ایک پُرعسرت زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے اس عالم غربت میں وہ اپنا دل ایک غریب لڑکی **عشرت** کو دے دیتا ہے عشرت کی غریب ماں اس محبت کی صداقت سے متاثر ہو کر عشرت کی شادی مسعود سے کر دیتی ہے۔

کچھ عرصے کے بعد مسعود کے والد نواب ثریا جاہ کا انتقال ہو جاتا ہے اور مسعود کی سوتیلی ماں ممتاز جہاں ایک جعلی وصیت نامہ تیار کر کے مسعود کو اس امر پر مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے باپ کی دولت اور اپنی بیوی کی محبت دونوں میں سے ایک چیز کو منتخب کرلے۔

ممتاز جہاں کی اس کوشش کی تہ میں ایک راز ہے جو ڈرامے کے مکمل مطالعہ کے بغیر ایک طویل تشریح کا محتاج ہے

مسعود کا فلسفی دماغ باپ کی وصیت کو پورا کرنے کے فرض اور اپنی گرانقدر وراثت کی ذمہ داری کے احساس کو ایک عورت کی محبت سے پامال کرنا پسند نہیں کرتا۔

اس منظر میں وہ اس مہیب فیصلہ کو عملی صورت دینے کے لئے عشرت کو اس کے جائز حق سے محروم کرنے پر آمادہ ہے۔ عشرت کی محبت اپنی زندگی کے لئے آخری جد و جہد کر رہی ہے

نوٹ:۔ اسٹیج ایڈیشن میں یہ منظر اس سے کسی قدر مختلف اور مختصر ہے۔

باپ کا گناہ

دوسرا باب **پہلا منظر**

بتاؤ کونسی آفت تمھیں حیران رکھتی ہے
تمھارے دیدہ و دل میں بپا طوفان رکھتی ہے
مصیبت کیا ہے جو یوں مضطرب ہراں رکھتی ہے
وہ کیا مشکل ہے جو شرمندۂ ہیجان رکھتی ہے
کہو مجھ سے کہو بیتابیٔ دل کا سبب کیا ہے
تمھارا دکھ اٹھانے کے لئے میرا کلیجا ہے

مسعود

(بہت مجبور ہو کر)

اف۔ فرض کا دعوی ہے ادھر اور اُدھر اور
الفت کا تقاضا ہے ادھر اور اُدھر اور
آزار تمنا ہے ادھر اور ادھر اور
تجویز مداوا ہے ادھر اور اُدھر اور
اب خیر نظر آتی نہیں کشتیٔ دل کی
مشکل میں ہے سرگشتہ طوفان تباہی

عشرت

(اور زیادہ لجاجت سے)

مسعود تمھیں اپنی پرانی قسموں کی قسم تمھیں اس غیر فانی عہد کی قسم جس نے میری اور تمھاری زندگی کی دو ندیوں کو ایک ہی دھارے میں بہا دیا ہے کہو۔ مجھ سے اپنی پریشانی کا باعث کہو۔

مسعود

مجھے مجبور نہ کرو۔ مجھے کچھ نہ کہنے دو۔

عشرت

میں نہ مانوں گی۔ مسعود تمھیں کہنا ہو گا

مسعود

تو سنو گی ؟

عشرت

ہاں :۔

مسعود

سن سکو گی ؟

عشرت

ہاں :۔

مسعود

تو لو سنو۔ میں تمھاری زندگی کی سب سے بڑی حسرت کو پامال کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ تمھیں تمھارا جائز حق دینے سے معذور ہو گیا ہوں۔

عشرت

کیا ؟ کیا ؟

مسعود

یہی کہ اب تم میری محبت کو دل سے مٹا دو۔

عشرت

نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا ؎
نشانِ شمس و قمر آسماں سے مٹ جائے
بساط گلشن ہستی جہاں سے مٹ جائے
یہ جسم خاک ہو۔ کون و مکاں سے مٹ جائے
امید وصل دلِ ناتواں سے مٹ جائے

مگر محبت جانسوز مٹ نہیں سکتی
یہ شمع داغ دل از دست نہیں سکتی

مسعود

محبت فنا نہیں ہوسکتی۔ محبت فنا نہیں ہوئی
مگر محبت کرنے والوں کی زندگی برباد کیجا سکتی
ہے۔ وہ برباد کردی گئی ہے۔

عشرت

اس کو کس نے برباد کیا۔ بتاؤ۔ وہ خود
برباد ہوگا۔ اس کی اپنی بربادی ہم کو برباد
کرنے کی حسرت پر خون بہائے گی۔

مسعود

وہ تمھارے قبضۂ اختیار سے باہر ہے
وقت۔ حالات۔ واقعات . . . .

عشرت

(بات کاٹ کر)

. . . . وقت . . . حالات . . . واقعات
مسعود۔ صاف صاف کہو کہ اب مسعود نے
اپنا نام تبدیل کردیا ہے۔ اب مسعود اپنے آپکو
وقت۔ حالات۔ واقعات اور اس قسم کے دوسرے
ناموں سے خطاب کرنا پسند کرتا ہے کیونکہ صرف
تم ہی ایک ایسی ہستی ہو جو میرے انتقام کی لامحدود
حد سے باہر ہے۔ تمھارا حسین جسم ہی ایک ایسی پناہ
ہے جو میرے مجنون ناخنوں کی زد سے محفوظ ہے

نہیں تم تو بتاؤ کس نے میری زندگی چھینی
میری قسمت پہ ڈاکہ ڈال کر میری خوشی چھینی
میری امید کا راحت محل برباد کرڈالا
میرے حق کو چرا کر مجھکو بے بنیاد کرڈالا

مسعود

(فوراً روک کر)

عشرت! عشرت!! ہوش میں آؤ۔ جس حوصلہ کی
داستان ابھی ابھی سنائی تھی اسے کام میں لاؤ
مگر نہیں میں نے تمھارے صبر کا تمھاری طاقت
سے زیادہ امتحان کیا ہے۔

عشرت

نہیں۔ تم نے میرے صبر کو ایک ناجائز جگہ
پہ آزمایا ہے۔ ایک بہادر سپاہی خودکشی نہیں کرسکتا
ہاں اپنی سلطنت کو بچانے کے لئے اپنی عزت کو محفوظ
رکھنے کے لئے ایک فوج کے مقابل سربکف جانی
کے لئے تیار ہوسکتا ہے۔ ایک بیوی اپنے شوہر
کو نہیں چھوڑ سکتی۔ ہاں اس کی محبت کو اور
غارت گروں سے بچانے کے لئے دنیا سے
برسرپیکار رہ سکتی ہے۔ اگر اس دل کو اور اس کی
قوت برداشت کو آزمانا چاہتے ہو تو آؤ میرے
پہلو میں بیٹھ جاؤ اور کہہ دو کہ میں تمھارا ہوں پھر دیکھو
کہ میں اس دولت بے بہا کو اپنے قبضہ میں رکھنے
کے لئے کیا کیا نہیں کرسکتی۔

مسعود

عشرت ۔ میری پیاری عشرت اپنے دل کی بیتابی کو اس قدر نہ بڑھاؤ کہ وہ تھک کر ساکت ہو جائے ۔ میں مجبور ہوں ۔ معذور ہوں اب میں تمھاری محبت کے قابل نہیں رہا صرف تمھارے رحم کا طلبگار ہوں ۔

عشرت

مسعود ۔ مجھکو تمھارے رحم کی تم سے زیادہ ضرورت ہے ۔ دیکھو مسعود تم مرد ہو ۔ تمھارے لئے محبت ایک کھیل ہے ۔ عورت کا دل ایک کھلونا ہے ۔ تم نے جب چاہا یہ کھیل کھیلا ۔ اور جب چاہا اس مٹی کے گھروندے کو بگاڑ کر دنیا کے اہم کاموں میں مصروف ہو گئے ۔ مگر سنو محبت کی آگ ۔ عورت کے دل میں فقط ایک مرتبہ شعلہ زن ہوتی ہے اور اس ایک ہی دفعہ شعلہ زن ہو کر اس کے خرمن صبر و قرار کو ۔ اس کے مرغزار نشاط و عشرت کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے اس کی آیندہ زندگی صرف ایک ہی مقصد کے لئے وقف ہو جاتی ہے ۔ میرے مقصد حیات میرے سرمایۂ زندگی تم ہو ۔ میں تمھیں نہیں چھوڑ سکتی ۔ یہ میرا عزم ہے ۔ سنو یہ ایک عورت کی محبت کا تہیہ ہے ۔ اس لئے مجھ کو اگر تم بھی چاہو تو اس سے باز نہیں رکھ سکتے ۔

مسعود

(بہت مجبوری اور بیتابی سے)

آہ ۔ میں کیا کہوں ؟

عشرت

(فوراً ایک قطعی فیصلہ کر کے)

اگر تم اس محبت کے حق میں کچھ کہنا چاہتے ہو تو کہو ۔ میں اپنی عمر کی ساعتوں کو لا انتہا بنا دوں گی ۔ اپنی سننے اور سمجھنے کی قوتوں کو لازوال کر دوں گی اور تم جو کچھ کہو گے اسے سنتی رہوں گی ۔ لیکن اگر تم چاہتے ہو کہ اس کے خلاف کچھ بھی کہو تو اس سے پیشتر کہ تمھاری زبان ایک لفظ کو ترکیب کرنے کی کوشش کرے میں اپنی ناکام زندگی کو تمھاری محبت کی خونی چوکھٹ پر بھینٹ چڑھا دوں گی اور اسی مسعود کے قدموں پر جس نے میرے حسن کو اپنی محبت کا محتاج بنایا جس نے میری زندگی کو اپنی توجہ کے ساتھ وابستہ رہنا سکھایا ۔ اسی طرح اپنا سمجھ کر ۔ اسی طرح اپنا دیکھ کر جان دے دونگی ۔

مسعود

(بہت بے بس ہو کر)

عشرت میں کیا کروں ۔ میرے والد مرحوم کی وصیت میرے اور تمھارے درمیان حائل ہو گئی ہے ۔ یہ غلط ہے کہ میں اب تم سے محبت

نہیں کرتا۔ محبت کرتا ہوں بہت کرتا ہوں۔ اپنی زندگی اور روح سے بڑھ کر کرتا ہوں۔ مگر آہ اپنے باپ کی مرضی کے سامنے جس کو میں اب کسی دلیل۔ کسی فلسفے۔ کسی التجا سے اپنے اور تمہارے حق میں نہیں کر سکتا مجبور ہو گیا ہوں میں ان کو ان کی زندگی میں خوش نہیں رکھ سکا مجھ سے مت کہو کہ اب ان کی موت کے بعد اُنکی روح کو بھی ناخوش کروں۔

عشرت

یہ جھوٹ ہے۔ تمہارے والد مرحوم کی روح ایک عورت کی زندگی کو برباد کرکے کبھی خوش نہیں ہو سکتی۔ کیا ایک باپ اپنے بیٹے کی زندگی چھین کر اس سے کسی اور کو زندہ کرنے کی کوشش کر سکتا ہے۔ کیا ایک باپ اپنے بیٹے کی خوشی کی کھنڈر پر اپنے جابرانہ حکم کا مغرور محل تعمیر کرنا پسند کرتا ہے۔ مسعود۔ ہوش میں آؤ۔ ایک مصنوعی فرض کی یاد میں محو ہو کر اپنے اصلی فرض کو نہ بھلاؤ۔ ایک روح کو خوش کرنے کے خیالی احساس سے دو زندگیوں کو خاک میں نہ ملاؤ

دل ہے مٹی کا کھلونا نہیں مت توڑ اسے
کوئی پتھر نہیں اک شیشہ ہے مت پھوڑ اسے
یہ وہ گھر ہے جو بگڑ کر کبھی بنتا ہی نہیں
یہ ہے وہ باغ اجڑ کر جو سنورتا ہی نہیں

مسعود

(متاثر ہو کر مگر اس اثر کو زائل کرنے کے لئے اس کے پہلو سے اٹھ کر)

بس بس عشرت میں دیوانہ ہو جاؤنگا میں مجبور ہو گیا ہوں میں اب تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں۔

عشرت

(منت سے گلے میں باہیں ڈال کر)

مسعود۔ میرے شوہر تم اب بھی میرے لئے سب کچھ کر سکتے ہو تم اب بھی میری ڈوبتی ہوئی کشتی کو تباہی کے بلا خیز طوفان سے بچا سکتے ہو۔ تم اب بھی ایک بے کس بے بس لڑکی کو ایک کامیاب عورت بنا سکتے ہو۔ دیکھو مسعود اپنے بچے پر۔ اپنے بچے کی ماں پر۔ اپنی بیاہتا بیوی پر رحم کرو۔ ایک لاوارث عورت پر جو تمہاری محبت کی قربانگاہ پر۔ اپنی عزت۔ اپنی عصمت۔ اپنی زندگی۔ قربان کر چکی ہے۔ رحم کرو۔ اچھا لو۔ اگر تم رحم نہیں کر سکتے تو انصاف کرو۔ انصاف نہیں کر سکتے تو ظلم کرو۔ (اس کے قدموں پر گر جاتی ہے)

اڑا جا ٹھوکروں سے اس دل ناشاد کے ٹکڑے
مٹا جا مجھ کو او بیداد گر۔ فولاد کے ٹکڑے
سزا دے جا دل بیتاب کو اپنی محبت کی

کئے جا سنگدل اس خاندان برباد کے ٹکڑے

مسعود

(بہت زیادہ متاثر ہو کر اسے اٹھاتا ہے اور گلے سے لگا لیتا ہے)

عشرت میری پیاری میری اپنی عشرت مجھے معاف کرو۔ ایک خیالی فرض اور شاید دولت کے لالچ نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ مگر تمھاری محبت کی پاک اور روشن شعاعوں نے میری آنکھوں کو بینائی میری روح کو زندگی بخش دی۔ میں تمھارا ہوں تمھارا ہی رہوں گا۔ اور اگر تمھاری محبت کی قیمت پر مجھ کو دنیا بھر کی دولت ملے گی تو اس کو نفرت سے بھی نہ دیکھوں گا۔

عشرت

(خوش ہو کے اور پیار کر کے)

تو پھر پیارے مسعود تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ ایک عورت کی محبت دنیا بھر کی دولت سے زیادہ قیمتی نعمت ہے +

(پردہ)

(احمد شجاع)

میں وہی ہوں

وہ کہتے ہیں کہ تو سرد مہر ہے **مگر میں** تو جب ہار سنگھار کے پھولوں کی سیج پر لیٹتی ہوں تو پھول میرے شباب کے گرم جسم کو مس کر کے مرجھا جاتے ہیں۔ ان کی ڈنڈیاں آتش حسن کی گرمی سے لال انگارا ہو کر دہکنے لگتی ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ تیری مدبھری آنکھوں سے الفت کی آتش سیال کے وہ شعلے بجھ گئے جنکی آنچوں اور لپٹوں سے میری محبت اپنے دل کی ٹھنڈی چوٹیں سینکتی تھی **تو اچھا** جب میں ان کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتی ہوں تو فرط مسرت سے ان کا چہرہ کیوں تمتما اٹھتا ہے ان کی گوری گوری پیشانی پر پسینہ کیوں آجاتا ہے۔ ان کے جوش تبسم سے تر ہونٹوں شراب حسن سے نمناک آنکھوں سے ایک غیر مرئی دھواں سا کیوں اٹھنے لگتا ہے جیسے دوپہر چڑھے سورج کی تیز دھوپ میں پانی سے بھیگے گیلے کپڑے سے اٹھنے لگتا ہے۔ ان کے جذبات شوق میں انفعال اضطراب کی گرمجوشیاں کیوں مشتعل ہو جاتی ہیں۔ وہ دل ہی دل میں ایک گرم سا گہرا سانس لے کر چپ کیوں ہو جاتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں تیرے حسن کے آئینہ میں اب وہ جلا نہیں رہی جس میں میرے عشق کی دارفتگیاں گھنٹوں اپنا منہ دیکھ کے تو حیرت رہتی تھیں **اچھا تو پھر** وہ روز جب نہا دھو کے بنتے سنورتے ہیں تو انکی خود آرائیاں رہ رہ کے میرے منہ کو کیوں تکنے جاتی ہیں جب گھر سے پہن اوڑھ کے خیر سے باہر نکلتے ہیں تو ان کی خوش نمائیاں پہلے میرے سامنے آ کر کیوں اپنی زیبائش حسن کا اطمینان طلب کرتی ہیں وہ جب تک میری آنکھوں میں اپنا منہ نہیں دیکھ لیتے انھیں اپنی جامہ زیبیوں کا یقین کیوں نہیں آتا۔ ہاں شاید ان کو اپنے حصول مقصد کے فاتحانہ ناز نے میرے ناکام سوز سے آسودہ تمنا کر دیا۔ ورنہ میں وہی ہوں جو تھی +

(مجذوب)

کیا میں دیوانہ ہوں؟

جب میں نے دھڑکتے دل سے اس کو اپنا راز بتایا۔ اور اس سے جواب طلب کیا تو اس کی سیاہ اور روشن آنکھیں جن میں مجھے خدا اور خدا کی خدائی نظر آیا کرتی تھی۔ دیوار کی طرف اٹھ گئیں۔

اس وقت وہ تنہا بیٹھی ہوئی ٹکٹکی لگائے ایک کونے کی طرف دیکھ رہی تھی بعض اوقات انسان کے دل میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس کا دماغ خیالات سے۔ دل جذبات سے اور آنکھیں چمک سے بیگانہ ہوتی ہیں۔ میں نے سوچا۔ کہ اس پر بھی کچھ ایسی ہی حالت طاری ہے لیکن جب اس نے میرے آنے کی آہٹ پائی۔ اور مڑ کے میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں تارے کی سی چمک موجود تھی۔

میں نے ایک آہ بھری۔ بھری نہیں۔ آہ میرے دل سے اٹھی۔ آخر کب تک چھپاتا۔ محبت بھی کچھ عجیب جذبہ جس وقت تک اظہار نہ ہولے۔ دل کی بے چینی اور بے قراری کسی طرح کم نہیں ہوتی مگر حرف آرزو زبان پر آیا۔ تو بے چینی کے ساتھ ہی ایک قسم کی تسلی بھی محسوس ہوتی ہے۔ شاعر اپنے آپ کو بسمل اور مقتول قرار دیتے ہیں۔ اگر اس تشبیہ کو جائز قرار دیا جائے تو یوں سمجھنا چاہیے۔ کہ جو آدمی محبوب پر اپنا عشق جتا دیتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو شہید تصور کرنے لگتے ہیں۔ اور جو رو برو ہو کر اظہار نہیں کرتے وہ صرف مقتول۔

ہاں تو میں نے ایک آہ سرد بھر کر اس کو اپنا راز محبت بتا دیا۔ میرے دل کی دھڑکن۔ میری آنکھوں کی چمک میری آواز۔ غرض کہ میری ہر حرکت سے اس پر ظاہر ہو گیا۔ کہ میں اس کا اور فقط اسی کا ہوں۔ کون جانتا ہے۔ میری داستان غم سن کر شاید اس کے دل میں بھی ایک ہوک اٹھی ہو ...... آخر میری آواز ...... شدت جذبات کے باعث کچھ بھر آگئی۔ اس نے پہلے تو میری طرف دیکھا۔ پھر دیوار کی طرف نظر اٹھائی۔ اور ہاتھ سے اشارہ کر کے کہنے لگی "مگر ...... مگر میں تو اس کو ......" دیوار پر ایک تصویر تھی۔

افسوس کہ میری تمام امیدیں چکنا چور ہو گئیں۔

(۲)

میں اس کو بھی خوب جانتا تھا۔ وہ میرا دوست تھا۔ ہاں دوست لیکن میری زندگی کے ہر لمحہ کو تاریک بھی تو اس نے بنایا تھا۔ خوشی کی گھڑیاں بھی تو اسی نے چھینی تھیں۔ میرا رقیب بھی تو وہی تھا۔ کیسا دوست اور کہاں کی دوستی۔ وہ میرے راستے میں پتھر بن کر حائل ہوا۔ کون انکار کر سکتا ہے کہ اگر وہ نہ ہوتا۔ تو وہ ہمیشہ کے لئے میری بن چکی ہوتی۔ جب میں کام کاج سے تھک ہار کے آیا کرتا۔ تو وہ اپنے باریک باریک گلابی ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیتی اور اس عہد محبت کو استوار کیا کرتی جو میں نے ازل میں اس کے ساتھ باندھا تھا۔

ان کی شادی بھی ہو گئی اور میں شادی میں شامل بھی ہوا۔ دونوں میں سے کسی کے دل میں یہ خیال نہ آیا۔ کہ میرے دل میں کیا کچھ محشر بپا ہے۔ وہ مجھ سے بہت مہربانی سے ملتی۔ شاید اس لئے کہ اسے یہ خوب معلوم تھا کہ اس کے خاوند کی بہ نسبت میں اسے زیادہ پیار کرتا ہوں۔ آخر اس کا اس میں کیا قصور؟ وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ ہاں اور مہربانی کی وجہ یہ بھی تھی کہ عورت ہمیشہ اس پر مہربان رہا کرتی ہے جس کی زندگی اس نے تباہ کر دی ہو۔

ایک دن باتوں ہی باتوں میں میں نے اس سے پوچھا "اتنا تو کہو کہ اگر وہ نہ ہوتا....." اس نے کچھ جواب نہ دیا لیکن جو بات زبان بیان نہیں کرتی۔ آنکھیں اسے بتا سکتی ہیں۔ میرے دل میں ایک آگ تھی۔ ایک نہیں بلکہ دو۔ غصہ کی آگ اور محبت کی آگ۔ رفتہ رفتہ غصہ انتقام۔ اور محبت مایوسی میں بدل گئی۔

رہ رہ کے میرے کان میں کوئی آہستہ آہستہ یہ کہہ رہا تھا "اگر وہ نہ ہوتا۔ اگر وہ نہ ہوتا....." میں نے تہیہ کر لیا۔ کہ قدرت کی ایک غلطی کی اصلاح کر کے چھوڑوں گا۔

(۳)

میں نے دل میں سوچا۔ کہ دیوانہ بن جاؤں۔ یہ تو مجھے یاد نہیں۔ کہ میرے دل میں یہ خیال کیسے سمایا۔ ہاں اتنا ضرور جانتا ہوں۔ کہ انتقام لینے کی ترکیب میں نے یہ نکالی کہ دیوانہ بن جاؤں۔ ایک دن ان کے ہاں دعوت تھی اور بہت سے آدمی میز پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے میں نے ارادہ کیا کہ آج ہی پہلا تجربہ کرنا چاہئے۔ یک بیک میں نے آسمان کی طرف نہیں آسمان کہاں چھت کی

طرف - مجھے کچھ اچھی طرح معلوم نہیں - بیٹھے تو ہم کمرے میں تھے - مگر مجھے خوب یاد ہے کہ نیلا نیلا آسمان اس وقت آنکھوں کے سامنے تھا ---- ہاں تو میں نے آسمان کی طرف دیکھنا شروع کیا - سب گھبرا گئے اور وہ کہنے لگی "تم کیا دیکھتے ہو - کیوں دیکھتے ہو؟"

میں نے کچھ جواب نہ دیا جس طرح مسمریزم کرنے والا اپنے معمول کو گھورتا ہے - میں بھی اس کو گھورتا رہا اور ساتھ ہی میز پوش کے ایک کونے کو پکڑ کر آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا - گلاس گر پڑے - پیالے پیالیاں - گلدان - غرض کہ ہر چیز زمین پر آ رہی تھی مجھے یاد ہے کہ پہلا برتن جو گرا تو اس کے خاوند پر ہی گرا - اور خدا جانے کیوں میں نے اسے نیک فالی سمجھا - بعد ازاں ---- مجھے کچھ یاد نہیں -

پھر مجھے کچھ ایسا یاد ہے کہ میں ان ہی کے مکان میں ایک بستر پر پڑا تھا - ڈاکٹر سرہانے بیٹھا کہہ رہا تھا کہ اس کی دماغی حالت خراب ہو گئی ہے - اور اس قسم کے دورے اسے اکثر پڑتے رہیں گے - میں نے دل میں کہا "لو یہ مجھے دیوانہ سمجھتا ہے - بھلا اسے کیا خبر - کیا میں دیوانہ ہوں؟ ہرگز نہیں -

اس کے بعد بہت سے دن گزر گئے - کتنے - مجھے معلوم نہیں - شاید ایک برس ہو - یا ممکن ہے ایک ہفتہ ہی ہو - اب مجھے کچھ یاد نہیں - بہر حال ایک خاص مدت کے بعد میں نے دوسرا کھیل کھیلا -

ہم تینوں بیٹھے تھے - میں اپنی آنکھوں میں خون بھر لایا - گردن کی رگوں میں تناؤ دے کر - پیشانی پر بل ڈال کے آئینے کی طرف گھورنے لگا - پھر ہاتھ اپنے عکس کی طرف پھیلا کے کسی فرضی چیز کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور دبانا شروع کیا - بعد ازاں میں یک بیک بڑھا - اور تصویروں کا وہ مرقع جس میں ان دونوں کی تصویر لگی ہوئی تھی پھاڑ دیا - اس طرح پھاڑ دیا کہ ایک کی تصویر دوسری سے الگ ہو گئی -

(۴)

کہتے ہیں - موت لوگوں کو بلاتی ہے - ممکن ہے - مگر موجودہ مثال میں تو اس نے خود ہی اپنی موت کو بلایا - کم سے کم اس کی آمد میں تعجیل ضرور کی - حسب معمول میں شام کے وقت ان کے ہاں گیا ہوا تھا - ہم تینوں لائبریری میں جا بیٹھے - اس کے لکھنے کی میز پر ایک نہایت ہی خوبصورت پیپر ویٹ پڑا تھا - میں نے جو اسے اٹھایا - تو وہ جسامت کے لحاظ سے بہت وزنی معلوم ہوا - میں نے کہا "دیکھو کس قدر

وزنی ہے"۔ وہ بولا" وزنی اور اس قدر وزنی کہ سر پر آ لگے تو آدمی مر جائے"۔

اس نے یہ بات ایک تبسم آمیز لہجے میں کہی۔ پھر ہنس پڑا۔ اس اجل رسیدہ انسان کو کیا خبر تھی۔ کہ یہی تبسم اس کے لئے تبسم برق یا خندۂ اجل بن جائے گا۔ انسان اس پر غور کرے۔ تو اسے کائنات کا ایک رازِ عظیم معلوم ہو جائے۔ وہ ایک معمولی سی بات پر ہنس رہا تھا۔ میں اس کی ہنسی پر ہنس رہا تھا۔ اور دونوں کی خاطر میں نے یہ سب کچھ کیا تھا۔ ہم دونوں کے ہنسنے پر ہنس رہی تھی۔ اگر کسی کو بھی ہنسنا چاہئے تھا تو وہ ہی تھا۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس نے ایک بات کی۔ فقط ایک۔ اور اپنی موت کی ترکیب مجھے بتادی۔ مجھے کامیابی کی مجسم صورت نظر آئی۔ پارس کا مجسمہ۔ ہاں تو وہ بھی ہنس رہی تھی۔ میرے لئے تو وہ صورت کامیابی کی دیوی بن گئی۔ مگر اس کے لئے وہ موت کا فرشتہ تھا۔ کہ اسے دانت دکھا رہا تھا۔

میں نے دو ہی منٹ میں تیور بدل لئے اور نہایت تحکمانہ لہجہ میں کہا" بس ادھر دیکھو!"

اس نے نظر اٹھائی اور ابھی حیرانی کا ایک سمندر اس کی آنکھوں میں لہریں مار رہا تھا۔ کہ میں نے وہی پیپر ویٹ۔ اس کے سر پر دے مارا۔

ایک چیخ نکلی اور چیخ کے ساتھ ہی جان۔

(۵)

کیا میں دیوانہ ہوں نہیں۔ مگر میں پاگل خانہ میں ہوں یہاں کب سے آیا نہیں جانتا کب تک ہوں گا نہیں جانتا اور سچ تو یہ ہے کہ میں اس جگہ کو گھر سے بہتر سمجھتا ہوں جب میں نہیں چاہتا کہ میں نہاؤں اور نہا دھو کے کپڑے بدلوں تو کیا وجہ کہ میرا نوکر نہانے کے کپڑے بدلنے کی۔ بال سنوارنے کی تاکید کرے جب میں ہی چاہتا ہوں کہ رات کو جاگوں اور چاند سے باتیں کر کے دل بہلاؤں۔ فلک سے تارے نوچ لاؤں (اور میں ایسا کر بھی لیتا ہوں) اور جب چاند افق کی آغوش میں سو جائے۔ اس وقت خود بھی سو جاؤں تو کسی کو کیا حق ہے کہ مجھے دن کو جگاوے اور رات کو سونے کی تاکید کرے جب میں آبادی سے دور۔ انسان کی شکل و صورت سے خائف کسی جنگل میں اکیلا رہنا چاہتا ہوں تو سوسائٹی کو کیا پڑی ہے کہ مجھے شہروں میں بازاروں میں گھسیٹے جہاں کے آدمیوں اور جانوروں میں صرف یہ فرق ہے کہ ایک کا جسم بالوں سے اور دوسرے کا کپڑوں سے ڈھکا ہوتا ہے۔ جب میں آدمیوں کو ان دو ٹانگ والے جانوروں کو چار ٹانگ والے جانوروں سے بہتر نہیں سمجھتا تو یہ کیوں مجھے اپنا جیسا بنانا چاہتے ہیں؟ میں مانتا ہوں کہ یہاں بھی آدمی نظر آتے ہیں لیکن نہ اتنی تعداد میں اور نہ اتنے برے۔ یہ لوگ خواہ مخواہ دخل در معقولات نہیں دیتے۔ ہر ایک اپنی دھن میں مست رہتا ہے۔ دیکھو وہ آدمی جو دور ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھا ہے میں خوب جانتا ہوں کہ زمین کھود کھود کر ایک گڑھا بنا رہا ہے تا کہ جو

کیطرح اسمیں سما جائے۔ اب مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں اسے منع کروں لیکن اگر یہ کہیں بازار میں جا کر اس طرح اپنا دل بہلانا چاہے تو سب کے سب اس کے درپے ہو جائیں گے۔ بھلا کیوں؟ یا دیکھو وہ آدمی جو بے تحاشا بھاگتا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی پیچھے مڑ مڑ کے بھی دیکھ رہا ہے۔ اس وضع سے ٹھیک ایسی وضع سے کسی احمق کو دیکھ کر کون بھاگا تھا۔ ہاں حضرت عیسیٰؑ تو وہ جو حضرت عیسیٰؑ کی طرح بھاگا جا رہا ہے کل ٹھوکر کھا کے گر پڑا ہے میں اس کو اٹھانے نہیں گیا۔ اور جاتا بھی کیوں مجھے اپنے کام سے مطلب اسے اپنے کام سے مطلب۔ اگر میں اس کے پاس جاؤں تو دیوانہ کہلاؤں۔

بہرحال ڈاکٹروں نے بھی کہا ہوگا کہ میں دیوانہ ہوں۔ مگر کیا میں دیوانہ ہوں ....؟

(۶)

آج یہ کیا ہو رہا ہے مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں واقعی دیوانہ ہوں۔ اب کس سے پوچھوں کس سے مشورہ لوں؟ باہر دیکھو تو رات ہے۔ ستاروں سے جگمگاتی ہوئی رات نہیں جو مجھے پیاری معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ مہیب۔ اندھیری۔ بھیانک رات

مجھے ایک الو کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ دل میں خیال آیا۔ کاش میں بھی اسی کی طرح سے بول سکتا مگر یہ خیال جلد ہی چلا گیا۔ پھر خدا جانے کتنی دیر کے بعد اس کی مردہ تصویر خاک و خون میں لتھڑی ہوئی میری آنکھوں میں پھر گئی۔ میں نے کہا۔ مرکے آدمی زمین پر ہی لٹا دیا جاتا ہے چلو میں بھی مر کے دیکھوں .... یہ خیال بھی دماغ سے نکل گیا۔ شاید ایک گھنٹہ ہوا ہوگا۔ نہیں نہیں ایک گھنٹہ نہیں۔ بلکہ ایک منٹ ہوا ہوگا۔ کہ ایک اور خیال دل میں آیا۔ کہ میں اپنا گریبان پھاڑ دوں۔ بلکہ ایک دفعہ تو میں نے اپنا ہاتھ گریبان میں ڈال بھی دیا۔ پھر خدا جانے کیوں ٹھہر گیا ....

تو تینوں خیالات دماغ میں یکدم دوڑے۔ میں کچھ نہ کچھ کرنے کے لئے بیتاب ہو رہا ہوں۔ مگر کیا کروں؟ الو کی طرح بولوں نہیں نہیں شاید کوئی جاگ اٹھے۔ کیا زمین پہ لوٹوں نہیں نہیں۔ کیا فضول بات ہے۔ تو اے دل تو ہی بتا۔ میں کیا کروں؟ الو کی طرح نہ بولوں؟ نہیں زمین پہ نہ لیٹوں؟ ——— نہیں ——— تو گریبان چاک کر ڈالوں ....

ہیں یہ کیا؟ میں زمین پہ لیٹا ہوا ہوں۔ مرے ہاتھ کہاں ہیں؟ گریبان میں۔ گریبان پھٹ چکا — آہ تو کیا میں واقعی دیوانہ ہوں نہیں نہیں میں تو دیوانہ بنا تھا پھر میں زمین پر کیوں لوٹا میں نے گریبان کیوں پھاڑا .... کوئی آؤ۔ آؤ میری مدد کو آؤ۔ اے سائنس دانو! اے علم طب کے ماہرو آؤ۔ اور خدا کے واسطے مجھے بتاؤ کیا میں واقعی دیوانہ ہوں؟ *

انور مجید

رانی دُرگاوتی اور نسوانی شجاعت

اکبر کا عہد فرمانروائی بھی ہندوستان کی کتاب تاریخ کا ایک زریں باب ہے جہاں جلالِ اکبری کی سطوت وجبروت نے بڑے بڑے شجاعان ہند کی آنکھیں نیچی کیں۔ سرکش سے سرکش ہستیوں کی عجز ونیاز کے ساتھ گردنیں جھکوائیں۔ وہاں امن وامان اور فارغ البالی کے بادلوں سے بھی آسمان مملکت خالی نہیں ہے۔ ہر طرف ہن برس رہا ہے۔

رعایا شاد وآباد ہے۔ افراد ہند بے خطر و بے خوف زندگی بسر کر رہے ہیں۔ زبردست کا زہرہ نہیں جو کمزور کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھے۔ ظالم کی مجال نہیں کہ کسی کو ستا سکے۔

سیلاب فتوحات نے گو عظیم الشان حکمرانیوں کا چراغ گل کر دیا ہے اور بڑی بڑی با اقتدار سلطنتیں خس وخاشاک بن کر بہ گئی ہیں۔ مگر مساوات۔ عدل اور آزادی کا یہ حال ہے کہ حاکم و محکوم قوی وکمزور۔ ہندو و مسلم۔ سب ایک سطح پر آگئے ہیں۔ اپنے پرائے سب سے یکساں سلوک ہے اور مساویانہ برتاؤ۔ قومی برتری کا سوال مٹ گیا ہے۔ حاکمانہ غرور معدوم ہے۔ اکبر جیسا با اقتدار شہنشاہ مہارانی جودھا بائی کا ڈولا اپنے کندھے پر اٹھا کر ہندو راجاؤں کی بے نظیر عزت افزائی فرماتا ہے اور دنیا کی اسٹیج پر محبت و برابری کی وہ مثال قائم کرتا ہے جس کی مثال اقوام عالم میں ناپید ہے۔ راجہ مان سنگھ اور راجہ ٹوڈرمل اس قدر بلندیوں پر پہنچ گئے ہیں اور اتنا عظمت واقتدار ایک اسلامی حکومت میں حاصل کیا ہے کہ آج انیسویں صدی کی تہذیب باوجود ادعائے شائستگی و مدنیت کے بھی کوئی نمونہ اس کا ہم شکل نہیں پیش کر سکتی۔

یہی دور ہے اور یہی عظمت خیز زمانہ کہ خاک پاک ہند سے دو نسوانی ہستیاں اُٹھ کر منصۂ شہود پر جلوہ آرا ہوتی ہیں اور اپنی بسالت و پامردی اور فرمانروائی وقابلیت کے وہ نقوش نگین صفحات عالم پر بنا جاتی ہیں جن کو کوئی زبردست ہاتھ تا بدور قیامت نہ مٹا سکے گا۔ کون ہے جو چاند بی بی کے

شوکت آرا اور نامور نام سے واقف نہ ہو۔ کوئی مورخ ایسا دکھا سکتے ہو جس نے اس بے نظیر منتظم و جانباز سلطانہ کے کارنامے لکھتے وقت حیرت سے بار بار دانتوں میں انگلی نہ دبالی ہو۔ اسی طرح رانی درگاوتی کا نام بھی اوراق تاریخ کے گوشوں میں جگمگاتا ہوا ملے گا اور اس کے کارنامے بھی تعجب و مسرت کے ساتھ دیکھے جائیں گے۔

ممالک متوسط کی ایک چھوٹی سی خود مختار ریاست گڑھ منڈل کی ملکہ رانی درگاوتی اپنے اندر ایسے گوناگوں اوصاف اور مختلف جوہر رکھتی تھی کہ اکبر جیسا تاجدار بھی اُن پر نظر عزت ڈالتا تھا اور ایک مدت تک باوجود مناسب ترغیبات کے اس کی فتح پر آمادہ نہ ہوا۔ رانی درگاوتی قنوج کے راجہ کی لاڈلی بیٹی تھی۔ شادی گڑھ منڈل کے رانا سے ہوئی جو خود بڑے کمالات و خصائص کا کامیاب اہل تھا۔ شادی کے بعد تین۔ چار برس بھی لطف محبت اور عیش حیات میں نہ گزرنے پائے تھے کہ شمع و پروانہ اور گل و بلبل میں مفارقت دائمی کا اٹل پیغام آپہونچا۔ اور فرشتۂ اجل کے زبردست ہاتھ نے بجبر ان دو شیفتگان محبت اور جرعہ کشان عشق کو علیحدہ کر دیا۔

رانا نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ بدنصیب درگاوتی تڑپ کر رہ گئی۔ وہ صدمہ پڑا کہ قلب و جان میں ہر وقت شعلے بھڑکنے لگے۔ آنکھیں گنگ و جمن بن گئیں حسن و خوبی کا وہ سدا بہار پھول جو ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ مفارقت والم کی باد سموم سے کملانے لگا۔ دلفریبی و رعنائی کے وہ مضطرب جلوے جو دیکھنے والوں پر بجلیاں گرایا کرتے تھے ختم ہونے لگے۔

درگاوتی تیار تھی کہ اپنے شریک حیات اور جان نثار پر پروانہ وار قربان ہو جائے۔ اور محبت و عشق کی بھڑکتی ہوئی آگ کو ایک دوسری آگ میں فنا کر دے۔ مگر ایک خورد سال بچہ متوفی کی نشانی تھا جس نے دامن پکڑ پکڑ کر اس کو کھینچا اور وادی محبت و غم سے کھینچ کھینچ کر باہر لایا۔

اب وہ وقت آچکا تھا کہ محبت و فرقت کے شعلوں کی بھڑک اور غم و کا بیدگی کے کانٹوں کی چبھن کم ہو اور یہ پیکر محبت۔ وارفتۂ عشق اور مجسمۂ لیاقت دلیہا سلطنت کی دلیہ بن کر مہمات ریاست کو دیکھے۔ اور نظم و نسق حکومت میں توجہ دے۔

آخر کنج الم سے نکل کر تخت حکومت پر بیٹھی اور اس بیدار مغزی اور لیاقت سے داد فرمانروائی دینے لگی کہ ہر طرف سے آنکھیں اٹھنے لگیں۔ ریاست اعدا سے گھری ہوئی تھی۔ اکبر کی فتوحات کے

سیلاب کا پہونچنا ہر وقت ممکن تھا۔ امرا میں آثار سرکشی پیدا ہو چلے تھے۔ مگر درگاوتی نے وہ فرزانگی و دانائی دکھائی کہ کسی کی ہمت و جرأت نہ ہو سکی کہ دفعتاً اُدھر نگاہ ڈال سکے۔

اکبر برابر گڑھ منڈل پر حملہ آوری سے انکار کرتا رہا اور کبھی ترغیب کا خیال نہ کیا۔ مگر کچھ ایسے وجوہ و اسباب پیدا ہو گئے کہ آصف خان نے ریاست پر چڑھائی کر دی۔

رانی جانتی تھی کہ شہنشاہی افواج سے مقابلہ تباہی و بربادی کا پیغام ہے۔ مگر یہ جانباز اور بہادر خاتون بلا لڑے بھی ریاست دے دینا کب گوارا کر سکتی تھی۔ سنتے ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اسلحہ لگائے اور باشندگان ریاست اور افسران فوج کو نہایت جانسوز اور پُر اثر الفاظ میں محکومی و تعبد کی لعنتیں دکھائیں اور عزت سے جینے اور عزت سے مرنے کا ایسا دلنشین سبق پڑھایا کہ ہر طرف ایک آگ سی لگ گئی۔ ہر شخص "آزادی یا موت" کا نعرہ لگانے لگا۔ اور دیکھتے دیکھتے ہزاروں سپاہی رانی کے گرد جمع ہو گئے۔ آصف خاں کو اس جوش و دلیری اور کثرت افواج کا گمان بھی نہ تھا۔ راجدھانی کی دیواروں کے نیچے جنگ ہوئی۔ رانی خود فوج کو لڑا رہی تھی اور اپنے پُر جوش الفاظ سے ہر بار نئی روح ڈالتی جاتی تھی۔ کہ یکایک دشمن کے پاؤں اُکھڑے۔ اور سخت شکست کھا کر آصف خاں واپس لوٹا۔

ریاست میں اس فتح و فیروزی پر مسرت کے دریا بہ گئے۔ چراغاں ہوا۔ مگر رانی جانتی تھی کہ میری قوت و دلیری کا غلط اندازہ تھا جس نے آصف خاں کو ہزیمت دلائی۔ اکبری افواج کی یلغار پھر ہوگی۔ اس وقت ریاست کا وجود مشکل ہے۔ سال کے اندر اندر ایک بڑی فوج آصف خان کی زیر سرکردگی پھر حملہ آور ہوئی۔ رانی ہر طرح تیار تھی۔ وہ اس دن کو جانتی تھی گو امید باقی نہ تھی مگر پھر طوفان کی طرح اٹھی اور بجلی کی طرح گری۔ اور انتہائی جرأت و بسالت نے اس فوج کو بھی پسپا کیا۔ اور بار دگر حملہ کیا گیا۔ فوراً ہی ریاست خفیف سامان۔ اکبری فضا شگاف افواج۔ کہاں تک مقابلہ ہوتا اور کس حد تک کامیابی کی امید کی جا سکتی۔ یہ بھی رانی کی ہستی تھی جس کی بے نظیر جرأت و شیر دلی نے ریاست کو بچائے رکھا۔ غرض رانی نے اب بھی بلا جنگ کئے ملک حوالہ کرنا ننگ خیال کیا اور میدان جنگ میں آگئی اور بہادرانہ لڑنے لگی۔ اسی اثنا میں اس کا اکلوتا بیٹا زخمی ہو کر گرتا نظر آیا۔ بیتاب ہو گئی حملہ سخت تھا۔ جگہ سے ہٹتی تو سپاہ بیدل ہو جاتی۔ چنانچہ اسی سرگرمی سے لڑائی جاری رکھی اور اس [illegible] بیٹا ان کے جگہ پہ

قائم رہی۔

اتفاق وقت کہ ایک تیر آ کر رانی کی آنکھ میں لگا۔ کوشش کی بہت نکالا۔ مگر نہ نکل سکا۔ شدت درد سے بے چین تھی۔ مگر لاپرواہ یا نہ کھڑی رہی اور جب تک جسم نازک میں زخموں کا ایک چمن نہ کھل گیا اور فوج کا ایک ایک سپاہی کام نہ آ گیا ہمت و حوصلہ کو نہ چھوڑا۔ اب رانی نے دیکھا کہ اقارب کٹ گئے۔ سپاہی ختم ہو گئے۔ ریاست مغلوب ہو گئی۔ جینا بیکار اور زندگی فضول ہے۔ لہذا اپنے ہاتھ سے اپنے اس سینے میں جو جذبات شجاعت کے علاوہ محبت و عشق کے رنگین حیات سے بھی مالامال تھا خنجر بھونک کر اپنی قیمتی جان کا خاتمہ کر لیا۔ ایک سپاہی فوراً جسم فانی کو اٹھا کر لے گیا اور بہت سی بہادر سہیلیوں کے ساتھ چتا میں رکھ کر آگ لگا دی گئی۔

یہ رانی جس قدر جذبات محبت کی خزینہ دار تھی اُتنا ہی بہادرانہ خون اس کی رگوں میں جوش کھاتا تھا جتنی حسین و گل اندام تھی اسی قدر فرزانہ اور منتظم واقع ہوئی تھی۔ ریاست کا انتظام اور امن و اہتمام اس کے وقت میں سب سے بہتر اور عمدہ تھا۔ رعایا خوش تھی عدل و انصاف کا دور دورہ تھا۔ رانی نے اپنی ریاست میں رفاہ عام کے بہت کام کئے۔ تالاب۔ کنوئیں سرائیں اور مندر بنوائے خیرات خانے قائم کئے۔ گڑھ منڈل تجارت کی منڈی تھی۔ اناج کثرت سے پیدا ہوتا تھا اس کے دور حکومت میں رعایا خوش اور آسودہ حال رہی۔ ریاست کے لوگ رانی کو ماں سمجھتے تھے۔

زمانہ کی دستبرد نے بڑے بڑے جواہر کو خاک میں ملا دیا۔ نامور سے نامور ہستیاں گمنامی کے گنجوں میں پڑ کر غائب ہو گئیں۔ ہر امر تربیت و تعلیم اور موقع و وقت پر مبنی و منحصر ہوا کرتا ہے جب ہندوستان کی قسمت اور عروج و اقبال کا آفتاب نصف النہار گزر رہا تھا ہم کو تربیت و مواقع حاصل تھے تو اسی ہندوستانی فضا کے ذرات نہ صرف ارجن و کرشن۔ اکبر و شیر شاہ پیدا کرتی تھی۔ بلکہ رضیہ۔ چاند بی بی درگاوتی اور اہلیا بائی جیسے منور تارے۔ آسمان کمال پر چمکتے اور جگمگاتے نظر آتے تھے۔

اب تو جو دل چاہے دنیا کہے۔ بزدل بنائے یا نالائق لیکن ہندوستان بھی کبھی خوش نصیب تھا۔ اور سربلند اقوام جھک جھک کے سلام کرتی ہوئی ہمارے درباروں میں آیا کرتی تھیں۔ اس وقت ہم بھی بہادر تھے اور لائق۔ لیکن اب کیا ہے محض ایک کوشش ہے اور درد دل! ہم ہیں اور ایک مچلنے والی آرزو

شوق چمن ز خاطر بلبل نمے رود (شریف احمد مرکز مارہروی)

مخزن کی ڈاک

ادیب سحر نگار۔ خان بہادر سید ناصر علی خان صاحب اڈیٹر "صلائے عام" کی حوصلہ افزائیاں اور تحسین آفرینیاں مزید افتخار و سعادت ہونے کے ساتھ شعریت سے بھی اتنی معمور ہوتی ہیں کہ ان کا ایک ایک جملہ ارباب ذوق و نظر کے نزدیک صہبائے ادب کے بریز کیفیت ساغروں سے کم سرور بیز نہیں ہوتا۔

ذیل کی سطور اگرچہ باہمی رابطۂ نیاز و کرم اور اتحاد خلوص و شفقت کی محض اجمالی تفسیر ہیں ذیا ممدوح محترم کے اس مکتوب کا اقتباس جس کے حصول شرف کا خیر مقدم مری تہنا مسرت اور سپاس منت کے سوا۔ اور کیا ہو سکتا ہے۔ مگر چونکہ اس معمولی اور رسمی خط کے بلا ارادہ حسن رقم سے بھی جو ادبی دلفریبیاں مترشح ہیں۔ وہ اردو لٹریچر کے ایشیائی طرز تحریر کے لئے یقیناً غیر معمولی سرمایہ ہدایت ہیں۔ اس لئے اس سلاست زبان کی خوش کیفیت مستیوں سے تنہا سرور اندوز ہونا۔ اور احباب کی طبع رنگین کو شریک ضیافت نہ کرنا۔ میری عقیدت کے نزدیک نہ صرف جرم بخل تھا۔ بلکہ کفران نعمت بھی۔

ممدوح نے اس میں "مخزن" کی رسید۔ اور اپنی خیریت کی اطلاع کے ساتھ جس خوبی سے ایک گارڈن پارٹی میں شرکت کا بیان کیا ہے۔ اس کا لطف ارباب نظر کے ذوق سے متعلق ہے۔ (ایڈیٹر)

پاٹوڈی
گوڑگاؤں

جناب بندہ۔ پچھلے "مخزن" میں آپ نے جو میرا نیاز نامہ چھاپ دیا۔ اس نے مرے لئے مسیحائی کا کام دیا۔ مری مدت کی خاموشی سے جو احباب مجھ سے افسردہ دلی کے شاکی تھے۔ یا اس غیر محدود سکوت کی وجہ سے مجھے زندہ نہیں جانتے تھے۔ وہ اب مرحوم "صلائے عام" کے افسوس و ماتم کے ساتھ میرا پتہ دریافت کر کے مجھ سے لکھنے پڑھنے کا تقاضا کر رہے ہیں سے

لب اعجاز کی تاثیر بڑھانے کے لئے چومتے منہ ہیں مسیحا ترے بیماروں کا

خیر اب لوگوں کو یہ یقین تو ہو گیا کہ میں ابھی وہاں نہیں پہنچا ہوں جہاں سب کو جانا ہے لیکن پوچھتے ہیں کہ مرد خدا منہ میں گھنگنیاں کیوں بھر رکھی ہیں؟ مدت کی چپ کیوں سادھ لی ہے؟

اس کا جواب علیحدہ علیحدہ دینا تو مشکل ہے "مخزن" کی معرفت گذارش ہے کہ وعدے کے طور پر نہیں۔ مگر بغیر تقاضۂ وافرار جو کچھ لکھا کروں گا وہ آپ کو بھیج دیا کروں گا۔ بشرطیکہ آپ میری عدیم الفرصتی کو حسن ظن سے بھی دیکھیں۔

کل پاٹودی کے قریب ریواڑی میں اعلیٰ حکام صوبہ کی تشریف آوری پر "گارڈن پارٹی" تھی موسمی معذوریاں اگرچہ ہمت کی سنگ راہ ہو کر تکمیل ارادہ کی مزاحمت کر رہی تھیں۔ مگر بارش کی خوش کیف ترشح اور باران رحمت کے دلفریب تقاطر نے کچھ ایسا پاکیزہ سماں کر دیا تھا کہ زحمت سفر گراں نہ ہوئی۔ گیا اور نہ صرف شرکت تقریب کی استدضرورت سے سبکدوش ہوا۔ بلکہ حنا بستہ پائے خیال کے ذوق گلگشت سے بھی بہت خوش خوش آیا۔

خوش ہجگی کا حسن ظن۔ گرفتاری دام قفس کا حیلہ بہانہ تو مشہور ہے۔ ادھر کچھ ضرورت بھی محرک تھی کہ مدح سرائی کا فرض ادا کردں اس لئے سخت فکر مند تھا کہ کیا کہوں؟ کیونکہ دل ودماغ تو موسمی تحریکات سے معمور ہیں خیال غیر کی گنجائش کہاں۔ آنکھوں میں ہلکے ہلکے مینہ کی ننھی ننھی پھوار اور موسلا دھار بارش کی مسلسل لڑیاں پھر رہی ہیں۔ سوائے لطف بہار اور کیا زبان پر آئے گا۔ ہاں یہی کہ وقت کے پیش نظر باغ و بہار کے دو چار موسمی پھول کسی کے قدوم میمنت لزوم پہ نچھاور کر دوں گا۔ مگر اچھا ہوا کہ نہ مصلحت اور حالات نے اجازت دی اور نہ احباب کے امتثال امر نے مجبور کیا۔

ہمارے ہاں کے شاعر اکثر مضمون خیالی بہار کی تعریف سے شروع کرتے ہیں یہانتک کہ اب شاعری کا طرز خاص بھی بہاریہ مشہور ہو گیا ہے۔ اس تقریب کی تعریف کے لئے خیالی بہار کی کیا ضرورت تھی

آسمان کی فضا۔ واقعہ کا وقوع خود شاہد ہے کہ یہی بہار سبزۂ وگل کی نگاہ کے سامنے ہے۔ ابر رحمت کی بوچھاڑ نے گلستان زندگی کی کیاری کیاری کو حسن فطرت کا غماز بنا دیا ہے۔ در و دیوار پر سبزہ اگا ہوا ہے۔ یہ کیوں ؎

چوں ابر بہاری بسرم سایہ فگن شد	بر ہر در و بامے کہ نظر کردم چمن شد

اس لیئے اس صحبت کے باعث انعقاد اور مقصود کو بھی اس بارش حسن و نور سے وہی نسبت ہے جو بادِ بہاری کے خوش خرام جھونکوں سے موسم کی خوش منظری کو ہوتی ہے۔ ایسی تقریبیں ایسے ہی موسم میں زیب دیتی ہیں۔ جوش بہار میں گلگشت چمن کا لطف زیادہ ہو جاتا ہے۔

فارسی والے سبزے کو خوابیدہ کہتے ہیں۔ مگر آئیں دیکھیں کہ ساعدت وقت نے سبزۂ خوابیدہ کو بھی منعموں کے بخت بیدار کی طرح سوتے سے جگا دیا ہے۔ جس طرح سوتے ہوئے آدمی کے منہ پر پانی کا چھینٹا پڑنے سے آنکھ کھل جاتی ہے۔ اسی طرح پانی پڑنے سے سبزۂ خفتہ بخت بھی جاگ اٹھا ہے اور صحن چمن میں کھڑا انگڑائیاں لے رہا ہے باغ کے پھول پھول اور کلی کلی کو سر اٹھائے دیکھ رہا ہے اور اپنی فطری خوش موجیوں سے آپ ہی آپ لہرا رہا ہے۔

مادر گیتی کے آغوش رافت میں لہلہاتے نخل و نہال کے منہ پر جو انوار برس رہا ہے جس طرح ماں بچے کا منہ ہاتھ دھلاتی ہے تو بچے کا چہرہ نکھر جاتا ہے اسی طرح بارش نے بھی مخلوقات نباتی کا منہ دھلا دیا ہے۔ چہرے صاف اُجلے نکل آئے ہیں حسن عالم کی سادگی اور صفائی میں سبزہ کا جوش نمو کچھ اور ہی رنگینیاں پیدا کر رہا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی حسن ملیح پر خط سبز رونما ہے۔ یا کسی بامذاق ساقی نے بادۂ گلرنگ کے مصفیٰ جام و ساغر پر برگ حشیش کی پشت دے رکھی ہے ؎

لب کا بڑھا دیا ہے مزہ خط سبز نے	ساقی نے پشت دی مے صافی کو بنگ کی

اصطلاح عجم میں سبزے کو بیگانہ کہتے ہیں۔ شاید واضعان اصطلاح کی اس طرف توجہ نہیں ہوئی کہ فرط مسرت مغائر بیگانگی بھی ہے۔ آج سبزے کو بیگانہ سمجھنا غلطی ہے۔ اس تقریب سعید میں بیگانگی کا

خیال محل عیش ہے۔ سبزہ وگل یکساں ہم نشین ہیں۔ دوست۔ دشمن سب کا خلوص بلطف مساوات مہمان عزیز ہے۔ امیر غریب۔ کہ و مہ سب کی عقیدتیں اس تواضع شاہی کی یاد آوری اور عزت افزائی کے ہمزبان شکر و سپاس ہیں ؎

خار وم وے گلاب زمن ستیوال گرفت
از لبسکہ بوئے ہمدمی گل گرفتہ ایم

ناصر علی

اقوال زرین

حسد کا منشا صرف ان اوصاف حمیدہ کا اعتراف ہے جو محسود میں ہیں اور حاسد اُن کا خواہاں ہے مگر حاصل نہیں

اختلاف موجب رحمت ہے اور درستی اخلاق کا بہترین ذریعہ

عقلمند انسان مخالف کی رائے کو بہت شوق سے سنتا ہے تاکہ اس کی اچھی بات کو حاصل کرے اور اپنے آپ میں جو غلطی ہو اسے صحیح کرلے۔

دنیا میں یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ تمام لوگ ایک ہی رائے سے متفق ہوں۔ خواہ وہ کیسی ہی صحیح اور صائب ہو

دشمن سے راستبازی برتنا۔ اخلاق سے پیش آنا دشمن پر فتح پانے کا بہترین طریقہ ہے۔ جو لوگ ایسا نہیں کرتے غلطی کرتے ہیں

خوشامد اور چاپلوسی کا جذبہ اخلاق کی کمینگی سے پرورش پاتا ہے۔ اس کی ابتدا ایک نالائق اور ناقابل شخص کی وضع الوقتی اور حاجت برآری ہے اور انتہا دنیا کی نگاہوں میں حقیر و ذلیل بے عزت بیوقار بیغیرت۔ بے اعتبار ہو جاتا ہے۔

ہشیاری وچالاکی، مکاری ودغابازی کا دوسرا نام ہے جس طرح میٹھی میٹھی باتیں کرنے اور مصنوعی تپاک جتانے کا خوش اخلاقی نام رکھ لیا گیا ہے۔

عزت حقیقت میں ایک صفت ہے جو اور اوصاف فطری کی طرح انسان کے ساتھ پیدا ہوتی ہے جو آدمی اپنی عزت کرتا ہے وہ دنیا سے اپنی عزت کراتا ہے۔ دوست دشمن سب اس کے آگے سر جھکاتے ہیں

عیب فی نفسہ ایک مستقل بدصورتی ہے جسے ہم رسم ورواج اور عادت کے آرائشی پردوں میں خوشنما دیکھنا چاہتے ہیں۔

اپنے طریق معاشرت کو تہذیب کے اعلیٰ درجے پر دیکھنے کے لئے سب سے پہلے اپنے رسوم وعادات کو تحقیق سے دیکھنا لازمی ہے جس طرح ترقی کے لئے تنزل کے اسباب کا مطالعہ ضروری ہے۔

(مجدد الوقت سر سید احمد خان)

تنقیدِ لطیف

(حسان رضی اللہ عنہ کے شعر پر ایک شاعرہ عرب کے سات اعتراض)

معاشرت عرب کا یہ دستور تو قدیم سے چلا آتا تھا کہ سال چھ مہینہ میں ضرور کسی نہ کسی چشمے یا آبادی کے کنارے ایک نہ ایک بازار لگا کرتا تھا۔ اس میں اطراف ملک کے مختلف قبائل جمع ہوتے ہفتوں رہتے سہتے۔ اشیاء مایحتاج کی خرید و فروخت کرتے باہمی نفاق و اتفاق کو تازگی دیتے اور پھر اپنے اپنے ٹھکانے ہو رہتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ رسم معاشرت۔ ضروریات ملکی میں سے قرار پاگئی اور بعض بعض مقامات ان بازاروں میلوں کے لئے ہمیشہ کے وقف انعقاد ہو گئے۔ ان ہی میں کا ایک بازار عکاظ بھی ہے۔

یہ بازار بیرون حرم وادی مکہ کے ایک قریبی میدان میں ہر سال لگا کرتا تھا۔ اس میں دور دور کے قبائل آتے۔ راوٹیاں۔ چھولداریاں۔ ڈیرے خیمے استادہ کرکے کئی کئی دن رہتے اور مختلف سیر و تماشے سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ بداوی عرب کی خلقت چونکہ فطرتاً اپنی شجاعت و مردانگی کے اظہار و فخر کے عادی تھی۔ اپنی ناتحانہ مدح و ثنا کے قصائد۔ مفتوح قبائل کے مرگ بے کسی کے مراثے پر ناز کرنا ان کا روزمرہ کا شعار و شغلہ تھا اور یہی جبلت ملکی شاعری کی وجہ تخلیق اور اس کی نشو و نمو کے لئے آغوش پرورش ہوئی تھی۔ اس لئے شاعری بھی اس زمانے میں اور اوصاف انسانی کے ساتھ ایک ضروری حسن عمل سمجھی جاتی تھی۔ چنانچہ بازار عکاظ میں جہاں بہت سے اور طریقے دل بستگی کے ہوا کرتے تھے۔ وہیں ہر سال ایک مشاعرہ بھی ہوا کرتا تھا جس میں بڑے بڑے شعراء عصر اپنا اپنا کلام سنا کر خراج تحسین حاصل کیا کرتے تھے اور کسی نہ کسی کے سر افضلیت کا سہرا بندھتا رہتا تھا۔

نابغہ ذبیانی اپنے قبیلہ کا امیر اور سردار ہونے کے ساتھ خود بھی بہت بڑا شاعر تھا۔ مگر امارت اور استطاعت نے اسے دوسروں کا کلام سننے کا زیادہ خوگر بنا دیا تھا۔ اس لئے سخن سنج ہونے سے

زیادہ سخن فہم تھا جس کی بنا پر ہر سال یہ بزم مشاعرہ اسی کے ڈیرے میں منعقد ہوا کرتی تھی۔ شعرا عرب اسے آکر اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ اور اس کے مذاق سلیم کے فیصلہ کو اپنے لئے صحیح داد سخن۔ اور تنقیدی قول فیصل سمجھتے تھے۔ ایک سال حسب عادت جب وہ اپنے سرخ ڈیرے میں شعرائے ہم وقت اور فصحائے ہمعصر کے ساتھ شریک لطف شعر و سخن تھا۔ شعرا اپنا اپنا کلام سنا رہے تھے اور وہ ہر ایک کو منصفانہ داد دے رہا تھا تو تماضر بنت عمر الملقبہ بالخنسا جو اس وقت کے طبقہ نسوانی کی مایۂ ناز شاعرہ تھی۔ وہ بھی آئی ہوئی تھی۔ اس نے بھی اپنا قصیدہ پڑھا۔ سنا یا۔ نابغہ۔ خنسا کا کلام سن کر عش عش کرنے لگا۔ اور نہایت معترف و حیران ہو کر بولا" واللہ اگر اس وقت تجھ سے پہلے میں اعشیٰ کا قصیدہ نہ سن چکا ہوتا تو میں تیرے اشعار کو اس سال کے کہے ہوئے تمام شعرا کے اشعار پر ترجیح دیتا۔ تو یقیناً عرب کے موجودہ تمام شعرا جن و انس سے افضل کہے جانے کی مستحق ہے

اتفاق سے حسان رضی اللہ عنہ بھی اس بزم ادب میں موجود تھے۔ انھیں یہ بات سن کر طیش آگیا اور نہایت غصہ کے لہجہ میں نابغہ سے کہا میں تجھ سے اور اس عورت سے دونوں سے افضل ہوں۔ نابغہ نے سنا۔ آپ کے احترام فن سے متاثر ہو کر پہلے تو اس کے سوا کچھ نہ کہا کہ" شاید آپ کا یہ خیال درست ہو" مگر خنسا کو مخاطب کر کے بولا" کیوں خنسا تمھاری کیا رائے ہے؟"

اس سوال میں چونکہ ایک انتقامی حسن طلب مضمر تھا۔ خنسا سمجھ گئی۔ اور حسانؓ کی طرف متوجہ ہو کے بولی" آپ نے اس سال جو قصیدہ نظم فرمایا ہے اور اس کے جس شعر کو آپ سب سے بہتر اور چوٹی کا خیال فرماتے ہیں۔ کیا آپ اسے پھر دوبارہ پڑھ سکتے ہیں۔ اس پر مجھے بعض اعتراض ہیں" حسانؓ نے پھر اس شعر کو پڑھا ؎

لنا الجفنات الغر یلمعن بالضحیٰ واسیافنا یقطرن من نجدۃ دما

وہ ہمارے ہی بڑے بڑے روشن کاسے ہیں جو ہر روز صبح کو دن نکلتے ہی چمکنے لگتے ہیں۔ یعنی ہم بڑے مہمان نواز ہیں۔ اور ہماری ہی تلواریں ہیں جن سے جنگ میں خون کے قطرے ٹپکتے رہتے ہیں یعنی ہم بڑے جنگجو ہیں۔

خنسا نے سنا اور بغیر کسی توقف کے بولی۔ جناب آپ نے اس شعر میں جس بات پر فخر کیا ہے وہی ازروئے ذوق بیان مظہر مذمت ہے۔ آپ کے الفاظ نے آپ کے مافی الضمیر معانی کو نہایت

کمزور کر دیا ہے۔ جو بات آپ کے نزدیک مایۂ ناز و سرمایہ حسن و لطافت ہے۔ وہی ارباب فن کے نظر میں سقم و ذم ہے۔ مجھے اس شعر میں سات مقام قابل اعتراض و اصلاح نظر آتے ہیں۔ حسان رضؓ نے تعجب سے پوچھا وہ کونسے مقام ہیں بیان کرو۔

خنسا نے کہا۔ سنئے :۔

(۱) آپ نے اس شعر میں جفنات کا لفظ جمع کثرت کی جگہ فرمایا ہے۔ حالانکہ جفنات جمع قلت کے لئے آتا ہے۔ جو دس سے کم کے لئے مستعمل ہوتا ہے۔ اس لئے شعر سے حسن مبالغہ جو فی الحقیقت روح شعریت ہے۔ وہ جاتا رہا اور سقم پیدا ہو گیا۔ میرے نزدیک اس جگہ جفان ہونا چاہئے تاکہ آپ کا فخر صحیح ہو سکے۔

(۲) آپ نے جفنات کی صفت غرّ لکھی ہے۔ غرّ پیشانی کی سفیدی کو کہتے ہیں جو بہت قلیل و ناپائدار ہوتی ہے۔ ممدوح کو کسی ایسی صفت سے متصف کرنا جو عارضی اور بے اصل ہو آئین مدح کے خلاف اور معیوب ہے۔ اس لئے اگر بیاض ہوتا تو صحیح تھا جس سے غیر معلوم قیام و غیر متناہی وسعت مفہوم ہوتی ۱ور یہ سقم بھی نکل جاتا۔

(۳) یہی عیب یلمعن سے پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ لمع وہ چمک ہے جو بتدریج ظاہر ہو۔ اس جگہ یشرقن ہونا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ لمعان کے مقابل میں اشراق کو دوام و ثبات ہے۔

(۴) جہاں آپ نے بالضحیٰ لکھا ہے۔ وہاں بالدجیٰ کہنا چاہئے تھا۔ اس لئے کہ دن کی روشنی میں کسی چیز کا چمکنا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ البتہ تاریکی میں چمکنا قابل تعریف ہے۔

(۵) اسیاف کا لفظ بھی غلط استعمال ہوا ہے۔ اسیاف جمع قلت کے لئے آتا ہے اور اس سے اس سے کم مراد ہوتی ہے۔ جمع کثرت کے لئے اہل فن سیوف استعمال کرتے ہیں۔ آپ اگر اس جگہ سیوف فرماتے تو صحیح تھا جس سے تلواروں کی کثرت ظاہر ہوتی کسی قبیلہ کا سرمایہ جنگ و جدال اس سے کم تلواریں ہونا موجب فخر نہیں بلکہ اظہار ذلت ہے۔

(۶) یقطرن کا مفہوم قطرہ قطرہ کر کے ٹپکنا ہے۔ خون دشمن کا تقاطر حسن بیان نہیں کہلاتا اس لئے یسیلن ہونا چاہئے تھا جس سے خون کا سیلاب ظاہر ہوتا اور فاتح کی تیغ زنی کی شدت کے ساتھ خون دشمن کی بے انتہا روانی پائی جاتی۔

(۷) اسی طرح دم کی جگہ دماء ہونا چاہیے تھا تاکہ کثرت خون ریزی عیاں ہوتی اور کلام میں حسن و خوبی پیدا ہو جاتی۔

ان اعتراضات کو سن کر حضرت حسانؓ متحیر ہوئے اور چپ ہو گئے کوئی جواب نہ دیا۔ اللہ اللہ کیا زمانہ تھا کیا ذوق سلیم کیسی طبیعتیں تھیں اور کتنی منصف مزاجی۔

خنساء تمام شعراء عرب میں افضل مانی گئی ہے۔ بلکہ بعض نے تو اس کو اس کے ہمعصر شعراء سے بھی بہتر خیال کیا ہے۔ چنانچہ بشار سے ایک دفعہ پوچھا گیا کہ خنساء کی شاعری کی نسبت آپ کا کیا خیال ہے۔ بشار نے کہا کہ "قلل فوق الرجال" یعنی یہ عورت تو مردوں سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ اسی طرح جریر سے کسی نے پوچھا کہ اس وقت ملک میں سب سے بہتر شاعر کون ہے۔ جریر نے کہا کہ میں سب سے بہتر ہوتا اگر یہ خبیثہ (خنساء) نہ ہوتی۔

خنساء نے زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام دونوں زمانوں کو دیکھا ہے حضرت پیغمبر خدا صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام سے بھی مشرف ہوئی ہے۔ اور حضرت کو اپنے شعر بھی سنائے ہیں جنکو سنکر حضرت خوش ہوئے ہیں۔ اسکی وفات ۲۴ھ میں ہوئی ہے۔

خنساء شاعرہ ہونے کے علاوہ حاضر جواب اور بدیہہ گو بھی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنے بھائی کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے۔ اسے سن کر کسی نے کہا کہ تو نے بھائی کی اتنی تعریف کی کہ باپ کے مرتبہ کا کچھ خیال نہ کیا۔ یہ سن کر خنساء نے فوراً چند شعر اور اُسے موزوں کر کے سنا دئے اور کہا۔ شاید آپ نے پورا قصیدہ نہیں سنا۔ ان اشعار میں بھائی کو باپ کے برابر بھی ظاہر کیا تھا اور پھر باپ کے مرتبہ کی رعایت بھی ملحوظ رکھی تھی ان میں کے دو شعر یہ ہیں ؎

او لی فاولی ان یساویه — لولا جلال السن والکبر
وهما وقد برزا کانهما — صقران قد حطا علی وکر

بیشک یہی اولی ہے کہ میرا بھائی میرے باپ کے برابر ہوتا۔ اگر سن میں میرا باپ اس سے بڑا نہ ہوتا (یعنی کبر سن کے سوا۔ میرا بھائی ہر بات میں باپ کے برابر ہے) اور وہ دونوں ایسے ہیں گویا کہ دو شکرے ایک آشیانے میں اتر آئے ہیں۔ خنساء صاحب دیوان ہے۔ اس کا دیوان بیروت میں طبع ہوا ہے۔ اس میں ایسے کئی واقعے درج ہیں۔

سید نوازش علی لمعہ

تاریخ کا مطمح نظر

لارڈ میکالے کا قول ہے کہ علم تاریخ کا معراج کمال - ایک مجموعہ ہے شاعری اور فلسفہ کا - اگرچہ اس معراج کا عرش دنیا کے کسی مورخ کے دسترس میں نہیں آیا - تاہم تاریخ کوئی کا فن آغاز آفرینش سے رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ جن مختلف سانچوں میں ڈھلتا آیا ہے - ان سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کا کاریگر بھی اسی جادۂ عجیب و غریب میں قدم فرسا ہے جس کا خواب میکالے نے دیکھا تھا -

اس کی ایک جانب تو پھولوں سے لدے ہوئے سرسبز درختوں کی قطار ہے نسیم سحر کے نرم نرم جھونکوں سے رہ رہ کے پتلی شاخیں جھومنے لگتی ہیں برابر میں صاف و شفاف پانی کی نہر جاری ہے - جس کی نازک اور خوش منظر لہروں میں سورج کی سنہری کرنیں اُلجھ رہی ہیں - رنگ رنگ کے پھول ڈالیوں کی جھولوں میں جھولتے ہیں اور اس بہنے والی موسیقی کے ہم آہنگ ہو کر نواسنجیاں کر رہے ہیں - غرضیکہ ایک عالم ہے جس کے نشۂ تصور سے آنکھیں کیف اندوز اور طبیعت از خود رفتہ ہو جاتی ہے -

دوسری طرف چند سر بفلک پہاڑوں کا طویل سلسلہ چلا گیا ہے - ان کی بلند نکیلی چوٹیاں مکروہات روزگار کے بادلوں کو چیر کر انتہائے رفعت پر حکمرانی کر رہی ہیں دامن کوہ میں جو خوفناک غار ہیں ان کی گہرائی تن مساحت کے بس کی نہیں معلوم ہوتی - ان کی تاریکی میں خون آشام درندوں کے دہاڑنے کی آوازیں گونجتی ہیں کہیں کہیں کسی شامت زدہ اژدہے کی زہریلی پھنکار سے اطراف کی زمین دور تک ہل جاتی ہے غار کیا ہیں گویا دہان قبر ہیں جو موت نے جمائی سُلئے ہوئے اپنی پوری کشادگی اور زشت روئی کے ساتھ کھول لئے ہیں - اطراف و اکناف کوہ میں کسی چوڑی چکلی چٹان پر ایک مقدس ہستی آنکھیں بند کئے تنہا مراقب ہے - اعضائے جسمانی میں سے سوائے سر کے کوئی حصہ دکھائی نہیں دیتا جس کا محیط معمول سے بہت بڑا اور منور ہے - حالت ظاہری سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بزرگ ہستی کو علائق دنیوی سے کبھی کوئی

واسطہ نہیں رہا ہوگا لیکن ان سپید ابروؤں کے آثار چڑھاؤ کو دیکھنے سے منتشر زندگی کے نہایت پُرشور ہنگاموں کے آثار عمر در ہویدا ہیں۔ زندگی کا کوئی تجربہ نہ ہوگا جس کی ایک خاص شکن اس میں موجود نہ ہو۔ چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کو بھی مشاہدہ کے دامن میں لے کر اس کی اور اس کے متعلق جملہ حالات کی کنہ حقیقت دریافت کرتا ہے حتیٰ کہ اس کے اسباب و نتائج کے مابین ایک قدرتی سلسلہ قائم ہوجاتا ہے اس لئے یہ وسعت و رفعت گہرائی و خشکی غور و خوض کا مجموعہ ہے۔

الیس احمد انصاری

موتیوں کی مالا

کسی کی تضحیک کرنا۔ اس کی نگاہ میں اپنا وقار کھو دینے کا نہایت آسان نسخہ ہے۔

انتہائی ذلت۔ انتقام کی خواہش کو بھی فنا کر دیتی ہے۔

خفت کا تکدر۔ زندگی کی دلفریبیوں کو بھی محسوس نہیں ہونے دیتا۔

عورتوں کی نزاکت صرف مردوں کا تخیل ہے۔ مرد انھیں نازک کہہ کہہ کر زبردستی نازک بنا دیتے ہیں۔

صورت افلاس۔ افلاس سے زیادہ تکلیف دہ ہے افلاس سے صرف اپنے آپکو تکلیف ہوتی ہے اور اس سے دوسروں کو بھی

گناہوں سے مغلوب انسان خزاں رسیدہ پتہ ہے جو ہوا کے ہلکے سے جھونکے کا بھی متحمل نہیں ہوتا

محبت کینہ اور پرخاش سے قطعاً بے لوث ہوتی ہے۔ وہ اس دامن میں بھی منہ چھپانے سے عار نہیں کرتی۔ جو اس کے عزیزوں کے خون سے بھی آلودہ ہو۔

سخت صدمے کے وقت دل و دماغ کی ساری قوتیں۔ سارے جذبات۔ سارے حسیات سب ایک ہی طرف رجوع ہوجاتے ہیں۔ جیسے ندی کا کوئی بڑا کڑارا جب ٹوٹ کر گرتا ہے۔ تو آس پاس کا تمام پانی چاروں طرف سے سمٹ کر اسی خلا کو پورا کرنے کے لئے دوڑتا ہے۔

(پریم چند)

اندلس اور اسلام

(از مسٹر ایس۔ پی اسکاٹ امریکی)

یورپ میں "سلطنتہائے اسلامی" کے نام سے۔ "ایس۔ پی اسکاٹ" نے ایک ضخیم تاریخ اندلس لکھی ہے۔ اس کتاب کی تین جلدیں ہیں۔ میں نے حسب ایمائے مصنف ان کا ترجمہ اس شرط پر کیا ہے کہ اردو ترجمہ کرنے کے بعد عربی۔ فارسی زبانوں میں بھی ترجمہ کروں۔ چنانچہ اردو کا ترجمہ تو تکمیل پاکر عنقریب پریس میں جانے والا ہے۔ عربی و فارسی میں اب مصروف ہوں۔

یہ اسی کتاب میں سے کچھ صفحات ہیں جنھیں مدیر "مخزن" کا خلوص خاطر مجھے قبل از اشاعت کتاب نذر احباب کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔　　　(خلیل الرحمن)

یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ جس سرعت کے ساتھ فتح اندلس کے بعد لوگ مسلمان ہونے شروع ہوئے تھے۔ تمام اسپین کیوں نہ مسلمان ہو گیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو لوگ پورے طور پر دین عیسوی پر قائم رہے۔ ان کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ جو لوگ مسلمان ہوئے۔ ان میں زیادہ تعداد اُن لوگوں کی تھی کہ جو عالی خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ غلام اور غلامان رقیق کے جم غفیر میں سے بہت کم ایسے تھے جو موجودہ آزادی و آیندہ کی آسانی اور اقتدار کے بدلے میں اپنا مذہب چھوڑنے پر تیار تھے۔ صوبہ اشبیلیہ کے کثیر التعداد عیسائیوں نے ابتدا ہی میں اپنا مذہب چھوڑ دیا تھا۔ اور عبدالرحمن ثانی نے ان کے لئے ایک مسجد علیحدہ بنوادی تھی۔ قیدیان حرب میں سے زیادہ آدمی بغیر کسی حیل و حجت کے مسلمان ہو گئے۔ یہ بھی خدا تعالیٰ کی ایک قدرت کاملہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو سخت امتحان کے وقت متزلزل نہیں ہونے دیتا۔ اگر اس سے قطع نظر کر لی جائے تو حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ کچھ سیاسی اور تمدنی وجوہ ایسی پیش آگئی ہوں گی کہ تمام اندلس من حیث القوم مسلمان نہیں ہوا۔

اور حقیقت میں بات بھی یہی تھی ۔ لوگوں نے جو مسلمان ہونے سے انکار کر دیا ۔ ان کے وجوہ
اگر تلاش کئے جائیں تو منجملہ اور باتوں کے سب سے اہم وجہ نومسلموں کے ساتھ برا سلوک ہی ۔ نومسلموں
کے گروہ میں سب سے زیادہ تعداد آزاد لوگوں کی تھی ۔ باوجود اس کے کہ ان کے سابق آقاؤں نے
اُن کو شروع شروع میں مساوات کامل دے رکھی تھی ۔ اب وہ ان سے چھن گئی ۔ اُن پر جو عام طور پر
اسرو عبودیت کا دھبہ تھا ۔ وہ تمام برادری کے لئے وجہ طعن بن گیا ۔ اگرچہ ان میں سے بہت سے
آدمی اپنے عقائد کے پکے اور سچے تھے ۔ مگر اور لوگ صاف طور پر کہہ دیتے تھے کہ ہم تو فلاں وجہ سے
مسلمان ہو گئے ۔ مسلمانوں کو جب اس کا علم ہوا تو وہ نومسلموں کو نہایت ذلت کی نگاہ سے دیکھنے لگے
کھلے طور پر اُن کی بے عزتی ہونے لگی ۔ معیوب الفاظ سے ان کو یاد کیا جانے لگا ۔ جو لوگ گاتھک سلاطین
کے زمانے میں ارکان سلطنت اور امراء رہ چکے تھے ۔ ان کو بھی ادنیٰ درجے کے مسلمان بری نگاہ
سے دیکھنے لگے ۔ دولتمندی ۔ جوہر ذاتی ۔ لطافت مذاق یا تعلیم ۔ غرض کوئی چیز بھی ذلیل ترین آدمیوں
کے ہاتھ سے ان کو محفوظ نہ رکھ سکتی تھی ۔ بہت ہی کم ایسا اتفاق ہوتا تھا کہ کسی نومسلم کو خواہ وہ کتنا ہی
لائق کیوں نہ ہو ۔ کوئی بڑا عہدہ دیا جاتا ہو عیسائیوں کو بڑے بڑے عہدوں تک ترقی کر جانے کی امیدیں تھیں
ہاں نہیں تھی تو ان نومسلموں کو جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھتے تھے ۔ جب کسی برادری
کے افراد کی تعداد بڑھ جائے اور وہ طاقتور ہو جائیں تو وہ خاموشی کے ساتھ اپنی ذلت کو گوارا نہیں
کر سکتے ۔ اسلامی سلطنتوں کے انحطاط کی بڑی وجوہ میں سے ایک اہالی عرب کا غرور بھی تھا ۔ ابھی یہ
تباہ کن پالیسی اختیار کئے ہوئے بہت عرصہ نہیں گزرا تھا کہ یہ سیاسی غلطی بار آور ہونے لگی ۔ اور اس کے
برے نتائج ظاہر ہونے لگے ۔ ہر گروہ میں جاسوسی شروع ہو گئی ممالک شمالی کے عیسائیوں سے غدارانہ
خط و کتابت ہونے لگی ۔

الحکم اول کے زمانے میں قرطبہ کے جنوبی مضافات میں ایک خونریز غدر ہو گیا جفصون نے
ایک فوج بھرتی کر لی اور وہ تیس سال کامل افواج خلافت سے لڑتی رہی ۔ نومسلم تعداد میں تمام
لوگوں سے زیادہ تھے ۔ اگر ان کا نظام اچھا ہوتا ۔ اور سپہ سالار لائق ملتے تو وہ اپنے مغرور مخالفوں کو
سمندر میں جا ڈبوتے ۔ جب عربوں کا زور ٹوٹا اور ان کا گروہ تباہ ہو گیا ۔ تب جا کر کہیں ان نومسلموں
کی حالت درست ہوئی ۔ مگر اس وقت تک لوگوں کا اسلام کی طرف میلان اور شوق بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا

غیر مذہب کے لوگ جو مذبذب ہو گئے تھے اب وہ بھی اپنے اپنے مذہب کے سختی کے ساتھ پابند ہو گئے۔

اور اسباب بھی اس جمود میں مددگار ہوئے۔ نظام دین اسلام کے موافق تمام امور دینی متوسط با احکام الٰہی ہیں۔ اسی بنا پر مومنین کے دلوں پر یہ خیال مستولی رہتا ہے کہ اکثر باتیں خلاف عادت ظہور پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ دوسری طرف بادشاہ وقت وارث تخت نبی و قائم مقام رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سمجھا جاتا ہے۔ جو طریقہ کہ حکم الٰہی پر مبنی ہو۔ وہ فتنہ و فساد سے مبرا عیوب و نقائص سے خالی اور نفاق و شقاق سے دور ہونا چاہیے۔ اس کا بری عن الخطا ہونا۔ اس کے احکام کا ثابت ہونا چاہیے۔ اور اس کے علم کو کہیں بھی سرنگوں نہ ہونا چاہیے۔ مگر اسلام وحدت بندی۔ اور اختلافات سے پارہ پارہ ہو گیا۔ ہر طرف سے چھوٹے چھوٹے سلاطین ایک دوسرے کے مخالف اپنے اپنے حقوق سلطنت جمانے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ جہاں دو فرقوں میں جنگ و جدال ہو وہاں بدعتی اور صحیح الاعتقاد یا مستحق اور غیر مستحق میں فرق و امتیاز کرنا ہمیشہ ناممکن ہے۔ اسٹریاس کے نیم وحشی پہاڑی لوگوں کی فوجوں کے سامنے مسلمانوں کی فوجوں کو اکثر بے عزتی کے ساتھ بھاگنا پڑا ہے۔ اگر قرون وسطی کی جہالت کے معیار کو خیال کیا جائے اور اس کو دیکھا جائے کہ بدلی کا دوسرا نام غلبہ ہے۔ تو اسلام اس مذہب سے بہتر نہ تھا جس کو انھوں نے مغلوب کیا تھا۔

ماسوا اس کے اسلامی تہذیب جس کے فیوض و فوائد میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا متعبدین مخلص کی کوششوں کا نتیجہ نہ تھی۔ بلکہ علماء دین بلا کسی استثنا کے اس کے خار راہ رہے ہیں انھوں نے علم کو ہمیشہ مذموم قرار دیا ہے اور فلسفہ کو مبغوض بتلایا ہے۔ ان کے نزدیک علوم ادبیہ سے لطف اٹھانا۔ اور ان میں کمال حاصل کرنا مکروہ تھا۔ طالب علمان قرطبہ اپنے علم و فضل زنت و لطافت اور تہذیب و اخلاق میں مشہور تھے۔ علماء دین کسی صورت میں ان کے مساوی نہ تھے۔ علماء اپنے جسم کے متعلق بالکل غافل تھے۔ ان کے مزاجوں میں خشونت تھی۔ لہجہ نہایت سخت تھا۔ زبان خلاف قاعدۂ صرف و نحو تھی اور گستاخی روزمرہ۔ ان کی رائے میں ایک مخبوط الحواس تو ملہم تھا اور ایک سائنس دان عالم شیطان کا ہتھیار۔

مگر یونیورسٹی قرطبہ کے استادوں کی یہ حالت نہ تھی۔ ان کے ہاتھ میں قوم کے دل تھے اور وہ ممالک غیر سے آئے ہوئے شوقین لوگوں کے دلوں کو منور کرتے تھے۔ ان ہی کے درس تھے کہ

جن میں عیسائی طالبعلم نہایت خوشی کے ساتھ شامل ہوتے تھے۔ کوئی شعبہ اور کوئی شاخ علم کی ایسی نہ تھی کہ جس میں ان کو تجربہ حاصل نہ ہو۔ کوئی ادق مضمون ایسا نہ تھا کہ جس کی وہ تفسیر نہ کر سکتے ہوں اور اس پر بحث کرنے میں اپنا علم اور فصاحت و بلاغت نہ دکھلا سکتے ہوں۔ عقائد کے لحاظ سے ان میں سے ہر فرد وہی تھا کہ جس کو زمانہ حال میں لا ادری کہتے ہیں اور بعض تو مسلمہ ملحد تھے۔ ان سے قرآن و حدیث کے متعلق جب کبھی ذکر آتا تو وہ مسکرا کر خاموش ہو جاتے تھے۔

قرطبہ کی یونیورسٹی علمائے معقولی کے ہاتھوں میں تھی۔ اور ان کا اقتدار ایک مدت سے تمام ملک محروسہ پر مسلم تھا۔ اگرچہ یہ لوگ بعض وقت مسجدوں میں درس دیتے تھے۔ مگر ان کو مذہب یا علمائے منقولی سے کسی قسم کی ہمدردی نہ تھی۔ ان کی مفصل تعلیمات کو مسلمان فقیہہ اور عیسائی پادری نسلاً بعد نسل مکروہ سمجھتے آرہے تھے۔ اس یونیورسٹی کے دروازے ہر قوم و ملت کے ذہنی اور شوقین طالبعلموں کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ بلالحاظ عقائد آباؤ اجداد اس کے اعزاز ہر طالبعلم کو ملتے تھے۔ اس کے عظیم الشان کتب خانوں میں مسلمان۔ عیسائی۔ بدھ اور یہودی سب یکساں تفحص کیا کرتے تھے۔

ایسی صورت میں یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ عیسائیوں کا مسلمان ہو جانا مستقل طور پر رُک گیا۔ نومسلموں پر دست درازی۔ آئے دن کے بلوے۔ عقائد کی ابتری۔ علماء دین کی درشتی اور نامعقولیت۔ ان لوگوں کی گمراہی کہ جو دین قویم کی تفسیر و تاویل کرنے کے اہل تھے تعلیم کا عام ہونا۔ اور اس میں ہر طرح کی آسانیاں میسر ہوئی۔ اپنے مذہب کو چھوڑنے اور دوسرے مذہب کو اختیار کرنے کے مانع تھے نہ کہ محرک۔

اہالی کلیسا سوائے علم دین کے ہر قسم کے علوم سے سخت دشمنی ظاہر کرتے رہے ہیں۔ یہ خیال نتیجہ تھا ان اختیارات کا جن کو وہ صدیوں سے استعمال کرتے چلے آرہے تھے تاکہ لوگوں میں عقل نہ آنے پائے اور جذبات معقول کا خیال بھی ان میں نہ پیدا ہو۔ بہرحال ان پادریوں کو عیسائیوں کے اس روشن خیال فرقے سے بالکل خوف نہ تھا۔ مسلمانوں کی بے نظیر قابلیت اور بے مثال ترقیات کے مقابلہ میں آبار کلیسا کی غیر مسامحانہ تعلیمات کہاں تک قائم رہ سکتی تھیں۔ وہاں اگر دلوں کو تاریک کر دینے کی ترکیبیں کی جاتی تھیں۔ تو یہاں اسلامی آزادی تھی۔ اور اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ مبارک اُن کا معمول بہ تھے "کہ جو کوئی حصول علم کے لئے راستہ چلتا ہے خدا تعالیٰ

اس پر جنت کا راستہ آسان کرے گا ایک عالم کو ایک عابد پر وہی تفوق حاصل ہے جو تمام ستاروں پر بدر کامل کو" عام صدقات و مبرات بنی نوع انسان سے عام ہمدردی و فائدہ رسانی برکات تعلیم کا بلالحاظ ملت و قومیت عام ہونا، اسلامی تہذیب کا عام طور پر تمام تہذیبات سے برتر ہونا۔ عام میل جول کا قوی اثر دوسروں پر پڑنا مسلمانوں کی عام طور پر تقلید۔ تجارت کی انتہا ترقی، اس کے ذریعہ سے حصول دولت۔ عام طور پر دنیادی وجاہت۔ عیش و عشرت یہ تمام وہ چیزیں تھیں کہ گو اُن کے ہوتے ہوئے لوگ نقل مذہب کی طرف مائل نہ ہوں۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ ان تمام باتوں نے مل کر نوجوان عیسائیوں کے عقائد و استقامت مذہبی کی جڑوں کو بالکل کھوکھلا کر دیا تھا۔

فلسفیان قرطبہ کی تعلیمات، مسلمہ اصول اور مذہبی خیالات کے لئے موزوں نہ تھی۔ پادری اپنے مقلدین کی تشکیک اور بدعقیدگی کو سخت خوفزدہ نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اندلسی عربوں کی ہر شعبہ علم میں تعداد زیادہ تھی۔ صیغہ جنگ میں کامیابیاں ان کے پیش پیش تھیں ان کی ذہانت۔ انکی لیاقت ان کے اخلاق و آداب۔ ان کی متزلزل کر دینے والی شان و شوکت اور دولت و ثروت عیسائیوں کی ہونہار نسل مرعوب ہوتی چلی جاتی تھی۔ اور ان سب کا اثر ان پر ایسا پڑتا چلا جاتا تھا کہ پادریوں کے وعدہ و وعید، اور ہر ہفتہ ہزاروں کلیسائی منبروں پر سے ان پر لعن و طعن بھی اس رعب و اثر کو کسی طرح کم نہ ہونے دیتی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں مذہبوں کا تقابل کہ ایک آسمان پر تھا تو دوسرا زمین پر۔ ایک خالی الذہن اور غیر متلاشی حق کو حیرت میں ڈال دیتا تھا۔ ایک طرف تو گرجا سونے بڑے تھے اور ان کے بھیانک قبے، تنگ و تاریک قبروں کے تہ خانے۔ خانقاہ اور اس کی تیرہ و تار حجرے۔ صندوق ذخائر القدوسین اور اس کی سڑی ہوئی لاشیں اور مکروہ ہڈیاں۔ ایک عجیب متضاد طریقہ جس کے رو سے اگر ایک ہاتھ میں صدقات و مبرات کی سند تھی تو دوسرے ہاتھ میں احتساب کی تیغ عریاں۔ قسی القلب پادریوں کے جبر و جور۔ علم سے نفور کرنے کے منظم طریقے۔ کرسی اعتراف خطایا تھی اور اسرار پنہانی کا اظہار۔ عابدین کی جماعت تھی اور نغمے اور زمزمے ایک نا معلوم زبان میں بے معنی نماز تھی۔ اور جاہل عیسائی کفارے اور عقوبت دینیہ تھیں اور اس کی ذلیل کن تکالیف شاقہ۔ دوسری طرف مسجدیں کھڑی تھیں اور جن کی عمارتیں روشن۔ ہوادار اور خوبصورت تھیں، ان کی خوش وضع میناریں آسمان تک پہنچی ہوئی تھیں، ان کے کشادہ صحنوں میں نخل اور نارنگی کے درختوں کا سایہ تھا۔

ہزاروں غیر ملکی پھولوں کی خوشبو سے تمام ہوا طبلۂ عطار بنی ہوئی۔ فواروں سے پانی گرنے کی سرور بخش آواز سے خوش آیند باجے کی آواز نکلتی ہوئی۔ دیواریں نہایت خوشنما چمکدار پچی کاری سے چمکتی ہوئی محرابوں میں سنہرے حروف سے لکھی ہوئی قرآنی آیتیں (امام کے کھڑے ہونے کی) محراب منبت کاری سے سونے کی طرح دمکتی ہوئی۔ جو پرانے افسانوں کے موافق انسان کا نہیں بلکہ جنوں کا کام معلوم ہوتا تھا۔ اماموں کے وہ خطبے تھے کہ جن کو ہر ماموم خواہ کسی حیثیت و قابلیت کا ہو سمجھ سکتا تھا۔ اور عبادت کا وہ سادہ طریقہ جس میں حضور قلب بھی تھا اور خشوع و خضوع بھی۔

ایک طرف مصنوعی نیکیوں کا اظہار تھا۔ مکروہ شہوانی جذبات تھے۔ جو لازمۂ تجرد میں تفرّج و تفنن کا جس کے بغیر صحت اجیرن اور زندگی دوبھر ہو جاتی ہے نام لینا بھی گناہ تھا سخت و کرخت رہبانی مجاہدات اور ریاضات تھے۔ کسی طرح نہ چھپنے والی افراط تھی کہ جس کو فطرت انسانی ایک خودساختہ مداہنت و فریب کا بدل یا تحلیل سمجھتی ہے۔ نیم دیوانہ۔ پرجوش لوگوں کی خود کام "شہادت" تھی۔ کفار اور خارج عن الدین لوگوں کی تقلید۔ اہالی کلیسا کی تمثیل جہالت تھی یعنی اخلاقی دنائت و ذلت اور جسمانی ناصافی اور عدم طہارت۔ دوسری طرف حرم سرا کی عیش و عشرت تھی۔ جسمانی و دماغی ہمت و حمیت تھی جو تمام عصبات و عضلات اور قوت دماغی کی کثرت ورزش سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ فوائد تھے جو زیادتی غسل و طہارت سے آدمی کو پہنچتے ہیں۔ شاہانہ حماموں کے درجہ بدرجہ کمرے تھے۔ بے انتہا سامان راحت تھے۔ جو اس سوسائٹی کے مخترعہ یا ماخوذہ تھے۔ جو ہر نئے خیال اور ہر پرانے تجربے سے فائدہ اٹھانے کے لئے اُدھار کھائے بیٹھی تھی۔ ایک طریقۂ تعلیم کا فیضان تھا کہ جس کی خوبی کا کوئی مثیل نہ تھا اور جس کی گرد کو بھی زمانۂ قدیم اعقل استاد نہیں پہنچتے تھے۔ بڑے بڑے کتب خانے تھے کہ جن میں قدیم و جدید علم کے خزانے بھرے پڑے تھے اور لٹ رہے تھے۔ دار المعارف کے درس تھے۔ علمائے سائنس کے محیر العقول تجربات تھے۔ اجلے میلوں کی رونقیں تھیں۔ مذاکرات علمیہ کے ابحاث و مناظرات تھے۔

صحیح الاعتقاد عیسائیوں کا اصول قانون بے بنیاد واہمہ پر مبنی تھا۔ ان کے مقدمات ایک غیر محقق دستور العمل کے موافق فیصل ہوتے تھے قسموں پر انحصار ہوتا تھا اور آگ اور پانی منصف ہوتے تھے۔ غلامان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدمات قاضی کے سامنے پیش ہوتے تھے جو ایک مقررہ

قانون کا پابند تھا۔ اور وہ از روئے دین و ایمان تمام معاملات و مقدمات کا بے رو رعایت فیصلہ کرنے پر مجبور تھا۔

جب کوئی عیسائی بیمار ہوتا تھا تو معالجین یہ کوشش کرتے تھے کہ جن ارواح خبیثہ کی وجہ سے یہ بیماری لاحق ہوئی ہے۔ اس کو رفع کریں۔ کبھی تو وہ گرجاؤں کی قربان گاہوں سے باندھا جاتا تھا۔ کبھی اولیاء سے استمداد کی جاتی تھی کبھی تبرکات استعمال ہوتے تھے کبھی تعویذ باندھے جاتے تھے اور جب کوئی مسلمان بیمار ہوتا تھا تو وہ شفاخانہ پہنچا دیا جاتا تھا۔ جو بیت المال کے خرچ سے قائم تھا۔ مرض کی تشخیص اور اسباب مرض کی تحقیق کی جاتی تھی۔ اور جب تک وہ شفاخانے میں رہتا تھا طبیبانِ حاذق اس کے معالج رہتے تھے اور تیماردارانِ شفیق اس کے خبرگیراں۔

پاپائے روم اور روم کے پادری نواز دہاقین۔ شرقیین کو دشمن خدا کہتے تھے اور بنی نوع انسان کا تباہ کن جانتے تھے لیکن جو عیسائی کہ با امن و امان انہی شرقیین کی سلطنت میں رہتے تھے۔ ان کے الطاف سے بہرہ ور۔ ان کی تعلیم سے مستفید اور ان کی مہمان نوازی سے مستفیض ہوتے تھے وہ خوب جانتے تھے کہ ان دیہاتیوں اور ان کے پادریوں کے افترا و بہتان کہاں تک صحیح ہیں۔ ان لوگوں کی خباثت جب کبھی زور کرتی تھی تو خود اُن پر اور مسلمانوں کی رعایا عیسائیوں پر۔ ان کی شرافت و نجابت ظاہر ہوتی تھی۔ اس وقت یہ دیکھتے تھے کہ یہ لوگ کیسے وفاشعار دوست اور جاں باز دشمن ہیں۔ عربوں کے درمیانی مناقشات اور ان کا ان لوگوں سے بُرا سلوک کہ جو بطیب خاطر مسلمان ہوئے تھے سب سے بڑا ذریعہ اس کا ہوا کہ فاتح و مفتوح ایک نہیں ہو گئے۔ ورنہ مفتوحین ایسے راستے پر پڑ ہی چکے تھے کہ کچھ ہی دنوں میں وہ سب مسلمان ہو جاتے۔ اگر یہ وجہ نہ پیدا ہو جاتیں تو چند ہی صدیوں کے بعد مسلمانوں کی تمام رعایا مسلمان ہوتی۔ انھوں نے فاتحین سے تعلقات و قرابت صحریت قائم کر لی تھی۔ تجارت نے آپس میں دوستی پیدا کر دی تھی۔ اور تعلیم۔ زبان اور عادات کے لحاظ سے دونوں ایک ہو ہی چکے تھے۔

فی الحقیقت کیفیت یہ تھی کہ عیسائی رعایا خلافت اور ان کے بادشاہ کے درمیان ایسے مخلصانہ تعلقات تھے کہ مسلمانوں کے آپس میں بھی ایسے گہرے نہ تھے۔ عربوں کے درمیان آپس میں جو منافرت پشتہا پشت سے چلی آتی تھی وہی آگ یہاں بھی بھڑکی۔ اور اسی نے اُن کی اس عظیم الشان سلطنت کو بھسم کر کے رکھ دیا۔ فقط

خلیل الرحمن

اُردو زبان کی توسیع و ترقی

مانوس و غیر مانوس الفاظ

آج کل اردو کی ادبی دنیا میں تحقیق و تدقیق الفاظ و محاورات کی دلچسپ و مفید بحث کا سلسلہ جاری ہے۔ ہر شیدائے ادب اسے قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ دنیا کی تمام مکمل و مبسوط زبانیں اسی قسم کی مربیانہ کوششوں سے پایۂ تکمیل کو پہنچی ہیں۔ خدا ان مقدس بزرگوں کے مزاروں کو گلہائے رحمت سے گلپوش فرمائے جن کی آغوش سرپرستی میں معصوم اردو پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔ مبارک ہیں وہ مساعی جمیلہ جو اردو کو پروان چڑھانے میں صرف ہوئیں اور ہو رہی ہیں۔ اور چوم لینے کے قابل ہیں وہ ہاتھ جنھوں نے کشت اردو کی آبیاری کر کے اس میں وہ وہ خوشنما پودے لگائے جن کے پھولوں کی مہک سے ایک عالم طبلۂ عطار بنا ہوا ہے۔

اگرچہ آج کل حالات حاضرہ کی حیرتناک نزاکت و پیچیدگی کی وجہ سے دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا ہے۔ خلافت و حریت ایسے مقدس مسائل کو بہترین طریق پر حل کرنے کے لئے جان سپارانہ مساعی عمل میں آ رہی ہیں۔ ترک موالات اور سوراجیہ کے زبردست نعرے سطح زمین سے بلند ہو کر گنبد افلاک میں ایک محشر خیز غلغلہ پیدا کر رہے ہیں۔ اور بعض ادیب بھی مجبور ہو کر سیاسیات کی طرف جھک پڑے ہیں۔ تاہم اس قحط الرجال و فقدان ذوق سلیم کے زمانے میں چند ایسی مقدس و وسیع النظر ہستیاں بھی موجود ہیں جو ثبات و سکون سے ادبی شاہراہ پر گامزن ہو کر اردو علم ادب کا دامن مختلف علوم و فنون سے بھر رہی ہیں۔ ایک ژرف بیں شخص ایسی کوششوں میں عملاً شریک ہونے یا زبان سے خراج تحسین و آفرین ادا کرنے کو "نقارخانے میں طوطی کی آواز"۔ "سرود بے ہنگام" یا "بے وقت کی شہنائی" سے تعبیر نہیں کر سکتا۔ ماہران علم اللسان جانتے ہیں کہ زبان کی ترقی و تکمیل اور ملک کی فلاح و بہبود میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وسعت خیالات کا راز تکمیل زبان میں مضمر ہے۔ اور پختگی خیال عملی جامہ پہن کر ہوشیار و بیدار مغز مدبر کے تاج حکومت میں الماس کی طرح دمکنے لگتی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مختلف مہذب و مکمل زبانوں کا بغور مطالعہ اور عمیق نگاہوں سے تماشا گاہِ عالم کا نظارہ ایک فہیم و فطین شخص کو ایسے زریں اصول سکھا دیتا ہے جن پر عمل پیرا ہو کر بہترین زندگی بسر کی

جا سکتی ہے۔ مگر جو لوگ اپنی زبان کی حتی الوسع خدمت کرکے اسے بڑی بڑی جامع و وسیع زبانوں کے دوش بدوش لا کھڑا کرتے ہیں۔ ان کی کامیاب کوششیں بھی مقابلتہً کچھ کم تعریف و ستائش کی مستحق نہیں ہوتیں وہ فائق الاقران و قابل رشک ہستیاں اپنی زندگی جاوید کی آپ ضامن ہوتی ہیں۔ روح القدس ان کے نخل بقا کو ہمیشہ آب حیات سے سینچا رہتا ہے جس کے لذیذ پھلوں سے آنے والی نسلیں شیریں کام ہوتی رہتی ہیں۔

زبان و ملک دونوں کی خوش قسمتی سے توسیع و ترقی اردو کے لئے اکثر انجمنیں قائم ہیں اور ہو رہی ہیں۔ اکثر علمی و ادبی موقت الشیوع رسالے خدمت زبان پر کمر بستہ ہیں اور متعدد جدید مجلات و رسائل نکل رہے ہیں۔ ہماری دنیائے ادب میں صحیح تنقید کا رواج بالکل نہیں ہے جس کا وجود ترقی زبان کے لئے ناگزیر ہے اس کی طرف خاص توجہ مبذول کرنی چاہیے۔ بلا شائبہ بخل و تملق عرض کرتا ہوں کہ ملک میں آج تک جس قدر کوششیں خدمت زبان کے متعلق کی گئی ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قابل تعریف وہ کامیاب کوششیں ہیں جن کا سہرا ارکین ندوۃ العلما کے سر ہے۔ صاحب اقتدار ریاستوں کو چاہیئے کہ ایسی درسگاہوں کی طرف عنان جود و کرم منعطف کریں۔ اور انھیں ہر قسم کی مالی ضروریات سے بے نیاز کرکے اپنی بیدار مغزی و روشن خیالی و علم دوستی کا ثبوت دیں۔

بعض اصحاب متروکات پر بہت زور دے رہے اور اپنے خیال کے مطابق سمجھ رہے ہیں کہ یہ بھی ترقی و وسعت زبان کا ایک مفید اصول ہے۔ بے شک اکثر الفاظ ایک خاص مدت کے بعد بالکل مردہ ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی جگہ نئے۔ خوبصورت و فصیح الفاظ پیدا ہو کر مستعمل ہونے لگتے ہیں (دیکھیے انسان و حیوان اور حجر و شجر تو ایک طرف۔ انقلاب کے بے پناہ تیروں سے الفاظ تک کے جگر بھی چھلنی چھلنی ہو جاتے ہیں) مگر جس لفظ کا پورا پورا مفہوم کسی دوسرے لفظ سے ادا نہ ہو سکے۔ اسے بے وجہ ترک کر دینا وسعت زبان کی چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانا ہے۔ مثلاً اکثر حضرات "سو" کو متروک قرار دیتے ہیں۔ مگر "جو ہو۔ سو ہو" کے جملے اور بہت سے دیگر فقرات میں "سو" کی جگہ نہ "وہ" کام دے سکتا ہے نہ "تو" اور نہ کوئی اور لفظ

مانوس و غیر مانوس الفاظ کی بحث بھی جس قدر مفید ہے اسی قدر عجیب و غریب ہے۔ اکثر حضرات جب کبھی کوئی ایسا لفظ (مفرد یا مرکب) دیکھتے ہیں۔ جو پہلے ان کی نظر سے نہ گذرا ہو۔ یا کانوں نے نہ سنا ہو تو جھٹ حکم لگا دیتے ہیں کہ چونکہ یہ لفظ غیر مانوس ہے۔ اس لئے قابل ترک ہے۔ یہ عجب معیار فصاحت ہے

کہ جو لفظ صرف و نحو کے رو سے تو درست ہو۔ مگر نظر یا کان اس سے ناآشنا ہوں۔ وہ ناقابل استعمال سمجھا جائے۔ بات یہ ہے کہ مضمون نگاروں، مصنفوں اور خصوصاً مترجموں کو دوران تحریر میں اکثر ایسے مواقع پیش آتے ہیں جہاں انھیں مرادف الفاظ استعمال کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ مثلاً ایک فقرے میں "محنت طلب" و "وقت طلب" دونوں ترکیبیں ایک ساتھ آپڑی ہیں تو تکرار کی غیر موزونی دور کرنے کے لئے کسی ایک ترکیب میں "طلب" کو "خواہ" سے بدلنا پڑے گا۔ جو قواعد کے رو سے بالکل صحیح ہے۔ کسی غیر زبان کے لفظ یا ترکیب کا ترجمہ کرتے وقت نہایت احتیاط سے کام لینا اور جو بہتر سے بہتر لفظ اس کے لئے مل سکے استعمال کرنا چاہیئے۔ مانوس وغیر مانوس کا جھگڑا ہی فضول ہے۔ ہر نیا مگر صحیح لفظ پہلے غیر مانوس معلوم ہوتا گو پھر آہستہ آہستہ رواج کی منزلیں طے کرتا ہوا۔ مانوس بلکہ فصیح و افصح بن جاتا ہے۔ انگریزی لفظ "پروٹسٹ" (PROTEST) کا ترجمہ "صدائے احتجاج" ہے۔ پہلے اسے کوئی شخص استعمال نہیں کرتا تھا۔ مگر اب جس اخبار کو اٹھا کر دیکھیئے بس اسی کا کلمہ پڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایسے ہزاروں الفاظ آپ کو ملیں گے جن کی پہلے کسی کو خبر بھی نہ تھی۔ مگر اب ہر شخص کے وردِ زبان ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جناب حمید میرٹھی مدیر "نظارہ" نے اپنے ایک نوٹ میں موسم گل کی ترکیب کو نادرست قرار دیا تھا۔ واضح ہو کہ "مَوسِم" عربی لفظ ہے اور گل فارسی۔ لہذا یہ اضافت جائز ہے۔ اگر شعرا "مَوْسَم" (بفتح سین) کو ہندی سمجھ کر اسے ہمدم و ماتم کا ہم قافیہ قرار دینا جائز سمجھتے ہیں تو سمجھا کریں مگر ایسا کرنے سے لفظ کی اصلی صورت میں ہرگز فرق نہیں آسکتا۔ یعنی یہ نہیں کہہ سکتے کہ مَوسَم (بفتح سین) ہندی الاصل ہے۔

خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی لفظ بِلا (بغیر) کو غلط قرار دیتے ہیں۔ اور سچ مچ جھوٹ موٹ میل جول۔ گول مول وغیرہ میں توابع مہمل کا استعمال جائز نہیں سمجھتے۔ میرے خیال ناقص میں بِلا (بغیر) بالکل درست ہے۔ کیونکہ (ب) و (لا) دونوں حرف عربی ہیں۔ عربی الفاظ کے ساتھ لفظ بلا کا استعمال "بے" کی نسبت زیادہ صحیح ہے یعنی بلا شک۔ بلا شائبہ وغیرہ "بے شک" "بے شائبہ" وغیرہ سے افصح ہیں۔ توابع مہمل کا استعمال بھی درست اور بالکل درست ہے۔ زبان کا خزانہ فصیح و درست الفاظ کے مختلف۔ خوبصورت سکوں سے بھر دینا چاہیئے۔ صحیح الفاظ کو غلط یا متروک قرار دے کر زبان کا دائرہ تنگ نہیں کرنا چاہیئے۔ مکتوبات امیر مینائی (مرحوم) میں مولف صاحب نے حضرت امیر و جناب داغ

کے کلام کا موازنہ کرتے ہوئے ایک جگہ رقم فرمایا ہے کہ مرزا داغ (مرحوم) نے عظیم کی جمع عظام لکھی ہے۔ جو غلط ہے۔ حالانکہ امر واقع یہ ہے کہ "عظیم کی جمع "عِظام" "عُظّام" دونوں طرح درست ہے تحقیق و تصدیق کے لئے قاموس یا صراح ملاحظہ فرمائیے۔ شک رفع ہو جائے گا۔ منشی احمد اللہ صاحب العصر کے کسی پرانے پرچے میں اردو رسائل پر نقد و نظر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ عربی قواعد کے رو سے صرف اسماء فاعل و مفعول کے ساتھ علامت "یئت" کا استعمال جائز ہے قطع نظر اس سے کہ آپ کا ارشاد کہانتک صحت و درستی پر مبنی ہے وسعت زبان اس امر کی مقتضی ہے کہ بہت سے نئے فصیح و درست الفاظ خود وضع کئے جائیں۔ انگریزی ترکیب "محمڈ نزم" کا ترجمہ تو اسلام کر سکتے ہیں مگر "کرسچینیزم" "اسلازم" "ہندوازم" اور "امپیریلزم" کے واسطے اردو میں "مسیحیت" یا "عیسائیت" "اسلامیت" "ہندویت" اور شہنشاہیت سے بہتر الفاظ موجود نہیں۔ اس کے علاوہ مختلف علمی اصطلاحات کے لئے نئے نئے مگر موزوں ترین الفاظ وضع کرنا ادیبوں اور زباندانوں کا فرض اولیں ہونا چاہئے۔

چند حضرات کے اسماء گرامی گنوانے سے خدا شاہد ہے مجھے کسی صاحب پر اعتراض کرنا مقصود نہیں۔ ذاتی حملہ کرنا عام اس سے کہ وہ نفس الامر کے مطابق ہو یا غیر مطابق میرے مذہب میں سخت ممنوع بلکہ حرام ہے میرا منتہائے نظر صرف یہ ہے کہ تحقیق و تصدیق اور اصلاح و درستی کو پیش نظر رکھ کر جہانتک ہو سکے زبان کا دائرہ وسیع کیا جائے۔

ممدوح الصدر حضرات اور دیگر زباندان اصحاب کی خدمت میں گذارش ہے کہ اگر میں غلطی پر ہوں تو معقول و مدلل بحث کر کے اس کی اصلاح کی جائے میں نہایت خوشی سے ہر معقول دلیل کا خیر مقدم کرنے کو تیار ہوں۔

میں یہاں چند الفاظ و تراکیب درج کئے دیتا ہوں جو واقعی غلط ہیں مگر اکثر تعلیم یافتہ حضرات ناواقفیت کی وجہ سے انھیں برابر استعمال کر رہے ہیں۔ یہ بڑی شرمناک غلطیاں ہیں۔ ان کے استعمال سے سخت احتراز کرنا چاہئے۔

غلط	صحیح	غلط	صحیح
لاچار	ناچار	تابعدار	تابع یا خادم
سنسنی خیز	سنسنی پیدا کرنیوالا	دھمکی آمیز	عتاب آمیز یا تہدید آمیز

ناراضگی	ناراضی	ادائیگی فرض	ادائے فرض
ایزادی	ایزاد	راشی (رشوت لینے والا)	مرتشی
غمی	غم	جلدی (فوراً)	جلد
فوق البھڑک	فوق البرق	عدیم الفرصتی	عدم فرصت
متلاشی	متجسس	رہائش	(۱) سکونت (۲) قیام (۳) بود و باش

مضمون غلط ہے مضمون صحیح ہے۔ کیونکہ یہ اجوف واوی ہے۔ مہموز العین نہیں۔ رجحان غلط ہے رجحان صحیح ہے "میں راضی خوشی ہوں" یہ فقرہ بھی غلط ہے۔ دوجرائم دو وزراء۔ اور دو اشعار وغیرہ محض غلط اور بالکل قابل ترک ہیں۔ تلاش کرنے سے ایسی کئی ترکیبیں اور الفاظ مل سکتے ہیں جن کا ترک کرنا لازم ہے۔ فارسی و عربی الفاظ میں عطف و اضافت کا استعمال جائز۔ مگر فارسی و ہندی یا عربی و ہندی الفاظ کی تراکیب بجز چند مخصوص حالتوں کے قطعاً ناجائز ہیں۔ بعض فاضل اصحاب کی زبانی میں یہ سن کر سخت حیران ہوا کہ یہ فقرہ "میں آپ کا مشکور ہوں" غلط ہے۔ جب ایک صاحب سے میں نے عرض کی کہ حضرت اس میں کیا غلطی ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ "مشکور کی جگہ" شکرگذار" یا "شاکر" ہونا چاہیئے۔ میں نے التماس کی کہ عربی میں مفعول بمعنی فاعل بھی استعمال ہوتا ہے۔ جب ہم اردو میں بھی منصور (مفعول) کو ناصر (فاعل) کے معنی میں برابر استعمال کرتے ہیں اگر مشکور کو شاکر کے معنی میں استعمال کیا جائے تو اس میں کیا قباحت ہے۔ یہ سنکر آپ نے اس معقول دلیل کو تسلیم کر لیا

یہ مضمون جس قدر تفصیل طلب ہے۔ اسی قدر مفید بھی ہے۔ چونکہ کثیر المشاغل ہونے کے علاوہ میری علمی قابلیت بھی بہت محدود ہے اس لئے بہت بہتر ہوگا کہ کوئی اور صاحب اس موضوع پر قلم اٹھائیں۔ تاکہ نظم و نثر (اردو) پر ایک جامع و مکمل تنقید ہو جائے اور ہماری زبان غلط الفاظ و محاورات کے زہریلے اثر سے محفوظ رہ کر ایک عالم پر اپنی ترقی وصحت اور وسعت و شیرینی کا سکہ بٹھائے۔

(ابو نعیم نشتر جالندھری)

نقاد کا میرے نزدیک مقصود یہ ہے کہ وہ خیالات سے۔ اصل آراء سے نتائج غور و فکر سے بھرا ہو اور ان کو لگاتار بیان کرتا چلا جائے۔ اور کہیں کہیں کیف کی مستی میں اس کی زبان سے بے اختیار اس شاعر کے اشعار نکل جائیں جس پر تنقید لکھی جا رہی ہو۔

پطرس

"کسی کو"

(از نتیجۂ فکر میاں تصدق حسین صاحب خالد بی-اے بٹالوی)

جلوہ پرست حسن دیکھ - عشق کی شان اسی میں ہے ۔ جب تو نوا طراز ہو - محفلِ جاں گداز ہو
جلوہ طرازِ عشق ہوں - حسن کی کامگاریاں ۔ یعنی عزیز کام دل - برق نگاہ ناز ہو
کیف قیود ہی تو ہے - اصلِ نظام آرزو ۔ تجردی طلب نہ تو - وقف رخِ مجاز ہو
جلوہ فزائے حسن ہو - اشک کی سی فتادگی ۔ رعبِ جلال انفعال - رشکِ جمالِ ناز ہو
بیخودی غنا سے ہے - شانِ بساطِ آرزو ۔ حسن ہو مائل نیاز - عشق فدائے ناز ہو
تیرے جنونِ شوق کی - ہوں وہ کرشمہ سازیاں ۔ حسن ہو سوز مضطرب - جلوہ عشق ساز ہو
لیلیٰ تحیر آشنا - قیس ہو جلوہ ریز حسن ۔ نہایتِ عشق تو ہے جب - غزنوی خود ایاز ہو
منزلِ عشق میں کہاں - فرصتِ رخت آگہی ۔ نغمہ طراز حسن تو - حسن سے بے نیاز ہو
بجلی سی دل پہ آگرے - طائر روح کانپ اٹھے ۔ شاہد قوم پر اگر - دستِ ستم دراز ہو
خاک فسردہ میں ترے - شعلے ہوں بیقرار سے ۔ سازِ شکستہ پھر ترا - گرم نوائے راز ہو
ز آتشِ نغمہ خودت - شعلہ بہ پیرہن شوی
شورِ الست بر زدہ - قصرِ ستم فگن شوی
فصلِ بہار ہو چکی - محملِ گل رواں ہوا ۔ بزمِ چمن کی خامشی - منظرِ جاں گداز ہے
شعلہ نوائیوں سے ہے - شورشِ بزمِ آرزو ۔ سعیٔ حصول مدعا - پیکرِ سوز و ساز ہے
اصل قیامِ قوم ہے - تابعِ ربط باہمی ۔ تاب و تب حیات کا - بس یہی ایک راز ہے
سرّ ثبات عشق ہے - جذبِ وجود ماؤ تو ۔ ورنہ تو فریب خوردۂ - جلوۂ امتیاز ہے
کشمکش آفریں ہوئیں - درد نوازیاں تری ۔ گلکدۂ خیال تو - نقشِ طلسمِ راز ہے
اے کہ تھی گرمیٔ نمود - سوزشِ عشق سے تری ۔ نغمہ طراز رازِ غم - تیرا شکستہ ساز ہے
تا بکجا فسردگی! تا بکجا ستم کشی! ۔ گرمیٔ سوزِ غم تری - شعلہ زنِ مجاز ہے

خیزو صدائے ہُوزدہ ۔ خنجرِ انتقام کش!
ملتِ تست در خطر ۔ دشنۂ بے نیام کش!

خالد

غزل

(از منشی فاضل عبد السمیع خانصاحب نکہت شاہجہانپوری)

چل دئے کیا جانے کیا غصے میں فرماتے ہوئے
دیکھ کر بیمارِ غم کو ہوش میں آتے ہوئے

گر پڑی بجلی مرے ہی خرمنِ امید پر
چار دن گزرے نہ گلشن کی ہوا کھاتے ہوئے

یوں شہیدانِ وفا اب تک رہیں ممنونِ یاس
سو گیا کیوں فتنۂ محشر یہاں آتے ہوئے

تیرے دیوانوں کو کیا معلوم دیر و خانقہ
پھرتے ہیں ہر آستاں پر سر کو ٹکراتے ہوئے

آج مجھ کو بھی دکھا دینا ہے اندازِ جنوں
عرصۂ محشر میں وہ پھرتے ہیں اٹھلاتے ہوئے

گر پڑے بجلی الٰہی خرمنِ امید پر
مدتیں گزریں دلِ شیدا کو سمجھاتے ہوئے

مرتے مرتے بھی نہ چھوڑی ہم نے اس بت کی گلی
عمر گزری حضرتِ واعظ کو بہکاتے ہوئے

اے اجل قرباں نہ ہوں اس کی نگاہِ ناز پر
کیوں ترے ممنون ہوں ملکِ عدم جاتے ہوئے

حضرتِ نکہت کو کیا جانیں بھلا ظاہر پرست
کل انھیں دیکھا تھا ہم نے بتکدے جاتے ہوئے

(نکہت شاہجہانپور)

نشترِ عشق

(از ابو نعیم نشتر جالندھری)

تلاشِ یار میں نکلے چمن سے بُو ہو کر
ہوئے ہم آپ ہی گم محوِ جستجو ہو کر

جنوں میں باغ کی دیوار پھاندنا کیا ہے
ہوائے دوش پہ اڑ جاؤں گا میں بو ہو کر

ابھی تو اشک کو دامن میں جذب کرتے ہو
کچھ اور رنگ نہ لائے یہ دل لہو ہو کر

جدھر نگاہ کرو - وہ ادھر ہے جلوہ نما نماز پڑھتے ہیں کیوں لوگ قبلہ رو ہوکر
خیال حضرت بنت العنب ضرور رہے
پیو شراب جو نشتر تو با وضو ہوکر

تخمیس مانی

(بر غزل حضرت غالب مغفور)

آہ! پامال ستم کیوں دل ناشاد نہیں میں تجھے یاد دلاتا ہوں اگر یاد نہیں
بخدا اور کوئی مقصد فریاد نہیں نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوہ بیداد نہیں

راہ الفت میں یہ ہے مرحلۂ فن کیا خوب مطلب غیر کی خاطر ہے تگ و دو کیا خوب
پھر یہ دعویٰ کہ ہے شیریں سے لگی لو کیا خوب عشق و مزدوری عشرت گہہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامی فرہاد نہیں

ہاں یہ سچ ہے کہ اگر عشق ہو وحشت ملزوم اور وحشت کا ہے ویرانہ پسندی مفہوم
تو مرا گھر بھی ہے ویرانہ تفرج گہہ بوم کم نہیں وہ بھی خرابی میں یہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

کیوں کبھی غم کبھی شادی کبھی دن ہو کبھی شب انقلابات یہ ہرگز نہیں بے وجہ و سبب
غور سے دیکھ کے ہر بات کا سمجھو مطلب اہل بینش کو ہے طوفان حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلی استاد نہیں

میں تو چپ ہوں کہ نہ ہو جائے کہیں درد سوا وہ سمجھتا ہے کہ یارا نہیں دم لینے کا
مٹ گئی آہ امید صلۂ صبر و رضا وائے محرومی تسلیم و بدا حال وفا
جانتا ہے کہ مجھے طاقت فریاد نہیں

قفس و قید کے آتے نہیں اس کو آئین نہ کوئی باغ میں ایسا ہے جو کردے تلقین
شکر کر بوئے گلستاں سے ہے کچھ تو تسکین سبد گل کے تلے بند کرے ہے گلچین

مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں

ہاتھ ہرچند تمنائے دلی سے دھویا — لیکن اس کے سے بھی خوش ہے دہن کا جویا
یعنی کچھ بات تو کی وہم تو دل سے کھویا — نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا

دی ہے جائے دہن اس کو دم ایجاد نہیں

مانتا ہوں کہ کہاں خلد بریں کی ہر خشت — جلوہ دار حرم و صومعہ و دیر و کنشت
پھر بھی انصاف کی یہ بات ہے اے حور سرشت — کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت

یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

کچھ نہیں بادہ ہو ساقی ہو کہ مطرب ہو کہ لے — باتیں ہی باتیں ہیں بوئے چمن و نشۂ مے
کون کہتا ہے کہ دنیا میں بقا ہے کوئی شے — رنگ تمکین گل و لالہ پریشاں کیوں ہے

گرچراغان سر رہ گزر باد نہیں

واقعی بے وطنی بھی ہے مصیبت غالبؔ — پوچھ مانی سے مگر اس کی حقیقت غالب
لاکھ زحمت ہو سفر پھر ہے غنیمت غالب — کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب

تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں

مانی - جائسی

جذبات ندرت

اٹھاتا ہے جسے تو وہ تری محفل سے اٹھتا ہے — مگر اس اٹھنے والے کا قدم مشکل سے اٹھتا ہے
کہوں کیا رات کو کیوں درد میرے دل سے اٹھتا ہے — یہ شر روز تیرے وعدۂ باطل سے اٹھتا ہے
نکل جاتا ہے جل بجھ کر جنازہ ایک حسرت کا — تڑپ اٹھتا ہوں میں جب کوئی شعلہ دل سے اٹھتا ہے
اسی ساحل کی جانب رخ ہے میری کشتی دل کا — ڈبونے کے لئے طوفان جس ساحل سے اٹھتا ہے
ہجوم آرزو میں دل سے یوں آہیں نکلتی ہیں — دھواں جیسے چراغ کشتۂ محفل سے اٹھتا ہے
گرا دیتے ہو تم اپنی نظر سے جس کو محفل میں — سہارا درد دل کا لے کے وہ محفل سے اٹھتا ہے
کسی دن چارہ گر کی آنکھ پر پٹی نہیں بندھتی — مگر جس روز چاہا میرے زخم دل سے اٹھتا ہے

جلاتا ہے جسے رشکِ رقابت تیری محفل میں
وہ وہ شمع بن کر خود تری محفل سے اُٹھتا ہے

پھپولے کی طرح دل بیٹھ جاتا ہے محبت میں
یہ بارِ ضبطِ غم بھی ہائے کس مشکل سے اُٹھتا ہے

گزر اک چلنے والے کا ہوا تھا راہِ الفت میں
دھواں اب تک غبارِ جادۂ منزل سے اُٹھتا ہے

نظر اپنا دکھانا چاہتے ہیں کب زمانے کو
اب آتے ہیں وہ خود اب آئنہ محفل سے اُٹھتا ہے

دمِ آخر ہے ۔ بالیں پر مری روتی ہے اک دنیا
یہ عالم دیکھ کر اس وقت تو کس دل سے اُٹھتا ہے

سبکدوشی تو بارِ سر سے ہو سکتی ہے مقتل میں
مگر خنجر بھی اے ندرت کفِ قاتل سے اُٹھتا ہے

ندرت میرٹھی

حیاتِ بیباک

(سید حسین احمد صاحب المتخلص بیباک مخز تلامذہ حضرت فصیح الملک داغ مرحوم)

جور پر صبر تو اربابِ وفا کرتے ہیں
غم مگر حد سے گزر جائے تو کیا کرتی ہیں

آسرا بھی یہ بری شے ہے کہ اب عشق میں ہم
کبھی ناصح کا کبھی دل کا کہا کرتے ہیں

رشکِ دشمن سے ستائیں کہ جلائیں دل کو
یہ مگر کون کہے آپ یہ کیا کرتے ہیں

قابلِ داد ہے یہ شانِ کرم بھی ان کی
کشتۂ ناز کے جینے کی دعا کرتے ہیں

دل جھپٹ لیتی ہیں دزدیدہ نگاہیں اُنکی
آئینہ پیشِ نظر ہو تو حیا کرتے ہیں

تیرے وعدے پہ بھروسا ہے یہ بیماروں کو
موت بھی آئے تو امیدِ شفا کرتے ہیں

میرے ہی نامۂ اعمال میں لکھنا یا رب
بوالہوس بھی جو محبت میں خطا کرتے ہیں

پار کیونکر ہوں مرے دل کے نگاہیں اُنکی
ایسے ناوک تو رگِ جان میں رہا کرتے ہیں

آپ کیوں اس پہ بگڑتے ہیں اگر ہم ناشاد
داورِ حشر سے قسمت کا گلا کرتے ہیں

دلِ مایوس کو اتنی بھی تو امید نہ تھی
اب سنا ہے کہ وہ غیروں سے وفا کرتی ہیں

اپنی قسمت میں ہے یہ بھی تو برابر کا شریک
وہ اگر ہم پہ تو ہم دل پہ جفا کرتے ہیں

خاک میں مل کے جو نکلے تو نتیجہ نکلے
ہم وہی کام محبت میں کیا کرتے ہیں

چارہ گر ہیں کہ مرے دشمنِ جاں ہیں بیباک
کیوں مرا ہاتھ مرے دل سے جدا کرتے ہیں

آفتاب ادب غروب ہوا

محی والوقت لسان العصر حضرت سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی غفرلہ کی ہمہ بالشان شخصیت کسی تعارف کی یا آپکا مذبہ ماتم کسی تحریک و ترغیب کا محتاج نہیں۔ آپکا علمی تبحر ادبی تشخص علوم مشرقی و مغربی کی مستند جامعیت۔ فن شعر و سخن کی قابل تقلید بصیرت فطرت کے پُر اسرار مظاہر کی صحیح ترجمانی۔ تلون جذبات کی حیرت افروز نقاشی۔ حوادثات عالم کی موثر اور دلگداز نوحہ خوانی۔ یہ سب اوصاف خصوصی ملک اور قوم کے لئے دلیل سوگ اور موید تاسف ہیں۔

حضرت اکبر کی مغتنم ذات کا عالم حیات سے روپوش زندگی ہونا۔ ابظاہر گو نظام مشیت کے دستور مروجہ کا ایک رسمی عمل اور معمول ہے۔ مگر درحقیقت آپکا وصال عناصر قومی کے مضمحل مجموعہ سے اس روح لطیف کا فراق ابدی ہے جسپر حیات ملیہ کا مدار و انحصار ہے۔ آپکے مفید ہدایت وجود کا ناپید و معدوم ہو جانا اور اصل سرمایہ ناز اور متاع افتخار رو دیت کی ایسی محسوس کمی ہے جسکا بدل جس کی تلافی خود قدرت کی سعی تمثیل کیلئے بھی تا قیامت ناممکن الصدور خرق عادت ہے۔

حضرت لسان العصر کی وفات مرگ مفاجات نہیں۔ بلکہ قضا و قدر کے عاملانہ تشدد کی نافذ کی ہوئی۔ زبان حال کی گویا سیاسی بندش ہے۔ آپنے اگرچہ ۷۵ سال کی عمر میں انتقال فرمایا لیکن اس محشرستان قحط الرجال دور میں ایسی قابل اور مقتدر ہستی کا اٹھ جانا۔ بدنصیب ہندوستان کے دلپر نا قابل اندمال داغ مفارقت اور ناقابل برداشت صدمہ ہے

شاعری اگرچہ مرحوم کے تاج شہرت کی طرۂ امتیازی ضرور تھی۔ مگر آپکا توغل او موضوعات علم سے بھی یکساں لطف اندوز مشاغل رہا جس طرح آپ فلسفہ قدیم پر حاوی تھے۔ اسی طرح فلسفہ جدید پر بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے آپ کی ذات جہاں دنیاوی حیثیت سے معاصرین میں ایک اعلیٰ خصوصیت کے ساتھ مسلم و مستند تھی وہیں آپ کی عقیدت مذہبی پرستاری توحید میں فرید دہر تھی یہی وجہ ہے کہ ناظم ادیب ہونے کے ساتھ آپ کی روحانی وجاہت بھی اخیر دم تک ممتاز رہی۔ اور مرتے دم تک اسلامی خصوصیات اور اسلامی امتیازات سے بیگانہ نہیں رہے۔

مرحوم اردو کے خوش فکر شاعر۔ زندہ دل فلسفی حیات انسانی کے جذبات کے عدیم النظیر ناظم۔ ایشیائی اور اسلامی تہذیب کے نوحہ خواں تھے۔ آپکا دماغ سوز و گداز سے لبریز تھا۔ اور دل نور معرفت سے روشن۔ آپکا کلام ملک کا بہترین مشیر اور وقت شناس معلم تھا۔ آپ کی شاعرانہ جدت طرازیاں اور ندرت نگاریاں نہ صرف ابنائے زمانہ کے لئے زبان حال تھیں بلکہ مستقبل کے رشد و ہدایت کیلئے بھی حقائق و معارف کا سرچشمہ تھیں یہی وجہ ہے کہ آپ کی موت شخصی موت نہیں ہے بلکہ علمی ادبی اخلاقی۔ ملی۔ قومی۔ ملکی موت ہے۔ آپ کی موت سے ملک کو سخت نقصان پہنچا۔ گویا آسمان ادب کے آفتاب تھے جس کے غروب ہوتے ہی دنیائے شعر و سخن کے روشن دن تا بنات عالم سوگوار راتوں سے بدل گئے۔ بزم حیات کی شمع روشن تھے جس کے بجھتے ہی عشرت کدۂ زندگی کا گوشہ گوشہ ظلمت شب سے تاریک ہو گیا ؎

کیوں نہ تاریک ہو جہان ادب ۔۔۔ نور چشم زمانہ تھے اکبر

۱۳۴۰ھ

فہرست مضامین مخزن اکتوبر ۱۹۲۱ء

نمبر شمار | جلد ۴۲ | جملہ حقوق محفوظ ہیں | نمبر ۶ | نمبر صفحات

شذرات

"مخزن" کا نظام عمل نا مساعدت طالع سے کچھ ہدف تنکا بیت ہو ہی گیا ہے۔ طباعت و اشاعت کی لاعلاج مشکلات کی بدولت جو دو مہینہ سے تعویق و تاخیر پیش آ رہی ہے وہ تو مستحق ملامت مسلم ہے۔ مگر یہ امر قابل افسوس ہے کہ اس کی شہرت و مقبولیت غیر مستحق حضرات کے دست تصرف کی بھی شکار ہے۔ محکمہ ڈاک کی بدسلوک بے اعتدالیوں سے آئے دن پرچہ نہ پہونچنے کے گلے شکوے موصول ہو رہے ہیں۔ ہر مہینے ایک معتد بہ تعداد میں رسالہ اس تلافی مافات کی نذر ہو رہا ہے۔ چنانچہ ستمبر نمبر کی کاپی سے خود اس کا دفتری فائل تک محروم سرمایہ ہو گیا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر یہی افتاد مشیت قسمت رہی تو یہ بہدیہ اس کی کم استطاعت زندگی کے لئے قطعاً ناقابل برداشت ثابت ہو گا۔

بعض ہنگامی اور نظمی صعوبات کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ رسالہ کی تاریخ اشاعت میں کچھ تغیر و تبدل جائز رکھا جائے۔ اس لئے ناظرین کرام کی خدمت میں اطلاعاً التماس ہے کہ دسمبر سنہ ۱۹۲۱ء سے "مخزن" ہر انگریزی مہینہ کے آخری ہفتہ میں اشاعت پذیر ہوا کرے گا۔ جن گرامی قدر خریداروں اور معزز اہل قلم حضرات کی خدمت میں پہلی تاریخ تک پرچہ نہ پہنچے۔ وہ دوبارہ دفتر سے منگوا سکتے ہیں۔ ورنہ بقیمت حصول رسالہ کی زحمت گوارا فرمائیں۔

"مخزن" کے دور جدید کی حیات نشوی کے متعلق یہ کہنا تو یقیناً کفران نعمت ہے کہ بہ نسبت سابق کے اس کی مقبولیت روز افزوں نہیں۔ مگر ہاں ابھی وہ تقویت ضرور حاصل نہیں ہوئی جو اس صحیفۂ ادبی کی بقاء و حیات کی ضامن و کفیل ہو سکے۔ اس لئے اس کی ضروریات زندگی۔ اس اپیل پر مجبور ہیں کہ ملک کے عام ارباب ذوق و نظر اس کی توسیع اشاعت کی طرف بھی کچھ توجہ مبذول و منعطف فرمائیں تاکہ یہ محی علم و ادب اپنے فرائض و مناصب میں اس عجز و تقصر سے متاثر نہ ہو جو اور بہم عصروں کی ہلاکت و فنا کا باعث ہوا۔ اور اس کی صرف یہی صورت ہے کہ جو بزرگان ملک و قوم بزمرۂ خریداری اس کے معین و معاون ہیں وہ اپنے حلقہ تعارف میں حوصلہ افزائی کے سفارشی ہوں۔ اور جو مربیان علم و ادب اس کی قلمی سر پرستی فرماتے ہیں وہ اس کے ان محاسن میں معتد بہ حصہ لیں جن پر صوری و معنوی حسن و ارتقا کا انحصار ہے۔

کاش وہ اہل استطاعت حضرات بھی ہماری بے مائگی پر ترس کھائیں جن کی بارگاہ دولت میں "مخزن" بغیر کسی قلمی و درمی معاوضہ کے محض وجاہت ظاہری کی بنا پر حاضری و حضوری سعادت جانتا ہے ؞

ایڈیٹر

سبدِ گل

صید و صیاد یہ دلآویز قصہ نہ صرف ایک فرانسیسی افسانہ نویس کی تصانیف نغز پیرا میں سے ہے۔ بلکہ خوش فکران مغرب کی ادب نوازیوں کا بہترین اور قابل اعتراف نمونہ ہے جس طرح قصہ کا خیال بالکل نیا۔ اسلوب بیان بے حد اچھوتا ہے۔ اسی طرح دو اجر محبت سے مایوس اور جفائے محبوب سے ٹوٹے ہوئے دلوں کے درد و کرب کو تمام کر دینے والے۔ آخری محسن عمل کی "صید و صیاد" کے کھیل سے تعبیر و تشبیہ بھی ایک نہایت دلچسپ شاعرانہ شوخی ہے۔ فریب محبت کے جذبات لطیف کا تلون تو قصے کی روح رواں ہی ہے۔ مگر افراد قصہ بھی باوجود اتحاد مقصد۔ اور اختلاف طبائع کے اپنی جدت آرزو اور حصول حد نظر میں بے انتہا موجد دلکشی ہیں۔ پھر اس پر موت اور زندگی کے وصل و اتصال کی لطیف اور نازک جگہ کو اس ندرت و عمدگی سے نمایاں کرنا۔ دہشتناک تاریکی میں بنارو م کے قبر کو ایک نقرئی آواز سے تعبیر کرنا۔ ایک لمحہ کا تذبذب جس میں مقید زندگی جذبات آزاد ہو کر مطلق العنانی سے عمروں کی منازل طے کر جانے میں اس سے روشناسی۔ یہ سب ادبی دلفریبیاں سونے پہ سہاگہ ہیں۔

ہم جناب "پطرس" کے حسن انتخاب اور ذوق سلیم کی حضوری میں ہدیہ تحسین کی پیش کشی اپنا فرض و حق جانتے ہیں کہ ان کی اعلیٰ قدرت ترجمہ نے اس قصہ کی جدت سے اردو افسانہ نویسی کے یکساں تسلسل میں تنوع پیدا کیا۔ ہمارا دل نفین فخر و امتنان سے انتہا شکریہ ادا کرتے ہوئے آرزومند ہے کہ آپ آیندہ بھی اپنے قلم سحر رقم کے اعجاز و خوارق سے صفحات مخزن کو طور و ایمن کا تخز دیں گے۔ اور کسی مناقشہ لفظی کو اس سلسلہ عواطف کا قاطع نہ بنائیں گے۔ کیونکہ شعبہ ادب مرابطہ ظاہری کے ترک و اخذ سے بے نیاز ہے۔

شہزادی کا فرماجرا۔ ادیب افسانہ نگار سید امتیاز علی صاحب تاج کی سحر نمائیاں عالم انشا و ادب میں محتاج معرفی نہیں۔ موجودہ حلقہ علم و ادب میں کوئی ذوق نظر ایسا نہیں جو آپ کے حسن تحریر سے لطف اندوز نہ ہو۔ یہ مختصر سا مضمون گو آپ کے ان خوارق ادبیہ کا ہم نشین صدر نہو۔ جو کہکشان۔ انقاد اور مخزن میں برق ریز اعجاز ہو چکے ہیں۔ مگر اہل کیف و وجدان کے نزدیک جہاں سرسری نظر سے دیکھتے۔ اس رنگین اور مبسوط مضمون میں ہزاروں دلآویزیاں رقصاں ہیں۔ وہیں چشم حقیقت بین سے مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ سرمایہ سرور و مستی ہے۔ پھر انداز بیان اتنا اچھوتا اور دلکش کہ لفظاً لفظاً حسن و عشق کے جذبات لطیف سے بریز کیفیت ہے۔ اس کا صحیح اندازہ ارباب ذوق سلیم ہی کر سکتے ہیں۔ ہماری ندرت قلم قاصر ہے۔

ننھی بوندیاں گو اس مضمون میں ربط و تسلسل تو اسی طرح محجوب بصیرت و بصارت ہے جس طرح اس کے موضوع کی تصویر و تشکیل دقت نظر کی محتاج ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ہمارے مخلص دوست مولانا امام خانصاحب نوشہروی کی طبع رنگین کی خیال آفرینیاں اس معنی کر مستحق تحسین ضرور ہیں کہ آپ نے نرم و مدھم پھوار کو موسلا دھار بارش کی مسلسل جھڑیوں پر ترجیح دیتے ہوئے۔ اس لطیف اور نازک فرق مابہ الامتیاز کو بھی ایسے دلفریب اسلوب سے ظاہر کیا ہے۔ جو مقابلتہ ہر فطرت پرست اور حسن شناس صاحب ذوق کے نزدیک مسلم ہے۔ پھر زبان سلیس۔ الفاظ جنت نگاہ اور انداز بیان فردوس گوش۔ اللہ کرے حسن رقم اور زیادہ۔

محک یہ تعریفی مضمون "جناب گہر جائسی" کے ان فلسفیانہ اعتراضوں کا شیرازہ ہے۔ جو حضرت علامہ شبلی نعمانی نور اللہ مرقدہٗ کی معرکۃ الآرا تصنیف "شعر العجم" پر کیے گئے ہیں۔ مضمون ابھی نامکمل ہے۔ اس لیے بالصراحت تو نہیں کہا جا سکتا کہ در اصل فن تنقید اور اصول تعریف کو ملحوظ رکھتے ہوئے نقد و رائے میں کہاں تک کامیاب ہے۔ مگر ہاں اس پہلی قسط کے سرمایہ تنقیص بہم عمیق نظر ڈالنے سے یہ ضرور مترشح ہوتا ہے کہ حضرت مولانائے مغفور کے بہت سے عقیدتمند نیاز کیش دفع دخل کی ضرورت کو ابھی محسوس کریں گے۔ ممکن ہے ہمیں بھی صاحب مضمون سے کچھ تبادلۂ خیالات کی جرأت ہو۔ رہا انداز تحریر وہ حضرت گہر جائسی کا مسلم ہے۔ آپ موجودہ حلقۂ ادب میں بہترین نغز گو ادیب اور مایۂ ناز انشا پرداز ہیں۔

تکوین عالم مولانا نعیم الرحمٰن صاحب ایم۔ اے پروفیسر محمڈن گورنمنٹ کالج مدراس کا مطالعہ تاریخ مستحق اعتراف ہے۔ آپ کی وسعت نظر مخزن کو عرصہ سے سرمایہ شکر بنانے میں فیاض رہی ہے۔ اس مضمون میں آپ نے اہل بابل کے ان معتقدات سے ملک کو روشناس کرایا ہے جو تکوین عالم کے متعلق ان کے جز و ایمان چلے آتے ہیں۔

اہل بابل جس طرح تمام موجودات عالم کے لئے ایک ایک رب النوع مانتے ہیں جسے دیوی یا دیوتا سے تعبیر کیا ہے۔ اسی طرح اس کے نظام عمل کو بھی ایک واقعہ کی تحت میں سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس مضمون کا موضوع اسی قصہ کا آغاز ہے۔ اس کی پہلی قسط دورسالے کے "مخزن" اپریل ۱۹۲۱ء میں نکل چکی تھی۔ یہ اس کی دوسری کڑی ہے۔ ہم مولانا ممدوح کی خدمت میں سپاس منت پیش کرتے ہوئے مستدعی ہیں کہ آئندہ بھی اس سلسلہ عواطف کو جاری رکھیں گے۔ تاکہ ہماری نیازمندیاں یونہی منت کش احسان رہیں۔

پیغام ٹگور ملک الشعرا ٹیگور کی شخصیت دنیائے ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ٹیگور کا نام نہ صرف ہندوستان میں زبان زد خاص وعام ہے۔ بلکہ فضائے مغرب کی وادیاں اور اوقیانوس کے دور دراز سواحل بھی اس مطرب خوشنوا کے گیتوں سے گونج رہے ہیں۔ اس کا روحانی فلسفہ اور اس کا نصب العین تجارت اور کاروبار کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے مغرب کو خواب فردوس معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کے قدر دانوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ فطرت انسانی کی وہ دلنشین خواہشیں جو ضمیر کے ساتھ ہر مجسمہ حیات میں مضمر ہیں۔ اس ملہم مسرت کے اقوال کو زیب عیب سمجھ کر بھی اس کی داد سے عہدہ برآ نہیں۔ ہندوستان کو اس ایک ہستی پر جس قدر بھی فخر ہو بجا ہے۔

طلوع آفتاب کی سرزمین نے مغربی دنیا کو جو پیغام دیا۔ اس کا ایک ایک لفظ موجودہ مسخر تمدن میں دلیل ہدایت ہے۔ ہم فدائے ملت مولانا ابو رشید حضرت عبدالمجید خانصاحب سالک بٹالوی کے نہایت شکرگزار ہیں کہ انھوں نے ہماری درخواست پر ایک انگریزی رسالے سے ترجمہ کرکے "مخزن" کو یہ بیش بہا خیالات عطا فرمائے ہیں۔ ہماری زبان اگرچہ ابھی ایسے تنقیدی مضامین سے سرمایہ دار ہونے میں مفلس ہے مگر حضرت مترجم کی قابلیت اور مستحق تحسین عبارت انشا مستغنی عن التقریب ہے۔ مولانا سالک جس طرح ملک میں اپنی طبعزاد سحر طرازیوں سے صدر نشین بزم ادب ہیں۔ اسی طرح ترجمہ کرنے میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ آپ کے معجز نگار قلم نے ان ادق خیالات کو جس خوبی سے سلیس اور حسین اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اور جس قدرت سے ایک زبان کو دوسری زبان میں منتقل کیا ہے۔ وہ خوارق ادب میں سے ہے ہم دست بدعا ہیں کہ اللہ پاک انھیں مہلکہ سیاسی میں استقلال و استقامت عطا فرمائے۔

شکریہ زندانی یہ نظم حضرت بیخود موہانی کی ہے جو ایک ایسے موضوع پر۔ جو ایک صحیفہ ادبی کے مستغنی عن الخصوصیت خدمات سے قطعاً بے تعلق ہے۔ مگر نظم کی دلآویزیاں زبان کی سلاست اور شستگی مصرع کے قدرت فن کی بین دلیل ہیں۔ اس کے علاوہ اگر احباب ذرا گوشۂ چشم بصیرت کے بذل والتفات کی زحمت بھی گوارا کریں تو شکریہ زندانی "انسانی زندگی کے تیرہ لمحات وہماری عشق نیکی صحیح آئینہ حقیقت ہے۔ ہم اخی مکرم سید وجاہت حسین صاحب رمز شاہجہانپوری کے شکرگزار ہیں کہ ان کی اخوت نے مولانا سے سفارشی ہو کر "مخزن" کے دامن تہی کو مالا مال کیا۔ امید ہے کہ آئندہ مولانا بلاواسطہ بھی اس عطا و مرحمت کو جائز رکھیں گے ✦

لمعات ثاقب پہلوان سخن مولانا نجم الدین صاحب ثاقب بدایونی ملک کے قادر الکلام اور مسلم شعرا میں سے ہیں آپ کو آسمان اردو کے دونوں مہر و ماہ (داغ و ظہیر) سے کسب ضیا اور فخر تلمیذ کا شرف ہے۔ آپ کا کلام۔ شوکت الفاظ۔ سلاست زبان کے ساتھ نہ صرف تبحر فن کا ثبوت ہی ہے بلکہ اس سوز و گداز سے بھی لبریز ہوتا ہے جو جان تغزل ہے۔ راقم کو بمبئی کے قیام میں کئی برس تک مخلوص اخوت ہم آقا ستاہونے پر ناز ہے۔ یہ ذو بحرین غزل اسی دور زندگی کی یادگار ہے ✦

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مخزن

جلد ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۱ء نمبر ۶

صید و صیّاد

۲۴ر دسمبر ۱۸۸۲ء کو رات کے وقت پیرس کا ایک نوجوان دریائے سین کے قدیمی پُل پر چلا جا رہا تھا۔ اس نے اس جہان فانی سے ہمیشہ کے لئے اپنا تعلق منقطع کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ اس کے قدم نہایت آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے۔ اور جوں جوں وہ اپنی منزل کے قریب پہنچتا جاتا۔ اس کے دل میں اطمینان اور سکون بڑھتا جاتا تھا۔

یہ نوجوان (جس کا نام ایڈمنڈ سیوین تھا) جب پُل کے عین وسط میں پہنچ گیا تو جنگلے پر ہاتھ رکھے دریا کے سیاہ پانی کو کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اس کا جسم ذرا کانپا۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک لمحہ کے لئے تیز ہوئی۔ لیکن پھر وہ سنبھل گیا۔ اور غافلانہ انداز میں اپنا اوور کوٹ اتارنے لگا۔

اوور کوٹ کو تہ کرکے اس نے زمین پر رکھ دیا۔ تھوڑے سے تامل کے بعد اس نے جنگلے کو مضبوط پکڑ لیا۔ اور آنکھیں بند کرلیں۔ وہ دریا میں کود پڑنے ہی کو تھا کہ کسی نے اسے کندھے سے پکڑ لیا۔ اور اس کے کانوں میں آواز آئی "ذرا ٹھہر جائیے حضرت!"

اس موت کے تمنائی نے اجنبی کے ہاتھ کو ایک جھٹکا دے کر ہٹا دیا۔ اور پھر چھلانگ مارنے لگا۔ لیکن اب کے بار اس کے کندھے کو دو ہاتھوں نے زور سے کھینچ لیا۔ اور پھر وہی آواز آئی۔

"حضرت ذرا ٹھہر جائیے۔ صرف ایک گھنٹے کے لئے ٹھہر جائیے۔ کیا اتنا بھی آپ کو بہت معلوم ہوتا ہے؟"

سیوین نے مڑ کر دیکھا۔ اجنبی درمیانہ قد کا ایک دبلا پتلا سا آدمی تھا۔ چہرے کے نقش باریک۔ جن پر نیکی یا بدی کسی صفت کی کوئی تحریر نہ تھی۔ صرف ایک تفکر سا تھا۔ آواز اس نازک وقت میں بھی نہایت مطمئن معلوم ہوتی تھی۔

لیکن موسیو سیوین کو غصہ سا آ گیا۔ اس نے اپنے دل کو جس محنت سے خودکشی پر آمادہ کیا تھا، اس کا یوں رائگاں جانا اسے ناگوار معلوم ہوا۔

وہ جھلا کے بولا: "آپ ہوتے کون ہیں؟"

اجنبی نے کہا: "حضرت یہی تو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔ میرا ایک کام ہے۔ جو میرے خیال میں سوائے آپ کے کوئی نہیں کر سکتا۔ ورنہ میں کاہے کو مخل ہوتا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ اگرچہ آپ کا خودکشی کا طریقہ نہایت بھدا سا ہے۔ لیکن میں کیوں دخل دیتا۔ لیکن بات یہ ہے کہ اس وقت ایک خاتون کو آپ کی امداد کی بہت ضرورت ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی۔ تو آپ یقین جانئے میں کبھی یوں آپ کو تکلیف نہ دیتا۔"

سیوین بڑی درشتی سے ہنس کر کہنے لگا: "تو تم نے میرے پاس آنے میں غلطی کی ہے۔ ایک عورت کی خاطر ہی تو میں یہ (اس نے دریا کی طرف ہاتھ پھیلا دیا) عورت کی جنس کو میں یہاں جان کا خراج ادا کرنے آیا ہوں۔ اس سے زیادہ میں کیا کر سکتا ہوں؟"

اجنبی بولا: "قصور ایک عورت کا۔ اور آپ سب عورتوں کو الزام دے رہے ہیں۔ اب انکار نہ کیجئے۔ میں آپ کے منہ سے "نہ" نہیں سن سکتا۔ دوبارہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ ایک خاتون کی چل کے مدد کیجئے۔ ایک نوجوان خاتون کی۔ ایک حسین خاتون کی۔ آپ اپنے سفر کو ایک گھنٹہ تک ملتوی کر دیجئے۔ محض ایک گھنٹے تک۔ کیا یہ بہت زیادہ ہے۔ اس وقت سے لے کر ابد تک جتنا بھی زمانہ ہے۔ آپ اس کے مالک و مختار ہیں۔ کیا آپ اس میں سے ایک گھنٹہ بھی کسی کو نہیں بخش سکتے؟"

سیوین نے جو باوجود ناراض ہونے کے اجنبی کی باتوں کو غور سے سننے لگا تھا۔ پوچھا۔

"تم مجھ سے کیا چاہتے ہو"؟

اجنبی نے کہا "یہ دیکھئے میں ابھی آپ سے کہتا ہوں۔ یہاں سردی ہے۔ آپ اتنی مہربانی اور کیجئے کہ اپنا اوورکوٹ پہن لیجئے۔ اور میرے ساتھ اس شراب خانے تک چلے چلئے۔ وہ جہاں سرخ روشنی نظر آرہی ہے۔ جو کچھ مجھے کہنا ہے آپ وہاں پہنچ کر سُن لیں۔ اگر اس سے آپ کی تشفی نہ ہوئی تو آپ بیشک واپس آجائیے۔ اس میں ہے ہی کیا؟"

سیوین نے دریا کو ایک نظر دیکھا۔ اور اجنبی کی بات مان لینے کو تیار ہو گیا۔ اپنا کوٹ پہنا۔ اور ساتھ ہو لیا۔ اجنبی نے کہا "شکر ہے کہ آخر کار آپ مجھے مل گئے۔ ورنہ خدا جانے میں کہاں مارا مارا پھرتا۔ آج رات مجھے آپ سے پہلے دو آدمی آپ ہی کی طرح کے اور بھی ملے تھے لیکن وہ کسی کام کے نہ تھے۔ بدتمیز کہیں کے۔ میری سنیں ہی نہیں بس کرتا کیا۔ اس وقت وہ دونو دوسری دنیا میں ہیں۔ اور شاید تمنا کر رہے ہیں کہ کسی طرح واپس پیرس میں پہنچ جائیں لیکن آپ بالکل میرے مطلب کے آدمی ہیں ——— یہ لیجئے ہم پہنچ گئے۔ یہ شراب خانہ ہے تو چھوٹا سا لیکن کیا مضائقہ ہے ...... پہلے آپ صاحب"

دونوں کمرے میں ایک طرف کو ہو کر بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کو غور سے دیکھنے لگے۔ اجنبی کی شکل پہلے کی بہ نسبت زیادہ عقاب سے مشابہ اور زیادہ متفکر معلوم ہوتی تھی لیکن یوں دیکھنے میں بُرا نہ تھا۔ موسیو سیوین پچیس برس کی عمر کا نوجوان تھا۔ چہرے کے نقش نفیس ترشے ہوئے۔ لباس پیرس کے دیہاتیوں کا۔ رنگ ذرا زرد۔ بولا "تو تمہارا کیا مقصد ہے"؟

اجنبی نے کہا "مجھے اپنا مقصد تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ چل کے "شیر شکاری" کھیلئے۔ "شیر شکاری" کے کھیل سے تو آپ واقف ہوں گے"؟

"نہیں"

"افسوس انسان اپنی شہرت پر کیا بھروسہ کر سکتا ہے۔ تو حضرت آپ نے میرا نام تو یقیناً سنا ہوگا۔ مجھے پوَل کہتے ہیں"

سیوین نے کہا "کہتے جاؤ۔ میں نے تمہارا نام کبھی نہیں سنا"

پوَل۔ مایوسی کے لہجے میں بولا "جب تو مجھے بہت ہی افسوس ہے۔ تو جناب سنئے جو حضرات اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہیں۔ ان کے لئے میں نے ایک ایسا طریقہ ایجاد کر رکھا ہے جس پر انہیں کسی طرح کی

ملامت نہ ہو سکے۔ اگر آپ کو اس بات کا علم ہوتا۔ تو آپ دریائے سین کے پاس جانے کی بجائے یقیناً میرے پاس آتے۔ اگر اشتہار دینے میں مجھ سے کوئی دقیقہ فروگذاشت ہو گیا ہے تو یہ میرا قصور نہیں۔ میں مجبور ہوں۔ میرا کام ہی ایسا ہے لیکن میرا خیال تھا کہ آپ نے معزز طبقوں میں میرا ذکر ضرور سنا ہوگا۔"

سیوین نے کہا "جو کچھ تمھیں کہنا ہے۔ جلدی کہو۔ آدھ گھنٹہ سے زیادہ گزر چکا ہے۔ اور مجھے ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا۔

تول نے کہا "میں آپ سے معافی چاہتا ہوں۔ دیکھئے نا۔ آخر ایک موجد بھی سینے میں دل رکھتا ہے۔ اس کے بھی حسیات کو صدمہ پہنچ سکتا ہے۔ تو صاحب بات یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں۔ انسان ایک حیوان متمدن ہے۔ تمدن حقوق و فرائض کے باہمی تعلقات کا نام ہے۔ چند فرائض ایسے بھی ہیں جن کو زندگی کے آخری لمحوں میں بھی پورا کرنا ضروری ہے۔ سوسائٹی کا اقتضا یہی ہے۔ کیا آپ کو دنیا سے یوں اکیلے چلے جانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جبکہ کئی لوگ ایسے موجود ہیں۔ جو آپ کو تشریف لے جانے میں مدد دینے کے لئے تیار ہیں۔ تیار کیا؟ خواہشمند ہیں جن کی مدد سے آپ کے وداع آخری کو نہ صرف زیادہ پر لطف بلکہ زیادہ خوبصورت بنایا جا سکتا ہے۔ اس حسن آفرینی کے لئے میں نے ایک معمولی سا کھیل ایجاد کیا ہے جس میں دو کھلاڑی اعلیٰ درجے کا لطف حاصل کر سکتے ہیں۔ اور ان میں سے ایک کا انجام قطعی یقینی ہوتا ہے۔ زندگی سے تنگ آئے ہوئے دو آدمی آپس میں قرعہ اندازی سے فیصلہ کر لیتے ہیں کہ کون شیر بنے۔ اور کون شکاری۔ اس کے بعد شیر اپنے گلے میں ایک نقرئی گھنٹی باندھ لیتا ہے۔ اور شکاری ہاتھ میں ایک بھرا ہوا پستول لے لیتا ہے۔ کمرے کے تمام چراغ گل کر دئے جاتے ہیں اور صید و صیاد کو تنہائی میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ پھر شیر کی مرضی کے مطابق موسیقی سے اس کی سامعہ نوازی کی جاتی ہے۔ پھر موسیقی بند ہو جاتی ہے۔ شیر کی حرکت سے اس کے گلے میں لٹکی ہوئی گھنٹی بجتی ہے۔ شکاری اندھیرے میں فائر کرتا ہے۔ ایک دفعہ۔ اور پھر ایک دفعہ اور۔ پھر چراغ روشن کر دئے جاتے ہیں۔ اگر شیر زخمی ہو گیا ہو تو وہ یقیناً مر جاتا ہے۔ کیونکہ سب گولیاں زہر آلود ہوتی ہیں۔ اگر وہ بچ جائے تو گھنٹی اس کے گلے سے اتار کر شکاری کے گلے میں باندھ دی جاتی ہے۔ اور کھیل پھر سے شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کھیل جاری رہتا ہے

حتیٰ کہ ان میں سے ایک رخصت ہو جاتا ہے۔ پہلے پہل صرف مردوں میں اس کھیل کا رواج تھا لیکن جب اس کی شہرت بہت بڑھ گئی تو ایک خاتون نے بھی اس میں شرکت کی درخواست کی۔ یہ بدعت کسی قدر پسند کی گئی۔ اب جہاں تک ممکن ہو سکے۔ ایک مرد کو ایک عورت کا شریک بنایا جاتا ہے۔ عام طور پر وہ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں۔ تو صاحب اس کھیل کو بہت پسندیدگی نصیب ہوئی ہے۔ میں نے اس میں ایک دو جدتیں بھی پیدا کی ہیں۔ مثلاً میں کبھی کبھی ایک خالی کارتوس بھی بھر دیتا ہوں۔ سوائے میرے اور کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ کہ کونسا کارتوس خالی ہے اس سے ذرا لطف اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ معزز حضرات اور معزز خواتین کو اب اس بات کی ضرورت نہیں کہ وہ دریائے سین میں پڑے پائے جائیں۔ وہ اب اس پر لطف موت کو ترجیح دیتے ہیں "

سیبوین نے پوچھا "لیکن تمھاری اس ہرزہ سرائی کو مجھ سے کیا تعلق ؟ اگر مجھے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا منظور ہے۔ تو یہ میرا اپنا ذاتی معاملہ ہے۔ تم اس میں کیوں دخل دیتے ہو؟ میں سمجھتا ہوں تمھیں اپنے اس قبیح فعل کے لئے کسی فیس کی توقع ہے۔ تو وہ پھر تم کو مجھ سے نہ ملے گی۔ میں واپس پل پر جا رہا ہوں۔ اور نہیں سمجھتا کہ کسی طرح بھی تمھارا ممنون ہوں " +

یہ کہہ کر وہ اٹھا۔ اور اپنی ٹوپی کے لئے ہاتھ بڑھایا +

پوّل نے نوجوان کا کوٹ پکڑ کے کہا "خدا کے لئے پانچ منٹ یہاں اور بیٹھ جائیے۔ میں آپ سے کوئی فیس نہیں مانگتا۔ آج رات ایک ڈیوک اور ایک خاتون کو آپس میں کھیل کھیلنا تھا۔ خاتون تو پہنچ گئی ہیں لیکن ڈیوک صاحب اب تک تشریف نہیں لائے۔ ان کے بغیر کھیل کیسے کھیلا جا سکتا ہے۔ اس طرح کا واقعہ کبھی پہلے پیش نہیں آیا۔ اس میں میری سخت بدنامی ہے۔ دربار میں یہ خبر پہنچی تو میری ناموری میں خلل آ جائے گا۔ آپ چل کے ڈیوک کی جگہ لے لیجئے۔ اور مجھے اور اس خاتون کو اپنا شرمندۂ احسان بنائیے۔ اگر خدانخواستہ آپ اس کے نشانے سے بچ گئے۔ تو آپ اس پر احسان کر کے واپس یہاں تشریف لے آئیے "

سیبوین نے گھبرا کے پوچھا "تم چاہتے ہو۔ میں اس کی جان لوں ؟ "

پوّل نے کہا "یہ کیا ضروری ہے۔ ممکن ہے آپ اس کا نشانہ بن جائیں۔ آپ یہ بتائیے

آپ کو دونوں میں سے کونسی بات پسند ہے چشم زدن میں ایک حسین خاتون کے ہاتھوں مرجانا یا ایک دریا میں پڑے سڑتے رہنا۔ جہاں اس بات کا بھی خطرہ ساتھ لگا ہے کہ کوئی خدائی فوجدار آکے آپ کو بچا نہ لے کس قدر شرم کی بات ہے۔ میرے ہاں آپ کی تسلی کو کم از کم یہ خیال تو ہو گا کہ آپ کی موت دلپسند صحبت میں واقع ہوئی"۔

سیوین نے کہا "ممکن ہے میں جانبر ہونے کو ایک حسین عورت کے قتل پر ترجیح دوں تمھیں تمھاری ایجاد مبارک ہو جس کی بدولت تم نے خدا جانے کتنے انسانوں کو پیش از وقت مار دیا ہے"۔

موجد بولا "حضرت۔ آپ بہت کج نگاہی سے کام لے رہے ہیں۔ آپ کے الفاظ سے مجھے صدمہ پہنچا ہے۔ ذرا آپ غور تو فرمائیے میں نے کس کو جا کر کہا کہ تم قبل از وقت مرجاؤ۔ میرے پاس تو وہی اصحاب تشریف لاتے ہیں جنھوں نے مرجانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہوتا ہے۔ اس کا فائدہ کیا۔ یہ سنئے (جیب سے ایک پاکٹ بک نکال کر) یہ میرے بہی کھاتے کا حساب سنئے۔ آج تک کل بیاسی فرمائشیں ہو چکی ہیں۔ جن میں سے باون مردوں کی تھیں اور تیس عورتوں کی۔ کل بیالیس بازیاں کھیلی جا چکی ہیں۔ نتیجہ۔ بیالیس اموات۔ اب حضرت اگر میرے مربی اپنا طریقہ مرگ خود سوچتے تو اموات کی تعداد اس سے قریباً دگنی ہوتی۔ ہے کہ نہیں؟ جناب عالی۔ میں تو مصلح بنی نوع انسان ہوں۔ میں تو جانیں بچاتا ہوں"۔

سیوین نے کہا۔ اور تمھیں اس بات کا خیال نہیں کہ جو لوگ تمھاری بازی کے بعد زندہ بچ جاتے ہیں۔ وہ پھر کسی اور طرح خودکشی کر لیتے ہیں۔

حضور مجھے معاف کیجئے۔ آپ پھر غلطی پر ہیں پہلی اکتالیس بازیوں میں سے جو زندہ بچ گئے ممکن تھا کہ وہ سب آپس میں پھر یہ کھیل کھیلتے حتیٰ کہ ان میں سے صرف ایک باقی رہ جاتا لیکن ہوا یوں کہ زندہ بچ جانے والوں میں سے صرف ایک نے دوبارہ مرنے کی خواہش کی۔ اس ایک کے ماسوا باقی سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اور جاتے ہوئے میرا شکریہ ادا کرتے گئے۔ اندھیرے میں گولی کے چلنے کا ڈر ایک مختصر۔ مگر شدید انتظار مرگ۔ مجروح نعش کا گھناؤنا نظارہ۔ یہ ایسی ہیبتناک باتیں ہیں کہ جو لوگ زندہ رہ جاتے ہیں۔ وہ پھر فیصلہ کر لیتے ہیں کہ مرنا ہے۔ تو گھر میں جا کر طبعی موت ہی مریں گی

—— حضور۔ اگر آپ چلی کر اس خاتون کے سر پر تھوڑا سا احسان کر دیں۔ اور خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے۔

آپ اس کی گولیوں سے بچ جائیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ خدا تعالیٰ کا شکریہ ادا کریں گے۔ کہ آپ زندہ بچ گئے"۔

سٹیوین نے کہا "خیر یہ بات تو غلط ہے لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ تمہاری باتیں بہت دلچسپ ہیں مختصر یہ کہ میں یہ کھیل کھیلنے کو تیار ہوں۔ بقول تمہارے زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ میری موت چند گھنٹے دیر میں آئے۔ اور کیا؟"

بوّل بے انتہا مسرور ہوا۔ اور بڑے مجھے دار فقروں میں شکریہ ادا کرنے لگا۔ سٹیوین نے اس کی بات کو کاٹ کر کہا "بل ادا کرو اور چلو چلیں۔ بہت وقت ضائع ہو چکا ہے"۔

شراب خانے سے نکلے تو بوّل آگے آگے چلنے لگا۔ چلتے چلتے وہ تنگ و تاریک گلیوں میں پہنچ گئے۔ جہاں کہیں کہیں ایک آویزاں لمپ کی ناکام روشنی رات کی سیاہی کو اور بھی تاریک کر دیتی تھی۔ بوّل نہایت لسانی سے باتیں کرتا جاتا تھا۔ شاید اس ڈر سے کہ کہیں اس کا ساتھی خاموشی سے گھبرا کر واپس ہو جانے کا ارادہ نہ کر لے۔ دن بھر کی تازہ خبروں پر تبصرہ کرتا رہا کبھی دربار شاہی کے معاملات پر اور کبھی تازہ ترین ڈرامے کے متعلق۔ کہ فلاں ایکٹرس نے بہت بری طرح ایکٹ کیا اور گاتے وقت بے سُری ہو گئی۔ اور جب اس طرح کی باتیں ختم ہو چکیں تو اس نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور چاند ستاروں کے متعلق ایک تقریر شروع کر دی سٹیوین بالکل خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔

کوئی بیس منٹ چلنے کے بعد وہ ایک کشادہ بازار میں پہنچے۔ اور ایک کسی قدر بڑے گھر کے دروازے کے سامنے آکر ٹھہر گئے۔ بوّل نے ایک گھنٹی کی رسی کو پکڑ کر کھینچا۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے کی ایک کھڑکی میں سے کسی نے باہر کو جھانکا اور آواز آئی "کون ہے؟"

بوّل نے کہا "میں ہوں۔ دروازہ کھولو"۔

دروازہ کھلا۔ اور یہ دونو اندر داخل ہوئے۔ بوّل نے پوچھا۔ "وہ خاتون ابھی یہیں ہیں؟" جواب ملا "ہاں صاحب"۔ "ڈیوک صاحب آئے ہیں؟" جواب ملا "نہیں صاحب"۔ بوّل نے اپنے ساتھی کی آستین کو پکڑ کر کہا "آئیے"۔ دونو ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ جہاں ایک بربط دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ میز پر ایک رباب رکھا تھا۔ اور کرسی پر ایک عورت سوئی پڑی تھی۔ شکل حسین نہ تھی +

سٹیون نے مایوس ہو کر پوچھا "کیا یہی وہ خاتون ہیں؟"

بوَل نے کہا "نہیں صاحب۔ یہ تو بربط بجانے والی عورت ہے۔ انتظار کرتے کرتے تھک کر سو گئی ہے۔ وہ خاتون تو ساتھ کے کمرے میں ہیں۔ آپ اپنی ٹوپی اور لبادہ اتار کر یہاں لٹکا دیجئے اور یہ ایک معمولی سی رسم ہے اسے بھی پورا کر دیجئے یعنی یہ نیم نقاب پہن لیجئے۔ گمنامی میرے یہاں کا سب سے مقدم اصول ہے۔ ٹھیک۔ ادھر کو تشریف لائیے۔"

ساتھ کا کمرہ پہلے کمرے سے بڑا تھا۔ فرنیچر تھوڑا۔ مگر جس قدر بھی تھا۔ اچھا تھا۔ ایک دیوار تصویروں سے بالکل عاری تھی۔ انگیٹھی میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ اور آگ کے سامنے ایک عورت نہایت قیمتی لباس پہنے بیٹھی تھی۔ دروازہ کھلا تو وہ چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور کہنے لگی "اب آ بھی چکو اتنی دیر کر دی تم نے۔ اگر میرا دل مضبوط نہ ہوتا۔ تو میں کب کی واپس چلی گئی ہوتی۔"

بوَل نے کہا "بیگم صاحبہ میں تہ دل سے معافی کا خواستگار ہوں مجھے کچھ مشکلات پیش آ گئی تھیں جن کی وجہ سے میں رک گیا۔ یہ میرے ساتھ جو صاحب ہیں۔ یہ ان بے وفا حضرت کی قائم مقامی کریں گے جو آنے کا وعدہ کر کے نہیں آئے۔ اب قاعدے کی رو سے آپ کو آدھ گھنٹہ دیا جاتا ہے آپ اس میں ایک دوسرے سے واقفیت پیدا کر لیجئے۔ یا دنیا کے لئے کوئی پیغام چھوڑ جانا ہو تو وہ لکھ ڈالئے۔"

عورت نے اٹھ کر کہا "نہیں میں ضرورت سے زیادہ انتظار کر چکی ہوں۔ یہ ابھی اور انتظار۔ کیا معنی؟ اجنبی صاحب اگر ہم قاعدے کی خلاف ورزی کر کے یہ آدھ گھنٹہ استعمال میں نہ لائیں۔ تو آپ کو اس میں کوئی اعتراض ہے"

سٹیون نے کہا "بیگم۔ سچ بات یہ ہے۔ کہ تھوڑی دیر ہوئی میں فوراً اس دنیا سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا۔ لیکن کچھ بوَل کی باتوں کا اور کچھ آپ کی ملاقات کا مجھ پر یہ اثر ہوا ہے کہ مجھے تعجیل کا کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا۔ آپ یہ آدھ گھنٹہ ٹھہر جائیے۔ مجھے آپ سے یہ درخواست کرنے کا حق ہے۔ کیونکہ آپ ہی نے میرے اصلی ارادے کو درہم برہم کر دیا۔ آپ نہ ہوتیں تو میں اس وقت دریا کی تہ میں پڑا ہوتا۔ یا یہ کہ سیورے تک پہنچ گیا ہوتا۔"

خاتون نے کہا "جس طرح آپ کی مرضی ہو صاحب لیکن افسوس اس وقت میں اپنی رفاقت

میں کوئی دلپذیری پیدا نہیں کر سکتی"۔ چند منٹ تک کمرے میں بالکل خاموشی رہی جس میں سیوین اس حسین کے چہرے کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ نقاب نے چہرے کے بالائی حصے کو مستور کر رکھا تھا لیکن پھر بھی ٹھوڑی کی گولائی۔ ہونٹوں کی کمان۔ چھوٹے چھوٹے کانوں کی خوبصورتی جو بالوں کے گھنگھر والے جال میں سے جھانک رہی تھی۔ اس بات کے لئے کافی تھیں کہ سیوین نقاب پوش حصے کی متعلق غور کرنے لگ جائے۔ شاید خاتون بھی اسی طرح اس کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ بہر حال ان کی آنکھیں کبھی کبھی چار ہو ہی جاتی تھیں۔

اتنے میں خاتون بولی "جناب اگر ہمیں اپنی زندگی کے آخری لمحے اکٹھے ہی گزارنے ہیں تو میں تکمیل کے ہی گزار دیں۔ میں دو گھنٹے خاموش بیٹھی رہی ہوں۔ ذرا میرے دل کو بہلانے دیجئے۔ خدا کے لئے کچھ بات ہی کیجئے"۔ سیوین نے کہا "بیگم بسروچشم۔ کیا بات کروں؟! اچھا اسنئے۔ میں بات کرتا ہوں۔ جب میں ادھر کو آرہا تھا تو رستے میں پوَل ستاروں کے متعلق باتیں کرتا رہا تھا ایک طرف کو زہرہ دکھائی دے رہی تھی۔ پوَل نے مجھ سے پوچھا تھا۔ یہ زہرہ یہاں کیسے آگئی؟ اسی قسم کا ایک سوال اس وقت میرے دل میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ زہرہ یہاں کیسے آگئی؟ کیا دنیا میں کوئی ایسا دل باقی نہیں رہا جسے توڑا جا سکے۔ کوئی ایسا انسان موجود نہیں جو حسن کا فریب کھا سکے۔ دلوں کے توڑنے کا مشغلہ اسی قدر دلچسپ ہے جس قدر [illegible] میں۔ اس کی طرح اس میں بھی صرف ایک ہی آدمی مجروح ہوتا ہے۔ [illegible] کہ زہرہ یہاں کیسے آگئی ہے؟"

خاتون نے جواب دیا "جناب معلوم ہوتا ہے۔ آپ کو تشبیہوں کا بہت شوق ہے۔ یہ سوال آپ اور کسی وقت پوچھتے تو میں اس کو آپ کی دیدہ دلیری سمجھتی۔ اور خاموشی کے سوا دوسرا جواب دینا گوارا نہ کرتی۔ لیکن اب چونکہ ہم میں سے ایک کو صرف تو دو گھنٹے اور زندہ رہنا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ صاف گوئی سے کام لیا جائے تو بہتر ہوگا۔ تو شاید زہرہ کے یہاں موجود ہونے کی وجہ عطارد ہے جس کی ظاہر اشکل وصورت تو ایک اچھے بھلے انسان کی تھی لیکن دل دغا سے بھرا ہوا تھا"

سیوین نے کہا "اس نے اور حالات سے مجھے آگاہ کیجئے"

خاتون نے حقارت آمیز لہجے میں کہا "میں اس سے زیادہ کیوں بتلاؤں۔ میں راز کے بدلے راز کا اظہار کر سکتی ہوں۔ گمنام صاحب۔ آپ بتائیے۔ آپ یہاں کیوں تشریف لائے ہیں (معاف کیجئے۔ میں آپ کو کسی آسمانی نام سے نہیں پکار سکتی)"

"بیگم صاحبہ۔ میرے یہاں آنے کا باعث حسن و خوبی کا ایک درخشندہ ستارہ ہوا ہے۔ جو میرے ساتھ قران میں آیا۔ اور کچھ عرصے تک میری ہمراہی میں گردش کرتا رہا لیکن یہ ستارہ آخر میں آپ کے عطارد کی طرح کج رفتار نکلا۔ اب وہ ایک سپاہی کی آغوش میں چمک رہا ہے یہ دنیا اس کے بغیر تاریک ہے۔ اس لئے میں کسی دوسری دنیا میں جانا چاہتا ہوں"۔

"تو آپ سے ایسا سلوک پہلے کبھی نہیں ہوا"

"کبھی نہیں۔ اسی لئے میں نے قسم کھالی ہے کہ پھر اس طرح کا واقعہ کبھی پیش نہ آئے گا"

"آپ کے خیال میں وہ خاتون اس قابل ہے کہ اس کے لئے جان یوں قربان کر دی جائے؟"

"کیا آپ کا محبوب اس قابل ہے؟"

خاتون نے جوش میں آکر کہا "ہرگز نہیں۔ قطعاً نہیں۔ آپ یہ نہ سمجھئے کہ میں موت کو دلِ شکستہ کا مرہم جان کر اس کی طلبگار ہوں۔ آپ کا شاید یہ خیال ہو۔ لیکن میں تو صرف اس لئے مرنا چاہتی ہوں کہ مبادا دربارِ شاہی کے لوگ میری ہنسی اڑائیں۔ زندگی بھر پہلے بھی ایک دفعہ مجھ سے یوں دغا کی گئی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ تیسری دفعہ پھر بولو ہو۔ مرد جھوٹے اور بیوفا ہیں"۔

"بیگم صاحبہ ایک آپ کو چھوڑ کر عورتیں بھی کچھ کم نہیں"

بات کو یہاں تک پہنچا کر دونوں غمزدہ نظروں سے آگ کے شعلوں کو دیکھتے رہے تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد سیمون نے کہا۔

"بیگم صاحبہ زندگی کی چند گھڑیاں باقی ہیں۔ آپ میری اتنی بات مان لیجئے کہ اپنا نقاب اتار کر مجھے اپنا چہرہ دکھا دیجئے"۔

خاتون نے نہایت بے پروائی سے کہا "کیوں"؟

"میری آرزو ہے۔ کہ میں اس خاتون کی شکل دیکھ لوں۔ جو ابھی مجھے دوسری دنیا میں بھیج دے گی۔ یا مجھ سے چند منٹ پہلے وہاں جا پہنچے گی"

جواب ملا "فضول تمنا ہے۔ آپ کو چاہئے۔ کہ اس وقت آپ اپنے دل کو اعلیٰ و ارفع خیالات میں مصروف رکھیں۔"

سیبوین نے کہا "بیگم صاحبہ یہ نہ کہئے۔ ابھی ابھی مجھ سے وُرل نے کہا تھا کہ انسان ایک حیوان متمدن ہے۔ ہم ایک طول طویل سفر کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور اگر میں اپنے ہم سفر کی شکل دیکھنا چاہوں تو یہ کونسی تعجب کی بات ہے۔ معاف کیجئے۔ آپ کو میرا شرمندہ احسان ہونا چاہئے۔ آپ نہ ہوتیں تو میری تکلیف کا اب تک خاتمہ ہوگیا ہوتا۔ اور پھر آپ کی گولی کا نشانہ بننا۔ یا آپ کو اپنا نشانہ بنانا کوئی معمولی سی بات ہے؟ ——— مجھے اپنی شکل دکھا دیجئے۔"

کچھ دیر تک وہ تامل میں رہی۔ پھر کہنے لگی "جناب فی الحقیقت بقول آپ کے میں آپ کی احسانمند ہوں۔ آپ کا حکم ماننے کے بغیر چارا نہیں۔ آپ بھی اپنا نقاب اتار دیجئے۔"

دونوں نے اپنے نقاب اتار دئے اور دونوں غور سے ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھنے لگے سیبوین خوش شکل تھا لیکن بے نقابی نے خاتون کے چہرے کے حسن کو آشکار کر دیا تھا۔ سیبوین کی توقع سے بالا تھا۔ باریک نفیس ابرو۔ جیسے کسی خوش مذاق مصور کی قلم طرازی نیلی نیلی خوبصورت آنکھیں لمبی لمبی مخروطی پلکیں۔ آنکھوں کی نیلگوں گہرائیاں سیبوین کا دل دھڑکنے لگا۔

خاتون نے کہا "کیا آپ کو میرے چہرے میں کوئی ایسی قباحت نظر آتی ہے جس کی وجہ سے دو مرد مجھ سے یوں منہ پھیر لیں۔"

سیبوین نے کہا "جو کچھ میری آنکھوں کو نظر آرہا ہے۔ اس سے تو ایک تیسرا شخص بھی مسحور ہو سکتا ہے۔ اگر ان دونوں نے آپ سے بے وفائی کی۔ تو اس کی وجہ اس موہنی صورت میں مجھے کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ کیا انھوں نے کوئی اور وجہ نہیں بتائی۔"

"ایک بے وفا کو میرا افلاس ناگوار تھا جب میرے والد کے ساتھ ہی میرا تمول بھی رخصت ہوگیا۔ اور ناداری نے مجھے آن گھیرا تو میرا چھبیلا ایک دن مجھے ملنے آیا عشق و محبت کی داستان رک رک کے اور تھم تھم کے مجھ سے کہتا رہا۔ آواز میں عجز تھا۔ انداز میں انکسار تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ گیا کہ میں محض اپنی آمدنی پر گھر بار کے اخراجات کا کفیل نہیں ہو سکتا۔ شادی کیسے ہو سکتی ہے۔ ——— حضرت میرے جہیز کی ہوس میں منہ کھولے بیٹھے تھے۔ دور اندیش واقع ہوئے تھے۔"

سیوین نے جیسے ایک درد محسوس کر کے کہا "او خدا ایسی شکل کو دیکھنا اور پھر دور اندیش رہنا - اور آپ کے عشق کا دوسرا شعلہ - آپ کا عطارد - وہ بھی دور اندیش تھا؟"

"نہیں اب تو میں دولتمند ہوں چچا کے مرجانے کے بعد مجھے بہت کچھ ورثے میں ملا - میرے سورما کا دل اور شمشیر چھ مہینے تک میری قدم بوسی کرتے رہے لیکن آہ میں کیا کہوں - جوانمرد سپاہی ایسے نہیں ہوا کرتے - بجائے ایک انھوں نے حسن کا معیار بدل لیا - ذرا آپ کا عذر ملاحظہ فرمائیے میری دردمندی کا بھی خیال کیجئے - مجھ کو آپ لکھتے ہیں "رنگ کے بارے میں میرے خیالات کچھ بدل گئے ہیں" اب تک وہ اندھا تھا - ایک نئی نویلی نے اسے بصارت بخشی - اب اسے نیلی آنکھوں کی بجائے بھوری آنکھیں اچھی لگتی ہیں"

سیوین نے کہا "یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے لیکن نہیں بیگم صاحبہ یوں ہو سکتا ہے - اس سے پیشتر مجھے بھورا رنگ دنیا کے تمام رنگوں سے پیارا معلوم ہوتا تھا - تھوڑی دیر ہوئی میں نے اپنا مذہب بدل ڈالا - اب میں نیلے رنگ کی قسم کھایا کروں گا"

"حضرت آپ اسی بھورے رنگ کا ذکر کر رہے ہیں جس کی خاطر آپ ایک گھنٹہ پہلے جان دینے کو تیار تھے؟"

"بیگم صاحبہ میں شاعر ہوں جس بے رحم عورت کی خاطر میں آج جان دینے والا تھا - اس کی صورت میں مجھے تمام محاسن - سب کی سب خوبیاں نظر آتی تھیں میں نے اس کی تعریف میں قصیدے لکھ لکھ کر گائے ہیں - لیکن اب مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ میری جہالت کا نتیجہ تھا - میں گاؤں کا رہنے والا ہوں - اور مجھے شہر سے نفرت تھی - اب مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو رہا ہے - میں اسے تمام عورتوں سے بڑھ کر حسین جانتا تھا - اس لئے کہ میں نے ابھی آپ کو نہ دیکھا تھا"

نفرت آمیز جواب ملا - کہ "شاعر صاحب کیا کہنے - آپ بھی اور مردوں کی طرح ہر لحظہ بدلنے والے ہیں - آپ بھورے رنگ کی پرستش کرتے ہیں - اس کے لئے جان دینے کو تیار رہتے ہیں - اور بمشکل ایک گھنٹہ گزرنے پاتا ہے کہ آپ کو نیلا رنگ موہ لیتا ہے - شاید آپ نیلے رنگ کے لئے بھی جان دینے کو تیار ہو جائیں؟"

سیوین نے کہا "میں نیلے رنگ کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں - یہ نیلی آنکھیں مجھے التفات کی

نظر دیکھیں تو یہی زندگی جنت ہو سکتی ہے۔"

خاتون طنزاً ہنس دی اور کہنے لگی۔

"جناب آپ یقین جانئے۔ کہ نیلا رنگ کبھی مہربان نہیں ہو سکتا۔ آپ شاعر لوگ سمندر کو نیلا کہتے ہیں لیکن اس کی لہریں غرق و فنا کر سکتی ہیں۔ آسمان نیلگوں ہے لیکن اس کی بجلیاں تاراج کر سکتی ہیں۔ اور ابھی میں آپ کو دکھا دوں گی کہ نیلی آنکھیں پستول کا نشانہ بھی لگا سکتی ہیں۔"

ستیوین نے آہستہ سے کہا " آپ کو شاید یاد نہیں کہ پستول اندھیرے میں چلانا ہوگا۔"

خاتون نے جوش میں آکر کہا " میں بہت ہی خوش ہوں۔ کہ آپ تشریف لے آئے۔ آپکو مار دینے سے مجھے بہت ہی مسرت حاصل ہوگی۔"

شاعر نے کہا " اب میری سمجھ میں آیا ہے کہ دوراندیش صاحب نے اور عطارد نے کیوں آپ سے بے اعتنائی کی۔ بیگم صاحبہ یہ برہم مزاجی نیلی آنکھوں کو نہیں سجتی۔ آپ بہت بے رحم ہیں لیکن آپ کے عطارد کا دل معلوم ہوتا ہے شعریت سے بالکل مبرا تھا۔ آپ کا عتاب میں بگڑنا آپ میں جو حسن پیدا کر دیتا ہے۔ وہ اسے دیکھ نہ سکتا تھا۔ ان نیلی آنکھوں میں جب غصہ چمک آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آسمان کی نیلگوں گہرائیوں کے ایک تلاطم میں کہیں سورج نظر آرہا ہے پھر اس پر بادل گھر کر آجاتے ہیں۔ پھر کس ناز سے بجلیاں چمکتی ہیں۔ پھر شاید چند بوندیں بھی ٹپک پڑتی ہیں۔ اور پھر سورج اپنا رخ تاباں بے نقاب کر دیتا ہے جس نے اس روح افزا نظارے کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ حسن کی کس طرح قدر کر سکتا تھا لیکن بیگم صاحبہ اگر میں آج رات زندہ بچ جاؤں تو ذکر اس پری وش کا اور پھر بیان اپنا جو آپ کے ساتھ بے وفائی کر گئے ہیں۔ کف افسوس ملیں۔ آپ کو فردوس کی پُر فضا گلگشتوں میں یہ حسرت ہو۔ کہ اے کاش میں اس بیچارے شاعر کی پرستش کو قبول کر لیتی اور زندہ رہتی۔ اس وقت شہرۂ آفاق ہوتی۔"

اس تقریر کے دوران میں خاتون اس کے چہرے کا نہایت غور سے مطالعہ کرتی رہی۔ آخر بولی۔

"سبحان اللہ کیا فصاحت ہے۔ لیکن شاعر احمق ہوتے ہیں۔ کیوں صاحب کوئی شخص آپ کی نظموں کو چھاپنا گوارا بھی کرتا ہے؟"

شاعر نے فخر و غرور سے کہا "بیگم صاحبہ۔ میرا نام ایڈمنڈ سیوین ہے"۔
"کون سیوین؟ مان کانٹو کا رہنے والا"
شاعر نے کہا "میں وہی ہوں۔ آپ کو میری نظموں میں سے کونسی پسند ہے "حسن شیریں"؟
"عشق لیلیٰ"؟
"نظمیں؟ میں نے نظمیں کبھی نہیں پڑھیں۔ شاعر سیوین کا نام میں نے آج سے پیشتر کبھی نہیں سنا۔ کیا آپ کی محبوبہ اس بھوری آنکھوں والی کا نام ڈوبا آرے ہے؟"
"ہاں۔ ہاں۔ مگر آپ اسے کیوں کر جانتی ہیں؟"
"میرا کپتان۔ میرا سورما۔ میرا عطارد۔ مان کانٹو میں اسے اپنا دل دے چکا ہے مجھے اس نے خط میں لکھا تھا۔ کہ وہ پہلے سیوین نامی ایک مجنون شاعر کی دلدادہ تھی۔ اب وہ ایک جنگجو۔ بہادر سپاہی کو ترجیح دیتی ہے۔ میرا عطارد مشہور خطوط باز ہے خط بہت مفصل لکھا کرتا ہے"
غصے سے سیوین کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اور وہ بیتاب ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ آخر کار بولا۔
"تو بیگم صاحبہ آپ ہی ہیں جنھوں نے بیدردی کے ساتھ میری خوشی میری راحت مجھ سے چھنوادی ہے۔ اگر آپ اپنے اس سورما کو اپنے پاس سنبھال کر رکھتیں تو میں اپنی زندگی مسرت اور اطمینان سے گزارتا۔ میں شہر ایک ضروری کام کے لئے آیا تھا۔ مجھے کیا معلوم۔ کہ میری عدم موجودگی میں۔ میری دولت کو یوں ایک لٹیرا آکر لوٹ لے جائے گا"
اس نے اتنا کہا اور ٹہل کر کمرے کی ایک دیوار سے دوسری دیوار تک چلا گیا۔ وہاں سے مڑکر اس نے اپنی نظریں۔ اس خاتون کے چہرے پر گاڑ دیں گرمیٔ تقریر سے خاتون کے چہرے پر ایک سرخی جھلک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک نور چمک رہا تھا۔ اس کے حسن کا طلسم پہلے سے بھی زیادہ ہوش ربا تھا۔
"عجب حسن اور اس پہ شاعر کی نگاہ سیوین کی پلکوں کو انکسار نے جھکا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اور ایک پیکر التجا ہو کر بولا۔
"بیگم کیا یہ نہیں ہوسکتا۔ کہ آپ اپنے سورما کو بھلا دیں۔ اور میں اپنی بے وفا محبوبہ کو بھول جاؤں۔ اور ———

"اور کیا"؟

"اور ہم دونوں ایک دوسرے کے ہوجائیں؟"

خاتون نے ایک قہقہہ لگایا - اور دیر تک ہنستی رہی - اتنی دیر تک کہ سیوین توہین محسوس کرنے لگا - کہنے لگی -

"شاعر صاحب مجھ سے آپ کے عشق کی پائداری کو تو نہیں سراہا جا سکتا - البتہ میں آپکی جدت طبع کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتی - لیکن مجھے افسوس ہے - میں آپ کی اس دانشمندانہ تجویز کو قبول نہیں کر سکتی - میں نے سچے عشق کی پہچان الفاظ سے کرنی چھوڑ دی ہے - جو مجھ سے شادی کرنا چاہے - اسے کچھ کرکے بتانا پڑے گا - میں اپنا دل کسی ایسے آدمی کو نہیں دے سکتی - جو آج تو نیلی آنکھوں پر مرتا ہے - اور پھر قوس قزح کے ساتوں رنگ باری باری اسے اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں - مجھ سے ایسی حماقت نہیں ہو سکتی - اور چونکہ ایسے شخص کا ملنا ناممکن ہے ———— اس لئے ————"

اتنے میں دروازہ کھلا - اور پول اندر داخل ہوا - دونوں کو بے نقاب دیکھ کر چونکا - اور کسی قدر درشتی سے کہنے لگا - "یہ سخت بے قاعدگی ہے - آپ از راہ نوازش اپنا اپنا نقاب پہن لیجئے"

خاتون نے کہا "اب کیا ہے؟ اب تو ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا ہے - پول! تمہیں جو کچھ کرنا ہے - جلدی کرو - یہ صاحب تو ایسے خشک گفتار ہیں جیسے کوئی واعظ ہوں - آپ شاعر ہیں - مجھے شاعروں سے سخت نفرت ہے - میں شاعر کو گولی سے بھی مار سکتی ہوں"

پول نے ایک تھیلی آگے بڑھا کے کہا "اس میں کپڑے کی بہت سی چھوٹی بڑی کترنیں ہیں آپ ایک ایک کترن نکال لیجئے - جس کے حصے میں چھوٹی کترن آئے گی - اسے شیر بننا پڑے گا"

خاتون نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کپڑے کا ایک ٹکڑا نکال لیا - سیوین نے بھی اپنی قسمت آزمائی کترنوں کو ایک ساتھ رکھ کر ماپا گیا -

خاتون پکار اٹھی "میں شکاری ہوں"

سیوین نے کہا - اور میں شیر ہوں - بیگم صاحبہ گولی بالکل سیدھی چلائیے - یہ جھگڑا جلد پاک ہو جائے"

پول نے کہا "یہ دیکھیے۔ یہ گھنٹی ہے۔ اسے اپنے گلے میں لٹکا لیجیے۔ اور ہلا کے دیکھیے ٹھیک بجتی ہے یا نہیں۔ ٹھیک۔ بیگم صاحبہ یہ پستول۔ اس میں کسی طرح کا نقص نہیں۔ صاحب آپ اس دیوار کے سامنے ہی رہیے۔ اور جس وقت موسیقی بند ہو جائے تو آپ دو تین قدم چلیے اور گھنٹی کو بجنے دیجیے۔ اور بیگم صاحبہ آپ جس وقت گھنٹی کی آواز سنیں فوراً پستول چلا دیں۔ لیجیے آداب عرض ہے۔ میں آپ کا بہت ممنون ہوں۔ خدا کرے آپ کا سفر جلدی سے طے ہو جائے۔ اور آپ کی منزل خوشگوار و دلپسند ہو۔ صاحب۔ آپ کو کس طرح کی موسیقی چاہیے ہے؟"

سیوین نے کہا "کوئی دردناک سا شعر بجاؤ جس میں امیدوں کا خاک میں مل جانا ہو جس میں نیلی آنکھوں کی سفاکی ہو جس میں ایک درد بھرے دل کا نالہ ہو۔ ایک بے رحم شکاری کے شکار کی آہ وزاری ہو۔ بیگم صاحبہ لیجیے۔ جو انتقام آپ کو مردوں کی جنس سے لینا ہے۔ وہ مجھ اکیلے کی ذات سے لے لیجیے"

پول نے طاق پر رکھی ہوئی شمعیں بجھا دیں۔ انگیٹھی کی آگ کے سامنے لوہے کا ایک تختہ رکھ دیا۔ پھر میز کا لمپ اٹھا کر باہر چلا گیا۔ جب دروازہ بند ہو گیا تو کمرے میں بالکل اندھیرا تھا۔ ساتھ کے کمرے سے بربط اور رباب کی دردناک موسیقی نے فضا میں ایک بیتابی پیدا کر دی تین منٹ تک یہی حالت رہی۔ اس کے بعد موسیقی بند ہو گئی۔

محیط تاریکی اور خاموشی میں گھنٹی کی نقرئی آواز بالکل صاف سنائی دی۔ پستول کی ایک گولی چل گئی۔ دوبارہ گھنٹی بجی۔ ایک اور گولی چلائی گئی۔ پول۔ لمپ ہاتھ میں اٹھائے اندر داخل ہوا۔ پستول خاتون کے ہاتھ میں تھا۔ نالی میں سے دھواں ابھی نکل رہا تھا۔ سیوین۔ ویسے کا ویسا کھڑا تھا۔

پول نے دیوار پر نظر ڈال کر کہا "گولیوں کے نشان کہاں ہیں۔ وہ ہیں۔ وہ دو سوراخ۔ بیگم صاحبہ۔ آپ کا نشانہ بہت ہی غلط تھا۔ اب صاحب آپ گھنٹی بیگم صاحبہ کو دیدیجیے۔ اور میں پستول ابھی آپ کو بھر کے لا دیتا ہوں"

پول کونے میں ایک میز کے پاس کھڑا ہو کر پستول بھرنے لگا۔ شاعر نے کہا "بیگم صاحبہ آپ نے پستول بہت اونچا چلا دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آپ نے جان بوجھ کے

ایسا کیا ہے میرے دل میں اتنا رحم نہیں۔ میری ایک نہ ایک گولی ضرور مہلک ہوگی"

خاتون نے کہا" شاعر صاحب یہی تو میری تمنا ہے"

پول نے پستول بھر کر سیوین کو دے دیا۔ خاتون سے پوچھا" آپ کو کس طرح کی موسیقی چاہیے"

جواب ملا" کوئی بے پرواسی چیز بجا دو۔ دردناک سُر مجھے نہیں بھاتے۔

دروازہ بند ہو گیا۔ اور ایک ایک لمحے کے بعد اس تاریکی میں ایک ہنستا کھیلتا ہوا سُر سنائی دیا۔ آخر وہ بھی بند ہو گیا"

ایک گھنٹی کی آواز آئی۔

ایک گولی چلی۔

صیاد نے آواز دی" شاعر صاحب پستول ذرا نیچا کر کے چلائیے"

صیاد نے کہا" نیلے نیناں والی خدا حافظ"

اندھیرے میں ایک ہنستی ہوئی آواز نے جواب دیا" بے وفا شاعر۔ خدا حافظ" اور پھر گھنٹی بجی۔ ایک فائر ہوا۔ ایک چیخ سنائی دی۔ کوئی زمین پر جیسے گرا۔

پول روشنی لیکر اندر آیا۔ خاتون اپنی جگہ پر کھڑی تھی۔ سیوین کے ہاتھ میں پستول تھا۔ خود فرش پر پڑا تھا۔

خاتون نے ایک چیخ ماری۔ اور گرتی پڑتی سیوین کے پاس پہنچ کر زمین پر بیٹھ گئی چلا چلا کر کہتی رہی۔

"میرے شاعر۔ میرے پیارے شاعر۔ تو نے اپنے آپ کو کیوں مار ڈالا۔ ہائے کس انداز سے تو نے خدا حافظ کہا تھا۔ اور میں نے یونہی تیرا مضحکہ اڑا دیا۔ میرے خوبصورت شاعر تو کیوں مر گیا؟"

پول نے شبہ کی نظروں سے دیوار کو دیکھ کر کہا" لیکن وہ مر کیسے سکتا ہے۔ دوسرا کارتوس تو خالی کارتوس تھا"

"کیا کہا تم نے؟"

"میرا خیال ہے۔ میں نے آپ سے ذکر بھی کیا تھا۔ کہ میں کبھی کبھی ایک خالی کارتوس بھر دیا کرتا ہوں۔ پہلا کارتوس جو چلایا گیا۔ اس کا نشان تو دیوار پر موجود ہے۔ اس لیئے دوسرا کارتوس بھی خالی ہوگا۔ ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ کارتوس خالی ہے۔ یہ مر کیسے سکتے ہیں؟ صرف بیہوش ہوگئے ہیں۔ وہ بھی نہیں۔ دیکھیئے ان کی آنکھیں کھل رہی ہیں۔"

سیوین نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا کہ حسن عشق کے انداز میں نیازمند ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا۔ "تو گویا میں جنت میں پہنچ گیا ہوں۔ تم بھی یہاں ہو۔؟ او خدا۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں"؟

خاتون نے آہستہ سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ کہنے لگی "نہیں میرے صاحب ہم ابھی پیرس میں ہیں"

"پیرس میں؟ کیا کہا تم نے پیرس میں۔ کیا لغو بات ہے" سیوین اٹھ کر بیٹھ گیا "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ میں نے اپنے دل پر پستول چلایا تھا۔ یہ دیکھو بارود کا نشان۔ اس بات کا شاہد ہے"

ڈوَل۔ بولا "وہ خالی کارتوس تھا۔ آپ کو نئے سرے سے کھیل شروع کرنا پڑے گا بیگم صاحبہ اب آپ کے شکاری بننے کی باری ہے"

خاتون نے کہا "اب مجھ سے نہیں ہوسکتا میں تنگ آگئی ہوں برائے مہربانی مجھے ایک گاڑی منگوا دیجیئے۔ مجھے آج ہی ورسیلز پہنچنا ہے۔

ڈوَل نے کہا۔ بیگم صاحبہ یہ نہیں ہوسکتا۔ ابھی تو کھیل شروع ہی ہوا ہے۔ دیکھیئے ایک دو گھونٹ سے آپ کا خون ابھی پھر گرم ہو جائے گا۔ یہ پی لیجیئے"

"صاحب۔ آپ مجھے فوراً گاڑی منگوا دیجیئے۔ آپ سنتے ہیں"؟

ڈوَل مایوس ہو کر کمرے سے باہر چلا گیا سیوین۔ آہستہ آہستہ فرش پر سے اٹھا۔ خاتون نے پوچھا "میرے اچھے صاحب مجھے ایک بات بتا دیجیئے۔ آپ نے مجھ پر گولی کیوں نہ چلائی"؟

"تم میرے عشق کی سچائی کا ثبوت مانگتی تھیں۔ میں یہی کرسکتا تھا کہ تمہارے لیئے جان دیدوں افسوس وہ بھی نہ ہوا۔

خاتون نے بڑی ملائمت سے کہا "یہ آپ کیا جانیں"؟ اور پھر خاموش ہوگئی۔

تھوڑی دیر کے بعد بولی۔ میرا نام وِن سینیز ہے۔ میں ملکہ کی درباریوں میں سے ہوں۔ کیا

آپ اتنی تکلیف گوارا کر سکتے ہیں کہ کل دوپہر کے بعد ورسیلز میں آ کر مجھ سے ملیں۔ میں آپ کے شعر آپ کے منہ سے سنوں گی۔ اور پھر ——————"

اور پھر کیا"؟

اور پھر میرے شاعر ہم ستاروں کی باتیں کریں گے"۔

شاعر نے پوچھا "ان دو نیلے ستاروں کی جو اس وقت مجھ پر چمک رہے ہیں؟"

خاتون نے نوجوان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر کہا "یونہی سہی"! +

(ماخوذ از فرانسہ) "پطرس"

آہ میں گستاخ ہوں

کیوں؟ اس لئے کہ میرا وفور شوق۔ میرے جذبات الفت میری بیخودی عشق۔ میری شوخی تقریر کی مزاحم ہے۔ میری وارفتگیاں تیرے تمکنت حسن کو اظہار نفرت کا موقع نہیں دیتیں۔

موسم بہار میں جب نسیم صبح مست خرام ناز ہوتی ہے۔ تو جہاں فطرت کی متلون شوخیاں نخل نخل کو حسن غنچہ و گل سے آراستہ کر دیتی ہیں، طیور چمن کی ترنم ریز نغمہ سنجیاں گلزار زندگی کی کیاری کیاری میں محشر تلاطم بپا کر دیتی ہیں۔ وہیں بلبل اپنے الفت زدہ دل کے ولولوں سے مجبور ہو کے پھول پھول پر ٹوٹ ٹوٹ کے گرتی ہے۔ نشہ آرزوئے وصل میں چور اور سرشار ہو۔ کر کلی کلی کے معصوم منہ کو چومتی اور چھپاتی ہے۔ اور رہ رہ کے گلوں کے عارض رنگین کو چھپا لیتی ہے۔ ..... مگر اس کے وفور شوق کا کوئی شکوہ سنج نہیں۔

حسن قدرت کا متنوع ظہور جب عالم ظاہر میں نور و نار کو اپنا جلوہ گاہ بناتا ہے۔ تو پروانوں کے ہجوم اپنے جذبات زندگی سے اکتا کر ہر شمع انجمن کے شعلہ ہائے جوالہ پر چھاپا چھاکے آتے ہیں۔ ان کی دیوانہ وار سرفروشیاں اور جاں نثاریاں ہر برق حسن کی عریانیوں سے اپنے دیدہ و دل کے مستور حسرت نظارہ کو بے دریغ نکال لینا مقتضائے فطرت اور منشائے قانون عشق سمجھتی ہیں ...

مگر شمع باوجود سراپا زبان ہونے کے بھی اس دیدہ دلیری اور اس گستاخی جرأت کی کبھی گلہ مند نہیں ہوتی۔

لیکن آہ جب میرے محدود وسعت خیال کی رسائی میرے مفلس عشق کی مجبوریاں مجھے پا جاتی ہیں۔ اور میرے سرگرم تمنا ارمان تیرے لب لعلین سے تشنگی بجھانے اور توغل برتنے میں محو ہو جاتی ہیں تو خدا جانے کیوں خود میرے ہی ضمیر منفعل کی پشیمانیاں مجھے اس جرم کے ارتکاب کا ملزم و گنہگار ٹھیرانے میں ناانصافی سے کام لیتی ہیں ؎

بوسہ بے ادبم آنقدر آورد ہجوم   کہ لب لعل ترا فرصت دشنام نداد۔ "مدہوش"

ایک خواب

تکفینی باجوں کے سامعہ نواز نغموں نے جو لامحدود فاصلہ سے کسی گشتہ سحر کے ماتم گسار معلوم ہوتے تھے۔ مجھے میرے خواب نوشیں سے بیدار کر دیا۔ میں ایک کشتی میں سو رہا تھا جو ساحل پر لنگر انداز تھی۔۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سپیدۂ سحر آغاز ہو رہا تھا۔ اور اس کی دھندلی روشنی میں ایک لڑکی سر پہ گلاب کے سفید پھولوں کا تاج رکھے اس سنسان مقام پر جلد جلد قدم انداز تھی۔ اس کی رفتار سے خوف ٹپکتا تھا۔ اور وہ پیچھے پھر پھر کر دیکھتی جاتی تھی کہ مبادا کوئی دشمن اس کا متعاقب ہو۔ لیکن جب میں کنارے پر کود کر اس کے پیچھے بہ تعجیل روانہ ہوا کہ اس کو خطرۂ محاذی سے آگاہ کر دوں تو افسوس!! وہ مجھ سے بیحد خوفزدہ ہو کر بھاگی۔ اور میں اسے پکار پکار کر بے فائدہ اس ریگ رواں سے متنبہ کرتا رہا جو اس کے سامنے دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ تیزی سے دوڑی۔ اور چٹانوں کی ایک فلک فرسا چوٹی کے گرد گھوم کر غائب ہو گئی۔ میں بھی طرفۃ العین میں اس جگہ پہنچا لیکن آہ!! یہ دیکھنے کے لئے کہ فریب کار ریگ رواں اس کے سر پر محیط ہے۔ اس کا جسم نازک میرے پہنچنے سے پیشتر ہی دفن ہو چکا تھا۔ صرف حسین اور شباب نما سر اور گلاب کے سفید پھولوں کا تاج، متاسف آسمان کے نیچے نمودار تھا۔ ایک چیز اور بھی تھی جس پر نگاہیں بے اختیار پڑتی تھیں۔ وہ کیا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا ساعد سیمیں!!!

میں نے صبح کی جھلملی روشنی میں اس کا خوبصورت سر دیکھا جو ظلمت میں ڈوبا جا رہا تھا۔ میں نے اس کا صاف و شفاف بازو دیکھا جو اس دغاباز تربت سے باہر نکلا ہوا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں میں نے اس کا وہ بازو دیکھا جو کبھی گھومتا۔ کبھی اٹھتا۔ اور کبھی کسی چیز پر چنگل مارتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ گویا وہ کوئی ایسا واہمی اور غیر محسوس ہاتھ پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو اونچے اونچے بادلوں سے اس کی دستگیری کے لئے نکلا ہو۔ آہ!! یہی نہیں میں نے اس خوبصورت بازو کو اس کی خون گشتہ امید اور آخری یاس کا بھی مظہر پایا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سر، پھولوں کا تاج، بازو، سب غرق ہو گئے۔ اور آخر کار

ان پر بھی ظالم ریگ رواں کا تسلط ہو گیا۔ اب روئے زمین پر اس پیاری اور خوبصورت لڑکی کی کوئی یادگار باقی نہ تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ صرف میرے اشک حسرت جاری تھے! تجہیزی گھنٹوں کے نغمے جو وسیع اور سنسان سمندر پر آتے ہوئے اور بھی تیز ہو گئے تھے۔ اس مدفون لڑکی کی تربت اور اس کی سحر سرگشتہ پر نوحہ خواں تھے۔

میں بیٹھ گیا اور چپکے چپکے وہ آنسو بہانے لگا جو اکثر ان لوگوں کی یاد میں بہائے جاتے ہیں جو تباشیر سحر سے قبل ہی مادر گیتی کی بے مہریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دفعتہً میرے آنسو اور تکفینی گھنٹوں کے نغمے کثیر التعداد اقوام کے شور و غل اور کسی جلالتماب پادشاہی توپ خانہ کے اس غریو سے بند ہو گئے جو وادیوں کے کنارے کنارے بعجلت تمام بڑھتا جاتا۔ اور پہاڑوں کی آواز بازگشت سے دور دور تک سنائی دیتا تھا۔ میں نے زمین کی جانب کان لگا کر سنا اور کہا "خاموش"!! "یہ نزاعی طوائف الملوکی ہے"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے پھر بگوش تمام سنا اور سر اٹھاتے ہوئے چپکے سے کہا "اے رب قدوس!! کیا یہی آخری فتح ہے۔ وہ فتح جو تمام فسادوں کو نیست و نابود کر دیتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

(ترجمہ) (تسکین سوروی فرینی)

توکہاں

پھول کہتا ہے "مجھے سونگھو کہ خدا میرے اندر بسا ہوا ہے" میں سونگھتا ہوں اور مست ہو جاتا ہوں
پھل کہتا ہے "مجھے چکھو کہ وہ میرے اندر بشکل لذت ہے" میں اسے چکھتا ہوں اور خوب خوش ہوتا ہوں
سبزہ کہتا ہے "مجھے چھوؤ کہ وہ میرے اندر سوتا ہے" میں اسے چھوتا ہوں اور نہال ہو جاتا ہوں۔
اونچی پہاڑی سے گرنے والا دریا۔ کہتا ہے میرے ترنم ریز نغموں کو سنو کہ وہ میرے ساتھ ہم آہنگ ہے" میں سنتا ہوں اور جھومنے لگتا ہوں۔

لیکن اے پیارے۔ دفعتاً تو کہیں سے آ جاتا ہے۔ اور کچھ کہتا نہیں۔ تیری نگاہ سے میری نگاہ ملتی ہے اور میں سجدے میں گر کر بیہوش ہو جاتا ہوں ⁂

نیاز فتحپوری

ننھی بوندیاں

برسات کا موسم ہو اور پانی برستا ہو تو موسلا دھار بارش کا تسلسل بھی واقعی پُرلطف سماں ہوتا ہے۔ تھم تھم کر برسنے والے بادل ضرور سرور انگیز ہوتے ہیں۔ مرۃً واحدۃً آسمان کی کسی ایک جہت یا مختلف سمتوں سے کالی گھٹاؤں کا اُٹھنا اور چشم زدن میں سر پر آکر برس جانا بھی عجیب فرحت افزا منظر ہے۔ شبانہ روز لگاتار جاری رہنے والی جھڑیاں نیلگوں سقف آسمان کی ابیض برقعہ پوشیاں۔ اور مہر عالمتاب پہ ابر کی تہ در تہ چادروں کا نقاب۔ یہ سب بجائے خود نیچر کے مستقل مناظر ہیں۔ مگر اس دلفریب برکھا رُت میں جو وجدان ننھی بوندیوں کے ترشح سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے سامنے دوسری تمام کیفیات کالعدم ہیں

کہنے کو تو یہ ننھی بوندیاں۔ ہوا کے جھکوروں میں جھول جھول کر برسنے والی موٹی اور بڑی بڑی بوندیوں کی بوچھاڑ کی سی سینہ زوریاں اپنے وجود میں نہیں رکھتیں جس کے مقابلے سے۔ انسان و حیوان شجر و حجر یکساں عاجز آجائیں لیکن ان معشوقوں کی فتنہ زائیاں بھی انکی چال میں ضرور روپوش ہوتی ہیں جس کے پاؤں پازیب کی جھنکار سے بے خبر ہوں۔ چال سے کسی قسم کی شوخی و شرارت نہ ظاہر ہو۔ اس کی قریب السکون رفتار حسینوں میں محض انداز خرام سے بڑھ کر کوئی دوسرا وصف مس تک سے محروم رہے۔ مگر اپنی مسیحا صفتی سے قدم قدم پر مردے جلانا اس کا ایک معمولی مشغلہ ہو چکا ہو۔

اے ننھی اور نہایت سکون سے برسنے والی بوندیو تمہاری شان دلربائی ضرور معشوقوں کے خرام ناز اور صفت مسیحائی کی عین متساوی و متوازی ہے۔

موسلا دھار برسنے والے پانیوں سے کائنات عالم کا ہر ایک متنفس گھبرا کر محفوظ مقامات میں پناہ لیتا ہے۔ سلسلہ وار جھڑی لگ جانے سے دنیا کچھ ایسی تنگ آجاتی ہے کہ ہر شخص عارض آفتاب کے دید کے لئے مضطرب ہو ہو جاتا ہے۔ مگر اس عالم اضطرابی میں بھی جب کبھی یہ ننھی بوندیاں اپنا نزول مقدس فرماتی ہیں تو یہی نہیں کہ تمام مخلوق اپنی کلفتوں کو بھول جاتی ہے۔ بلکہ اس وقت کرۂ ارضی کا ہر ایک ذی روح

ان کی خاموش صدا سن سن کر لبیک و سعدیک کہتا ہوا۔ استقبال کے لیئے مجبور ہو جاتا ہے۔ ہر شخص اپنی اپنی جائے پناہ سے نکل کر اور سقف فلک کے نیچے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور نہایت الفت سے سر اٹھا اٹھا کر انکو منہ پر لیتا ہے۔

آہ وہ بھی کچھ عجیب سماں ہوتا ہے۔ جب کہ لت عشوہ گراں جن کا اپنا قیام ازل ہی سے ہر ایک صحیح دماغ کی چوٹی پر قرار حاصل کر چکا ہے۔ اپنی اپنی فرودگاہوں کے ملحقہ باغیچوں اور روشوں پر اس حسرت کو پہلو میں دبائے ہوئے سروقد حاضر ہو جاتی ہیں کہ یہ بوندیں جو کہ نازکی و دلربائی میں ان کی طفیل بلکہ امثل نزین ہیں۔ ان کے اجسام گرامی کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف و ممتاز فرمائیں۔

آف! اس عالم کا تصور! جب کہ یہ ملائکہ صفت ہستیاں ان ننھی بوندیوں کو سر پہ اٹھاتی ہیں۔ کبھی دوش پر بٹھاتی ہیں اور پھر بیتاب کر فرط تعشق سے بے تاب ہو کر چاہتی ہیں کہ سینوں سے چپٹا لیں۔ اور ہائے! آخر چپٹا ہی لیتی ہیں۔

کافر ادا ہستیوں کے وہ نازک اور رنگین رخسارے جو ہمیشہ اغیار کے بوسے کی محض دلی تمنا کے ساتھ ہی پژمردہ ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ ان ننھی بوندیوں کی متواتر آمد و رفت کو اپنے لئے سرمایۂ صد افتخار سمجھتے ہیں۔ ان کی پیہم دو ادوش کو اپنے لئے متاع ناز جانتے ہیں اور ان کے خرام ناز کی گام زنی کی ہر ہر ادا پر اپنی حسرتوں کی قربانی مقصد حیات سمجھتے ہیں۔

غارت گران جنس قلب کی وہ افعی صفت زلفیں جو کسی غیر کو تو اپنی ہوا تک نہیں چھونے دیتیں مگر خود جب ان ننھی بوندیوں کے خیر مقدم کی غرض سے فرش راہ بننے کے لئے اس دوش سے شروع ہو کر کمر پہ لپٹتی ہوئی دوسرے کندھے تک منتہی ہوتی ہیں تو لامحالہ اس وقت وہ ظالم زلفیں اپنی ہمادوِ طالعی پر خود رشک سے دل گرفتہ ہو جاتی ہیں۔ اور باوجود پامال رہ ہونے کے بھی ان کا دماغ عرش بریں پر متمکن ہوتا ہے۔

جب کہ زور سے برسنے والے پانی جھولوں پہ ملار گانے والیوں کے مزوں میں غضب کی تلخیاں پیدا کر دیتے ہیں تو یہی ننھی بوندیاں اپنے قدوم میمنت لزوم کے ساتھ آسمان سے نزول فرماتی ہوئی۔ ان حسرتوں کو پھر ابھار دیتی ہیں۔ ابھی یہ نازک بدن پانی کے ڈر سے اندر جا چھپی تھیں۔ کہ ان ننھی بوندیوں کے ترشح کے ساتھ ہی اپنے خاص انداز رعنائی میں ڈوبی ہوئی پچرنگی ساریاں زیب تن فرمائے ہوئے پھر جلوہ افروز ہو گئیں اور ربع مسکون کے مخملی فرش کو اپنے خونی پاؤں سے روندنے

کے بعد جھولوں میں بیٹھ کر فضائے محیط میں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اٹھکیلیاں کرنے لگیں ساکنانِ زمین کو مٹاکران کمندوں کی وساطت سے اب آسمان پر یورش ہے کہ ملاء اعلی کو بھی اپنی دلفریبی و ناز کی کا شکار کرلیں کہ جس سے فرش و عرش پر ہماری حکومت مساوی تسلیم کی جاسکے بنانے ان ننھی بوندیوں کے سوا برسات کی کونسی نوعیت اس حد تک فتنہ زائی میں ید طولیٰ رکھتی ہے؟

کائنات عالم کے دیو ہیکل پہاڑ جو اپنی سربلندیوں کی وجہ سے سقف گردوں تک کا مقابلہ کرنے کو بڑھتے چلے جا رہے ہیں سینہ زوری سے بہنے والے پانیوں کو دور ہی سے دھتکار کر جذبۂ انتقام سے پاؤں تلے روند ڈالتے ہیں۔ مگر جس وقت یہ ننھی بوندیاں شرف صدور لاتی ہیں تو ان کی صوری لطافتوں اور معنوی نزاکتوں سے۔ یہ سنگدل پہاڑ بھی متاثر ہو کر کچھ ایسے ازخود رفتہ ہو جاتے ہیں کہ فرط ارادت سے ان کو گود میں بٹھا کر دلوں میں بسا لیتے ہیں۔ اور یہی نہیں کہ خوف رقابت سے کسی غیر کو اس کیفیت کے دیکھنے تک کی نوبت نہیں آنے دیتے بلکہ ایک لمحہ کے لئے بھی ان کو خانۂ دل سے باہر اُن کا قدم نکالنا گوارا نہیں ہوتا

سنبل و ریحان صحن چمن میں بارش کے مقدمتہ الجیش کی درشتی کی تاب نہ لاکر سرنگوں ہو چکے تھے۔ مگر ننھی بوندیوں کی آمد آمد کا خاموش غلغلہ ابھی فضائے عالم ہی میں ساری ہوا تھا کہ ان بیتاب برق کے کھنبوں کے کانوں میں بھی یہ خبر آپہنچی اور وہ سروقد کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ اور فرط مسرت سے کچھ اس طرح والہانہ محو رقص ہوئے کہ گلشن کے ہر ایک گل و بوٹے کو وقف تحیر کر دیا۔

نازک خیال شاعر جس وقت موسلا دھار بارش کی سرگرمیوں سے عاجز آکر کنج عزلت میں بیٹھا ہوا اپنے جذبات کا ماتم کرنے لگتا ہے۔ تو اس وقت مکان کی مصنوعی تزئین ہی اس کے اظہار تخیل کے لئے ممد ہوتی ہے۔ نہ مناظر قدرت کے تصورات نہ ہی اسکے دماغ کو شعر گوئی کی طرف منتقل کر سکتے ہیں۔ اور نہ کسی سامنے بیٹھنے والی حورشمائل کے خد و خال یا تناسب اعضا سے اس کی شعریت متاثر ہو سکتی ہے۔ بلکہ اس ماتم زائی کے عالم میں بارش کے وہ آخری قطرے جو ننھی بوندیوں کی شکل میں منتقل ہونے کے بعد پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے ہوئے جلوہ فرمائے عالم ہوتے ہیں۔ وہی اور صرف وہی اس وقت اس اہلیت کے واحد اجارہ دار قرار پاتے ہیں۔ دل گرفتہ شاعر کی ربابِ ہستی کے تاروں کو

اس کی شوخ مضرابیاں مرتعش طرب کر دیتی ہیں۔ ان کی ترنم ریزیاں اپنی ایک ایک صدائے بازگشت سے لاکھوں قلوب کو دم بھر میں مسحور کر دیتی ہیں۔

آہ! اس وقت جبکہ یہ ننھی بوندیاں برس رہی ہوں شاعر کے جذبات کا تلاطم تمام ربع مسکون سے اٹھ کر ہر فضائے محیط کو مضطرب کرتا ہوا آسمان تک کو سر پر اٹھا لیتا ہے اور وہ وہ عالم ہوتا ہے کہ اسرار قدرت کا ہر وہ معما جو ذرا دیر پہلے اس کے لئے عقدۂ لاینحل ہو رہا تھا۔ صرف اپنے ایک ہی ترانہ شعری سے اس کی گتھی سلجھا کر رکھ دیتا ہے۔

آہ! یہ ننھی بوندیاں ہی تو تھیں جنھوں نے اس حقیقت شناس شاعر کو اپنے فطری اور دلکش انداز و ادا سے متاثر کر کے اس کو اور اس کے کلام کو جاودانی زندگی دے دی۔

(ابو یحیٰی امام خاں نوشہروی۔ از سوہدرہ)

تنزل

مجھے نہیں معلوم میرا انجام کیا ہوگا؟ جس تیز روی سے میں تنزل کی طرف جا رہا ہوں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ دل و دماغ کے لئے مہلک ثابت ہوتی ہے مجھے خود بھی اس بات کا یقین ہے بلکہ ہمیشہ سے اس کا قائل رہا ہوں لیکن میں سوائے اس کے کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں بے بس ہوں۔ میں مجبور ہوں۔ میں اپنے آپ کو نہیں روک سکتا۔ ایک زبردست کشش۔ ایک ہمہ گیر جاذبیت مجھے ہلاکت اور پستی کی طرف کھینچے لئے جا رہی ہے۔ آہ بہت تھوڑے عرصے کا ذکر ہے۔ کہ میں اپنے آپ کو ایک نہایت عالی مقام پر پاتا تھا۔ میرا مطمع نظر اور میرا دائرہ افق بلند و وسیع تھا کہ اس پر نظر ڈالتے ہوئے میرا دماغ چکر کھاتا تھا۔ مجھے صرف عالی نگاہ لوگ دیکھ سکتے تھے۔ اور میں کوتاہ بینوں سے مامون تھا۔ اب میری یہ حالت ہے کہ کسی اور کو تو کیا؟ میں خود اپنے آپ کا مطالعہ نہیں کر سکتا۔ مجھے معلوم ہے کہ بہت عرصہ نہیں گزرنے پائے گا۔ جب کہ میرے حسیات فنا ہو جائیں گے۔ شاید میرے حواس مجھے جواب دے جائیں۔ میں اپنے آپ کو زندہ کہتا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں مردوں سے بدتر ہوں۔ کیونکہ جو شخص مر جاتا ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں ٹھکانے تو لگ جاتا ہے۔ اور میرا یہ حال ہے کہ دنیا میں کوئی سہارا نہیں آرام و سکون میرے لئے ناممکنات سے ہیں شاید مجھے اس وقت کوئی ناصح مفید ہو سکتا ہو اور نہ میں خود ہی اپنی رہنمائی کر سکتا ہوں چارہ گر کو مجھ پر صرف رحم آ سکتا ہے۔ اسے میرے نزدیک آنے کی ہمت نہیں پڑ سکتی۔

زندگی میں یہ ایک صرف ایک لغزش کا نتیجہ ہے۔

آپ نہیں سمجھے؟ خوب۔ بات یہ ہے کہ میں جامع مسجد کے مینار سے گر رہا ہوں۔

"پطرس"

کیا مجھے تجھ سے محبّت ہے؟

میں نہیں کہہ سکتا۔ مگر ہاں اتنا جانتا ہوں! کہ ۔ ۔ ۔ ۔ "جس طرح پرجوش سمندر کی لہریں شوق ساحل بوسی سے مضطرب ہو کر سیپیوں کی نچھاور میں سرگرم مستعدی رہنا اقتضائے فطرت جانتی ہیں" "جس طرح سطح زمین پر آفتاب اپنی شعاعوں کی نورانی چادر کو ہوا میں اڑا اڑا کر دن دن بھر مست رقص و سرود رہتا ہے" "جس طرح موسم بہار کی خوشرنگ فضاؤں میں الفت زدہ چکور کی جرأت پرواز اپنی پُر نغمہ و ترنم آواز کو چاند کے کانوں تک پہنچانے کی ناکامی سے بے قرار ہوتی ہے" اسی طرح میرا جذبۂ الفت سے متلاطم دل بھی تیری قدمبوسی کی تمناؤں سے دن رات وقف کشمکش ہے۔

جس طرح عشق پیچاں کی بیل کسی درخت یا مینار پر چھائی ہوئی ہوتی ہے "جس طرح شبنم کے بہار آفریں قطرے باغ جنگل کے برگ و گل کو تر و تازگی بخشتے ہیں" "جس طرح سایہ نور سے۔ اور دن رات سے ہمکنار ہوتا ہے" اسی طرح میری مشتاق روح بھی تجھ سے ہم آغوش ہو جانا چاہتی ہے۔

جس طرح چاند آتش آفتاب کے گرم شعلوں سے مرعوب ہو کر علیحدہ رہتا ہے۔ جس طرح زمین آسمان کے مشہور ظلم و ستم سے مامون رہنے کے لئے الگ تھلگ رہتی ہے۔ جس طرح پہاڑ موجوں کے زبردست تھپیڑوں کا استقلال اور جوانمردی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اسی طرح تیرا غصہ بھی مجھے تجھ سے دور ہی دور رکھنے اور جی ہی جی میں ضبط کر لینے پر مجبور کرتا ہے۔

جس طرح رات کے سکوت میں جاڑا اپنی ٹھنڈک سے گلاب کے پھولوں کو بڑی بے رحمی سے مرجھا دیتا ہے۔ جس طرح خنجر بُرّاں کا ایک وار بہادروں کو خاک و خون کر کے دنیا سے مٹا دیتا ہے۔ اسی طرح تیرا غم الفت مجھے ہر وقت ہلاک کرنے پر تُلا رہتا ہے۔

جس طرح بادشاہ بے نوا گداؤں سے نفرت کرتے ہیں۔ اور گدا آ آ کے انہیں کے دروازے پر صدا دیتے ہیں۔ جس طرح شمع پروانوں کی جان کی دشمن ہے۔ اور پروانے چھا چھا کے اسی پر دم توڑتے آ جاتے ہیں۔ اسی طرح میں بھی ہر پھر کے تیری ہی انجمن ناز کے سائے میں دم لیتا ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا یہ کیوں؟ شاید اسی کا نام محبت ہو"۔

(عبد الرحیم چغتائی)

شہزادی

ایک روز جب شہزادی اپنے عالیشان قصر کے آراستہ اور معطر ایوان میں نرم قالینوں پر دراز تھی۔ اور سیاہ اور گہری آنکھیں کچھ بند کئے، کچھ کھولے بوستان خیال کی سرسبز اور پُر اسرار روشوں میں گھنی اور ٹھنڈی جھاڑیوں میں اپنی کسی بیچین آرزو کی زندہ صورت تلاش کرتی پھر رہی تھی خواصوں اور رقاصہ لڑکیوں کے لطیف گیتوں اور ہلکے ہلکے گھنگھروؤں کی مدھم آواز اس کے خواب اور بیداری میں ایک نازک رشتہ تھی۔

لیکن یکایک شہزادی کے غافل کانوں کو ان نرم رسیلے، اور خواب آور نغموں میں اچانک ایک خلش۔ ایک گرمی محسوس ہوئی۔ جو نہ جانے کہاں سے آ رہی تھی۔ شہزادی چونک اٹھی۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگی منقش دیواروں۔ اور بھاری بھاری اطلسی پردوں کے باہر سے عود اور عنبر کی خوشبوؤں کے ساتھ ایک ارغنوں کی مدھم سی آواز ہواؤں سے تیر کر اندر آ رہی تھی۔ اور ایوان کی عالیشان دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر اور رقص و نغمہ کے روشن ہنگاموں پر چھا چھا کر کمرے میں بھر رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت اوپر کہیں بادلوں کی رنگین سرزمین سے کوئی زخمی طائر کراہتا ہوا نارِ دل کی دنیا کو اڑا جا رہا ہے۔

شہزادی بیتاب ہو کر اُٹھ بیٹھی۔ اس نے اپنا مرمری ہاتھ اوپر اٹھا دیا۔ رقص تھم گیا۔ موسیقی اور نغمہ کی آوازیں سکوت میں ڈوب گئیں۔ اور اس چپ چاپ میں شہزادی کے کان اس آواز کو صاف صاف سننے کے لئے متوجہ ہو گئے۔

لیکن جیسے شفق کی قرمزی رنگینیاں دہک دہک کر افق کے سنسان اندھیرے میں ڈوب جائیں۔ آواز کا جوش تھرتھرا دینے والی آہوں میں بدل کر آہستہ آہستہ خاموش ہو گیا۔ شہزادی اُٹھکر بھاگی اس نے ایوان کے پردے نوچ نوچ کر اتار پھینکے۔ اور دریچوں میں سے نظریں باہر ڈالنے لگی۔

صرف ایک چاند تھا۔ جو سنسان رات کی خاموشی کو ملائم نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اور فضا میں صرف پھولوں کی خوشبوئیں تھیں۔ یا ایک تحیّر و تذبذب۔

شہزادی واپس آکر قالین پر گر گئی۔ اور بیتابانہ اس کے اوپر لوٹنے لگی۔ اس کے دل میں کسی گئے گزرے زمانے کی موسیقی۔ ایک بے چین ارمان کی طرح بیدار ہو رہی تھی۔ اور ایک وسیع تمنا کے لئے اس کا دل لمحہ بہ لمحہ پھیلتا جا رہا تھا۔

رقاصہ لڑکیوں اور خواصوں کا جھرمٹ اس کے چاروں طرف جمع ہو گیا۔ اور وہ انتہائی پریشانی اور بدحواسی کے عالم میں کوشش کرنے لگیں کہ کسی طرح شہزادی کا اضطراب دور ہو جائے۔

لیکن شہزادی بیکایک اٹھی۔ شان تمکنت سے تن کر کھڑی ہو گئی۔ اور سب کو رخصت ہونے کا قطعی اشارہ کیا۔ خواصیں ذرا سے پس وپیش کے بعد حیرت سے اس کو دیکھتی دیکھتی الٹے پاوں واپس پھر گئیں۔ اور باہر جاکر پریشان چہروں اور متفکر نظروں کے ساتھ سرگوشیاں کرنے لگیں۔

شہزادی نے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کئے۔ وہ شاید اپنی روح کی خاموش اور بے قرار موسیقی کو اس دور سے آنے والے دھیمے دھیمے نغمے سے ہم آہنگ کرکے سکون حاصل کرنا چاہتی تھی۔

اس نے تمام چراغ گل کر دئے۔ باغ کی طرف کے دروازے کھول دیئے۔ شمعوں کی تیز چندھیا دینے والی روشنی کی جگہ چاند کے ہلکے ہلکے نقرئی نور نے لے لی۔ عود اور عنبر کی بھاری خوشبوئیں باہر نکل گئیں۔ اور تمام ایوان پھولوں کی لطیف اور نازک خوشبوؤں سے بھر گیا۔

شہزادی نے ایک رباب ہاتھ میں اٹھا لیا۔ اور خواب کے سے خمار کی کیفیت میں وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی۔ باغ کی روشوں میں چلی گئی۔ اور پھولوں کے ایک تختے پر گر کر اپنی ناتجربہ کار انگلیوں سے رباب کے تار تھرتھرانے لگی۔

ایوان کی غلام گردشوں میں پریشان اور خائف خواصوں کے کان میں ساز کی لرزتی ہوئی آواز پہنچی۔ اور انہیں ایسا معلوم ہوا۔ جیسے کسی بھولے بسرے سازندے کی روح ساز کے تاروں میں سے درد و کرب سے تڑپ تڑپ کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہی ہے ✱

سید امتیاز علی تاج

عورت بلند و پست!

اس شب کو جب عشوہ فروشوں کے بازار میں تیری دکان سج رہی تھی تو میری ہوس بیرادامن پکڑ کر تیری دکان تک لے گئی! پھر اس صبح کو جب شب کی بزم آرائیوں کے بعد تیری آنکھیں جھکی جاتی تھیں۔ شاید وہ نیند تھی یا تکان یا کیا؟ میں نے تیرے تھکے ہوئے جسم کے اندر ایک نیم بیدار روح کی جھلک دیکھی شاید اس وقت شب کی دکانداریاں تجھے پشیمان و محجوب کر رہی تھیں لیکن تو میرے سوال کا جواب کبھی نہ دے سکی۔

اے مغنیہ میں نے تجھ سے کتنی دفعہ سوال کیا کہ یہ ستار جو تیرے زانو پر ہے ایک نشاط روح۔ ایک کیف تمام۔ ایک وجدان علوی سے لبریز ہے۔ تو اس کے تاروں کی آواز میں غرق ہو جاتی ہے اور جب اسکے تار تیری آواز کا دامن پکڑتے ہیں تو میں سوچتا ہوں۔ کہ تیری روح اس ساز کے ہر تار میں جذب ہو گئی ہوگی! لیکن او ستار والی عشوہ فروش میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ جب تیری روح تیرے ساز کے تاروں پر لوٹتی ہے تو پھر تیرا وجود مادی کیونکر اپنی دکان سجاتا ہے۔ آنکھیں روح کے جھروکے ہیں۔ ان جھروکوں میں زید و عمر و بکر کی ہوس کیونکر جھانکنے کی جرأت کرتی ہے؟ کیا گھر کا مالک گھر کے اندر نہیں ہے۔ یا سو رہا ہے؟! تیرا ستار تیرے وجود روحانی کا دمساز نہیں۔ تو اس کے نغمے اس درجہ دلفریب کیوں ہیں؟ سچ بتا یہ کیا راز ہے؟ تیری فطرت کا یہ کیا معمہ ہے؟ تیرے ستار کے نغموں میں یہ تیرا وجدان قلب نہیں تو پھر کیا ہے! کیا موسیقی دھوکا دے سکتی ہے؟

پھر وہ صبح کی بھیرویں یاد کر جب تیرے عشوہ ہائے نوبنو! دل کی تمام کیفیات عالیہ کو شکست دے کر مجھے بار بار دعوت ناز دے رہے تھے۔ میں حیران ہوں کہ اس بھیرویں کے نشاط آسمانی میں حسن و عشق کی اونچ خام کاریوں نے کیونکر جگہ پائی! جبکہ خود میں سراپا مبتلا۔ کبھی کبھی چونک پڑتا تھا۔ اور زہر کی تلخی کو اپنی زبان پر محسوس کرتا تھا! کیا کبھی تو بھی زندگی کے اس زہر کی تلخی کو محسوس کرتی ہے! اگر تیرا وجدان بے لوث نہیں تو تیرا نغمہ کیونکر دلفریب ہو سکتا ہے؟ مگر میرے مذاق سلیم نے تو اس کو ہمیشہ دلفریب پایا! ......

تو جواب نہیں دیتی۔ یا نہیں دینا چاہتی۔ یا نہیں دے سکتی! صوفی صافی کچھ بتائیگا؟ زاہد خشک اس نکتہ کو حل کریگا؟ مسجد کے حجرے میں۔ یا مدرسے کے صحن میں کہیں کوئی بتائے کہ ناپاک روح کا نغمہ پاک بے لوث کیوں ہے؟ یہ عورت کا راز ہے ❖

"خاموش"

قندِ پارسی

(رباعیات ملک الشعرا حضرت شیخ غلام قادر صاحب گرامی شاعر خاص حضور نظام)

اے رازقِ باغ و راغ باراں بفرست
اے خالقِ خشک و تر بہاراں بفرست
واکردہ دہان خویش طفلانِ چمن
بفرست غذائے شیر خواراں بفرست

اے روح بجسم زار نالی تا چند
در بند قفس شکستہ بالی تا چند
پر بر زن و بر فرازِ سدرہ بنشیں
در مرکزِ فتنہ خاک مالی تا چند

برخیز کہ عارفاں بخود سیر کنند
در پردہ نظر بہ کعبہ و دیر کنند
خود را دیدند غیر از خود رفتند
خود غیر خودند قطع از غیر کنند

دلِ شاہ لرزہ گیرد ز گدائے بے نیازے

(از لسان الاسلام ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال پی ایچ ڈی بیرسٹرایٹ لا)

بلازمانِ سلطاں خبرے دہم ز رازے
کہ جہاں تواں گرفتن ز نوائے دلگدازے

بمتاعِ خود چہ نازی کہ بشہرِ دردمنداں
دلِ غزنوی نیرزد بہ تبسم ایازے

ہمہ نازِ بے نیازی ہمہ سازِ بے نوائی
دلِ شاہ لرزہ گیرد ز گدائے بے نیازے

ز ستیزِ آشنایاں چہ نیاز و ناز خیزد
دلکے بہانہ سوزے نگہے بہانہ سازے

رہِ دیر تختۂ گل ز جبین سجدہ ریزم
کہ نیاز من نگنجد بہ دو رکعت نمازے

ز تغافل تو خامم بہ رہِ تو ناتمامم
من و جان نیم سوزے تو و چشم نیم بازے

"مخزن" کی ڈاک

"مخزن" کے اگست نمبر میں "بدحواسی" کے عنوان سے جو مضمون حضرت فتحپوری صاحب ؟ کا چھپا تھا۔ اس نے ارباب تفنن میں ایک خاص مقبولیت حاصل کی "مخزن" کو کشت زار بنا دیا۔ ناآشنا لوگ پوچھتے ہیں۔ یہ کون صاحب ہیں ؟ خوب مضمون ہے۔

مگر بعض ایسے خطوط بھی ہیں جن کی تہ میں تنقیص وتعریض کا عنصر بھی مضمر ہے۔ چنانچہ ایک مکتوب ہمیں اپنے محترم دوست۔ اسیر ملت۔ شہید قوم۔ مولانا "معروف" کا موصول ہوا ہے۔ جو محبس سے آزاد دنیا میں آیا ہے اور سنسرڈ ہے۔

یہ خط اصل میں تو محب مخلص اور دوست ونواز "ملا واحدی صاحب" "ایڈیٹر" "خطیب" "نظام المشائخ" کے نام ہے مگر انھوں نے شاید اس کے شانِ ورود اور اصل منشا کو سمجھ کر ہمارے نام منتقل کر دیا ہے۔ ہم بھی اس مظہر شکوۂ الفت کو بجنسہٖ چھاپ کر جذبۂ تفنن سے سبکدوشی مناسب سمجھتے ہیں۔

اگست کے "مخزن" میں بعنوان "بدحواسی" حضرت فتحپوری ؟ کا ایک مضمون شایع ہوا ہے۔ اس میں میرا بھی ذکر خیر ہے۔ "بیدل" صاحب کو شاید معلوم نہیں کہ اس مضمون میں صاحب مضمون نے کس قدر انکسار و فروتنی سے کام لیا ہے میں احباب کو یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ اس فن شریف کے مدونین میں جہاں اور حضرات کے نام قابل ذکر سمجھے گئے۔ فی الحقیقت خود حضرت فتحپوری ؟ کا مرتبہ ان سب میں برتر و افضل ہے۔ اور انھوں نے کمال عجز سے (جو اہل کمال کا خاصہ ہے) اپنے خوارق ومعجزات فنیہ کو نہایت فراخ دلی کے ساتھ دوسروں کی طرف منسوب فرما دیا ہے۔ میں جیل کے اندر رہ کر اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ حضرت ممدوح نے نہایت درجہ ایثار و قربانی سے کام لیا ہے۔ اور ایک فن کی تدوین میں جو نمایاں خدمات انھوں نے خود انجام دی تھیں۔ اُن سے زمانہ کے صلہ اور ستائش سے مستغنی ہوکر

دوسروں کا دامن مالامال کر دیا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ہمارے دوست کے ساتھ یہ بڑی بے انصافی ہوگی کہ اس فن کے اندر جو بلند رتبہ اور اعلیٰ مرتبت ان کو حاصل ہے وہ نذر دیگراں ہو جائے۔ اور وہ اصلی مستحق ہوکر یونہی رہ جائیں۔ نہیں! حق کا حقدار ہی مستحق ہے۔

فن بدحواسی کے متعلق ابتدا میں جو نادر و نایاب خوارق پیش کئے گئے ہیں یعنی "جب سونکا جائیگا پھوڑا" اور "چنگرا سی"۔ وہ اگرچہ انتہائی دریا دلی کے ساتھ دوسروں کی طرف منسوب کر دئے گئے ہیں۔ مگر زینت المساجد کی ایک ایک اینٹ شاہد ہے کہ یہ معجزہ فی الحقیقت حضرت فتحپوری ہی سے ظہور میں آیا تھا چنگرا سی جیسی بہت سی مثالیں اور بھی ہیں۔ جن کے وضع ہوئے کا انھیں کو فخر حاصل ہے۔ مثلاً مولانا ابو الکلام ایڈیٹر الہلال کو نہایت جامع اور مختصر طریق پر یوں ارشاد فرمانا کہ مولانا ابو الہلال جس کے سنتے ہی فوراً سامع کا ذہن مشارٌ الیہ پر منتقل ہو جاتا ہے۔ اور یہ اختراع اصول مدوین زبان کے بالکل مطابق ہے جیسے پھول اور تیل کا مخفف پھلیل۔

خیالی بدحواسی کی مثال حضرت بیدل کے اس مشہور مصرعہ سے دی گئی ہے ؎

چشم ہر جا کہ پرد مژدہ دیدارے ہست

گو اسے فخر ایجاد کسی اور سے حاصل ہو۔ لیکن اس صنف کی متعدد مثالیں خود حضرت موصوف سے یادگار باقی ہیں۔ جن کا خدا معلوم کیوں ذکر نہیں فرمایا۔ مثلاً غالب کا شعر ہے ؎

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں سوز غم ہائے نہانی اور ہے۔

ہمارے محترم دوست کی غم فراموشیوں سے "غم ہائے نہانی" کے بجائے "ہمیشہ بھن خوش دبآواز بلند ——— کچھ اوہی عیاں ہوا۔ میر تقی میر کا شعر ہے ؎

فرصت عیش اپنی یوں گذری کہ مصیبت پڑی تمنا پر

دوسرے مصرعہ کو آپ نے یوں اصلاح دی۔ ع۔ کہ تمنا پڑی مصیبت پر

اس قسم کے صدہا خوارق نغز یہ موجود ہیں جن کے دیکھنے اور سننے والے سب جیل ہی میں نہیں ہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ چاندنی چوک دہلی۔ بنارس۔ ہمیر پور۔ آگرہ اور بھوپال سے صدائیں بلند ہونگی۔ اور ملفوظات ادبیہ کے جامع اور مدون حضرات جلد اس طرف اپنی توجہ مبذول فرمائیں گے۔ خود جناب بیدل صاحب بھی ایسے خوارق کی ملاحظہ سے محروم نہ ہوں گے۔

ہسوی؟

محک

جو کچھ بھی اس وقت میں دنیائے ادب میں پیش کرنے والا ہوں۔ اگر وہ باطناً تعجب خیز نہیں تو ظاہراً حیرت انگیز ضرور ہے۔ بہت سے اصحاب قلم اس پر اپنی رائے زنی کریں گے۔ بہت سے حضرات مجھ پر جسارت کا الزام لگائیں گے۔ بہت سے ظاہر بیں اسے چھوٹا منہ بڑی بات تصور کریں گے۔ چند افراد ایسے بھی نکلیں گے جن کے سلامت مذاق وقابلیت علمی انھیں امتیاز حق و باطل پر مجبور کرے گی۔

میرے سامنے اس وقت مولانا شبلی نعمانی کی شعر العجم جلد چہارم ہے جس کے آغوش میں جواہر کے ساتھ خزف ریزے بھی ہیں۔ مگر ان پر ادائے تحریر نے وہ نظر فریب صیقل کی ہے جس کی وجہ سے جواہر و خزف یکساں نظر آرہے ہیں۔ دنیائے ادب کے لئے یہ کتاب مایۂ ناز ضرور ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کتاب کے دیکھنے والے کچھ ایسے مہلک غلطیوں میں پڑ گئے ہیں جن سے نجات معلوم۔ بخدا میری نظر اس پر متعصبانہ نہیں۔ منقدانہ ہے۔ اور اگر کوئی نقد و عصبیت میں افتراق نہ کرے تو میری خطا نہیں سمجھنے والوں کا قصور ہے۔ مجھے اس کے دیکھنے سے یہ خدشہ پیدا ہوا کہ خدانخواستہ کہیں اس کی غلطیاں اساس ادب اردو نہ ہو جائیں۔ کیونکہ اکثر حضرات اس کے مطالب پر ایمان لا چکے ہیں۔ اگرچہ وہ مطالب غلط ہیں۔ مصنف کوئی معصوم نہ تھے کہ خطا کا خیال محال ہو۔ انسان تھے۔ اور انسان کے قلم کا بہک جانا بعید از عقل نہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس نقد میں میری غلط فہمی دخیل ہو۔ اگر ایسا ہوا تو اصحاب الرائے غالباً تقویم اود فرمائیں۔

مصنف شاعری کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں "شاعری وجدانی اور ذوقی چیز ہے اس کی جامع و مانع تعریف چند الفاظ میں نہیں کی جاسکتی۔ اس بنا پر مختلف طریقوں سے اس کا سمجھانا زیادہ مفید ہوگا"

ایک شے کو وجدانی ماننا۔ اور پھر اس کی تعریف کرنا انسانی فہم سے باہر ہے۔ وجدانیات و ذوقیات نہ تعریف طلب ہیں۔ نہ ان کی تعریف ہوسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رنج و سرور۔ درد و غم کی کوئی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ ان کا حل صرف وجدان پر موقوف ہے۔ اور اگر وجدان مختلف ہے۔ تو ایک وجدان۔ دوسرے

وجدان پر حاکم نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک صحیح اور دوسرا غلط نہ ہو۔ معلوم ہوا۔ وجدانیات قابل تعریف نہیں۔ لہذا شاعری کو وجدانیات سے تسلیم کر کے اس کی تعریف کرنا محض بے سود۔

کلام مصنف سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وجدانیات کی تعریف مختصر طریقہ سے ناممکن ہو لیکن مطول طریقے سے ممکن۔ دنیا میں ایسی کوئی حقیقت نہیں جس کی حقیقت کے بیان میں اختصار منع اور طول جائز ہو۔

مصنف) دو قوتیں تمام افعال و ارادات کا سرچشمہ ہیں ادراک۔ اور احساس۔ ادراک کا کام اشیاء کا معلوم کرنا۔ ہر قسم کی ایجادات۔ تحقیقات۔ انکشافات۔ احساس کا کام کسی چیز کا ادراک کرنا یا کسی مسئلہ کا حل کرنا۔ یا کسی بات پر غور کرنا اور سوچنا نہیں۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ جب کوئی مؤثر واقعہ پیش آتا ہے۔ تو وہ متاثر ہو جاتا ہے۔ شاعری کا دوسرا نام یعنی یہی احساس جب الفاظ کا جامہ پہن لیتا ہے۔ تو شعر بن جاتا ہے۔"

منتقد) اس کلام سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تاثر کا نام شاعری ہے۔ بشرطیکہ وہ الفاظ کے جامہ میں ظاہر کی جائے۔ مصنف کے نزدیک اوزان و بحور کی ضرورت شعر میں نہیں۔ اس میں قوت اول یعنی ادراک سے کوئی بحث نہیں کی گئی۔ اس لئے تاثر جائز و تاثر ناجائز دونوں کا نام شاعری ہوگا۔ ایک اعرابی صحرا میں رو رہا تھا۔ اس سے لوگوں نے غم کا سبب پوچھا۔ اس نے بیان کیا کہ مجھے خبر پہنچی ہے کہ حجاج نے عالم مظلومی میں انتقال کیا"۔ مصنف کے تعریف کے بنا پر ان الفاظ کا نام جس میں یہ تاثر ظاہر کیا گیا ہو شاعری ہے۔ لیکن اہل ادراک اسے ہرگز شاعری نہ کہیں گے۔ ہاں مصنف اسے شاعری سے تعبیر کر سکتے تھے۔

احساس جو قوت ثانی تسلیم کی گئی ہے۔ اور ادراک کی قسیم مانی گئی ہے۔ اس فرض کے بنا پر احساس کا ادراک سے معرا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے کہ ایک قسیم۔ دوسرے قسیم کے تحت میں نہیں مندرج ہوتا۔ اس بنا پر احساس ایک ایسی شے ہوگی جو مسلوب الادراک شخصوں کے سوا کہیں نہ پایا جائے گا۔ لہذا شاعری مجانین پر منحصر ٹھری۔ لیکن اگر احساس سے انفعال نفس مراد ہے تو مصنف کو یہ کہنا چاہئے تھا۔ کہ فعل و انفعال ان دونوں قوتوں سے شاعری کا مادہ مہیا ہوتا ہے۔ کیونکہ ادراک فعل نفس ہے۔ اور اس کے بعد جو تاثر نفس میں پیدا ہوگا۔ وہ انفعال نفس ہے۔ انھیں دونوں (فعل و انفعال) سے جو نتائج نکلیں گے وہ صحیح شاعری کا عنصر ہو سکتے ہیں۔

مصنف) جب اس پر کوئی جذبہ قوی طاری ہوتا ہے تو بیساختہ اس کی زبان سے موزون

الفاظ نکلتے ہیں۔ اور اسی کا نام شعر ہے "

منقد) اس بیان سے ہم یہ استفادہ کرسکے کہ وہ موزون الفاظ جو بغیر آمادگی وقصد ارادہ جذبات سے مغلوب ہوکر بے ساختہ دہن انسانی سے نکلیں شعر ہیں۔ اس میں اگرچہ سابق کی وہ فروگذاشت نہیں بایں معنی کہ اعتبار وزن کر لیا گیا ہے پھر بھی قرآن مجید میں جو آیات صورت اشعار میں موجود ہیں وہ داخل ہوجائیں گے۔ اور جو لوگ آمادہ ہوکر شعر کہتے ہیں۔ ان کا شعر شعریت سے خارج ہو جائے گا۔

مصنف) شعر کی منطقی تعریف جو جذبات الفاظ کے ذریعے سے ادا ہوں وہ شعر ہے "

منتقد) غالباً قابل مصنف کی مراد تعریف منطقی سے یہ ہو گی کہ وہ جنس و فصل سے مرکب ہے جیساکہ منطقیین تعریف حقیقی کیا کرتے ہیں۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس تعریف میں جنس وفصل ڈھونڈیں جذبات میں ایک عموم ہے۔ اس لئے ہم اسے جنس قرار دیتے ہیں۔ اور الفاظ کے ذریعے سے ادا ہونا۔ اس کو ہم فصل قرار دیتے ہیں۔ اور ان دونوں کے مجموعہ کا نام شعر کی حد تام رکھتے ہیں ہم اس حد تام میں یہ نقص دیکھتے ہیں کہ یہ غیر شعر مصطلح پر صادق آتا ہے۔ مثلاً نثر کے وہ الفاظ جن کے ذریعے سے جذبات ادا کئے جائیں۔ یا ایک مدہوش سکیش جو حرکات کے سوا۔ الفاظ مہمل یا موضوع جو بے محل مستعمل ہو رہے ہیں استعمال کرے۔ ان پر بھی صادق آتا ہے۔ حالانکہ وہ قطعاً شعر نہیں۔

مصنف) شعر کی تعریف یوں بھی کرسکتے ہیں کہ جو کلام انسانی جذبات بر انگیختہ کرے۔ اور انکو تحریک میں لائے وہ شعر ہے "

منتقد) اس تعریف میں بھی وہی خرابیاں ہیں جو سابق میں گذریں اس کے علاوہ سخت سے سخت گالی شاعری ہے۔ کیونکہ اس سے جذبات شہوانی و جذبات غضبی کا برانگیختہ ہونا ظاہر ہے۔ جس طرح یوروپین مصنف کے کلام کو مصنف نے ایک مذاق سمجھا ہے۔ یہ تعریف بھی ویسی ہی ہے۔ اس میں صرف لفظ کلام کا اضافہ ہے۔

مصنف) شاعری کا امتیاز دیگر علوم سے یہ ہے کہ موسیقی صرف قوت سامعہ کو محظوظ کرسکتی ہے۔ سامعہ نہ ہو تو وہ کچھ کام نہیں کرسکتی "

منتقد) سامعہ میں کوئی نفس ایسا موجود نہیں جو محظوظ ہونے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ تو نفس انسانی کا سفیر ہے۔ جو عالم مسموعات میں کارکن ہے۔ اسی کے ذریعے سے نفس محظوظ یا متألم ہوسکتا ہے

تاثر سے مراد صرف یہی نہیں کہ خوشی ہی کا تاثر ہو۔ بلکہ موسیقی سے زیادہ کڑک اور گرج اور شیر کے چیخوں میں تاثیریں پوشیدہ ہیں جن کے سبب سے کبھی کبھی انسان ہلاک ہوجاتا ہے۔ اگر مصنف کلام کو عام موثرات تک عام کرتے تو مناسب ہوتا۔ جب یہ بات ثابت ہوئی تو معلوم ہوا کہ قوت سامعہ میں محظوظ ہونے کی قابلیت نہیں۔ بلکہ اس کی آڑ میں نفس جو قوت سامعہ کا لایا ہوا۔ اثر قبول کرتا ہے۔ وہ محظوظ یا ناشاد کام ہوتا ہے۔

دوسرا فقرہ "سامعہ نہ ہو تو وہ کچھ کام نہیں کرسکتے" سچ ہے۔ بایں معنی کہ نفس بغیر آلہ کے کام نہیں کرسکتا۔

مصنف) لیکن شاعری تمام حواس پر اثر ڈال سکتی ہے۔ باصرہ۔ ذائقہ۔ شامہ۔ لامسہ سب اس سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔

منتقد) نہ معلوم سامعہ کیوں قابل تذکرہ نہ ہوا۔ تاہم یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ان سب کا کام صرف احساس ہے۔ مزہ یا بدمزگی اٹھانے والا محض نفس انسانی ہے۔ (باقی آیندہ)

گہر جائسی

شوخیٔ مسلک

ایک مکلف مجذوب کو نماز پڑھتے دیکھ کر کسی سالک نے کہا "دیوانے ہاتھ سینے پر باندھتا ہے۔ چھوڑ! پاؤں زیادہ پھیلاتا ہے۔ سمیٹ!

مجذوب نے ہاتھ چھوڑ دئے۔ سالک نے پھر ڈانٹا۔ ابے احمق ہاتھ نیچے باندھ۔

مجذوب نے نماز کو سلام کیا۔ اور یہ کہتا ہوا چل دیا۔ جناب نماز مجھے آتی ہے اور قواعد آپ کو۔

اس پر سالک کو بہت طیش آیا۔ اور لگے ہاتھا پائی کرنے۔ مجذوب نے کہا کہ بھائی نماز نہ ہاتھوں کی پابند ہے اور نہ پاؤں کی دست نگر۔ نیاز عبدیت ان قیود سے آزاد ہے۔ میں اس نماز سے باز آیا جس سے ہاتھ پاؤں کی نوبت آئے۔

مجذوب

تکوین عالم کے متعلق بابلی مذہب کے عقائد

(از مولوی محمد نعیم الرحمن صاحب ایم - اے منشی فاضل پروفیسر محمڈن گورنمنٹ کالج مدراس)

(۲)

قبل اس کے کہ نفس مضمون پر کچھ لکھا جائے - یہ بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اہل بابل قدیم کا مذہب اس حیثیت پر پہنچنے سے پہلے کہ جس میں ان کا دیوتا میروڈخ[1] باقی تمام دیوتاؤں کا سردار تسلیم کیا جاتا تھا - دو مدارج سے گزر چکا تھا - اس مذہب کے نشو کے پہلے درجے میں اَنُ جو آسمانوں کا دیوتا تھا - اور دوسرے میں ایع[2] یا اَعْ (جس کو اینکی بھی کہتے تھے) جو غاروں - اور عقل کا دیوتا تھا - دیگر دیوتاؤں کے سرگروہ تھے -

جس قدر اس وقت تک دریافت ہوا ہے - وہ یہ ہے کہ تکوین عالم کے متعلق اہل بابل قدیم کے ہاں جو روایت مسلم تھی (اور جن پر سطور ذیل مشتمل ہیں) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بابل کے مقتدایان مذہب کی مشاورت کے بعد فیصلہ ہو کر قائم ہوئی تھی - اور غالباً یہ اس وقت کے بعد کا واقعہ ہے کہ جب شہر بابل تمام متحدہ ریاستوں کا دار السلطنت مقرر ہوا - اگرچہ اس کے بعد ان کے مذہب میں کچھ کچھ تبدیلیاں ہوئیں - مگر ان کا اثر پائدار نہ تھا - البتہ سیلیوکس نکیٹر کے زمانے (یعنی تقریباً سنہ ۳۰۰ ق - م) میں بجائے میروڈخ کے اَنُ بَیْل[3] کو سرتاج خدایان تسلیم کیا گیا - اس وجہ سے تین ہزار سال قبل مسیح سے مذکورہ بالا زمانے تک اہل بابل کے عقائد مذہبی کے متعلق یہ روایت نہایت درجہ اہمیت رکھتی ہے او جو فلسفیانہ خیالات اس میں پائے جاتے ہیں - وہ کم و بیش تبدیل شدہ حالت میں ان لوگوں میں بھی پائے جاتے تھے - جو چھٹی صدی عیسوی تک بابلی مذہب کے مقلد و معتقد تھے - تاہم اگر غور سے دیکھا جائے تو اس تمام روایت میں تکوین عالم کا بیان زیادہ نہیں ہے - بلکہ بَیْل اور اژدہے کی جنگ کا ذکر ہے - تکوین عالم کا بیان محض بطور تمہید اس میں شامل کر دیا گیا ہے - بہرحال ایک دوسرے سے لاینفک ہے -

---

[1] بیائے مجہول و واؤ مجہول [2] بیائے مجہول [3] بیائے مجہول

آغاز روایت یوں ہے کہ جس زمانے میں آسمانوں کا کوئی نام نہ تھا۔ اور زمین بھی کسی خاص اسم سے موسوم نہ تھی۔ ابتدائے بحر اور ممّو تیاوث (یعنی بحیرہ) جن سے تمام مخلوق پیدا ہوئی یہی دونوں تمام اشیا کے خالق تھے ان دونوں کے پانی آپس میں بالکل خلط ملط تھے۔ نہ کہیں میدان تھے نہ کسی طرح کی دلدلیں وغیرہ تھیں علیٰ ہذالقیاس اور کسی دیوتا کی ہستی تو ایک طرف ان کا نام تک موجود نہ تھا۔ نہ مخلوقات کی قسمتوں کا فیصلہ ہوا تھا۔ اور نہ خواتیم اعمال و امور کا تصفیہ طے ہوا تھا۔ اس کے بعد جلیل القدر دیوتا نمودار ہوئے۔ سب سے پہلے لحمُو اور لحمی کا ظہور ہوا پھر اس کے ایک طویل عرصہ کے بعد انشر اور کِنشر پیدا ہوئے۔ جو علی العموم بالترتیب اجسام سماوی اور اجسام ارضی کے مترادف خیال کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کے اسمار کے مختلف حصص کے یہی معنی ہیں۔ اس کے بعد پھر ایک زمانہ مدید کے انقضا کے بعد ان کے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام اَنُو رکھا گیا اور وہ آسمانوں کا دیوتا ہوا۔ بعد ازاں اَلِلّا یا بیل پیدا ہوا۔ جو حقیقی معنی میں خدا یعنی سب سے برتر و اعلیٰ تھا۔ اور پھر عوشؔ نمودار ہوا۔ جو اَپسُو کا دیوتا تھا۔ عوث اور دَوُکے سے ایک لڑکا بیل میرودخ نامی تولد ہوا۔ اور اسی کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے دنیا کو موجودہ صورت میں پیدا کیا۔

اس مقام پر پہنچ کر دیوتاؤں کی پیدائش اور تقدیم و تاخیر کے بیانات کسی قدر مشکوک ہو جاتے ہیں لیکن بالعموم تاہم اس یہ کیا جاتا ہے کہ بیل میرودخ کے بعد نُدِ مُّد پیدا ہوا۔ مگر اس کے متعلق یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ وہی ایج ہے۔ جو سمندر اور دریاؤں کا دیوتا تھا۔ اور جو تمام کائنات کا خالق ہے ممّو تیاوث اور اَفسو (یعنی سمندر) کا بیٹا تھا۔ مگر ان تینوں میں اور لحمو اور لحمی کی اولاد میں زمین و آسمان کا فرق ہے چونکہ دونوں موخر الذکر دیوتاؤں کے اخلاق و عادات وغیرہ تیاوث کی اولاد جیسے نہ تھے اور ادھر افسو کو یہ شکایت تھی کہ اُن کے نامعقول افعال کی وجہ سے اسے دن رات میں کسی وقت آرام نصیب نہیں ہوتا۔ اس لئے بحر متلاطم کے تینوں نمایندوں یعنی تیاوث افسو اور مُمّو نے ایک مرتبہ اس امر پر مذاکرہ کیا۔ کہ ان دیوتاؤں سے جو علو مرتبہ اور شان و شوکت کے خواہاں ہیں کس طرح اپنا پیچھا چھڑایا جائے۔ اس سازش میں اصلی اور اہم شخص مُمّو تھا۔ جو تیزی میں اپنے ماں باپ سے بھی چند قدم آگے ہی رہتا تھا۔ افسو کو اس سازش کے قیام سے بہت خوشی ہوئی

لہ بہ واو مجہول اس کے دوسرے نام اِع۔ اِیج۔ اور ئے ہیں لکہ بہ یائے مجہول

اسے زیادہ رنج اس بات کا تھا کہ اورسب دیوتا۔ اُن تینوں کے احکام کی اطاعت اور ان کے اخلاق و عادات کی تقلید کیوں نہیں کرتے۔ حالانکہ وہ سب ان سے چھوٹے تھے۔ بلکہ ان ہی کی اولاد میں سے تھے۔ بہرکیف سازش پختہ ہوگئی۔ مگر یہ قرار پایا کہ کسی خدع و مکر کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ آسمانوں کے تمام دیوتاؤں پر سیدھے سبھاؤ حملہ کر کے ان کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ اور بس۔

اس پخت و پز کے بعد۔ بڑی شد و مد سے تیاریاں شروع ہوئیں۔ شر و فساد کی تمام طاقتیں دن رات نہایت غیظ و غضب کے انداز سے محنت و مشقت میں مصروف رہتی تھیں تیامت نے اپنے تمام قوائے تخلیق و تکوین کو مجتمع کر کے مصروف عمل کیا۔ اور اپنے پیرووں کو ایسے ایسے آلات حرب سے مسلح کیا جن کے حملہ کا دفعیہ قطعًا ناممکن تھا۔ اسی غرض سے اس نے بڑے بڑے دیو مثال سانپ پیدا کئے۔ جن کے دانت نہایت تیز اور پھن بے حد زہریلے تھے۔ اور ان کے تمام جسم میں بجائے خون کے زہر ہلاہل بھرا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ چمکدار جسم اور زبردست قدوں کے ہولناک اژدہے۔ غرانے والے کتے۔ انسان نما بچھو۔ انسان نما مچھلیاں۔ اور انواع و اقسام کی دہشتناک مخلوقات پیدا کی۔ اور ان کو تمام ضروری آلات و اسلحہ سے آراستہ کیا۔ اور جب سب کچھ ہو لیا تو کنگ[1] نام ایک دیوتا کو جسے تیادث اپنا شوہر قرار دے رکھا کرتی تھی۔ ان سب کا سپہ سالار مقرر کیا۔

حقیقت میں اس شر و فساد اور فسوق و جدال کی دیوی (تیادث) کا منشا یہ تھا کہ کل اشیاء کی آفرینش و پیدائش اپنے ہی دست اختیار میں رکھے[2]۔ وہ دن رات اسی فکر میں محو اور اس کی کامیابی کی تدابیر میں غرق رہتی تھی۔ اور ممکن طریق سے اسے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر بقوائے۔

نہاں کے ماند آں رازے کزو سازند محفلہا

[1] تیادث نے قسمت کی تختیاں بھی اسی دیوتا کی تحویل میں دے دی تھیں جن کی وجہ سے وہ آسمانوں کا دیوتا ہو گیا تھا اور باقی کل دیوتاؤں کی قسمتوں کی تعیین و تقدیر بھی اسی کے قبضۂ اقتدار میں تھی۔

[2] یہ بات نہایت دلچسپ اور قابل غور ہے۔ تیادث کے معنی سمندر اور افسو کے معنی غار یا سمندر کی گہرائی کے ہیں۔ تخلیق و تکوین کو ان ہی سے منسوب کرنا گویا استعارہ ہے اس امر سے کہ سمندر میں بے حساب مخلوق۔ اور وہ بھی بے حد و حساب اضاع و انواع کی پائی جاتی ہے۔ جو ہمیشہ ایک دوسرے کی ضد میں منہمک اور ہلاکت کے درپے رہتی ہے۔ اس کو اہل بابل نے ایک طرف تو بے ترتیبی اور عدم نظام اور دوسری طرف شر و فساد سے مترادف سمجھا۔ اور سمندر اور غار کو خالق عالم قرار دے دیا +

اِیج کو کسی نہ کسی طرح اطلاع ہو ہی گئی کہ تیاوٹ اور اس کے تمام متبعین آسمانوں کے دیوتاؤں کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ اسے نہایت رنج ہوا۔ اور سخت غصہ آیا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ اور وہ اُٹھ کے سیدھا اپنے باپ انشر کے پاس گیا۔ اور تمام قصہ من وعن اسے کہہ سنایا۔ اسے بھی غصہ آیا اور مارے طیش کے زور زور سے چیخنے چلانے لگا۔ جب غصہ ذرا دھیما ہوا۔ تو سوچنے لگا کہ آخر اس کے تدارک کے لئے کیا طریق عمل اختیار کیا جائے۔ غور کرتے کرتے اس رائے پر پہنچا کہ میں اپنے زبردست اور بہادر بیٹے اَنُ سے کہہ کر تیاوٹ کے پاس سفارش کے لئے بھیجوں۔ بسا ممکن ہے کہ اس کا غصہ فرو ہو جائے۔ چنانچہ اَنُ کو بلا کر اس غرض کے ایفا کے لئے اسے آمادہ کیا۔ اور وہ بھی جی کڑا کے تیاوٹ کی طرف روانہ ہو گیا مگر ابھی اس تک نہیں پہنچا تھا کہ اسے اس قدر خوف دامنگیر ہوا کہ بلا گفت وشنید واپس آ گیا۔ جب اس میں ناکامیابی ہوئی تو نُدِمُّد کو دیوتاؤں کا نمائندہ بنا کر بھیجا گیا۔ مگر اس کا بھی وہی حشر ہوا جو اَنُ کا ہوا تھا۔ اس لئے ایک اور شخص کا انتخاب ضروری معلوم ہوا۔

غور وخوض اور مشاورت کے بعد بالاتفاق بیل میرودخ کو اس مہم کے لئے منتخب کیا گیا۔ اور اس نے نہایت مستعدی سے قبول بھی کر لیا۔ اور کہا کہ میں دو شرطوں کے ساتھ اس کو منظور کرتا ہوں۔ اول یہ کہ مجھے مستقل اور غیر متبدل سپہ سالاری دے دی جائے۔ اور دوسرے یہ کہ میں جو کچھ کہوں وہ فوراً۔ اور بلا تامل کیا جائے۔ کیونکہ بغیر اس کے ناممکن ہے کہ غنیم پر کبھی فتح حاصل ہو۔ ان شرائط کو منظور کیا گیا۔ مقصد برآری کے لئے اسی وقت ایک جشن عام میں شریک ہونے کے لئے سب کو دعوت دی گئی۔ چنانچہ وقت مقررہ پر جشن منعقد ہوا۔ جب اکل وشرب وغیرہ سے فراغت ہو چکی تو بالاتفاق یہ فیصلہ کیا گیا کہ میرودخ ہماری طرف سے دشمن کا بدلہ لے۔ اور ہماری قسمت کا بنانا اور بگاڑنا۔ اور ہماری زندگی اور موت سب کچھ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جو کچھ اور جس طرح چاہے کرے۔" ہر ممکن الوجود طریقے سے اس کا اعزاز کیا گیا۔ اور خاطر ومدارات میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ اس کے لئے شاہانہ انداز کے کوشک ومحل تیار کئے گئے۔ تا کہ ان میں بیٹھ کر وہ نہ صرف اپنے تمام بزرگوں پر بلکہ کل کائنات پر حکومت کرے جب سب ہو چکا تو اس کی اس نو حاصل کردہ طاقت کی آزمائش کے لئے ایک کپڑا۔ اس کے سامنے رکھا گیا۔ اور اسے ہست سے نیست کرنے اور پھر دوبارہ ہست کرنے کو کہا گیا۔ چنانچہ اس نے پہلے ایک حکم کے ساتھ اسے عدم میں پہنچا دیا۔ اور دوسرے حکم سے دوبارہ معرض وجود میں لے آیا۔

جب اس طرح سب دیوتاؤں کو اس کی خدائی طاقت کا یقین ہو گیا۔ تو سب نے مل کر "میرودخ بادشاہ ہے" کا نعرہ لگایا اور بادشاہت کے تمام سامان و لوازم یعنی تاج و تخت و گرز وغیرہ اس کے حوالہ کر دیا تخت پر متمکن ہونے کے بعد اسے ایک ایسا ہتھیار دیا گیا جس سے دشمن کو ہلاکت و بربادی کے سوا۔ اور کوئی مفر نہ ہو۔ اس کے علاوہ اسے نیزہ۔ تیر۔ کمان۔ اور ترکش بھی دئے گئے۔ اس کے سامنے بجلی چمکی۔ اور آتش مشتعل اس کے تمام جسم میں حلول کر گئی۔ آسمانوں کے دیوتا انوؔ نے ایک بڑا سا جال دیا جس کو اس نے چاروں طرف پھیلا دیا۔ تاکہ تیاوث کو شکست کھانے کے بعد کہیں سے فرار کا موقع نہ ملے پھر اس نے اپنی کمک کے لئے سات ہواؤں کو پیدا کیا۔ اور ان تمام تیاریوں کو اتمام و انتہا تک پہنچانے کی نیت سے سب سے آخر میں اَبُبْ یعنی طوفان عظیم کو پیدا کیا۔

ایسی عظیم الشان تیاری اور ساز و سامان کے تہیہ کے بعد وہ اپنے ہولناک رتھ پر سوار ہوا جس میں چار جنگ آزمودہ۔ کف آلودہ۔ قوی ہیکل مستقل مزاج۔ زہریلے دانتوں والے گھوڑے جوتے گئے کہ جو سوا آگے بڑھنے کے کبھی پیچھے ہٹنا نہیں جانتے تھے۔ لڑائی کے لئے پوری طرح لیس ہو کر اپنے بزرگ دیوتاؤں کی دعائیں لیتا ہوا میرودخ تیاوث کے مقابلے کے لئے روانہ ہوا۔

میرودخ بڑی شد و مد سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ مگر جب تیاوث کا سامنا ہوا تو اس کی صورت سے کچھ ایسا مرعوب ہوا کہ قدم لڑکھڑانے لگے کچھ دیر تو یہی حالت رہی۔ مگر پھر اس نے حواس کو جمع کیا اور ہمت و جرأت سے کام لے کر ایک تقریر شروع کی جس میں تیاوث کو غدر کرنے پر بہت سختی کے ساتھ لعنت ملامت کی۔ اور آخر میں جنگ کے لئے مبارز کیا۔

بس پھر کیا تھا۔ ایک دوسرے پر پل پڑے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں گھمسان کی لڑائی ہونے لگی شر و فساد کی جامعۃ الکل یعنی تیاوث نے بجائے اس کے کہ ایمانداری کے ساتھ مقابلہ پر جمی رہتی حریف پر سحر و جادو کے وار شروع کئے۔ مگر حریف پر ان کا خاک بھی اثر نہ ہوا۔ آخر ہار گئی۔ بھاگنا چاہتی تھی۔ مگر دیکھا کہ ہر طرف سے جال میں محصور ہے۔ پھر انتقام اور حصول آزادی کے لئے اس نے اپنا منہ کھولا مگر میرودخ کی ہوائیں جو اس کے آگے آگے رہتی تھیں۔ اس کے منہ میں اس طرح داخل ہوئیں کہ پھر وہ کمبخت اپنا منہ بھی بند نہ کر سکی۔ ہزار کوشش کی۔ لاکھ ہاتھ پاؤں مارے کہ کسی طرح خلاصی ہو۔ مگر ایک بھی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ آخر ہمت ہار کر مغلوب ہو گئی۔ اور اس کے فاتح کو ایک شکار ہاتھ آیا۔

میرودخ نے پہلے تیاوث کے دو ٹکڑے کئے پھر اس کا دل نکال کے اس کی زندگی کا بالکل خاتمہ کر دیا۔ اور اس کی لاش کو زمین پر پھینک کے اس پر کھڑا ہو گیا **تیاوث** کی یہ گت دیکھ کے اس کے ہمراہیوں نے بھی بھاگنا چاہا۔ مگر خود کو ہر طرف سے نرغے میں پا کر بے بس ہو گئے۔ انہیں بھی پہلے جال میں پھنسایا گیا۔ اور پھر قید خانے میں محبوس کر دیا گیا۔ باقی رہا کنگ۔ اس کی مشکیں کس کسا کے موت کے دیوتا اُگت کے حوالے کر دیا گیا کہ اسے ہمیشہ اپنے ہمراہ رکھے تیاوث کی دی ہوئی الواح قسمت جو اس وقت تک اس کے پاس تھیں وہ بھی **میرودخ** نے اس سے چھین لیں اور ان پر اپنے نام کی مہر کر کے اپنے سینے میں رکھ لیا تیاوث جیسی حریفۂ عاتیہ کی موت سے **انشر** دیوتا کو اپنے اصلی حقوق واپس مل گئے۔ اور نُدِمُد کی مراد بھی پوری ہوئی کہ اس کے دشمن تباہ ہوئے۔

ان کاموں سے فراغت حاصل کر کے میرودخ پھر تیاوث کی لاش کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی تمام رگوں کو چیر پھاڑ کر بادشمال کو حکم دیا کہ اس کا خون تمام مخفی مقامات میں پہنچا دے[1]۔ پھر اس کے دو ٹکڑے کئے جن میں سے ایک کو آسمانوں کا سرپوش بنا دیا گیا[2]۔

تیاوث کو ہلاک کر کے میرودخ نے ازسرنو دنیا کی ترتیب و تنظیم شروع کی۔ جب تیاوث کے نصف جسم سے آسمانوں کا سرپوش بن چکا تو میرودخ نے غار مہیب یعنی نُدمُد کی آرام گاہ کو اس کے سامنے قائم کر دیا۔ اور اس کے اوپر بھی ایک متناسب عمارت کھڑی کی جس میں انُ بیل اور ایع کے لئے مقامات سکونت مقرر کئے گئے۔ بڑے بڑے دیوتاؤں کو اس نے ستاروں کی مختلف منزلوں میں مقیم کیا۔ پھر سال کی تقسیم اوقات کی۔ اور ہر مہینے کے لئے تین بروج مقرر کئے۔ اور اپنے ستارۂ خاص یعنی نبرُ کے لئے بھی ایک منزل قرار دی۔ اور آسمانوں کی تمام روشنیوں کی نگہبانی کا عہدہ دیا **تنشر** یعنی ماہِ نو کو روشن ہونے کا حکم دے کر اسے حاکم شب مقرر کیا اور اس کے مختلف حصص و صور کی اس طرح تعیین کی کہ مہینہ کے ساتویں دن اس کی شکل میں تغیر ہو۔ اور پھر

---

[1] اس مضمون سے غالباً یہ مراد ہے کہ بادشمال کی مدد سے شمالی دریا جنوبی سمندر میں جا گرتے ہیں ورنہ ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ (یعنی اہل بابل کے خیالات و عقائد کے مطابق)

[2] دیکھو عہد عتیق۔ کتاب پیدائش۔ باب اول۔ آیت نمبر ۷۔ جہاں آسمانوں کے اوپر سمندروں کا ذکر ہے۔

درمیان میں شبتؔ یعنی آرام کا دن ہو[1] پھر ہواؤں کو مقید کرکے ان کے مقامات و منازل کی تعیین کی گئی۔

سب دیوتا میرودخ کے ان کارہائے نمایاں پر نہایت متعجب تھے۔ اتنا کچھ بن جانے کے بعد پھر انھوں نے درخواست کی کہ ابھی آپ اور کچھ معجزات و خوارق دکھائیے۔ میرودخ نے اس مسئلے پر غور کرنا شروع کیا۔ اور آخر کار اپنے باپ ایع کے پاس جاکر یہ ارادہ ظاہر کیا کہ میں اپنے خون سے انسان کو پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ وہ دیوتاؤں کی خدمت و طاعت کریں۔ جب وہ اپنا کل طرزِ عمل دیوتاؤں کو سمجھا چکا تو حسب قرارداد اپنے ہاتھ سے اپنا سر کاٹ دیا۔ دیوتاؤں نے اس خون کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ اور اس میں مٹی کو گوندھ کر انسان کو پیدا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان میں عقل کا مادہ ہے۔ اور وہ علم الٰہیات و معرفت الٰہی کی طرف راغب ہوتا ہے۔

ایک اور بیان یوں ہے کہ بیل نے پہلے نور اور ظلمت کو علیحدہ علیحدہ کیا۔ پھر تمام کائنات کا نظم و نسق کرکے حیوانات پیدا کئے۔ مگر وہ روشنی کے متحمل نہ ہو سکے اور مر گئے۔ یہ حال دیکھ کر ایک دیوتا کو اپنا سر کاٹنے کا حکم دیا۔ اور اس کے خون کو مٹی میں ملا کر انسانوں اور دیگر ایسے حیوانوں کو پیدا کیا جو روشنی برداشت کر سکتے تھے۔ اس کے بعد اس نے ستارے، سورج، چاند۔ اور پانچ سیارے بنائے۔

یہ ہے وہ روایت جو اہل بابل قدیم کے ہاں تخلیق عالم کے متعلق مشہور و مقبول تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

محمد نعیم الرحمٰن ایم۔ اے

رباعی

فقیہاں دفترے رامے پرستند حرم جویاں درے رامے پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد کہ یاراں دیگرے رامے پرستند (عرفی)

---

[1] اس کے علاوہ ہاں کی منازل القمر وغیرہ کی بھی تعیین ہوئی ہوگی۔ مگر جس قدر کہ قدیم کتبوں وغیرہ سے صریح طور پر معلوم ہوتا ہے۔ وہ اسی قدر ہے جتنا کہ لکھا گیا۔ علیٰ ہذا القیاس اس مقام پر پہنچ کر میرودخ کے دیگر کارہائے ابداع و ایجاد کی کیفیت بھی نہایت مشکوک و مبہم ہے۔ البتہ میرودخ کے جال کے متعلق اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اسے بھی آسمان میں بطور ایک برج کے قائم کر دیا گیا تھا۔ واللہ اعلم۔

لآلیِ شاہوارِ غیر مطبوع

از کاملِ سخن۔ لسان العصر سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی

رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ

۱۹۱۲ء کے شروع میں جب میری کم مایہ بضاعت اجمیر کے اخبار "صلح کل" کی خدمات ادارت سے وابستہ ہو رہی تھیں تو حضرت لسان العصر مرحوم و مغفور کی عقیدت نواز شفقتوں نے مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ العالی کی وساطت سے مجھے یہ نظم اخبار کے سرورق کے لئے مرحمت فرمائی تھی لیکن بسوءِ اتفاق میں اس وقت۔ اس کی اشاعت سے معذور رہا۔ اس لئے یہ بھی شل اور پراگندہ و پریشان اوراق کے حوالۂ طاقِ نسیاں رہی۔

اب چونکہ مرحوم کی گم شدگی اور مفقودی نے آپ کے غیر مطبوعہ کلام کی پیش کشی کو بھی شاعیۂ تعزیت اور تہدیۂ دعائے مغفرت بنا دیا ہے۔ اس لئے میں اسے "مخزن" کے ذریعے سے اس دعا کے ساتھ نذرِ ناظرین کرنا اپنے لئے سعادت جانتا ہوں کہ یہ ان رشحاتِ قلم کی مسلسل لڑی ہے جو اب تک نہ صرف اردو کے جرائد و صحائف کے مس سے معصوم ہے۔ بلکہ عجب نہیں کہ مرحوم کے افکارِ مدونہ کے شیرازے میں بھی منسلک نہ ہو ؎

بخواب مرگ تو آسودۂ و من نالم — کہ زیست سے نبرد شورشِ فراق و وصال

مدارِ صلح کل

(از جناب اکبر الہ آبادی)

اس چمن میں دیکھئے آکر مدارِ صلح کل — ہر ہوائے نفس ہوتی ہے نثارِ صلح کل

یہ شگوفہ کیوں نہ کھلتا بلبلیں بیچین تھیں — ہو چکی تھی عمر صرفِ انتظارِ صلح کل

ہو گی یکساں باغ میں نیا ئی بادِ صبا — رنگِ گلشن پر نہ ہو گا اعتبارِ صلح کل

خوب ہے رشتہ جو پیدا ہو سکے زنار سے — دانۂ تسبیح میں پڑ جائے تارِ صلح کل

جنگ ہفتاد و دو ملت میں تو ہے مصروف دہر — ہمتِ عارف اٹھی ہے بہرِ کارِ صلح کل

بیقراری کیوں پراگندہ کرے اس جسم کو — باہمی ذروں میں جب کے ہو قرارِ صلح کل

زندگی کی کشمکش جاتی نہیں اکبر کبھی — موت ہی کو میں تو پاتا ہوں مدارِ صلح کل

ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور کا پیغام دُنیائے مغرب کے نام

مترجمہ ادیب سحر طراز مولانا ابو رشید عبدالمجید خانصاحب سالک بٹالوی

پچھلے دنوں ڈاکٹر رابندرا ناتھ ٹیگور اقصائے مغرب میں سیاحت کر رہے تھے جس کے دوران میں آپ نے یورپ کی مادّہ پرست دنیا کو ایشیائی فلسفہ کی روحانیت سے آشنا کرنے کے لئے ہر ملک میں تقریروں کا سلسلہ جاری کیا تھا۔ ایک حقیقت آگاہ انگریز ہیوبرٹ جی وُڈ فرڈ نے ٹیگور کے اس روحانی پیغام اور اس کے متصوفانہ فلسفہ پر انگلستان کے مشہور ادبی سالنامہ "بیبنسرا ینول" میں ایک نہایت فاضلانہ مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے۔ مناسب معلوم ہوا کہ اس سے مخزن کے قارئین کرام محروم نہ رکھے جائیں۔

فی زمانا ہندوستان کے قابل ذکر اشخاص میں ٹیگور سے زیادہ دلفریب و دلآویز ہستی کوئی نہیں ٹیگور فلسفی بھی ہے اور شاعر بھی۔ روح بھی پھونکتا ہے اور دعوت مقابلہ بھی دیتا ہے۔ اس کا سکون آمیز خوبصورت چہرہ اور جھکی ہوئی آنکھیں اس اطمینان وجدانی اور "عرفان حیات" کا پتہ دیتی ہیں جو اس کے تمام فلسفے کی روح ہے۔

ٹیگور ہمارے نقائص و اسقام پر اس غیظ و غضب سے جو مغربی مصلحین کا طغرائے امتیاز ہے ہمیں نشانہ تعریض و تشنیع نہیں بناتا۔ بلکہ نہایت سکون و وقار سے ہماری تہذیب کے ماؤف اعضاؤ جوارح کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے کہ فلاں فلاں مقامات نشانۂ امراض ہیں ممکن ہے کہ ہمیں کبھی نہ کبھی اس امر کا احساس ہو۔ کہ ٹیگور اپنے سینے کے اندر وہ راز مضمر رکھتا ہے جس کے انکشاف سے ہم محروم ہیں۔ اور جس کے بغیر ہماری دنیائے جدید اپنے تمام مدارج نشو و ارتقا کے باوجود بھی حقیقی ترقی کے راستے پر

گامزن ہونے کی توقع نہیں رکھ سکتی۔

ٹیگور کہتا ہے کہ رازِ حیات جلب وحصول کا نام نہیں۔ بلکہ عرفان سے عبارت ہے۔ ہم جلب وحصول کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اور اپنی اندھا دھند سعی وتلاش میں افق کی طرف بھاگے جا رہے ہیں جس کی دلفریبی ہمیں ایک ایسی زندگی کی طرف لے جا رہی ہے جس میں خورد ونوش۔ کاروبار۔ گفت وشنید اور سیر وسفر کے سوا۔ اور کچھ نہیں۔ ہم کبھی آرام سے نہیں بیٹھتے۔ ہمارا دائرہ زندگی وسیع ضرور ہے مگر عمیق نہیں۔ ہم حیات ارفع کی تلاش نہیں کرتے بلکہ بقول" ورڈزورتھ"" جمع وخرچ" کے کاروبار میں مصروف رہتے ہیں آسمانِ مشرق کا یہ ستارہ ہماری تھکی ہوئی روح کو سکون واطمینان کے راستے پر لگائے گا اور ہم ایک ایسے طریق سے جس کا قیاس بھی میتھیو آرنلڈ سے نہیں ہو سکا اپنے آپ کو پہچان کر اپنی مصیبت اور اپنے اضطراب بے مدعا سے نجات پائیں گے۔

ٹیگور ہندوستان کے دانائے صحرانشیں کے مطمح نظر کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ کہ :۔

> مُدعائے زندگی سعی حصول نہیں۔ بلکہ سعی عرفان کا نام ہے۔ اور اپنے احساس نفس کو اپنے ماحول کے اندر اور ماحول کے ساتھ بڑھانے سے عبارت ہے "

لیکن اس کے برعکس مغرب صرف اسی خیال میں غرق معلوم ہوتا ہے کہ۔ قدرت کو مطیع کرلے اور اس کے ناخواستہ ہاتھوں سے وہ خزانے چھین لے جن کی خواہش میں ہم مرے جاتے ہیں۔ لہذا جب ہم" قدرت" کی طرف عود کر آئیں گے تو ہمارا تعلق کائنات کی فضائے روحانی سے وابستہ ہو جائے گا جس میں ہماری روح بھی بمنزلہ ایک جزو کے ہے۔

جس جذبہ واحساس کا اظہار ہم بالعموم" استحقاق احساس نفس"۔ اور" اپنی روح کو اپنی روح سمجھنے کا حق" کے الفاظ سے کرتے ہیں۔ ان کی متبادل جن الفاظ میں ٹیگور کرتا ہے۔ ان سے ہم فرزندان مغرب بالکل بیگانہ واجنبی ہیں۔ اس کا قول ہے کہ" اپنی ذاتی زندگی بسر کرنا فی الحقیقت تمام دنیا کی زندگی بسر کرنا ہے" کائنات کی روح مشترک اعماق شخصیت میں مضمر ہے ٹیگور کے نزدیک حقیقی علم یہ ہے۔ کہ انسان :۔

> تمام زندگیوں میں ایک غیر متغیر زندگی کا مشاہدہ کرے۔ اور متفرق اشیا میں ایک ناقابل تفریق ہستی کو دیکھے۔ (بھگوت گیتا)

وحدت کے اس عقیدہ اساسی سے طبعاً یہ عقیدہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ تمام اشیاء جو ہمارے گرد و پیش واقع ہیں۔ لہلہاتی ہوئی کھیتیاں۔ آسمان کی متغیر فضا۔ پرندہ اور بچہ یہ سب ایک ناقابل تفریق ہستی کی مختلف صورتیں ہیں۔ یہ وحدت کبھی نہیں ٹوٹتی۔ خود موت بھی لا حقیقت میں خلا پیدا کرنے سے عاجز ہے۔ ہمارا دنیا میں حاضر و غائب ہونا امواج دریا کی طرح صرف سطحی ہے لیکن زندگی وہ مستقل و لافانی شئے ہے۔ جو زوال و فنا کے بے بنیاد خدشوں سے آزاد ہے۔

جب ہم تمام تغیر پذیر واقعات میں ایک ہی مقصد۔ اور ایک ہی آخری مطمح نظر کی جھلک دیکھنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ تو زندگی اور تاریخ عالم کے بھی نئے نئے مطالب و معانی کھلتے جاتے ہیں۔

"ٹیگور کا خیال ہے۔ کہ انسان ازمنۂ گزشتہ کی ظلمت محیط میں سفر کرتا ہوا۔ اپنی حقیقت نفس دریافت کرنے کے لئے بڑھا چلا جا رہا ہے۔ اسی تلاش کی داستان کا نام تاریخ ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

انسانی تاریخ۔ انسان کے اس سفر کی داستان ہے جسے وہ اپنے نفس لافانی یعنی روح کے عرفان کی تلاش میں طے کر رہا ہے سلطنتیں بنتی اور بگڑتی ہیں سیم و زر کے عظیم الہیئت انبار لگائے جاتے ہیں۔ اور پھر بے دردی سے خاک میں ملا دئیے جاتے ہیں۔ انسانی خواہشات و تصورات کی تشکیل کے لئے بڑی بڑی یادگاریں قائم کی جاتی ہیں اور پھر اسی طرح ضائع کر دی جاتی ہیں جس طرح بچہ بڑا ہونے پر اپنے کھلونوں کو توڑ پھوڑ دیتا ہے۔ جادو کی کنجیاں ڈھالی جاتی ہیں۔ تاکہ اسرار فطرت کے خزینۂ سربستہ کا قفل کھولا جائے۔ پھر انسان ازمنۂ ماضیہ کی تمام محنت کو ملیامیٹ کر کے دوبارہ اپنی کارگاہ میں آ بیٹھتا ہے۔ تاکہ کسی اور صورت میں آغاز عمل کرے۔ غرض اسی طرح نسلاً بعد نسل اپنی روح کے عرفان کی تکمیل کی طرف بڑھا چلا جاتا ہے۔ وہ اس روح کی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جو ان تمام اشیا سے افضل ہے جن کو انسان جمع کرتا ہے۔ ان تمام کارناموں سے ارفع ہے جن پر اسے ناز ہے۔ اور ان تمام فلسفیانہ دعاوی سے بہتر ہے جنھیں وہ قائم کرتا ہے۔ اور جس کی پیش قدمی کا راستہ فنا و نیستی سے مسدود نہیں ہو سکتا۔

حیات انسانی کا مقصد آخری یہی ہے۔ کہ اس شئے واحد کو پہچانے۔ جو اس کے اندر موجود ہے

جو اس کی حقیقت اصلیہ ہے جو اس کی روح ہے۔ اور جو ایسی کلید ہے جس سے روحانی زندگی کے دروازے کھل سکتے ہیں۔

ہم جتنے اپنے نفس حقیقی سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ اسی قدر ہماری زندگیوں میں ہمنوائی و ہم آہنگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اس ذات واحد سے وحدت حاصل کرنے کے لئے ہم کو کتنا ہی دور دراز سفر کرنا پڑے۔ ہماری پرواز کتنی ہی بلند و رفیع ہو لیکن حصول مقصد یقینی ہے۔ ٹیگور اپنی ایک دلآویز نظم میں لکھتا ہے :-

میرا سفر بہت لمبا ہے۔ اور میرا راستہ دور و دراز ! میں روشنی کی پہلی کرن کی رتھ پر سوار ہو کر آیا۔ اور بہت سے جہانوں کے ویرانوں میں سے سفر کرتا ہوا گزرا میرے قدموں کے نشان کئی ستاروں اور سیاروں پر باقی ہیں۔

اپنے آپ تک پہنچنے کے لئے مجھے بہت لمبا راستہ طے کرنا پڑے گا اور ایک نہایت سیدھا سادہ نغمہ نکالنے کی خاطر بہت سی پیچیدہ راگنیاں سیکھنی پڑیں گی !

مسافر اپنے گھر پہنچنے کی کوشش میں ہر بیگانے دروازے پر دستک دیتا پھرتا ہے۔ اور انسان کو اپنے اندرونی تیرتھ پر پہنچنے کے لئے تمام بیرونی دنیاؤں میں مارے مارے پھرنا پڑے گا۔

میری آنکھیں دور و نزدیک کے تمام نظارے دیکھ چکیں۔ جب جا کر میں نے آنکھیں بند کیں۔ اور میں کہہ اُٹھا کہ "یہاں میں نے تجھے پالیا"

کیا ٹیگور کے اس خیال سے ان بے شمار مسائل پر روشنی نہیں پڑتی جو آج کل لاکھوں انسانوں کو ضغطہ میں مبتلا کئے ہوئے ہیں۔ اقوام کی باہمی کشمکش۔ انسان کی عدم انسانیت خواہشات و مرضیات کے تصادم۔ اور عدم مساوات کے مختلف مناظر سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا کے تمام مرد و زن۔ ترقی روح اور ارتقائے نفس کے متفرق و متنوع مدارج میں سے گزر رہے ہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جنہیں وہ ہم آہنگی نصیب ہے۔ جس کے حصول کا صرف یہی طریقہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو فنا کر کے جز و کو کل میں اور کثرت کو وحدت میں نابود کر کے اس روح اعلیٰ کو پالے۔ جو کائنات میں مشترک ہے تاریخ

عالم کی تمام دردناک داستان صرف اس حقیقت پر مشتمل ہے کہ غرور شخصیت اور پندار انفرادیت نے "کل" اور "اجتماع" کو ٹھکرا کر اپنا ڈیرہ سب سے الگ جمانا چاہا۔ زمانہ ماضی کے راستے پر بے شمار تباہ و برباد قومیں۔ پامال معابد۔ اور مفلوج مذاہب بکھرے پڑے ہیں جنھوں نے دنیا کی بہت بڑی اجتماعی طاقت کے میلان و رجحان کو سر پائے تغافل سے ٹھکرا دیا۔ اور اسے اپنے ہی مخصوص استعمال کے رقبے میں مقید و محدود کرنا چاہا ہستی کے سمندر میں ایک ایسی چٹان بھی ہے جس سے ہر جہاز ٹکرا کر پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ عالم اسرار میں قوانین آسمانی نے ایک ایسا ریگ زار بھی پیدا کر رکھا ہے جس پہ خود غرضی کی آسمان بوس لہریں پھوار جتنا بھی اثر نہیں کر سکتیں۔ یہاں پہنچکر سنخرب۔ نیرو اور نپولین جیسے ملک گیر بھی آکر سرنگوں ہو جاتے ہیں کہ قوانین کائنات ایسے اجارہ داروں کے خلاف وضع کئے گئے ہیں۔ دنیا میں کوئی ایسا زبردست بادشاہ نہیں جو اس لامحدود طاقت کے خلاف جس کو وحدت کہتے ہیں سرکشی کرے۔ اور پھر بھی طاقتور اور زبردست رہ سکے۔ اس وصال کی سعی حصول اپنے آپ کو فنا کر دینے کی مترادف ہے۔ خودی کو اس مقام پر محبت و انکسار سے اپنا سر جھکا دینا اور وہاں کھڑے ہونا پڑتا ہے۔ جہاں بڑے اور چھوٹے۔ شاہ و گدا میں کوئی امتیاز نہیں۔ اس زیان میں سود ہی سود مضمر ہے۔ اور اس مغلوبیت میں غلبہ و عروج پوشیدہ ہے۔"

عرفان نفس کی ایک سبیل محبت ہے۔ یہ وہ سبیل ہے جسے خود ذات باری تعالیٰ اختیار کرتی ہے۔ خدا کو اپنی خالقیت سے اپنے نفس کا عرفان ہوتا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ "خدا نے فلاں کو ایسا محبوب بنایا کہ اسے یہ کچھ دے دیا"۔ زمین و آسمان بحر و بر اور انسانی زندگی کے دور دست مناظر میں ہمیں خدا کی محبت کے عطیات دکھائی دیتے ہیں۔

ہماری تمام نواحی اشیا کی حقیقت محبت ہے۔ محبت محض جذبہ کا نام نہیں۔ بلکہ یہ ایک صداقت ایک واقعیت ہے جس شخص کے دل میں محبت نہیں ہے۔ وہ ان حقیقی معانی کو نہیں پا سکتا جو سر راہ کھلے ہوئے پھول میں مستور۔ یا شام کے آسمان اور تاروں بھری رات میں سرمایہ دار تماشا ہے محبت انسان کو ایک غیر مرئی حقیقت کا وقوف و شعور بخشتی ہے۔ تمام مادی اشیاء اسی حقیقت کی نشانیاں اور علامتیں ہیں۔ اور انسان بصارت کے شاداب راستوں میں سے ہو کر بصیرت کی جلوہ گاہ میں پہنچ جاتا ہے۔ انسان اُن اشیاء سے جو مس کی جا سکتی ہیں۔ اور ان اصوات و نغمات سے جو ممنون سماعت

ہو سکتے ہیں۔ گزر کر اس حقیقی دنیا میں جا پہنچتا ہے۔ جو ہمارے بہت قریب ہے لیکن ہمیں اس کا عرفان نہیں ہوتا۔ اور جس کی ناپائداری ہی میں روح معرفت جاودانی حاصل کر لیتی ہے۔ محبت اندھی نہیں ہے بلکہ محبت تو وہ بصیرت حقیقی ہے۔ جسے تمام مادی اشیا میں نور خداوندی کا جلوہ نظر آتا ہے۔

اس تاویل کی روشنی میں کائنات اور انسان کی ماہیت بالکل متغیر ہو جاتی ہے۔ دنیا سے کنارہ کش ہونا بھی ویسا ہی خودکشی کے برابر ہے جیسا اپنے آپ سے کنارہ کش ہونا مہلک ہے۔ کائنات اپنا ایک روحانی پہلو بھی رکھتی ہے۔ جو ہماری زندگی کے روحانی پہلو کے ساتھ ہی شامل ہے۔ اور زندہ رہنے کی تمنا نہایت جائز و صحیح آرزو ہے۔ کیونکہ اس آرزو کے یہ معنی ہیں کہ ہم اس عظیم کائنات کے ساتھ اپنا تعلق برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ پھر یہ انسان کی کتنی نادانی و کم فہمی ہے کہ وہ اپنے خیالی شرف و مجد میں سرشار ہو کر ادنیٰ مخلوق کا ذکر نہایت ذلت سے کرتا ہے۔ اور دنیا سے اتنی نفرت کے ساتھ کنارہ کش ہوتا ہے۔ جیسے دنیا روح کی کوئی بہت ہی بڑی مہلک دشمن ہے۔

جو دریائے حیات شب و روز میری رگوں کے اندر رواں و دواں ہے۔ وہی تمام کائنات عالم میں لہریں لے رہا ہے۔ اور اس کی موجیں ایک نوائے آہنگ منتظم سے رقص کر رہی ہیں۔ ایک ہی مشترک زندگی ہے جو زمین کی خاک سے بے شمار برگہائے گیاہ کی شکل میں منصۂ شہود پر آتی ہے اور پھولوں۔ اور پتوں کی پُرشور لہروں میں جلوہ دکھاتی ہے۔ بلاشبہ خواص روح میں کائنات عالم ہماری نسبت کم درجہ نہیں رکھتی۔ پھول اور ستارے اپنی آنکھیں ہماری آنکھوں سے ملاتے ہیں۔ کیونکہ ہماری۔ اور ان چیزوں کی ہستی ایک ہی "کل" پر مبنی ہے۔

جب لوپوس رسول نے یہ کہا تھا۔ کہ درد و کرب میں چلاتی ہوئی اور فریاد کرتی ہوئی دنیا منتظر ہے کہ خدا کے فرزندوں کا الہام نازل ہو۔ تاکہ کائنات ہستی کے تمام اختلافات و افتراقات امواج محبت کے محیط الکل مدوجزر میں ڈوب کر فنا ہو جائیں تو اس حقیقت آگاہ بزرگ نے پالیا تھا کہ افتراق کا انجام نہایت غم انگیز و اندوہناک ہوگا۔

ہم اس اعلیٰ و ارفع پیغام کو جو ٹیگو مغربی دماغوں تک پہنچا رہا ہے سمجھ نہیں سکتے۔ تاوقتیکہ ہمیں ٹیگور کی متصوفانہ معرفت خداوندی پر غور و خوض کرنے کا سلیقہ نہ ہو۔ مغربی حکما و فلاسفہ کے تمام مادی اور ہمارے فلسفۂ مابعد الطبیعتہ کے تمام اصول اس شخص کے سکون آمیز ایمان و ایقان کے سامنے

بالکل ہیچ و ناکارہ نظر آتے ہیں۔ کیونکہ وہ تو خدا کے جلوے کو وہاں پاتا ہے۔ جہاں کوئی کسان سخت زمین میں ہل چلا رہا ہو۔ یا کوئی مشقت کا فرزند جنگل کی گھنی اور پیچیدہ جھاڑیوں کو کاٹ کر صاف کر رہا ہو ہمیں چاہئے کہ یہ "منتر جپنا۔ بھجن گانا۔ اور مالا کے دانے گننا" چھوڑ دیں اپنے تیرہ و تار مندر کا دروازہ کھولیں اور جہاں کہیں کسی انسانی ہاتھ کو مس کر سکیں۔ یا کسی انسانی آنکھ کے عمق کو دیکھ سکیں۔ وہیں اپنے اس ان دیکھے محبوب کو تلاش کریں جس کے قدموں کی خاموش آہٹ جنگل کی پگڈنڈیوں پر سنائی دیتی ہے اور یہ اسی کے کفِ پا کا مسِ زریں ہے۔ جو صبح صادق کے نور میں جلوہ پاش ہوتا۔ اور ہمارے دلوں کی مسرت بن جاتا ہے۔

جس طرح "عہد نامہ عتیق" کے زبور خواں نے کہا تھا کہ نورِ سحر کے پروں پر سوار ہو کر دنیا سے بھاگ جانا۔ اور اس طرح خدا سے بچ کر نکل جانے کی کوشش کرنا حماقت ہے۔ اسی طرح "ٹیگور اعلان کرتا ہے۔ کہ دنیا سے کنارہ کش ہو کر خدا تک پہنچنے کی جدوجہد کرنا بھی نادانی ہے۔ ہمیں تارک الدنیا بننا لازم نہیں۔ بلکہ ہمارے اندر اس دعوے کی جرأت ہونی چاہئے کہ خدا ہمیں موجود ہے اور اسی وقت موجود ہے"۔

اگر ہم تمام مردوں اور عورتوں کے اندر عام اشیائے نواحی کی ہیئت تقدس کا احساس عرفان پیدا کر سکیں تو ظاہر ہے کہ ہماری حیاتِ حاضرہ بے انتہا بلند ہو جائے گی۔ اگر سب لوگ اس حقیقت کو سمجھ لیں کہ اناج بونے اور اُون کاتنے میں بھی خدائے کائنات کی فعالیت جلوہ گر ہے تو غالباً اس امر کا امکان نہ رہے گا کہ لوگ ان چیزوں سے سفیہانہ و خود غرضانہ نفع حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ سُوت کا ذخیرہ تاجرانہ منافع حاصل کرنے کے لئے چھپائے رکھنا بھی ویسا ہی خلاف تقویٰ سمجھا جائے جیسا سورج کی روشنی اور تاروں کی چمک کو چھپانے کی کوشش کرنا تحصیل حاصل ہے۔

ٹیگور حریتِ حقیقی کی بشارت کا بھی مناد و مبلغ ہے۔ وہ ہماری حریتِ حاضرہ کو اس لئے مردود قرار دیتا ہے کہ اس حریت نے ہمیں نئی نئی غلامیوں اور محکومیوں کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ ہم نے ہوا کو مسخر کر لیا لیکن ہم ان "ہوائی بیڑوں" کے خوف سے ہر وقت لرزاں رہتے ہیں جو ہم پر ہر وقت موت کی مہلک بوچھاڑ برسا سکتے ہیں۔ ہم زمین دوز راستوں میں سے ریلوں پر سوار ہو کر سفر کرتے ہیں۔ اور بحر اوقیانوس کی پہنائیوں کو بحری راستے سے پانچ دن میں اور ہوا پر سولہ گھنٹے کے اندر اندر عبور کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم اس سرعتِ رفتار کے بھی غلام ہو چکے ہیں۔ اور ہماری تہذیبِ مغربی کی پیشانی پر یہ لکھا ہوا ہے

کہ دنیا ان سریع السیر مشاغل اور ان کی عاجلانہ سرگرمیوں سے تھک کے چور ہو چکی ہے ہم لاف زنی کرتے ہیں کہ ہم نے کائنات سے خوف و دہشت کا وجود مٹا دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دور حاضر کی تمام اقوام و ملل ایک دوسری سے خائف و بدگمان ہیں اور جنگ و پیکار کی تیاریوں میں ہر وقت سلح اور کیل کانٹے سے لیس رہتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ علم و فضل کے مصباح ضیا پاش نے اوہام کی تاریکی کو محو کر دیا ہے۔ لیکن کیا یہ درست ہے؟ ہاں اتنا تو ضرور ہے کہ ہم سمندر کے پُر اسرار روایتی عفریتوں کے خوف سے آزاد ہو چکے ہیں۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہماری ساری زندگی انسانی "شارکوں" اور آبدوز کشتیوں کی دہشت میں بسر ہوتی ہے۔ ہم اپنی مذہبی آزادی کے مدح خواں ہیں لیکن اپنے جابرانہ مسالک اور استقفانہ عقائد کے بندۂ بے دام بنے ہوئے ہیں۔ اگرچہ ہمارے مذہبی اختلافات ایک حیات کائنات کی گوناگوں تاویلات و تصریحات سے عبارت ہیں لیکن اکثر حالات میں ان کی حیثیت یہ ہے کہ ہر ایک اپنے اپنے عقائد و مسلمات کو ایک دوسرے سے مختلف اور ایک دوسرے سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اختلافات کیا ہیں؟ تعصب کے جزیرے ہیں جن کے گرد اگرد بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کا سمندر لہریں لے رہا ہے۔ خیال اور نصب العین کی یہی تنگ ظرفی ہے جس نے مذہب کی حقیقی مسرت ہم سے چھین لی ہے۔ ورنہ اگر ہم اس حیات عالم کے شفاف چشمے سے دو جُرعے پی لیتے۔ تو اس چشمے کی پُرشور اور حسین و جمیل لہریں ہماری روح کے اندر دوڑ جاتیں۔ اور اپنے ساتھ بہت سے پھولوں کی نکہت بہت سے جنگلوں کی خاموش سنسناہٹ اور بہت سے آسمانوں کی روشنی لے آتیں جس سے ہمارا چھوٹا سا تاریک لالہ زار سرسبز و شاداب ہو جاتا۔

ایک دن ایسا آئے گا۔ کہ ہم دانشمندی سے کام لیں گے۔ اپنے طائران روح کو عقائد کے ان پنجروں سے آزاد کر دیں گے جن میں وہ آج تک اسیر و محبوس رہے ہیں۔ اور پھر انھیں اجازت دینگے کہ اپنے پروں کی شکنیں کھول دیں۔ اپنی مانوس ہواؤں میں پرواز کریں۔ اور اس لامحدود نیلے آسمان میں خوشی کی تانیں اُڑاتے پھریں۔

ٹیگور کے نزدیک "موت کا آنا" زندگی کے حیرت انگیز سفر کے دوران میں محض ایک واقعہ ہے وہ کہتا ہے کہ جب زندگی مرنے کی چیز رہی ہے۔ اور جب ہر طلوع آفتاب اپنے ساتھ تازہ و عجیب واقعات لاتا رہا ہے۔ تو پھر یہ لازمی و لابدی ہے کہ جب ہم لمحوں اور سالوں کی حدود کو عبور کر جائیں

تو ان تمام واقعات سے بھی زیادہ حیرت ناک و تعجب انگیز مناظر نظر آئیں۔

پھر جب ولادت و ہلاکت ۔ نشاء و فنا کے مسلسل دائرے میں گھوم گھوم کر ہم تمام ضروری اشیائ کی تعلیم حاصل کریں گے جب ہم آسمانی باپ کے گھر کے بہت سے کمروں میں سے گزر چکیں گے ۔ جب ہم حسرت و اندوہ کے تاریک گلشن میں بیٹھے ہوئے طوفان کے فرو ہونے کے بعد حسن کی قوس قزح کا نظارہ کرلیں گے اور ان ستاروں کو جنت نگاہ بنا چکیں گے ۔ جو بادلوں کے نیچے ابدالاباد تک درخشاں رہتے ہیں جب ہم خورمی کے نہاں خانے میں ایک بیش بہا موتی مسرت کی شراب میں چھپا ہوا پالیں گے ۔ جب مشقت کی شورانگیز و غلغلہ آمیز کارگاہوں میں ہم اس حقیقت کو سمجھ لیں گے کہ ہر کام راحت و شادمانی سے انجام دینا چاہیے ۔ جب کارخانے کی بھٹی کے شعلے ہمیں دیوالی کا چراغاں بن کے نظر آئیں گے ۔ جب کارخانوں کا شور و غل موسیقی کی طرح سنائی دے گا ۔ جب معمولی سے معمولی کام اسی مسرت تخلیق سے انجام دیا جائے گا ۔ جسے شاعر نظم کہتے وقت ۔ صناع اپنی تصویر کے پردے پر اور بہادر آدمی اظہار شجاعت کے وقت محسوس کرتا ہے

اس وقت

ہماری روح کے خزانے ضروری تجربوں سے مالا مال ہو چکے ہوں گے اور ہم اس راز حیات کو پا چکے ہوں گے جس کو خدائے محبت نے نظام اشیا میں مستور کر رکھا ہے ۔ اور بالآخر ذات محیط کے اس بحر ناپیداکنار میں جو سب کا مبتدا و منتہا ہے ۔ جذب ہو کر وصل بالذات ہو جائیں گے ؞

سالک　　(ترجمہ از ہیپرز اپریل سنہ ۱۹۲۱ء)

حاضر جوابی

حاضر جوابی جس طرح تقریر و تحریر کی مقید و پابند نہیں اسی طرح نظم و نثر پر بھی موقوف و منحصر نہیں ۔ مجیب کے ذہن رسا کی قدرت جس اسلوب سخن کو ذریعہ فتحمندی بنائے ۔ مزہ دے جاتی ہے ۔

شاہ عباس صفوی والی ایران نے ایک دفعہ ہندوستان کے سلطان الاعظم حضرت جلال الدین اکبر کے پاس سفارت بھیجی تو جہاں سفیروں نے ملکی و سیاسی نامہ و پیام پیش کیا ۔ وہیں اپنے بادشاہ کی طرف سے اور تحائف و ہدایا کے ساتھ یہ رباعی بھی نذر نظر کی ؎

رومی بہ سپاہ و خیل و لشکر نازد　　اوزبک بہ سنان و تیغ و خنجر نازد
اکبر بہ خزینۂ پر از زر نازد　　عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد

دیگر مراحل تو باقتضائے منصب ابوالفضل نے طے کئے ۔ مگر اس ستم ظریفی کا جواب ہندوستان کے سخنور ملا فیضی کے شوخ گفتار قلم کی زبان سے دیا گیا ؎

دریا بہ گہر فلک بہ اختر نازد　　فردوس بہ سلسبیل و کوثر نازد
عباس بہ ذوالفقار حیدر نازد　　کونین بہ ذات اکبر نازد

"ب"

کیفِ توحید

(از جناب منشی فاضل حکیم سید امداد حسین صاحب توحید ہیڈ مولوی گورنمنٹ کالج اندور)

من شوق وصل را بتماشا گذاشتم — روئے نگار دیدم و دل را گذاشتم

اول بہ تیغ ناز مرا کشت و باز گفت — برخیز کشتنی کہ خدا را گذاشتم

تا محو دلفریبی دلدار بودہ ام — ذوقِ فنا و ذوقِ بقا را گذاشتم

خوابم سحر ربود۔ بہ بیداری وصال — ترک حواس کردم و غوغا گذاشتم

محوِ جمالِ یار بمیرم نہ ایں چنیں — خرم بود کہ دنیا و عقبیٰ را گذاشتم

اکنوں پیام دوست بقاصد نمیدہم — بر باد رفتہ ام کہ صبا را گذاشتم

توحید میگسار ہوں مستیش ہموں — آخر کہ گفت راہ ہدیٰ را گذاشتم

توحید چوں بعشق حقیقی رہم نمود

دیوانہ وار طرۂ لیلیٰ گذاشتم

توحید

خواب گاہِ آرزو

ایک بچے کی موت پر چند آنسو

(چکیدۂ کلک مولوی حمید احمد خان۔ برادر کوچک مولانا ظفر علی خان)

کس لئے صرفِ تلاشِ مدّعا ہو جائیے
خونِ حسرت سے نہ کیوں رنگیں قبا ہو جائیے

آہ اے آرامِ جاں کیونکر ترے مرنے کے بعد
پھر بلائے زندگی میں مبتلا ہو جائیے

تو ہمیں خود مبتلائے رنج و حرماں کر گیا
کشمکش ہائے الم سے کیوں رہا ہو جائیے

جی میں آتا ہے قرارِ دل کو رخصت کیجئے
اور سکون و صبر سے نا آشنا ہو جائیے

شعلہ ہائے غم کو پنہاں سینۂ صد چاک میں
اب نہ رکھئے اور آتش زیرِ پا ہو جائیے

ہم جلیں سوزِ دروں سے اور تو جنت میں ہو!
تیری شانِ بے نیازی کے فدا ہو جائیے

ق

نغمہ پیرائے فغانِ حبذا بن جائیے
پردہ سنجِ نالہ ہائے مرحبا ہو جائیے

تیری جانِ نازنیں لیتے نہ شرم آئی اسے
نوحہ خوانِ جور و بیدادِ قضا ہو جائیے

ہم سے تو چھوٹا مگر مرقد ترا کیوں چھوڑیئے
خواب گاہِ آرزو سے کیوں جدا ہو جائیے

یا کسی حیلے سے کیجے چارۂ دردِ جگر
یا محیطِ اشک میں نذرِ فنا ہو جائیے

یا مگر آنکھوں میں سیلابِ بلا کو روکئے
قلبِ مضطر کے لئے صبر آزما ہو جائیے

اے دلِ غم دیدہ تجھ کو کیجئے تلقینِ صبر
یعنی مصروفِ علاجِ بے شفا ہو جائیے

پڑھئے کل من علیہا فان کا درسِ ازل
اور اسرارِ بقا سے آشنا ہو جائیے

"کس سے کہئے چرخِ ناہنجار کا یارانہ ہے
کل جو گھر عشرت کدہ تھا آج ماتم خانہ ہے

حمید

جذبات تکلف

(از مسٹر وحید اللہ خان تکلف۔ پرائیویٹ اسٹوڈنٹ بریلی)

پھر کسی کا سامنا ہے۔ جان اک مشکل میں ہے لب پہ حرف مدعا ہے ناامیدی دل میں ہے

صاف کہدو۔ اب مریجاں۔ جان اک مشکل میں ہے عرض مطلب پر نہیں ہاں جو تمھارے دل میں ہے

جذب کامل کی کشش ہے قیس کے جو دل میں ہے ورنہ لیلی کون ہے۔ کیا پردۂ محمل میں ہے

بے خودی سے ہوش میں آلوں تو ناصح کچھ کہوں کس کا سودا سر میں ہے کس کی تمنا دل میں ہے

میرا مطلب وہ نہیں۔ میری تمنا وہ نہیں غیر کا ارمان ہے وہ۔ غیر کے جو دل میں ہے

جان بچتی اب شب فرقت نظر آتی نہیں پھر وہی وحشت وہی ان کا تصور دل میں ہے

رحم تم کرتے نہ کرتے پوچھ لینا تھا مگر
کیوں پریشاں ہو تکلف کیا تمنا دل میں ہے

تکلف بریلوی

ضیائے مہر

(از مولوی سید خورشید علی صاحب مہر دہلوی)

تمنائے دل عاشق اگر صبر آفریں ہوتی نہ دامن چاک ہی ہوتا نہ پرزے آستیں ہوتی

سکھایا مجھکو ذوق عشق نے ہر وقت چپ رہنا وگرنہ نالہ کش کیا کیا مری طبع حزیں ہوتی

پریشاں اب تو دنیا ہے۔ خدا جانے کہ کیا ہوتا فغاں کی تجھکو فرصت گر دل اندہگیں ہوتی

تمنائے مسرت ناگوار دل نہیں لیکن غم جاوید سے دم بھر کو فرصت ہی نہیں ہوتی

رکھا تقدیر نے غربت میں مجھکو عمر بھر ورنہ یہ حسرت تھی یہیں ہوتا۔ اور وطن کی سرزمیں ہوتی

سر آنکھوں پر یہ سمجھانا۔ مگر اے ناصح مشفق دل مایوس کو تسکیں نہیں ہوتی۔ نہیں ہوتی

میں رہتا چپ بھی اے قاتل تو تجھ کو داد یوں ملتی دہان زخم سے پیدا صدائے آفریں ہوتی

غنیمت ہے کہ رحمت نے کسی کی رکھ لیا پردہ قیامت تھی اگر اعمال کی پرسش کہیں ہوتی

رکھے گا مہر کب تک اپنے دل میں قیدنالوں کو
رہائی ان کی بھی مرد خدا اب تو کہیں ہو تی

(مہر دہلوی)

لمعات ثاقب

ذوبحرین

(از پہلوان سخن مولانا نجم الدین صاحب ثاقب بدایونی)

اب تو جی بھر کے مزے میرے فسانے کے لئے
منتظر کب سے ہے نیند آنکھوں میں آنے کے لئے

کام آئے گی قیامت کو اٹھانے کے لئے
چال رہنے دو کوئی اگلے زمانے کے لئے

لاش پر میری تعجب سے چباتے ہیں وہ ہونٹ
بجلیاں تیغ تبسم سے گرانے کے لئے

آگے آؤ تو سہی آنکھیں ملاؤ تو سہی
صاف رستا ہے مرے دل میں سمانے کے لئے

ضعف میں جب ترے کوچے سے بڑھے پائے جنوں
درد دل اٹھنے لگا میرے بٹھانے کے لئے

اُن کی خو میں ہیں وفائیں بھی جفائیں بھی مگر
وہ گھٹانے کے لئے ہیں یہ بڑھانے کے لئے

ہچکیاں آئیں جو غربت میں ہوا دل کو یقیں
آ گئی یاد وطن میرے بلانے کے لئے

شوخیاں بزم عدو میں ہیں زمانے سے نئی
شمع گل کرتے ہیں وہ میرے جلانے کے لئے

کیوں ابھی سے ترے ترکش میں ہے تیروں کی کمی
دل زمانے کے جو باقی ہیں نشانے کے لئے

شمع کشتہ ہوں مرے سینے میں چھالے ہیں نہاں
تیری محفل میں لگی جی کی بجھانے کے لئے

صدمۂ ہجر بتاں رشک عدو جور فلک
دے کے دل ہم نے مزے سارے زمانے کے لئے

قبر ثاقب کا نشان تم نے مٹایا بھی تو کیا
نام باقی ہے جو دنیا سے مٹانے کے لئے

(ثاقب بدایونی)

ملہمات اطہر

(از نتائج افکار حضرت ناظم الملک سید معشوق حسین صاحب اطہر ہاپڑی وکیل جے پور)

نگاہ شوخ ان کی خشمگیں معلوم ہوتی ہے
چھری کھینچے ہوئے چین جبین معلوم ہوتی ہے

دم وعدہ ترے لب پر نہیں معلوم ہوتی ہے
تری شوخی تبسم آفریں معلوم ہوتی ہے

ہزاروں نقشِ سجدہ ہیں بت کافر کے کوچہ میں
زمیں کعبہ زاہد۔ یہ زمیں معلوم ہوتی ہے

پسینہ آگیا ہے شکوۂ وصل عدو سن کر
ستاروں سے بھری ان کی جبیں معلوم ہوتی ہے

جگر میں داغ فرقت سے ہزاروں لالہ و گل ہیں
جگہ اتنی سی فردوس بریں معلوم ہوتی ہے

چلے آتے ہیں بزم غیر سے اترا ہوا منہ ہے
نگاہ شوخ بھی کچھ شرمگیں معلوم ہوتی ہے

وہ آئے گھر میں روشن ہو گئے دیوار و در سارے
شب وصل آج ہم کو چودھویں معلوم ہوتی ہے

سہیں سب آفتیں الفت میں لیکن اب ہے یہ مشکل
خفا مجھ سے مری جان حزیں معلوم ہوتی ہے

شب ہجر انتظار روز محشر ہے ہمیں لیکن
قیامت آج بھی آتی نہیں معلوم ہوتی ہے

بہار کوئے جاناں دیکھ زاہد میری آنکھوں سے
تجھے جنت کا ٹکڑا یہ زمیں معلوم ہوتی ہے

الٰہی دوپہر فرقت کی کیوں ڈھلنے نہیں کہتی
جہاں پہلے تھی دھوپ اب بھی وہیں معلوم ہوتی ہے

خدا رکھے سلامت دیدۂ خونبار کو اپنے
بہار لالہ و گل آستیں معلوم ہوتی ہے

نہیں معلوم ہوتا دل کسی معشوق پر آتا
مگر جاتی ہوئی جان حزیں معلوم ہوتی ہے

تمھیں خوش قسمتی جے پور میں لے آئی ہے اطہر
امید کامیابی اب یہیں معلوم ہوتی ہے

(اطہر ہاپوڑی)

کلامِ شامی

(از جناب محمد معراج الدین صاحب شامی تلمیذ حضرت شوق قدوائی)

فراقِ یار نے اتنا کیا نڈھال مجھے
کہ کروٹوں کا بدلنا ہے اب محال مجھے

یہ رعبِ حسن تو دیکھو کہ اس کے ملتے ہی
جواب دینے لگی طاقت سوال مجھے

کہاں سے بگڑی ہوئی شکل لے کے آئے ہو
کہ دیکھ دیکھ کے ہوتا ہے انفعال مجھے

مثال بدر گھٹانے لگا مجھے ہر روز
سمجھ لیا جو زمانے نے باکمال مجھے

نکلنا زلف کے پھندے سے کوئی آسان تھا
مرے خدا نے بچایا ہے بال بال مجھے

خیال زلف جو آیا تو یہ کہا دل نے
الٰہی اب تو نہ پیچید گی میں ڈال مجھے

جو میں فراق سے گھبرا اٹھا تو پاس آکر
کہا یہ غم نے کہ کر تو شریک حال مجھے

چمن میں اُٹھتے ہی پائے خزاں نے کر ڈالا
برنگ سبزۂ نو خیز پائمال مجھے

اٹھانے آئے ہو در سے تو صاف یہ کہدو
کہ دینے آئے ہو پیغام انتقال مجھے

تم اپنے ہاتھ میں دیکھو کسی کا دل تو نہیں
کہ ایک شے نظر آتی ہے لال لال مجھے

یہ جوش عشق تو میرا قصور ہے لیکن
کہا تھا کس نے کہ دکھلاؤ تم جمال مجھے

فلک کچھ آج کل آہستہ رو ہوا شاید
کہ ایک لمحہ ہے فرقت میں ایک سال مجھے

مذاق ساتھ زمانے کے چاہئے شامی
کچھ اور رنگ میں کہنا ہے اب کے سال مجھے

شامی

شکریۂ زندانی

(از مولانا بیخود صاحب موہانی)

اے شہ خورشید منظر اے شہ گردوں سریر
سرکشوں کے سرشکن بے دست و پا کے دستگیر

ہم سے مجبوروں کے والی تاجداروں کے امیر
تو زمانے کے لئے ہے سایۂ رب قدیر

کچھ سمجھ کر تجھ کو ایسی قدرتیں دیدی گئیں
ہاتھ میں تیرے ہماری قسمتیں دیدی گئیں

بھول سکتا ہے کہیں تیرے بزرگوں کا چلن
ساری سج دھج بھیم کی ارجن کا سارا بانکپن

بزم یاراں میں سرو دہی جن کی - چوتھی کی دلھن
دشمنوں کا خون تھا جس کا عروسی پیرہن

بیگنہ کے خون سے رنگین نہ ہو ڈرتا یہی
ان کی تلواروں کا سب سے بڑھ کر جوہر تھا یہی

تو انھیں کی آنکھ کا تارا انھیں کا نونہال
تیرے ہوتے بیگنا ہوں پر یہ سختی یہ جلال

بوئے گل سے ہو رہا ہے مست ہر دل ہر خیال
آہ یہ جوش بہار اور یہ اسیری کا ملال

کیا کہوں اپنا جو دہرے دشمنوں میں حال ہے
کشتی طوفاں زدہ دریا دل پامال ہے

یہ تو مانا ہے خیال انساں کا وہ جادو اثر
گھر کو جو زنداں بنا دیتا ہے اور زنداں کو گھر

کیوں نہ تڑپوں جب تصور میں رہے پیش نظر اُترا اُترا چہرہ بچوں کا۔ اور اس کی چشم تر
جو تڑپ کر نالہ جانکاہ کر سکتی نہیں اُٹھ رہی ہے ہُوک دل میں آہ کر سکتی نہیں
میرے بچے میری دنیا۔ میری امیدوں کا کشت جن کا چھٹنا ہے جہنم جن کا ملنا ہے بہشت
چین پیشانی میں جب یہ بے نیاز خوب و زشت بڑھتے ہیں بڑھتے ہوئے میری اور اپنی سرنوشت
شوق میں بڑھتا ہوں اور دکھ سہکے رہجاتا ہوں میں بیخودی میں پیار سے کچھ کہہ کے رہجاتا ہوں میں
دل کی ان بیتابیوں میں بھی اگر نیند آگئی ڈبڈبائی آنکھ اُن کی اور دل تڑپا گئی
ایسے جینے سے تو میری روح اب گھبرا گئی میرے ہوتے اُن کے چہروں پر یتیمی چھا گئی
مثل گل کیا بس یہی اک پیرہن پہنے رہیں میرے بچے جیتے جی کب تک کفن پہنے رہیں
رحم کر شاید ابھی باقی ہو کچھ جائے رفو آ چلی ہے ہر نفس سے خون زخم دل کی بو
آنکھ میں بے خوابیوں کا رنگ ہے نے گفتگو پہلے تھی ہلکی سی سرخی اب برستا ہے لہو
لب تک آتی ہیں آہیں خون میں ڈوبی ہوئی اب نکلتی ہیں نگاہیں خون میں ڈوبی ہوئی
حیف زندان رجا میں مجھ کو رہنا ہی پڑا یعنی ان مجبوریوں کا جبر سہنا ہی پڑا
آبلوں کو دل کے آخر پھوٹ بہنا ہی پڑا میں نہ کہنا چاہتا تھا اور کہنا ہی پڑا
کیوں ستم توڑا گیا یہ مجھ پہ اور کن کے لئے جان دے کر کی تھی خدمت کیا اسی دن کیلئے
یاں کی اُٹھتی کونپلوں میں ہے مرا سب رنگ و بو اب محبت ہے سرشت ان کی وفا ہے ان کی خو
یہ گرائیں گے پسینے پہ ترے اپنا لہو اپنے دل سے پوچھ ہے کچھ اس میں جائے گفتگو
اہل دل اس طرح تعزیر وفا دیتے نہیں جاں نثاروں کو نظر سے یوں گرا دیتے نہیں
اے سراپا اختیار ...... ہے بالکل بجا رحم کر اب بے گناہی سے نہ کر مجھ کو خجل
وقت کی رفتار سے ہو ہو کے دل میں منفعل بے گناہی سے کہیں توبہ نہ کر لیں اہل دل

امن کی آفت کہیں دنیائے آفت ہو نہ جائے
دیکھتے ہی دیکھتے برپا قیامت ہو نہ جائے

بیخود دہلوی؟

سرگذشت است ازیں وادیہ وحشتی اینک نبض رہ می تپد و سینۂ صحرا گرم است

فہرست مضامین

جلد ۴۱ | مخزن بابت ماہ نومبر و دسمبر ۱۹۲۱ء | نمبر ۷ و ۸

شذرات

اس میں شک نہیں کہ جب کوئی گام سعی اپنی شاہراہ مقصد سے پیچھے پڑ جاتا ہے تو اس کا اپنے ہم سفر رہروؤں کے گرد و امن ہونا مشکل ہو جاتا ہے۔ "مخزن" کی اشاعت بعض نامساعدت کی مجبوریوں سے معرض شکایت ہو گئی تھی۔ اس لئے اس مرتبہ ہم نومبر دسمبر کے رسالے مجتمع کر کے پیش کرنے کے معذرت خواہ ہیں۔ اور آئندہ جنوری سے یہ عہد نو سال نو کا ہم پیمان رہے گا۔ جن قارئین کرام کی خدمت میں ہر مہینہ کی ۲۵ تاریخ تک پرچہ نہ پہنچے۔ وہ دوسرے مہینے کی پہلی سے پہلے پہلے زحمت تحریر گوارا فرما کر منگا لیا کریں۔ ورنہ تاخیر بلاقیمت حصول کے مانع ہوگی۔

بعض متعارف ارباب ادب کی بارگاہ استغنا میں اب تک ہماری نیازمندیاں باوجود متواتر عرض حق کے یگانہ نوازیوں سے نامراد ہیں۔ ہم ان کی اس دست کشی اور دامن افشانی کو ضرور کسی ہنگامی مجبوری پر محمول کر لیتے۔ مگر دوسرے رسالوں میں ان کی گہرباریوں کو جلوہ افروز دیکھ کر ہمارے جذبات محبت اور اشک شکایت کا تلاطم خود کردہ نیاز دل کی فطرت ضبط پر گراں ہے۔ اور اس گلہ مندی میں نیاز۔ سجاد۔ ناتی۔ اقبال اور مولانا شرر اور جوش۔ بخصوصیت مخاطب ہیں۔ گو اطہر۔ یاس۔ پریم چند جیسے بندگان ادب سے بھی شکایت ہے۔ اس سے ہمارا مدعا خود غرضی نہیں۔ مگر یہ ضرور ہے ع "اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی"

افسوس اکثر اہل قلم احباب ترسیل مضامین سے مرہون التفات فرماتے ہوئے "مخزن" کے معیار مذاق کو ملحوظ نہیں رکھتے اور تاخیر اشاعت یا عدم اندراج پر تقاضوں اور ملامتوں کا ہدف بنا لیتے ہیں۔ مگر فرائض ادارت کی ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کرتے کہ ترتیب گلدستہ میں جس قدر دست گلچین انتخاب رنگ و بو کا پابند ہے اس سے بہت زیادہ رسالہ کے مقصد حیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اخذ و ترک پر مجبور ہے۔

امید ہے ہمارے عاجل اور شاکی احباب اب اس معذرت کو اظہار حقیقت سمجھ کر اس باب میں مخزن کے واجب العمل سے اتفاق کریں گے۔

خان بہادر سید اکبر حسین الہ آبادی کی ہر دلعزیز مقبولیت کو دیکھتے ہوئے یہ امر موجب افسوس و حیرت ہے کہ مخزن اس وقت تک ایسے مضمون یا قطعات تاریخی سے تہی دامن ہے۔ جن کا تہارا یہ اسے اشک تعزیت سے عہدہ برآ کرتا حضرت عطا صاحب امرت سری کی قدرت فن کا یہ نتیجہ فکر "خان بہادر سید اکبر حسین الہ آبادی" ضرور قابل تحسین تھا۔ اگر دو عدد کی زیادتی کے نقص سے ردپوش صحت نہ ہوتا۔ یا ان کے اخذ اعداد کے مافی الضمیر قاعدۂ تاریخ سے ہماری کوتاہ نگاہیں بھی معذور بصارت نہ ہوتیں +

سبد گل

گوہر شب چراغ یونانیوں کا اختر عروج و اقبال جب آسمان شہرت پر ہم اوج کمال تھا۔ تو ان کی رعنائیت کے حیرت فروز کرشمے بھی تسخیر آفاق میں ہم سحر تھے۔ ان کے معتقدات مذہبی کے افسانے (جو انگریزی میں "گریک مائیتھولوجی" سے موسوم ہیں) دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانیوں نے دنیا کی ہر مادی اور غیر مادی اشیا کو ایک اسی کی ہم جنس دیوی یا دیوتا کا پرستار فرض کر کے مخلوقات عالم کو لاتعد خداؤں کا بندہ بنا دیا تھا۔ اور ہر ایک رب النوع کے متعلق ایسے دلچسپ قصے مدون تھے جن کا مطالعہ باوجود امتداد زمانہ آج تک ساغر مسکر و سرور ہے۔ چنانچہ انھیں دیویوں میں ایک "گونج" کی دیوی ہے۔ اس کے سوانح حیات میں کہا جاتا ہے۔ کہ:-

"جب روح انسانی نے عالم اجسام میں کسی پیکر ظاہری کو اپنا کاشانۂ حیات نہیں بنایا تھا تو "گونج" کی دیوی سمندر کی لامحدود پہنائیوں اور غیر متناہی گہرائیوں پر حکمران تھی۔ خداوند "جیو" جو ان افسانوں کا زیب داستان اور احکم الحاکمین ہے۔ اس نے کسی نامعلوم تصور پر برافروختہ ہو کر اس کی قدرت سے معزول کر دیا۔ اس سزا پہ یہ اور تازیانہ ہوا کہ "نارسی سس" کے ناکام تمنا عشق کو مقید کر کے وصل محبوب کی ابدی محرومی کی بیڑیاں بھی پہنا دیں۔ محبت کی ماری غریب "گونج" "نارسی سس" کے غم فراق میں تحلیل ہو کر محض ایک آواز رہ گئی جب اس سے کوئی بولے تو جواب تو دیتی ہے۔ مگر خود محسوس بصارت ہونے سے معذور ہے"!

"مخزن" کے معاون خصوصی۔ سید سرفراز حسین صاحب بی۔ اے علیگ کے تبحر علمی اور وسعت مطالعہ نے جہاں اپنے مضمون کی بنیاد موضوع اس قصہ پر رکھتے ہوئے بالغ نظری سے کام لیا ہے۔ وہیں آپ کے ندرت طراز قلم کا یہ اسلوب نگارش بھی قابل اعتراف ہے کہ فلسفہ کی گرانباری کو اس لطافت سے ادب لطیف میں پیش کیا ہے کہ دونوں قدرتیں ہم پہلوئے غلبہ نظر آتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اپنے ہیرو کے معصوم کیرکٹر کی سعی احترام میں یہ بات خود بخود واضح ہو گئی ہے کہ ایک ارفع زندگی کا اثر دوسری پست سعادت ہستی پر کس حد تک ہو سکتا ہے۔ اور اگر اس فرشتہ خصلت تقدس میں صلاحیت اصلاح بھی ہو تو مقابل کی زندگی دنیا میں کس درجہ خوشگوار ہو سکتی ہے ۔

آئینۂ دل

یہ ایک خیالی تصویر دورِ زندگی کے اس عہد کا صحیح مرقع اور عہدِ شباب کی ان پُراضطراب حقیقتوں کا آئینہ ہے جس کو جذبات کے تسلسل اور حسن فطرت کے تلون سے وہی نسبت ظہور ہے۔ جو سطح سراب کو موج آب سے۔ لیکن مصور کی صورت آفرین قدرت نے اس خاموش تحیر مجسمہ کو بھی بحر زندگی کے شورش زا مدّ و جزر کا ہم سخن کر دیا ہے۔

مانیِ جذبات جناب "بطرس" نے اس نقش کی نقاشی میں جس رنگ و روغن سے کام لیا ہے۔ اس سے اگرچہ مقلدان قدامت غیر مانوس ہوں۔ مگر موجودہ انداز میں یہی خوش نما ادائیں خالق حسن اور ادب اردو کی روح و جان ہیں۔

اسرارِ محبت

"محبت" جس طرح ایک لاینحل معمہ ہے۔ اسی طرح اس کے متلون اسرار بھی کسی ایک نوعیت مفہوم کے محجوب تشکیل نہیں ہیں۔ ہر ذی حس ادراک کا مبلغ علم و فہم اپنے علم و یقین میں اس کی ایک منتہا قرار دے لیتا ہے۔ اور ہر چشم بصیرت کی منتہی نگاہ اپنی موہوم حد نظر کو اس کے اعماق حقیقت کا ایسا دھوکہ سمجھ لیتی ہے۔ جس کا خالق خود اپنا ہی ذوق نظر ہوتا ہے۔

ہماری مخزن سبھا کے ہم صحبت شریف احمد صاحب مرآد نے اس مضمون میں اسی محبت کی دو سطحی نیرنگیاں پیش کرتے ہوئے اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ حسن و عشق کی ہم صورت فطرتیں جذبات کے ضبط و اظہار میں وہی نسبت تفاوت رکھتی ہیں جو دل اور زبان کے مابین ما بہ الامتیاز ہے۔ اور یہ بھی دکھایا ہے کہ عورت کا پیکرِ انفعالیت۔ اگرچہ مرد کی نسبت ضبط الفت میں دل سے زیادہ بے زبان ہے۔ مگر جب اس کے جذبات عشق کا ہم اشک طوفان دریا اپنے حریف محبت کی تغافل کیش ناقدریوں سے موجزن ہو جاتا ہے تو اس کے سیلاب شکایت کی روک تھام۔ خود اس کی نسوانی غیرت کی قدرت سے باہر ہو جاتی ہے نسیم الفت کا طوفان تموج جب اس عروس فطرت کا نقاب حیا الٹ دیتا ہے تو پھر نہ دامن گل ہی پردہ داری کی تاب لا سکتا ہے اور نہ عصمت غنچہ ہی مشرب بے دہنی ہو سکتی ہے۔

جھوٹ

ہر ادیب کی تحریر میں ایک ادا ہوتی ہے جو اس کے انداز کی مختص خصوصیت ہو۔ حکیم احمد شجاع صاحب بی اے کے ادبی مرقع لفظی نقش و نگار۔ اور معانوی دلآویزیوں کی بے نظیر مثال ہونے کے ساتھ ایک خاص خداداد حسن کی بھی زبان حال ہوتے ہیں۔ آپ کی قدرت ادب فلسفۂ گناہ کی بخصوصیت پردہ در ہے۔ بظاہر آپ کا موضوع تحریر جرائم کی عظمت و احترام کا رونما معلوم ہوتا ہے۔ خطا میں جو لطف ہے۔ گناہ میں جو لذت ہے۔ اس کی تکلیف ہے،

مگر در اصل آپ کے قلم کا اسلوب بیان حقیقت معصیت کا منکشف ہے اور ان افعال قبیحہ کا علم و ہادی ہے جو معاشرت عامہ میں گناہ ہی نہیں سمجھے جاتے۔ اور لوگ اس کی ابتلا کو اپنی روش زندگی کا فخر جانتے ہیں۔ کسی شخص کو گناہ سے بچانے کا یہ بہترین طریقہ ہے کہ پہلے اس کے سامنے گناہ کے اچھے برے دونوں پہلو پیش کر دیئے جائیں اور پھر سمت نا ملائم سے احتراز خود اس کا طبعی حسن عمل بنا دیا جائے

اس مضمون میں بعض ایسی کیفیات کو بھی جھوٹ کے نام سے موسوم کیا ہے جن کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ صدق جذبات اور حقیقت تخیل کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے اصل راستی ہیں۔ مثلاً ایک لکڑی کا گھوڑا۔ ایک بچے کے لئے مرکب باد رفتار سے بھی زیادہ جاندار ہے۔ اور وہ اس کو اپنے جذبات کی نہایت صداقت سے گھوڑے کے نام سے پکارتا ہے۔ ایک عاشق کو اپنے محبوب کے چہرے میں ہر دو جہان کی خوبیاں فی الواقع نظر آتی ہیں۔ اس لئے اس کا قصیدۂ مدحیہ میں جس قدر مبالغہ ہو خلاف اصل نہیں ہے لیکن حق یہ ہے کہ حکیم صاحب نے جھوٹ کو حقیقت مسلمہ کے متضاد معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اور اس نقطۂ خیال سے نہایت ہی موزوں استعمال ہے نہ لکڑی کا گھوڑا مسلمہ طور پر جاندار ہے۔ نہ روئے لیلیٰ فی الحقیقت آئینہ آفتاب ہے۔ جھوٹ دروغ کا ہم معنی اصطلاحی ہے۔ اور خلاف اصل و نقل کا ہم آواز قدرتی ہے۔ اس پرچہ میں آپ کی ایک نظم بھی "کسی کی تلاش" کے عنوان سے ہے جو اپنی ظاہری خوبیوں میں اپنی نظیر آپ ہے

نظارۂ خاموش بظاہر یہ شیرازۂ خیال اپنے اظہار مقصد میں ناکام سا معلوم ہوتا ہے۔ اداۓ بیان بھی کچھ ایسا الجھا ہوا نہیں ہے جس سے نفس مطلب تا در ذہن کا ذریعہ رسائی ہو لیکن اگر عمیق نظر سے دیکھا جائے تو خاموش نظارہ اپنے حد نظر کے بیان حسن کے لئے قدرت گویائی ہے۔ ذوق تخیل سے منظور نظر کا فرض پھر عرض شکایت تسلیم رضا۔ اور اس کے ساتھ اپنے محروم تمنا ہونے۔ اس پر صبر و قناعت کے استقلال و بقا کی خود تدابیر پیش کرنا یہ مقتضائے فطرت ہے اور حسن تخیل ہم حضرت توحیدی کی اس مرحمت کے نہایت شکر گزار ہیں۔

موپلا موپلا قبائل کا عرصہ سے ہندوستان ملجا و ماوا ہے لیکن ایسے لوگ بہت کم ہونگے جو ان کی کنہ تاریخ سے بھی واقف ہوں "مخزن" سید حسین صاحب راحت شاہجہانپوری کی وسعت مطالعہ کا احسانمند ہے۔ جو اس مضمون کے پیرایے میں ان کے سوانح اصل مرزبوم۔ آمد۔ قیام کے ساتھ۔ ان کے خصائص فطرت اور خصائل معاشرت پر بھی روشنی ڈال کر ممنون معلومات کیا ہے۔ چونکہ "مخزن" کی غرض حیات علمی و ادبی مقاصد کے سوا۔ اور موضوعات زندگی سے طبعی اختلاف رکھتی ہے۔ اس لئے بعض وہ حصے جو موجودہ سیاسی شورشوں سے متعلق تھے ان کے حذف پر مجبور ہونا پڑا۔ امید ہے صاحب مضمون بھی ہمیں معذور جان کر اس جسارت کو نظر عفو سے دیکھیں گے۔

تاریخ الاغراب عربوں میں لحاظ تاریخ، پاس انساب، درایت اقوال۔ اہتمام اسماء الرجال یہ سب محاسن مختص تھے لیکن ان کے دور اقتدار کے ساتھ ایسے ہی خواب مرگ گئے۔ کہ اب ان کا خیال بھی نصیب دشمن ہے۔ مولوی حبیب الرحمن صاحب شاہجہانپوری کا تبحر علمی مستغنی عن التعریف ہے۔ جناب حبیب کے مفسر قلم نے اس مضمون میں یہ دکھایا ہے کہ قرآن مجید میں کیوں

اعراب کی ضرورت محسوس ہوئی اور کس کے عہد نے اس خدمت کو انجام دیا۔ ابتدائے اعراب کیا تھی اور اب کیا شکل ہو گئی لیکن علم نحو کے موجد اول کے تشخص میں اس اختلاف سے اعراض کیا ہے جس میں مورخین اسلام اور مدعیان تاریخ عالم دونوں ہم زبان ہیں۔ ابوالاسود کا خالق نحو و اعراب ہونا۔ اگرچہ صاحب طبقات ابن سعد۔ کتاب المعارف۔ دائرۃ المعارف۔ تاریخ الخلفاء وغیرہ سب سے ثابت ہے۔ مگر یہی لوگ اس میں مشتبہ بھی نہیں۔ ابوالاسود شیخ تابعین میں ہیں۔ مگر تاریخ کے مطالعے سے ان کی زندگی محض تقدس اور علم ہی میں محدود نہیں ہے شعر و ادب کے ذوق بخل و تدبیر کی معاشرتی بھی ہے۔ ہم انشاء اللہ اگلے نمبر میں ان کے مفصل حالات نذر ناظرین کرینگے

قابوس نامہ "مخزن" کا دور ماضی۔ قابوس کے حال سے ناظرین کو متعارف کرا چکا ہے۔ ہمارے سامنے چونکہ یہی اس کی آخری حیات ہے اس لئے محمود خاں صاحب شیرانی کا شکریہ ادا کرنے پر ہم بھی اکتفا کرتے ہیں۔ بہرحال مضمون تاریخی ہے۔ اگر ناظم کا لطف کا ادب نگار قلم موضوع کی خشکی سے مستغنی ہو کر دلی آبیاری بھی جائز رکھتا تو مضمون میں حسن بیان سے بھی گل کھل جاتے۔

داستان حقیقت محترمہ ز۔ خ۔ ش صاحبہ کا تبحر فن مسلم ہے۔ اسلامی دنیائے ہندوستان طبقہ نسوان میں گو اس کی مثال پیش کرنے سے ہمیشہ سے محروم ہے۔ مگر عجم و عرب کا مذاق مشرقی ستی در ایسے وجود لطیف اوراق تاریخ میں مخفی رکھتا ہے۔ یہ نظم روانی فن کے اعتبار سے تو تسلسل خیال اور ادائے بیان دونوں میں الجھی ہوئی ہے لیکن شوکت الفاظ اور جذبات کی موزونیت میں صنف لطیف کی برق باریوں کا معجزہ ادب اور افسون سحر ہے۔ نظم طول طویل تھی لیکن مصلحت فرائض نے اختصاراً ان خیالات کو نظر انداز کرنا ضروری سمجھا جن سے "مخزن" کی روش حیات کو اختلاف عقائد ہے۔ امید ہے کہ ہماری محسنہ خاتون محترم موجودہ صورت کو قوت مطلب سے ناموزوں دیکھ کر اس جسارت سے چشم پوشی فرمائیں گی۔ اور "مخزن" کے مستفیض صفحات کو ہمیشہ آپ کا ایثار ادبی فخر کا موقع دے گا۔

نقش گم گشتگی ایک غیر زبان کا خوش نوا کلام صفیران عجم ہونا اور اجنبی نہ سمجھا جانا۔ اگر آئینہ حیرت ہے تو یہ نظم قطعاً مستحق ہے کہ معجزہ ادب کہی جائے۔ سید احمد شاہ صاحب بخاری میرے جذبات دوستی کی آرزو اور اعتراف قابلیت کا ایمان ہیں۔ اس لئے بجائے حقیقت نمائی کے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خود ارباب کیف کے ذوق سلیم کو دوبارہ اس شعر کے تاثر لطیف سے متوجہ کروں ؎

نشان سجدہ ام اہل نظر را آستاں باشد — کہ زیر سجدہ ہائے شوق من آں آستاں گم شد

کیفیات رمز صاحب نازک خیال شاعر۔ اور حسن شناس ادیب ہیں۔ یہ غزل اگرچہ آپ کی قدرت شعر و ادب کی حسب حال افسانہ گو نہیں ہے آپ کے منظوم جذبات جو تعارف عالم کے کفیل ہیں۔ وہ اس سے بہت زیادہ مسرور و مخمور ہیں۔ مگر سلاست زبان، روانی کلام، اور تبحر فن کی حقیقت نما ہے۔ کاش آپکا استغنائے کمال مخزن کی سرپرستی کو آئندہ بھی مربیانہ شفقتوں کا اہل جانتا رہے۔

مرقع شوق مخلصی عبداللطیف صاحب تپش کا کلام۔ ندرت خیال، جدت بیان، اور شوکت الفاظ کی وجہ سے مختلف امتیازات کا سرمایہ دار ہونے کے ساتھ ذوق و شوق کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ ان اشعار میں تنگی بحر کے باوجود معانی کے جو گوہر مکنون ہیں وہ تپش شوق کا انتہائے ذوق ہیں۔ آپکا کلام ارباب فہم سے تحصیل خراج میں بے نیاز نہیں ہے۔ موجودہ مبلغین جرائد ادب بالاتفاق آپ کے ہم ثنا ہیں۔

افسانہ خونیں نپولین بونا پارٹ کی زندگی جس طرح تاریخ کے لئے سرمایہ ناز ہے اسی طرح پرستاران ادب بھی اس کی شیون طبیعت کے بعض دلگداز آہنگوں سے مسرور حیرت ہیں۔ حضرت رامز نے اس کی کوائف حیات میں سے چند حسن و عشق کی چنگاریاں کرید کر آگ سلگائی ہے۔ مگر ان شعلوں سے کم سخن ہے۔ جو اس کے ہم داستان ڈرامہ کی شکل میں ہمیں اسی زمانہ میں موصول ہوئے ہیں حضرت رامز کا یہ مضمون ابھی پورا نہیں ہوا ہے۔ مگر مبتدیانہ مذاق ادبی پیش رکھتے ہوئے توقع ہے کہ یہ بھی اپنے رنگ کا واحد کرشمہ ہو گا۔

جذبات ندرت جناب ندرت کو اگرچہ یہی کیا کم فخر احترام ہے کہ مجدد السنہ حضرت شوکت میرٹھی کے مایہ ناز خلفا رشید ہیں مگر دنیائے ادب میں آپ جس نظر اور جس نسبت سے دیکھے جاتے ہیں۔ وہ اس سے مستغنی ہے۔ آپ اردو کے بہترین اور پسندیدہ شاعر اور جذبات نگار مصور ہیں۔ کلام میں درد۔ بیان میں سوز و گداز ہونے کے ساتھ لحاظ فن اور پاس زبان قابل تحسین و اعتراف ہے۔ "مخزن" کے دامن آپ کے احسانات سے مالا مال ہیں۔ لباس کاغذی میں فریادی شکوہ نہیں۔ کاش چشم ذوق رشک نظر شناس سے معذور بصارت رہے۔

نقد و رائے

شیخ حسن جن پریوں کے قصہ تو دنیائے حیات میں سب ہی جگہ مشہور ہیں۔ مگر باوجود روحانیت ارواح کی شرکت یا تالیفی کے بھی انھیں زیادہ تر انسان کی صنف نازک اور نوع لطیف سے نسبت زندگی ہے۔ لیکن اگر مشاہدات عالم کے افسانوں کو کان لگا کر سنا جائے تو ان میں حقیقت اور صداقت کی بھی کچھ جھلک پائی جاتی ہے۔ یہ کتاب روحانیات کے دلچسپ اور چشم دید واقعات پر مبنی ہے۔ دنیا میں جنوں کا وجود ہے یا نہیں۔ روحیں دنیا میں بلوائی جا سکتی ہیں یا نہیں۔ عامل کیونکر ان سے ہمسخن ہوتے ہیں۔ روحوں کو باوجود مجبور شکل و صورت ہونے کے بھی کیا کچھ قدرت اختیار ہے۔ یہ باتیں اس کتاب کے موضوع کا دلچسپ بحث ہیں۔ شیخ حسن کی دردناک داستان اور رشیدہ کا الم انگیز انجام اشکوں سے خراج ہمدردی وصول کرتا ہے۔ مصطفےٰ اور علی دونوں بھائیوں کا طبعی شعار اور رشد فطرت کے خاص خصائل کا مکمل نمونہ ہے۔ کتاب گو انگریزی کا حرف بحرف اور اسم بہ اسم ترجمہ ہے۔ لیکن مولانا سید ممتاز علی صاحب قبلہ کی جوہر قابلیت اور وسعت مطالعہ کا آئینہ ہے۔ اردو میں بہت کم ایسے ناول ہیں۔ چھپائی لکھائی معقول ہے۔ اور دار الاشاعت پنجاب لاہور سے ۱۲ر میں مل سکتی ہے +

سرور انبیاء مولوی الف دین صاحب وکیل کی بہترین تصنیف ہے۔ مصنف نے رسول اکرم نبی محترم صلوٰۃ اللہ علیہ وسلم کی مبارک زندگی کے سوانح کا نہایت شرح و بسط سے بیان کرنے کے ساتھ اس طرف بھی روشنی ڈالی ہے کہ جس نور نے اول فاران کی چوٹی سے طلوع کیا۔ وہ بعد میں کن کن منازل کو طے کرکے عرفات کی بلندیوں پر آفتاب رسالت ہو کر چمکا۔ ۵۷۰ء سے ۶۳۲ء تک کے عہد محترم کو زمانہ کے دور ماقبل پر کن خصوصیات سے فخر ہے۔ مسلمان امت وسطےٰ کہے جانے کے کیوں مستحق ہیں۔ امت وسطیٰ کو اور امم سابقہ پر ممتاز ہونے کے کیا وجوہ ہیں۔ وہ کونسی تعلیم الٰہی تھی جس کے عکس و پرتو کی برکت سے مسلمان صراط مستقیم اور جادۂ اعتدال پر لائے گئے۔ بعثت رسول کے وقت دنیائے پیشینہ کی بلحاظ مذہب و اخلاق۔ سیاست و معاشرت کیا حالت تھی۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آئین فطرت نے اسلامی قومیت کی بنیاد ڈال کر ان گم گشتگان بادیہ ضلالت کو کس طرح سلطنت و ایمان کا اہل بنا دیا۔

طرز تحریر بہت دلچسپ ہے۔ انداز بیان میں ادبیت کی شان ہے۔ ملا واحدی صاحب ایڈیٹر نظام المشائخ کی مساعی مشکور مستحق تحسین ہیں۔ جو اس کتاب کے مطالعہ کا دنیائے اسلام کو موقع دیا۔ چھپائی لکھائی معقول ہے۔ قیمت ۱۰ر دفتر نظام المشائخ سے ملتی ہے +

فغان مسلم ابو نعیم مولوی عبد الحکیم خانصاحب نشتر جالندھری کی وہ دلآویز نظم ہے جو اسلام کے سچے جذبات سے معمور اور نشۂ حریت سے چور ہونے کے ساتھ نشتر صاحب کے حب وطن سے سرشار دل کی بھی آئینہ ہے۔ دردمندان اسلام اس نظم سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جس کا اسلام اپنے شعراء سے متوقع ہے۔ نشتر صاحب شعر و سخن کی قابل قدر قدرت رکھتے ہیں اور حضرت "طبا طبائی" کے ممتاز شاگرد ہیں۔ اس کتاب کے اول میں مصنف کی تصویر اور ابو القاسم صاحب سیر امرتسری کے دیباچے کے بعد ہندوستان کے مشہور و معروف ارباب قلم کی رائے بھی ہے۔ جس نے اسے "مخزن" کی تعریف سے مستغنی کر دیا ہے + قیمت ۱۰ر مینیجر ایس کے عزیز اینڈ کو تاجران کتب جلقہ نمبر ۲۴۱ بیرون شیرانوالہ گیٹ لاہور سے مل سکتی ہے +

روایات اسلامی دردمندان اسلام کے بہت سے رشحات قلمی جو مختلف اوقات میں نظم یا نثر کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ مگر ملک کی ناقدردانی کی وجہ سے ان کا وجود عام افادہ سے معذور رہتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کا حسن سماعت اور شوق قبول اس کے قیام و ثبات کے لئے ایسے طریقہ کے کاربند نہیں ہوتے جو ان خوارق ادب کے بقا و دوام کا ذریعہ ہوں۔ منشی شیخ عبد الغفور صاحب کی مساعی مشکور مستحق داد ہیں کہ انھوں نے اس سرمایہ منتشر کو ایک جگہ مجتمع کرکے اور ہندوستانی کتب خانہ کے ذریعہ سے چھپوا کر عام جذبات اسلامی کو مفید تاثر سے آشنا ہونے کا موقع دیا۔ اس میں مولوی ظفر علی خانصاحب۔ ڈاکٹر اقبال صاحب اور علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی وہ مایہ ناز نظمیں ہیں۔ جو ملک سے ایک حد تک خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ شروع میں تینوں بزرگان قوم کی تصویریں ہیں + قیمت ۶ر۔ مشرقی کتب خانہ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مخزن

جلد ۲۱ نومبر ۱۹۲۱ء نمبر ۹۷

گوہر شب چراغ

جب کہ محبت کی عالم آشوبیاں ابھی عرصۂ ظہور میں نہیں آئی تھیں۔ فطرت کے لطیف جذبات نہاں خانۂ ازل میں اس طرح مستور تھے جس طرح ظلمت شب میں ہیئت اشیاء۔ بربط گیتی کی خاموش ہستی۔ اس مضراب کی منتظر تھی جس کی نازک اور غیر محسوس ضرب کائنات عالم میں لرزہ پیدا کر دے۔ اور ہر ذی روح کو نغمہ فروشی سکھا دے۔ گونج کی دیوی پیکار حیات سے مصئون سمندر کی گہرائیوں میں حکمراں تھی۔ لہر اس کی چین جبین کا عکس تھی۔ اور سکون آب اس کے خواب راحت کی تصویر۔ تمام آبی مخلوق فروغ حیات کے لئے۔ اس کی جنبش ابرو کی محتاج تھی۔ اور بطن صدف میں سکون پذیر در یتیم اس کے گوشہ چشم کا منتظر۔ وہ ساحل بساحل سرگرداں نہیں ہوئی تھی۔ وہ عالم وارفتگی میں پہاڑوں سے نہیں ٹکرائی تھی کیونکہ اس وقت تک مصلحت خداوندی نے صور محبت نہیں پھونکا تھا۔ زمین نہیں ہلی تھی۔ آسمان نہیں تھرایا تھا۔

تو ایک دیوتاؤں کا ہیبت ناک دربار منعقد ہوا جس میں ہر متنفس سر بزانو تھا بلکہ نقش بدیوار

گونج بھی اپنی اقلیم آب سے نکل کر شرف حضوری حاصل کر رہی تھی کہ ناگاہ خداوند جیو نو برافروختہ ہوا۔ کون جانتا ہے کہ مورد عتاب بننے کے لئے گونج سے کیا خطا سرزد ہوئی۔ بہرحال۔ خداوند جیونو کی آواز رعد کی طرح گرجی۔ اور صاعقہ بن کر گری۔ گونج کو حکم ہوا کہ جب تک لوگ نہ بولیں تو بھی لب کشائی نہ کر۔ اس پیکر لطافت پر یہ چند الفاظ پہاڑ بن کر گرے نطق خداداد میں خلل واقع ہوا۔ دنیائے تکلم پر وحشت خیز تاریکی چھاگئی۔ سخن کا شیرازہ پریشان ہو کر رہ گیا لیکن اس سکوت مجبور سے محبت کا چشمہ اُبل پڑا۔ گونج نارسسس پر فریفتہ ہوگئی۔ اور اس کے تقرب کو رشتۂ جاں کی بقا کا ضامن سمجھنے لگی عشق ناکام سرنوشت ازلی تھی۔ اس لئے رضائے الہی نے اس محبوب کی فطرت میں جذبۂ الفت ودیعت ہی نہ کیا۔ گونج کا خدنگ عشق نشانہ پر نہ بیٹھا۔ اور اس کے غم والم میں اس کے عناصر یہاں تک تحلیل ہوئے کہ آواز کے سوا۔ اس میں کچھ باقی نہیں رہا

اسی طرح میں بھی جب بیخودی کی پُرکیف رنگینیوں سے ناآشنا۔ زندگی کی بے لطف یکسانیت پر قائم تھا۔ تو میری اس خطائے اجتہادی کا کفارہ بھی یہی ہوسکتا تھا کہ اپنے عناصر کو کسی کی محبت میں گھلا کر ایک صدائے بازگشت بن جاؤں۔

مجھے اپنے سوانح عمر کا وہ خجلت آفریں باب یاد ہے کہ میری زندگی کا دامن تلاش عیش سے وابستہ تھا۔ میرا معیار زندگی۔ اس سے متجاوز نہ تھا۔ کہ ایک جسمانی آسودگی میسر ہوجائے۔ اور اسی گمراہی میں سکون روحانی کا بھی سراغ ملے طبیعت سبے چین نہ تھی۔ حوصلہ بلند نہ تھا۔ آہ۔ اس دور رسوائی میں اگر کوئی سیماب صفت انسان۔ واردات قلب کے مدوجزر کے متعلق مجھ سے کچھ پوچھ بیٹھتا۔ تو مجھ بے بضاعت کے پاس خاموشی کے سوا۔ اور کیا جواب تھا۔ کیفیت کی برودت اور احساس کے جمود کی اس سے بری مثال اور کیا ہوگی کہ آنکھیں کھلتی تھیں۔ مگر دیکھ نہ سکتی تھیں۔ کان میں سماعت کی قوت تھی۔ مگر حسن سماعت کہاں۔ دل دھڑکتا تھا۔ مگر زندہ نہ تھا یعنی زندگی کا حق ادا کرنے سے معذور تھا۔ نہ محبت کا تلاطم تھا۔ نہ خود فراموشی کا حجابہ۔ نہ جوش طبیعت کا منظر تھا۔ نہ بیخودی کا عالم۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی میں مجھے جینے کی خبر نہ تھی۔ میں اپنے ساز زندگی کو کیف اثر سے بیگانہ جان کر اکثر گھبرا جاتا تھا۔ میں اس فردائے بد کے تصور سے کانپ کانپ اٹھتا تھا۔ کہ نغمہ پرستان عدم کے سامنے میں خالی ہاتھ جاؤں گا۔ اور جب محفل کی محفل کہے گی کہ لا اپنا ہدیۂ ترنم پیش کر تو میں کیا

جواب دوں گا۔
جب مذاق سلیم میری بیکار ہموار زندگی پر ہنستا تھا تو میں غیرت اور رشک کے جذبات میں ڈوب کر وجود محمود کی جناب میں دعا کیا کرتا تھا کہ اے ملک قدم کے واحد فرمانروا۔ میری کیفیات خوابیدہ کو بیدار کر دے۔ آخر کردار کی زبونی خلوص نیت سے دب گئی۔ کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ میری بے گناہ دعائیں قبول ہوئیں۔ اور پردۂ غیب سے مجھ پر اس پیکر سعادت کا ظہور ہوا جس کی ہر کرشمہ طرازی پر میری تمام پوشیدہ حسیات رقص کرنے لگتی تھیں جس کی ہر نغمہ آموز صدا پر میری روحانی کیفیات مترنم ہو جاتی تھیں جس کی ہر جنبش سحرکار پر میری دماغی عشرتیں مستانہ وار جھومتی تھیں جس کی ہر ضرب لسانی پر زندان عناصر جنت الفردوس کی مسرتوں سے زیادہ خوشگوار ہو جاتا تھا۔ اور حیرت واستعجاب کے ان نازک لمحوں میں میری قوت فیصلہ عاجز ہو جاتی تھی کہ آخر اس سحاب رحمت کی پرستاری کروں یا اس کے رشحات کی میگساری۔
میں نے دیکھا۔ اور پہلے پہل دیکھا کہ عناصر کی چار دیواری کا ایک مکین تلخئ زیست اور لذت فنا کو اپنی ذات میں متحد کئے ہوئے ہے۔ ایک نظام دنیوی کا مزاجدان انسانیت کی تکمیل کا مظہر بنا ہوا ہے قفس تن کا ایک گرفتار جاودانی مسرتوں کے خزانہ پر مسلط ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے محسوس ہوا کہ اس جمال جہاں آرا کے شوق تماشا میں میری روح اور جسم کی تمام مخفی قوتیں آنکھوں میں جمع ہو جاتی ہیں۔ اور نگہ واپسیں پر رضامند ہونے سے پہلے دم واپسیں کی آرزومند بن جاتی ہیں جب قوت باصرہ مجھے اپنا فرض ادا کرتی ہوئی نظر آئی۔ تو آرزو کی جولانگاہ بھی بدل گئی۔ اور میں چاہنے لگا کہ اپنے تئیں یار کا نقش ثانی بناؤں۔ یہ جذبہ تقلید تھا جو دماغ سے اٹھا۔ اور میری دنیائے بشریت پر پھیل گیا۔ ان کی ہر حرکت جسمانی پر میرا وجدان روحانی عش عش کرتا تھا۔ اور میں بے ساختہ چاہتا تھا کہ اس حرکت کو اپنی ذات میں ودیعت پاؤں۔ یا اکتساب عملی سے ہی مفتخر ہو جاؤں۔ میں ہنگامی مفارقت کی تنہا ساعتوں میں اپنی کیفیت معتدل کو ان کے علوئے باطنی سے ٹکراتا تھا۔ گویا فرق مراتب کی تحقیق کیا کرتا تھا کہ وہ کہاں ہیں۔ اور میں کہاں ہوں۔ میں کبھی کبھی اپنی قوت خیال کو دلیل راہ بنا کر ان کے مرتفع مقامات پر جا پہنچتا تھا۔ لیکن یہ ایک زوال پذیر دولت تھی۔ جو اس قوت خیال کے گم ہوتے ہی زائل ہو جاتی تھی اور اس طرح میں اپنے آپ کو اس عشرت ذہنی کی بلندیوں سے گرتے ہوئے دیکھتا تھا جو مجھے مرمر کے

نصیب ہوتی تھی۔ فی الجملہ یہ دماغی عشرت اندوزیاں جو قصِ شرر سے زیادہ طویل نہ تھیں۔ صرف میری خیالی جد و جہد کا حسنِ عمل تھیں لیکن میرا منتہائے نظر اور وسیع ہو رہا تھا۔ میری چشمِ تمنا اس جوہرِ ذات کے لئے وقفِ انتظار تھی۔ جو مجھے سعیِ خیال کے بارِ احسان سے بھی سبکدوش کر دے۔ اور میں ہر حال میں اپنے نظامِ نفس کو انہی کیفیاتِ سرور کے ساتھ عناں در عناں جاتا ہوا دیکھوں۔

آہ انسانی خامکاریاں مزرعِ عمل کی پختگی سے پہلے ہی۔ اس کے ثمراتِ شیریں کی تمنا کرنے لگتی ہیں۔ میں بھی اسی جرم کا مجرم بن رہا تھا۔ میں اپنے مذاقِ عشق کی تکمیل سے پہلے اس کی خوشگوار لذتوں کا جویا تھا۔ مکتبِ الفت کے ایک مبتدی کو منتہی کی ہمہ دانیوں کا دعویٰ تھا۔ تقلید کے چکر سے نکل کر ابھی جذبِ ذات کے مقام میں قدم نہیں رکھا تھا اس پر بھی ان مسرور کیفیات کی تلاش تھی۔ جو فنائے ذات کے عالم میں بستی ہیں۔ وہ میرے ذوق کی الم خیز یکسانیت کا ماتم کر چکے تھے اب خوش طبعی کے جذبات کی بہار تھی کہ وہ مسکرا مسکرا بار بار یہ فقرہ زبانِ دل پر لاتے تھے۔ "دیکھیں محبت کے دورا ہے پر کھڑا ہوا۔ یہ سرسیمہ مسافر کس طرف کو جاتا ہے۔" لیکن قبل اس کے کہ ایک آشفتہ دماغ۔ غربت کی دل شکنی میں تڑپ تڑپ کر جان دے دے۔ انھوں نے اشارۃً تلقین کی میں بھی عملِ جذب میں اس اندھیرے گھر سے کچھ کم نہیں رہا جس کا ایک شعاعِ نور کے طفیل میں کونہ کونہ چمک اٹھتا ہے۔

میں اپنی عقیدت کی ابتدائی منزلیں طے کر رہا تھا کہ ایک دن آلامِ حیات سے تنگ آ کر میں نے اس سے عرض کی کہ:۔

"زندگی کو کامیاب بنانے کی اکثر فکر کرتا ہوں۔ اور لوازمِ عشرت فراہم کرنے کو اس کا ذریعہ جانتا ہوں لیکن دوسروں کو مرتے ہوئے دیکھ کر کبھی کبھی اپنی کتابِ زیست کے تمت پر بھی نظر جا پڑتی ہے۔ اور اس مقام پر میری آرزوئیں۔ اس طرح پر شکستہ ہو جاتی ہیں کہ مجھ میں جنبش کی سکت بھی باقی نہیں رہتی۔ کیا سکونِ قلب و جمعیتِ خاطر کو دائرہ حیات سے باہر قیاس کرنا چاہیئے؟"

ہر ہر لفظ پر گرہِ تبسم کھلتی رہی۔ اور بیش از بیش شگفتگی کا انکشاف ہوا۔ یہاں تک کہ اپنی تقریر کے خاتمہ پر میں نے محسوس کیا کہ جدت طراز دماغ پر شعریت کا اثر غالب ہو چلا ہے۔ فرمانے لگے۔

تمھارا مطمح نظر بلند ہے لیکن اس تک پہونچنے کے ذرائع پست اختیار کر رکھے ہیں۔ کتاب زیست کے خاتمہ پر نظر دوڑاتے ہوئے۔ جہاں تمھاری آرزوئیں پرشکستہ ہوتی ہیں۔ وہاں رفعت پرواز کی ضرورت ہے۔ کیونکہ عشرت ذہنی کا چشمہ وہیں سے اُبلتا ہے۔ پہلے اپنے منشائے حیات کو کسی ذات میں جذب ہو جانے دو۔ پہلے اپنے نقش مراد کو کسی نقش قدم پر نثار کر دو۔ اور اس ناقابل تغیر قانون الٰہی کو بھی یاد رکھو کہ ہم اللہ کے ہیں۔ اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے۔ پھر تم دیکھوگے۔ کہ تمھاری طبعی صلاحیت غم و الم کے گرد و غبار سے پاک ہو کر قرص آفتاب کی طرح چمکتی ہے اور بیم و رجا کی سیمابی کیفیت کی بجائے سکون و عافیت کا سماں بندھ جاتا ہے۔"

ازبسکہ مغلوب محبت تھا مجھے خیال تک نہ ہوا کہ اُن کا روئے سخن کونسی ذات کی طرف ہے میں یہی سمجھتا رہا۔ اور خوب سمجھتا رہا کہ وہ میرے نقش مدعا کو اپنے نقش قدم پر مٹتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں اور میں نے بھی ان کے اس غیر محدود کنایہ کو ان کی ذات کی طرف دعوت عمل تصور کر کے اپنے آپ کو ایسا مٹایا کہ نقش حبیب کے سوا اب کوئی نشان باقی نہیں۔ آہ۔ اُس حاصل عمر صحبت کے برہم ہو جانے کے بعد آج مجھے زندہ یا مردہ رکھنے کے لئے یقین کا اتنا سہارا کافی ہے کہ جنون محبت نے غلطی نہیں کی بلکہ ایسے صحیح راستے پر قدم اٹھایا جس سے گوش حق نیوش چشم حقیقت نما۔ اور دل صداقت آشنا بن گیا۔

ایک زمانہ وہ تھا کہ مسئلہ توحید میں تقلید کو تنگ خیالی اور کوتاہ نظری پر محمول کرتے ہوئے۔ میں نے متکلمین کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ اور میری اوقات ہمیشہ اسی اُدھیڑ بن میں گزرتی تھی۔ کہ وجود الٰہی کو اپنے ذہن میں دلائل و براہین سے مستحکم کر کے روحانی صعوبتوں سے نجات پا جاؤں۔ ایک دن میں نے ان سے عرض کی کہ :-

صفات کمال حکما کے نزدیک قدرت علم اور وجود ہے۔ یہ تینوں تمام ممکنات میں ذات سے علیحدہ ہیں اور جس کی ذات کی یہ تینوں چیزیں عین ہوں اسکو ہم واجب الوجود کہیں گے۔ میرا عقیدہ ہے کہ صفات کمال اس کی ذات کا عین ہوتی ہیں لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ صفات اور ذات کیونکر متحد ہو سکتی ہیں۔ پس یہ دلیل اس کا

ثبوت ہے کہ واجب الوجود کی ذات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی لیکن یہ امر کہ علم اس کا عین ذات ہے سہل طریقے سے معلوم ہوتا ہے۔ علم کے معنی لغت میں دانستن کے ہیں اور معقولات میں حاضر عند المدرک کو کہتے ہیں۔ تیسرے معنی مبدا انکشاف اشیاء پس اللہ تعالیٰ تیسرے معنی کے مطابق عین علم ہے یعنی اس کی ذات مبدا انکشاف اشیاء ہے۔ اس لئے میرے نزدیک میرا یہ عقیدہ کہ خدا کی صفات کمالی۔ اس کی ذات کا عین ہیں صحیح ہے۔ دوسری صفت وجود ہے۔ وجود تمام اشیاء میں زائد علی الذات ہوتا ہے۔ کیونکہ ذات اور چیز ہوتی ہے۔ اور وجود جس کے معنی ہستی کے ہیں دوسری چیز ہے۔ ذات دار عدم سے نکل کر ہستی میں آتی ہے۔ تب وہ موجود کہلاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وجود زائد ٹھہرا۔ اگر وجود کسی ذات کا عین ہو تو لازم آئے گا کہ اس کی ذات ہمیشہ سے ہو۔ کیونکہ ہستی جو عام طور پر تمام اشیاء پر مشتمل ہے ہمیشہ سے ہے۔ جب کوئی چیز معدوم ہوتی ہے۔ یا معدوم تھی۔ تب بھی ہستی اس کے عدم کی نفی۔ اس بنا پر ضروری ہوا کہ ہستی خدا کا عین ذات ہو۔ اگر عین ذات نہ ہوگی۔ تو مرتبۂ ذات میں اس کو وجود نہ ہوگا۔ اور یہ بالکل ناممکن ہے۔ پس لازم آیا کہ اللہ تعالیٰ کا وجود عین ذات ہو۔ اور وہ ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے۔ اور مخلوقات کا وجود ہمیشہ سے زائد علی الذات ہو۔ ورنہ پھر یہ ماننا پڑے گا کہ جو چیزیں نظر آتی ہیں۔ وہ بھی ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔

میرے خضر طریقت نے شفقت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اور بغیر توقف اس طرح تادیب شروع کر دی تجا دۂ عدم کے مسافر! بھٹکنا چھوڑ دے۔ خدا نہ کرے کہ تیری منزل کٹھن ہو جائے اور فطرت تیری رہنمائی سے اکتانے لگے۔ اگر تمھاری طبیعت کی افتاد یہی رہی اور یہی تمھارے خیالات کی گردش، تو یہاں سے بڑھ کر تم کو اہل مشاہدہ کے طریق پر گامزن ہونا پڑے گا۔ اور منزل پھر بھی بہت دور ہوگی۔ تم نے عمر بھر کی کاوشوں کے بعد اپنے لئے دلیلوں کا یہ گھروندہ بنایا۔ لیکن اگر کوئی برہان قاطع تمھاری آنکھوں کے سامنے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دے تو تمھارا کہاں ٹھکانا ہو اس وقت سہو ڈر کہ

کوئی تمھیں بے خانماں کر دینے پر تُل جائے۔ زندگی اتنی طویل نہیں ہے۔ کہ تمھاری ساری تدبیریں پوری ہو جائیں اور موت اتنی رحمدل نہیں ہے کہ تمھاری سب حجتیں تمام ہو جانے دے۔ دیکھنا ایسا نہ ہو کہ باب حیات بند ہو جائے۔ اور حریم یار سے تمھیں دور باش ہی کی صدا آتی رہے۔ لوہے کو آگ میں ڈال کر دیکھو اگرچہ وہ آگ میں پڑ کر اپنی ذات تبدیل نہیں کر سکے گا۔ تاہم آگ کے تمام خصائص کو ضرور جذب کرے گا۔ اسی عمل جاذب کو کیمیائے عمل سمجھو۔ کیونکہ اس کے بغیر تم نامحرم کہلاؤ گے۔ اور تمھاری سب کوششیں نقش بر آب ثابت ہوں گی"

زندگی کے تاریک سے تاریک پہلو پر آسمانی روشنی پڑ رہی تھی۔ ان کی ذات اس روشنی کا منبع اس نور کا مطلع۔ اس جلوہ کی تجلی گاہ تھی۔ تب ہی میں اپنے مدعائے حیات کو ان کی ایک موج تکلم پر قربان کر دینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔

متانت اُن کی طبیعت کا جوہر امتیاز تھی۔ اس لئے وہ ہمیشہ اسی کو ملحوظ رکھتے تھے کہتے ہیں کہ اس جوہر کی مشق پیہم سے زندگی کی کلفتوں میں کمی کی بجائے اضافہ ہوا کرتا ہے لیکن مجھے کبھی یاد نہیں کہ انھوں نے کسی صحبت یا اختلاط کے دوران میں اپنے عقیدتمندوں کو گراں خاطر ہونے دیا ہو۔ وہ اپنی طبعی اداشناسی کی مدد سے مقتضائے وقت پر نظر رکھتے ہوئے اپنی تقریر میں موقع بموقع پاکیزہ شوخیوں کی رنگ آمیزی کرتے رہتے تھے۔ وہ اپنی سنجیدہ طوالت کلام کا صحیح اندازہ کر کے سامعین کو چمن ظرافت کی مختصر سی گلگشت کرا دیتے تھے۔ اور اس طرح تھکتے ہوئے دماغوں میں جوش بہار پیدا کر کے پھر اپنے اصلی نقطۂ خیال پر لے آتے تھے خشک سے خشک موضوعات پر خوش طبعی کی وہ وہ شگرف کاریاں کر جاتے تھے کہ قوت ادراک جھومتی رہ جاتی تھی۔ آہ۔ محبوب کے فراق میں اس کی چھوٹی چھوٹی نشانیاں عزیز سے عزیز تر ہو جاتی ہیں۔ میرے عالم دل میں ان کی لطیف بذلہ سنجیاں خوارق ادب کی بے نظیر یادگاریں ہیں۔ جن میں میری ہست و بود کا راز مضمر ہے۔ ایک مرتبہ فلسفہ مناکحت پر گفتگو کرتے ہوئے میرے منہ سے جورج ایلیٹ کا یہ قول نکل گیا کہ مناکحت بھی گناہ کی ایک شکل ہے لیکن یہ ایسا گناہ ہے جس کو جائز کر لیا گیا ہے۔ کہنے کو تو میں کہہ گیا لیکن ان کا جواب سننے تک ڈرتا ہی رہا کہ نفس قدسی کے سامنے شیطان کے خیالات کی ترجمانی کر دی ہے لیکن میری حیرت کی کوئی

انتہا نہ رہی جب میں نے عتاب کی جگہ گل تبسم کھلتے دیکھا۔ کہنے لگے کہ :۔

وہ غلط کاریاں جو شرم و حیا کے پردے میں چھپنا چاہتی ہیں ہماری بشریت کا ثبوت ہیں۔ اور اس لئے شاید کبھی قابل عفو متصور ہوں۔ لیکن گناہ کی فخریہ تائید اتنا بڑا گناہ ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔ اس نکتہ کو سمجھ لو کہ مرد اور عورت نظم حیات کے دو موزوں مصرعے ہیں اور مناکحت ان کے ربط باہمی کا نام ہے۔ اگر ابدی ادبیت کے طلبگار ہو تو اس شعر مجسم کی تنقید پر اپنے آپ کو وقف کر دو لیکن اس بات کی بھی احتیاط رکھو کہ تمہارا ذوق روحانی تم پر اس درجہ محویت طاری نہ کر دے کہ مردانہ صحبتیں برہم ہو جائیں اور تمہارے تشنہ کام احباب کو شکایت کا موقع ملے

یہ دیار محبت کی آبادی کا زمانہ تھا۔ یہ الفت کی بستی میں ٹھنڈی ہواؤں کی فصل تھی۔ یہ چمنستان عشق میں شاہد گل کا عہد شباب تھا۔ اور ان سب نعمتوں کی بنا صرف یہ تھی کہ وہ میری تمناؤں کا مسکن۔ میری پریشانیوں کا مامن۔ میری امیدوں کا کاشانہ بن کر آئے تھے میں ان کے مقدس پیکر میں اپنی خوشیوں کی چھوٹی سی دنیا دیکھتا تھا۔ لوگوں کی زبانی سنا کرتا تھا کہ موت اولاد آدم کے بڑے بڑے طویل قصوں کو مختصر کر دیتی ہے لیکن جب میں اپنی محدود دلچسپیوں کی اس مختصر دنیا پر غور کرتا تھا تو میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ فرشتہ اجل میرے افسانے کو اور کہاں تک مختصر کرے گا حقیقت یہ ہے کہ اس فردوس ذہنی کی طویل سکونت میں رنج و مصیبت کی طرف سے میں بالکل بے خوف ہو گیا تھا میں نے گردش روزگار کے ہاتھ سے کوئی زخم نہیں کھایا تھا میں اس دشنہ خونیں کی جگر کاوی سے واقف نہ تھا جس کو آسودہ دل انسان انقلاب کہہ کر ٹال دیتے ہیں میں نے اس بھری دنیا میں اپنی طرف سے کسی ذی روح کو شکوہ سنجی کا موقع نہیں دیا۔ پھر میں نہیں جانتا کہ مجھ پر ان کے فراق دوام کی خوفناک مصیبت کس گناہ کی پاداش میں نازل ہوئی۔ مجھے قیامت سے پہلے قرب قیامت کے آثار نظر آ گئے تھے۔ کیونکہ اس مفارقت دائمی کے آغاز سے کچھ عرصہ پہلے ان کی حرکات و سکنات۔ ان کی گفتگو اور انداز گفتگو میں نمایاں تبدیلی واقع ہو گئی تھی ان کے دلپذیر اطوار میں وداع کی جھلک اس طرح رونما ہونے لگی تھی کہ مجھے بعض اوقات گمان ہو جاتا تھا کہ میرے متعلق شاید وہ اپنا فرض ادا کر چکے ہیں۔ اور اب ان کے جمال دلفروز کو کسی نئے آئینہ کی ضرورت ہے

اب ان کے الفاظ میں وہ ولولہ خیز فسوں کاری نہ تھی۔ وہ جان لطافت فردوسیت نہ تھی۔ جس سے روح کے کاشانے میں سرور و انبساط کی مجلسیں برپا رہتی تھیں۔ ان سب کی بجائے ان کے لفظ لفظ میں آنے والے فراق کی افسردہ تاثیر غالب تھی۔ اب وہ بات بات پر میری آزمائش کرتے تھے۔ اور حالات و واقعات کی صراحت سے مجھے کبھی کبھی یقین کرنا پڑتا تھا کہ اب میری خوش قسمتی کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلکا چاہتا ہے میں اپنے عطر زندگی کی آخری مشام انگیزیوں کے دن بسر کر رہا تھا کہ ایک روز بیٹھے بیٹھے انھوں نے یہ بے سلسلہ تقریر شروع کی۔

مجھے اس حقیقت کے انکشاف سے بہت صدمہ ہوگا کہ تم میرے اقوال و افعال کی بے سوچے سمجھے کورانہ تقلید کر رہے تھے۔ میں اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوں کہ محبت کی غیر مشروط متابعت ظالم کی کند تشدد سے بہت زیادہ نقصان رساں ہوتی ہے ظالم کے غلام کے لئے آس اور امید باقی ہے۔ لیکن محبت کا غلام بے پناہ ہے۔ محبت کمزور کو قوی بنانے کے لئے ضروری ہے۔ مگر یہی محبت اس وقت جلاد کہلاتی ہے۔ جب وہ ایک غیر معتقد کو اتباع کا حکم دیتی ہے۔

میں نے ان کے ارشاد کو ابھی پوری طرح نہیں سنا تھا کہ خیال کی یہ رو بجلی کی طرح میرے دماغ میں دوڑ گئی۔ کہ محبوب کی محبوبیاں آمادۂ امتحان ہیں۔ اور عشق جانفروش کو اپنا فرض ادا کرنا چاہئے جو کچھ میرے جی میں آیا۔ میں اس وقت کہہ گزرا۔ لیکن اس کے بعد جب میں نے اپنے الفاظ پر غور کیا تو مجھے اس احساس سے بڑی ندامت ہوئی کہ عرض ارادت کی بے اختیار کوشش میں گرمیٔ کلام کا ناخوشگوار عنصر خود بخود شامل ہو گیا۔

جس بہشتی پودے کی آپ نے برسوں آبیاری کی۔ اب اس کو اپنے ہاتھ سے اکھاڑنا چاہتے ہیں۔ یہ رنجور عشق کے واسطے ابتلائے عظیم ہے۔ محبت کا غلام ایسی سخت آزمائش کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میری کورانہ تقلید نے مجھے ابدی زندگی کی بہار دکھائی ہے۔ جس کے لئے میری احسانمندیاں لبریز تشکر رہیں گی۔ جب قسمت کی نامساعدت مجھ پر حملہ کرے گی تو میں آپ کی حریم محبت میں پناہ لے لوں گا زمانۂ ناساز گار کی مخالف ہوائیں میرے چراغ حیات پر چلیں گی تو میں اس پر

آپ کے دامن محبت کا سایہ کر دوں گا۔ اور جب ہر طرح مایوس ہوں گا تو خود برباد ہوتے ہوتے آپ کی محبت کو غیر فانی بنا جاؤں گا۔ جہان والے دنیا کی آرزو میں مرجاتے ہیں۔ میں آپ کے خیال کو سرمایۂ زیست بناتے ہوئے مٹ جاؤں گا موت کی نیند سوکران کے منہ پر دنیا برستی ہے لیکن مجھ پر سر سے پاؤں تک آپکی محبت برسے گی "

وہ میری التماس کو سن کر ایسے چپ ہوئے کہ پھر کچھ نہ کہا لیکن ان کے سکوت متکلم سے اطمینان مترشح تھا۔ اور وہ نگاہیں۔ جو تھوڑی دیر پہلے تجسس نظر آرہی تھیں اب خوشی کے پھول برسا رہی تھیں۔ ان کی خاموشی سے وہی طمانیت ٹپک رہی تھی۔ جو ہر محنتی انسان کو اپنی کوششیں بار آور ہوتے دیکھ کر نصیب ہوتی ہے۔

جو فوق العادہ ہستی میرے مقاصد و مطالب کو ایک شیرازے میں منضبط کئے ہوئے تھی اس کی جدائی سے میرے نظام حیات میں ہلچل پڑ گئی۔ جو میری آرزوؤں کے قافلہ کو کشاں کشاں لے جاتا تھا۔ میں اس قافلہ سالار سے بچھڑ گیا۔ اور اس پسماندۂ کارواں کی طرح جو اپنے ہم سفروں سے چھوٹ کر صحرا بہ صحرا بھٹکتا ہے۔ میں بھی اپنی اس مختصر دنیا سے آوارہ ہو کر جہاں خراب کی وسعتوں کا قائل ہو گیا ہوں۔ اور قدم قدم پر خاک چھانتا پھرتا ہوں۔ دن اور رات کے پُر شورش و پُر سکون گھنٹوں میں بربط کائنات سے مغموم نغمے نکلتے ہیں۔ اور ان کو سن سن کر میرے جسم خاکی کا ایک ایک ذرہ اس طرح تحلیل ہونے لگتا ہے جس طرح سطح آب پر حباب۔ آہ سے

جھلملاتے ہوئے تاروں میں یہ سنتا ہوں صدا - رونے والے میں ترے پاس ہوں کچھ دور نہیں

حیرت اندیشہ اُن کی سپاس گزار ہے۔ اور بیخودی ان کی روشناس۔ ہر چند ان کے حسن عمل کی ضیا باریوں سے سپہر بلند پر چاند کا چہرہ فق ہو جاتا ہے۔ اور مجھ آوارۂ ہستی کی تاریک راتیں منور ہو جاتی ہیں لیکن ان کی جاذب شخصیت کا فراق میرے لئے سوہان روح بننے میں کبھی دریغ نہیں کرتا جس دن مجھے صبر آگیا سمجھ لوں گا کہ میری حیات مستعار کی کارفرمائیاں ٹھکانے سے لگ چکی ہیں۔ اور اب وہ جرس کارواں یعنی وہ صدائے بازگشت بھی ناپید ہو چکی ہے۔ جو میری نگین حیات کا نقش امتیاز تھی +

سرفراز حسین بی۔اے (علیگ)

آئینۂ دِل

بچپن کے جذبات۔ گویا ساحلِ دریا پر چھوٹی چھوٹی ہلکی ہلکی سی لہریں ہیں جہاں ننھے ننھے ننگے پاؤں سیپیوں کی تلاش میں ریت کی باریک اور نفیس سلوٹوں کو ایک معصوم بے پروائی سے مسل دیتے ہیں۔ جہاں کا طوفان قہقہوں اور پانی کے چھینٹوں سے زیادہ نہیں ہوتا۔

گویا ایک خوشنما نازک بربط جس کو اب تک کسی انسانی ہاتھ نے نہیں چھوا۔ اور جو ایک درخت کے سائے کے نیچے تنہا پڑا ہے جس کا زیر و بم لاابالیانہ تاروں اور پردوں میں کہیں بکھرا پڑا ہے۔ ہوا کے جھونکے اس کو کبھی کبھی گدگدا دیتے ہیں۔ اور اس میں سے ایک خندۂ آزاد۔ ایک بے ترتیب سا نغمہ یوں بے اختیار ہو کر فضا میں سے نکل جاتا ہے جیسے کسی بادرفتار پری کے پازیب کی جھنکار۔

اُٹھتی جوانی کا عالم مجھے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے ایک دریا۔ جس کی گہرائیوں کے تلاطم پر سطحی سکون بے خبر سا مسکرا رہا ہے جس کے اعماق کی تاریکیوں میں لہریں اٹھتی ہیں۔ اور سطح کو چھیڑ کر واپس ڈوب جاتی ہیں۔ جہاں ایک تلاطم پنہاں ہے۔ اور ایک محشر فروائی۔

جیسے بربط ایک ہنرمند مغنی کے ہاتھوں میں ہے ہر ایک تار ایک شدید انتظار سے کسا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نغمے اپنی ہنسی کو روکے ہوئے منتظر کھڑے ہیں۔ اور مضراب کو ناتمام نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

اس وقت کی حالت نہ پوچھ۔ جب عشق کا بلاخیز طوفان روئے دریا اور قعرِ دریا کو ایک کر دیتا ہے۔ جب غرقابی کی لہر ہر کشتی اور ہر تیراک کو پستی سے بلندی۔ اور بلندی سے پھر پستی تک یوں دھکیل کرلے جاتی ہے۔ جیسے قہر خداوندی۔ جہاں ہر ایک بھنور طاقتور سے طاقتور انسان کو اپنی طرف یوں کھینچ لیتا ہے۔ جیسے قسمت کی مجبوری۔

بربطِ ہستی کے تار تار میں تھرتھراہٹ کا ایک ہنگامہ ہوتا ہے۔ دلخراش نغمے بگولوں کی طرح چکر کھاتے ہوئے اٹھتے ہیں۔ اور اپنی سر چکرا دینے والی تیزی میں زیر و بم کو تنکوں کی طرح لپیٹے لئے جاتے ہیں۔ ہوش و حواس سروں کے ہجوم میں کہیں غائب ہو جاتے ہیں۔ اور ایک دل چیرنے والے سرود مد ایک نشیلے شور کے سوا۔ اور کچھ محسوس نہیں ہوتا۔

آہ۔ مگر جب دریا اپنے کناروں کی حدود کو توڑ کر اپنے جوشِ ہستی میں آوارہ ہو جاتا ہے۔ جب اس کی لہریں ایک بے معنی تلاش میں کوسوں تک نکل کر ہلکی پڑ جاتی ہیں۔ تو اس کا دم ٹوٹ جاتا ہے، بے رحم زمین قطرہ قطرہ کر کے اس کو چوس لیتی ہے۔ اس کا طوفان بس ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی روانی لنگ رہ جاتی ہے۔ اور آخر کار اس کا پانی سوکھ جاتا ہے۔ پھر وہاں موجۂ ریگ کے سوا۔ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ بحر جب بحر نہیں رہتا۔ تو بیابان ہو جاتا ہے۔ اور ایک ویران سنسان۔ ایک بھیانک وحشت کے سوا۔ اور کچھ نہیں ہوتا۔

گیت کی دردناک لے جب تاروں میں ایک بیقراری۔ ایک وجد کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے جب سر اپنی جان سے بیزار ہو کر بے حجابانہ اور بے تابانہ ایک دوسرے سے سر ٹکراتے ہیں جب بربط کی جانِ نازک اپنی بساط سے بڑھ کر چیخ اٹھتی ہے۔ تو اس کے تار ٹوٹ جاتے ہیں شکستگی نغموں کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ پھر وہ بربط۔ بربط نہیں رہتا۔ بلکہ فنا کا ایک خاموش نوحۂ ماتم ہو جاتا ہے۔

"یہ ہے عشق کی نامرادی"۔

پطرس

بادلوں کی زمین

فضائے ہند میں ہر سمت برپا ہے طلسم اس کا
ہمالہ کی پری کہتے ہیں پر "سم لا" ہے اسم اس کا

پہاڑوں سے ڈھلا ہے گود میں بادل کی جسم اس کا
لباس اس کا ہے سبزہ اور چٹانیں اس کا ہیں زیور

پرا باندھے ہوئے فوجیں کھڑی ہیں کوہساروں کی
ادائے خاروانہ ہے صفوں میں دیوداروں کی

جھپکتی ہے نظر یاں آدمی سے خود ستاروں کی
مزاج حکمرانی پرورش پاتا ہے شملے پر

(سید ہاشمی فرید آبادی از عثمانیہ یونیورسٹی)

اسرار محبت

چاندنی ہر طرف چھٹکی ہوئی ہے۔ تارے اپنی مدھم روشنیاں شب ماہ کے پھیلے ہوئے نور میں جذب کر رہے ہیں۔ چمن کا پتہ پتہ۔ ڈالی ڈالی زریں لباس میں ملبوس ہے۔ کھلے ہوئے پھول۔ اور خوبصورت کلیاں ایک جلوہ بہار سے معمور ہیں۔ روشوں پر۔ کیاریوں میں چمن کے اندر بنی ہوئی گول گول دلفریب شہ نشینوں پر فاروق آہستہ آہستہ گھومتا رہا۔ کبھی سایۂ گل کی مؤثر کشش باطنی سے رکا۔ کبھی کسی پھول کی رعنائی نے دامن پکڑ لیا۔ ایک گہرے تخیل میں غرق۔ ایک عمیق تصور میں ڈوبا ہوا فاروق ٹہل رہا ہے۔ وقت کے گزر جانے کی۔ رات کے ختم ہونے کی۔ اور اپنی حالت اضطراب کی کچھ خبر نہیں۔ اس عالم محویت۔ اس استغراق وسیع میں ایک روش پر مڑ لیا۔ اور گھوم کر وسط چمن میں بچھی ہوئی ایک آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔ روشن و تاباں چاند اپنا سیلاب نور چمن کی طرف بہاتا رہا۔ چاندنی نے دامنوں سے لپٹ لپٹ کر قدموں پر گر گر کر اپنی زرافشانیاں دکھائیں۔ فضا نے غضب کی دلکشی و دلآرائی سے مرصع ہو کر قلب بیتاب کو ادھر کھینچنا چاہا۔ مگر آہ! قدرت کی یہ دلفریبیاں۔ فضاء بسیط کے یہ خوشنما مناظر ایک نامراد دل کی نشترکاریوں۔ ایک افسردہ عاشق بیتاب کے اسرار سے بے خبر تھے۔ کون بتا سکتا تھا۔ کس کی نکتہ رسی دقائق محبت کے نقاب اٹھا سکتی تھی کہ کشتگان محبت کی حسرت نصیبیاں کس آرزومندی کی طالب ہوا کرتی ہیں۔ اور ان کی ایک وارفتگی کس درجہ نشاط افروز حیرت بن کر ارباب بصیرت کو دعوت اضطراب دیتی ہے۔ چاند کی مضطرب اور لرزاں شعاعیں برابر پڑ رہی تھیں۔ خوشگوار ہوا کے مہکتے ہوئے جھونکے آ آ کے دماغ میں فرحت بخش اثرات پیدا کر رہے تھے۔ کہ ملحقہ کوٹھی کے برآمدہ میں دفعتاً ایک بجلی چمکی شمعیں جھلملا گئیں۔ اور منظر میں ایک رنگینی پیدا ہو گئی۔ نوشابہ نشۂ حسن میں ڈوبی ہوئی نوشابہ ایک فتنہ خیز اور مست چال کے ساتھ آتی ہوئی دکھائی دی۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ کائنات مسکرا رہی ہے۔

ایک ہجراں نصیب قلب کے لئے یہ ناگہانی آفت۔ یہ بلاخیز رعنائی جمال۔ کیا کچھ سامان

غارت گری کی حائل نہ تھی جو فاروق ضبط کر سکتا۔

زہائی ساری میں نوشابہ کا نازک اور خوبصورت جسم ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سبز فانوس میں شمع کا نوری روشن ہے۔ بے اختیار جی چاہا کہ پوری قوت کے ساتھ سینے سے لپٹا لے۔ مگر رعب حسن سے جرأت نہ ہوئی۔ سینے میں جوش تھا۔ مگر جسم میں رعشہ۔ دل میں امنگ تھی لیکن خدا جانے کیوں پس و پیش طبیعت کے ولولہ سے اٹھا۔ مگر پاؤں میں لغزش زنجیر پا بن گئی۔

نوشابہ نے برابر کے پیڑ سے ایک گلاب کا پھول توڑا۔ اور ایک لفظ کہے بغیر اس کو توڑ کر فاروق کے آگے ڈال دیا۔ ایک ایک پتی آن کی آن میں منتشر ہو گئی۔ فاروق اس ستم زدگی۔ اس ادائے دلنواز کی تاب نہ لا سکا۔ اور ایک آہ کے ساتھ کھڑا ہو کر بے ہوش گر پڑا۔ یہ وقت بہت نازک تھا۔ تنہائی کا عالم۔ رات کا سناٹا۔ اور ہر طرف چھایا ہوا سکوت! پھر فاروق کا بیہوش ہو کر اس انداز و یاس سے گرنا۔ نوشابہ گھبرا سی گئی۔ اور ایک اضطراب کے ساتھ "اللہ کیا کروں" "یہ کیا ہو گیا!" کہہ کر اٹھی اور اُٹھ کر فاروق کے پاس آئی۔ سر اپنے زانو پر رکھ کر عجیب گھبراہٹ اور بے چینی کے ساتھ دامن سے ہوا دینے لگی۔ اور ساتھ ہی چشم غزالین سے چند قطرات اشک محبت کے عطر میں ڈوبے ہوئے نکل کر فاروق کے چہرے پر گرے۔

دامن محبوب کی ہوا۔ اور چشم ناز کے آنسوؤں کے قطرے کس کا نصیب ہے جو میسر ہوں۔ بخت و اتفاق کی خوبی و رہبری تھی۔ جو برسوں کی تڑپ اور سوزش قلبی کے بعد آج اس طرح یہ نشاط افروز موقع حاصل ہو گیا۔ مریض عشق نے آنکھیں کھول دیں۔ دامن نازکی ہوا۔ اور چشم محبوب کے آنسو گلاب و عنبر بن گئے۔ نئی طاقت جسم ناتوان میں عود کر آئی۔ فاروق کو ہوش آنا تھا کہ نوشابہ فوراً اُٹھ کر کرسی پر جا بیٹھی۔ ادھر یہ بیمار الم بھی سنبھلا۔ اور سنبھل کر کرسی پر لیٹ گیا۔ چاہتا تھا کہ کچھ کہے۔ مگر زبان نے یاری نہ کی۔ اور دل کے شعلے زبان تک نہ آسکے مہکتی ہوئی ہوائیں آئیں اور چلی گئیں۔ نیم شگفتہ غنچوں کی نکہت نے آ آ کر اٹھکیلیاں کیں اور ختم ہو گئیں۔ مگر دو تڑپتے ہوئے دلوں کے تلاطم اور جوش محبت میں نہ جانے کیا کیفیت چھا گئی تھی کہ دیر تک کوئی زبان نہ کھلی۔ آخر فاروق سے نہ رہا گیا۔ پیمانہ صبر و ضبط چھلک اُٹھا۔ اور ایک حسرت انداز لہجے میں کہنے لگا:-

پیاری نوشابہ! ظلم و جور کی کوئی حد؟ عتاب و غارتگری کا کوئی معیار؟ آخر کب تک

ستاؤ گی۔ کہاں تک کرب و الم میں تڑپتا رہوں کیا ابھی ستم و تعدی کا ارمان باقی ہے؟ کیا ابھی جان حزیں پر قہر کی اور بجلیاں توڑنی ہیں۔ اچھا تیار ہوں۔ یہ سر حاضر ہے۔ اٹھو۔ اور ایک دلدادۂ ناز کا کام تمام کردو!"

نوشابہ نے ہیجان محبت کو ضبط کر کے جواب دیا:۔ کیا میں ظالم ہوں؟ اور اگر ظالم ہوں تو مجھ سے ادعائے محبت غلط! محبت مہربانوں سے۔ لطف و لینت برتنے والوں سے کی جاتی ہے۔ نہ کہ ظالموں سے! بہتر ہوا کہ تمھارے الفاظ نے تمھارے غم گشتہ محبت دل کی ترجمانی کر دی۔ ورنہ ضرور تھا کہ اس بہترین فرصت میں میرا قلب معصوم فریب کھا جاتا۔ اور ایک سادہ جذبات ہستی برباد ہو کر رہ جاتی۔

فاروق اپنی گل اندام محبوبہ کی زبان سے یہ ریمارک سن کر بیتاب ہو گیا۔ اور مخاطب ہو کر کہنے لگا:۔

ناممکن ہے کہ میں تمھارے جور پیہم۔ تمھاری مسلسل ستم آرائیوں سے اپنے الفاظ بزنگو ل تین برس کا طویل زمانہ کچھ کم مدت نہیں ہوتی۔ ہجر کی ایک ایک رات کاٹنا کوہ کندن اور کاہ برآوردن ہوتا ہے۔ مجھ حرماں نصیب نے تو آہ مر مر کر۔ تڑپ تڑپ کر نہ جانے کس طرح یہ زمانہ گزارا۔ اور کیونکہ اب تک زندگی کی کڑیاں جڑی رہیں۔ تمھارے ایک اشارۂ ناز۔ تمھارے ایک ایما حسن میں میری اذیتوں کی فنائیت کا راز مضمر تھا۔ مگر اے بہوشان ستم شعار۔ آہ! تمھارا کام نہیں۔ بلکہ ایک مشغلۂ تفریح ہوتا ہے کہ غم نصیب عشاق پر قہر کے پہاڑ توڑو۔ اور جب تک وہ جل کر مشت خاک نہ ہو جائے دم نہ لو۔ اللہ ہماری فریادیں سننے والا اور تمھارے جور دیکھنے والا ہے"!

یہاں تک پہنچکر فاروق کی آواز رُک گئی۔ آنسوؤں کا دریا بہنے لگا۔ اور فرط بیتابی سے ایک لفظ زبان سے نہ نکل سکا۔ چاندنی اسی طرح چھٹکی ہوئی تھی۔ ہوا کے جھونکے اسی طرح چل رہے تھے۔ نوشابہ کی مخمور جوانی بھی اب مچل گئی۔ اس کا اضطراب بھی بڑھ گیا۔ اور ایک ادائے بے خودی کے ساتھ کرسی سے اٹھی۔ اور ایک حرف کہے بغیر حسرت اندوز فاروق کی گردن میں گوری گوری نازک باہیں حمائل کر دیں۔ منور چاند کی شعاعیں تڑپنے لگیں۔ دونوں فرقت زدہ قلب جوش محبت سے لبریز ہو گئے اور تھوڑی دیر بعد دیکھا گیا کہ فضاء بسیط کا ہر ذرہ۔ اور کائنات ارضی کا ہر ریزہ ایک نئے دلفریب

رنگ میں جلوہ گر ہے۔ اقرار محبت ہو چکا ہے۔ اور نوشابہ کے نازک نازک پیارے رخسار بے بھی آنسوؤں کی تمنا کی کاز اہد فریب اور جذب انگیز منظر پیش کر رہے ہیں۔ اتنے میں کچھ حرکت ہوتی ہے۔ نوشابہ کھڑی ہو جاتی ہے۔ اور قلب آرزومند پہ ہاتھ رکھ کر ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں لیتے ہوئے کہتی ہے:۔

"پیارے فاروق! تمھاری محبت اور مجھے نہ ہو۔ ناممکن! محال!! رگ رگ میں تمھاری شیفتگی بسی ہوئی ہے۔ خون کے ذرہ ذرہ میں تمھاری الفت آرائی کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ روح مضطرب اگر جسم میں باقی رہ گئی ہے۔ تو تمھاری فداکاری کی تمنا میں۔ اور جان حزیں اگر رہ گئی ہے۔ تو تمھاری پذیرائی کے لیے۔!!

تمھیں اختیار ہے کہ آہ! مجھ ناآشنائے راحت کو بیوفا کہو یا سرد مہر، ستمگر پکارو کہ جفا جو!! مگر میں بتا دینا چاہتی ہوں کہ میرے سینہ زار محبت میں ایک عورت کا دل ہے۔ جو اسرار عشق۔ اور رموز شیفتگی کا ازل سے جلوہ گاہ آرزو رہا ہے جس میں محبت و دلداری کے لطیف جذبات ہمیشہ متلاطم نظر آئے ہیں۔ فرق ہے تو اتنا کہ محبت کی چنگاریاں عشق و موالفت کی بیتابیاں ہم انتہائی ضبط اور امکانی قوت کے ساتھ نہاںخانہ دل میں مرکوز و مستتر رکھتے ہیں۔ بے اختیاری کا ذکر نہیں اگر خاکستر بھی ہو جائیں۔ مٹ بھی جائیں۔ مگر واشگافی اور راز داری کو ہمیشہ شیوۂ عمل قرار دیتے ہیں شمع کی طرح گھل گھل کر فنا ہونا۔ اور پھول کی مثال خموشی و سکوت کے ساتھ جان دینا گوارا ہوتا ہے۔ اور نہیں پسند کرتے کہ بلبل کی نالہ زاریاں یا پروانہ کی اضطراب افروزیاں دنیا کو دکھلائیں۔ ہزاروں مثالیں مل سکتی ہیں کہ ہم نے محبت کے بیتاب شعلوں کو سینہ سے لگایا۔ اور کنج عزلت میں ایک تڑپ کے ساتھ جان نثار کر دی۔ مگر آہ! اے دعوے داران محبت میں تمھارے جذبات کی صداقت کی تنقیص نہیں کرتی۔ مگر اتنا کہنے اور بتلا دینے کی ضرور ایک لطف اندوز جرأت کرتی ہوں کہ تم نے ہمارے دردمندانہ ضبط اور مستتر حرم صبر کا نام ظلم و ستم آرائی رکھ لیا ہے۔ اور یہ وہی خوشنما جرم ہے جس کا مجرم سوختنی تم مجھے قرار دے چکے ہو۔ ورنہ صنف نازک کے دل مضطرب کا خمیر عشق و محبت سے اٹھایا گیا ہے۔ وہ ایک نگاہ محبت پر اپنی جان۔ اپنی آسائش۔ حتیٰ کہ اپنی تمام زندگی قربان کر دینے کو ہر وقت آمادہ رہتی ہے۔ اس کے دل میں جذبات رنگین کا ایک دریائے نور بہا

کرتا ہے۔ یہ حقیقت آرائی کا ایک لطیف نکتہ تھا۔ جو میں نے تمہاری آرزومندیوں۔ تمہاری نشتر کاریوں کے آگے رکھ دیا۔ اجازت دو تو اسی فرصت عجیب میں اپنے قلب بسمل کے چند مجروح ٹکڑے بھی تمہارے سامنے نکال کر رکھ دوں۔ اور پھر دکھاؤں کہ محبت کے خونچکاں زخم اور عشق کے زہر میں بجھے ہوئے تیروں کے پیکان ایسے ہوا کرتے ہیں۔ مٹنے اور ہٹانے کے رمز۔ تڑپنے اور جلنے کی سرشاریاں۔ کوئی ان دلوں کی اضطراب آرائیوں سے پوچھے۔ بہرکیف میں آپ کی وارفتۂ محبت کنیز ہوں۔ اور تم سے زیادہ تمہاری شیفتہ!

پیارے! اس چھٹکی ہوئی چاندنی کے ہر ریزۂ نور کو۔ اس پھیلی ہوئی فضا کے ہر ذرہ کو میں اپنی خلوص محبت اور صداقت اضطراب پر شاہد بناتی ہوں۔ اور بتائے جاتی ہوں کہ اب اگر زندہ ہوں تو تمہاری پرستش محبت کے لئے۔ اور سانس لیتی ہوں تو تمہاری آرزومندیوں کی خاطر!

ع خدا محفوظ رکھے عشق کے جذبات کامل سے

شریف احمد مرادؔ

طلسم فنا

اے طلسم فنا کی نیرنگی — اک نظر ہم سے بدنصیبوں پر
عالم زیست اک قیامت ہے — اللہ اللہ وعدۂ محشر
چشم عبرت میں تاب ضبط کہاں — ذرّہ ذرّہ میں ہیں نہاں نشتر

ہائے فصل بہار کی آمد — ہے وہ دلفریبی منظر
ہائے وہ بلبلوں کی عمر رواں — اشک ریز اپنی فانی ہستی پر
ہائے گہوارۂ مسرت و عیش — وائے فرش زمین و خاک بسر
زندگی ہے حباب کا عالم — کس طرف دیکھے کوئی جی بھر کر

اب تمنا یہی ہے۔ اے نکہت
چل بسوں میں بھی بوئے گل بن کر

لہ حباب — نکہت شاہجہانپوری

جھُوٹ

انسانی دماغ کی کاوشوں کا وہ بہترین نتیجہ جسے لوگ "جھوٹ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ایک ایسا لفظ ہے جس کے نام سے نفرت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ اور جس کی برائیوں سے اخلاق کی کتابیں سیاہ ہیں۔

شاید انسان کا فطری تقاضا ہے کہ وہ دھوکا دینے والوں کو پسند کرے۔ کیونکہ اگر اسے کوئی بھی دھوکا نہ دے۔ تو وہ اپنے آپ کو ایک زندہ فریب میں مبتلا کر لیتا ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ برے سے برا شخص بھی چاہتا ہے کہ دوسرے لوگ اسے اچھا سمجھیں یا کم از کم اچھا کہیں۔ اور جب وہ اس خواہش کی تکمیل سے مایوس ہو جاتا ہے تو اپنی برائیوں کے علم کے باوجود اپنے آپ کو نیک سمجھنے کی کوشش کرتا ہے یعنی جب وہ دوسروں کو جھوٹ بولنے پر آمادہ نہیں کر سکتا تو خود جھوٹ بولتا ہے۔ مگر اس حقیقت سے آشنا ہونے سے گریز کرتا ہے۔

لوگ جھوٹ بولتے ہیں جھوٹ سننا پسند کرتے ہیں۔ مگر جھوٹ کو برا کہتے ہیں۔

جھوٹ حقیقت میں راستی کی برتری کی سب سے مضبوط دلیل ہے۔ ایک کامیاب جھوٹ وہی ہے۔ جو بالکل سچ معلوم دے۔ یعنی جھوٹ کہنے والے کا منتہائے نظر راستی اور صرف راستی ہی ہو سکتا ہے۔ جو شخص اس طرح جھوٹ نہیں بول سکتا کہ وہ سچ معلوم ہو۔ وہ اس فن کے اعتبار سے صرف ایک مبتدی ہے۔ جو بات جھوٹی معلوم ہو۔ حقیقت میں جھوٹ کی خصوصیات سے عاری ہے

میں دیکھتا ہوں کہ جھوٹ کئی مشکلات کا حل ہے۔ اور ہر سمجھدار انسان وقتاً فوقتاً اس سے مدد لیتا ہے۔ اگرچہ وہ اسے اس کے اصلی نام سے موسوم کرنے سے احتراز کرتا ہے۔ یہ بھی ایک ہنر ہے۔ جھوٹ ادب میں صنعت اور سیاسیات میں تدبیر کے معزز ناموں سے پکارا جاتا ہے مگر یہ تبدیلی اصل میں کسی قسم کا تغیر پیدا نہیں کرتی۔

جھوٹ کو محبت سے ایک ازلی مناسبت ہے۔ اگر محبت کرنے والا محبوب کو ویسا ہی سمجھے

جیسا کہ حقیقت میں وہ ہو۔ یا محبوب اپنے محبت کرنے والے سے اپنے حسن کی اسی قدر تعریف سننا پسند کرے جس قدر اس کا جائز حق ہے تو ظاہر ہے کہ دونوں کی شخصیت میں کوئی ایسی خصوصیت پیدا نہ ہوگی۔ جو ان دونوں کو ایک دوسرے کی نظر میں باقی کے تمام انسانوں سے ممتاز کر دے

انسان جھوٹ صرف اسی شخص کے لئے بولتا ہے جس کا اسے پاس ہو۔ میں نے کبھی کسی شخص کو کسی ایسے شخص کے لئے جھوٹ بولتے نہیں دیکھا جس کی رضامندی یا ناراضگی اس کے لئے کوئی معنی نہ رکھتی ہو۔ یعنی جھوٹ فقط دوسروں کی خوشنودی اور دلجوئی کے لئے بولا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک نیک مقصد ہے۔ شادی کے بعد ایک مرد اور عورت کی زندگی کی خوشی اسی نسبت سے یقینی ہو سکتی ہے جس نسبت سے وہ جھوٹ کے فن میں ماہر ہوں۔ کوئی عورت ان تمام آزمائشوں کی کیفیت سن کر خوش نہ ہوگی جن میں ایک مرد کے اخلاق چار و ناچار مبتلا ہو جاتے ہیں۔

سب سے کامیاب شاعر وہی ہے جو تخیل کو سب سے زیادہ خوبصورت جھوٹ کہنا سکھا سکتا ہے۔ بچہ جو فطرت کی معصومیت کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ صرف ایک جھوٹی دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے۔ شاذ و نادر ہی دیکھا جاتا ہے کہ اس کی نظر اور اس کا دماغ ایک ہی چیز کی ماہیت۔ اور ظاہری کیفیت کے متعلق متفق الرائے ہوں۔ ایک معمولی لکڑی کو ایک تیز رفتار گھوڑا سمجھ لینا۔ اگر جھوٹ نہیں تو اور کیا ہے۔ عقلمند سے عقلمند انسان کے دماغ میں عالم طفلی کی یہ خصوصیت زندہ رہتی ہے۔ اور عمر کی زیادتی کے ساتھ ترقی کرتی جاتی ہے۔

ہر پُراسرار یا انسانی عقل سے بالاتر کیفیت پر یقین لانے کی کوشش کرنے کا شوق اسی محبت کی دلیل ہے۔ جو انسانی اعتماد کو فطرتاً جھوٹ سے وابستہ رکھتی ہے۔

جھوٹ پر یقین لے آنا اس قدر مشکل نہیں جس قدر جھوٹ کہنا مشکل ہے۔ اس لئے بہت سے لوگ جو شاید اس فن کو ارادی طور پر اختیار کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اس فن کی تربیت میں اہل فن سے کم حصہ نہیں لیتے۔

جھوٹ کیلئے قوت حافظہ کی توانائی ضروری ہے۔ اور اگر قوت استعمال سے نشو و نما پا سکتی ہو تو یقیناً جھوٹ قوت حافظہ کی مشق کے لئے وسیع مواقع پیدا کرنے کا اہل ہے۔

کامیابی سے جھوٹ بولنے کے لئے ضروری ہے کہ جھوٹ بولنے والا تقریر میں اختصار سے کام لے۔ کلام کی طوالت ہمیشہ بہت سی اندرونی کیفیتوں کی خفاشی کر دیتی ہے۔

یہ مضمون بھی جھوٹ کی روایتی خصوصیتوں کو مدنظر رکھ کر مختصر ہونا چاہئے۔ مگر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ میرا اس تحریر سے منشا نہ جھوٹ کی تعریف ہے۔ نہ اس کی توہین۔ صرف جھوٹ کے متعلق چند سچی باتیں لکھنے کا ارادہ تھا۔ جو شاید پورا ہو گیا +

احمد شجاع

ناکامِ تمنا

سجن سکارے جائیں گے نین مرینگے روئے　　بدھنا ایسی رین کر و کہ بھور کبھی نا ہوئے

"پیارے تم صبح جاؤ گے! ہائے میری آنکھیں کیونکر دیکھ سکینگی؟"

جب زمانہ زبان نگہ سے یہ الفاظ میرے کانوں میں رس ٹپکا رہا تھا۔ تو میں دیکھ رہا تھا کہ ان مست شباب نکھوں سے آنسو جاری تھے۔ رات تاریک تھی لیکن لیمپ کی روشنی میں یہ معلوم ہو رہا تھا کہ گلاب کے دو پورے کھلے ہوئے پھولوں پر شبنم کے قطرے چمک رہے ہیں کسی کی نازک نازک اور گداز باہیں میرے گلے میں حمائل تھیں۔ اور صبح کا وہ حسرت انگیز سین میری نظر کے سامنے۔ جب فلک یا قسمت کی گردش۔ دو محبت بھرے دلوں میں سینکڑوں منزل کی دوری کر دیتی ہے میں نے لاکھ تسلی آمیز الفاظ کہنا چاہے۔ مگر وفور الم سے زبان نے یاری نہ کی،

"پیارے تم صبح جاؤ گے: ہائے میری آنکھیں کیونکر دیکھ سکیں گی؟"

ان دردناک اور پُر حسرت جملوں کا جواب میری طرف سے فقط ایک لمبا اور ٹھنڈا سانس تھا جس کے بعد میں بیخود ہو گیا، میں نے ایک عجیب عالم حسرت میں ان کو اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے جس کے اندر دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ لپٹا لیا۔ اور اپنے خشک لب جن میں تمنائیں تھرتھرا رہی تھیں۔ اُن رخساروں پر رکھ دیئے۔ جن پر قطرہ ہائے اشک نے جم کر ایک عجیب عالم دلفریبی پیدا کر دیا۔

لوگ کہتے ہیں کہ فراق کی راتیں بہت ہی کٹھن ہوتی ہیں۔ اور بڑی مشکلوں سے کٹتی ہیں لیکن اکثر تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ یہ رات بھی وصل کی رات کی طرح بڑی سرعت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ ابھی شام کو ہوئے کچھ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا۔ آفتاب نے دریچۂ مشرق سے سر نکال کر اپنی شعلہ بار اور قہر آلود نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ در و دیوار سے الفراق۔ الوداع کی خوفناک صدائیں آنے لگیں۔ اور ایک مرتبہ پھر انھوں نے میری طرف پُر حسرت نگاہوں سے دیکھ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "پیارے اب تم جاؤ گے! ہائے میری آنکھیں کیونکر دیکھ سکیں گی؟"

سامان سفر تیار ہو چکا تھا۔ میں نے ان کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اور ان فقروں کا جواب ایک گرم ...... سے دیا۔ اور "فی امان اللہ" کہہ کر چل دیا۔ اور اشکبار آنکھوں کے ساتھ اپنے مچلے ہوئے دل کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ +

"ن" گورکھپوری

نظارۂ خاموش

میں نے تجھے دیکھا ہے۔ مگر یہ نہ پوچھ کہ کب اور کس طرح۔ میں نہیں جانتا کہ میں نے تجھے کہاں دیکھا۔ مگر ہاں یہ ضرور یاد ہے کہ جب مری اول نظر تری جلوہ باریوں سے روشناس الفت ہوئی ہے تو مجھ پر ایک عالم بیخودی طاری تھا۔ اور تو ایک غبار کی صورت میں نمودار ہوا تھا۔

اس وقت جبکہ تو ایک گہرے غبار میں روپوش حقیقت ہو کر میرے سامنے آیا تو میں نے خیال کیا کہ یہ شاید مری سیاہ بختی کی تیرگی ہے جو بڑھ کر مری دنیا تاریک کر رہی ہے۔ مگر جب وہ دیکھتے دیکھتے ایک نور سا دکھائی دینے لگی تو میں سمجھا کہ یہ میری لیلائے شب کی تیرگی نہیں بلکہ صبح تمنا کا سفیدہ ہے۔ مگر آہ۔ وہ بھی میری قدرت واہمہ کا مخلوق دھوکہ تھا۔ کیونکہ اب مجھے صاف نظر آرہا تھا کہ میں عالم خواب میں کسی فرشتہ کو دیکھ رہا ہوں۔

میں نے جب بغور دیکھا تو میری نگاہیں اس منظر حسن میں ایک حرکت سی محسوس کرنے لگیں۔ میں نے اپنی آنکھیں ملیں اور پھر بغور دیکھا تو چشم بصیرت کے سامنے ایک تصویر حسن تھی جس کے یوسف طلعت چہرے پر زلف برہم کی پریشانیاں ہلکی ہلکی سیاہی کی صورت میں ابھری جاتی تھیں میں گھبرایا۔ کیونکہ اب یہ خیالی مجسمہ تیرے نورعلی نور پیکر سے ملتا جلتا نظر آنے لگا تھا۔ میں نے پھر اپنی آنکھوں کو ملا اور دیکھا تو یہ تصویر بکمال متانت و خموشی کھڑی ہوئی تھی۔ مگر اب اس نے اپنی نازک سی انگلی کو دانتوں میں دبا لیا تھا۔ گویا وہ میری دیوانہ وارخستگی پر حیران و ششدر تھی۔ لیکن اب اس تصویر کے خال و خد صبح کی ہلکی ہلکی ضیا پاشیوں میں نمایاں ہوتے جاتے تھے۔ میرے جسم میں ایک لرزش سی پیدا ہوئی۔ اور میں بصد جرأت چاہتا تھا کہ اس عالم آرا تصویر سے کہہ دوں کہ یہ کوئی تصویر تو نہیں بلکہ "تم ہو"۔ مگر آہ۔ کہ اس خیال کے آتے ہی تو کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ اور غائب ہو گیا

میں نے ایک چیخ ماری اور اٹھ بیٹھا۔ پھر میں نے مدتوں تک خموشی اختیار کر لی۔ گویا وہ میرا

سکتہ تھا۔ جو اس خواب پریشان کے بعد مجھ پر ونوں تک طاری رہا۔ پھر میں عرصہ دراز تک کسی سے نہ بولا اور چپ رہا۔ مگر اب میں نے اپنا گریبان چاک کر ڈالا تھا۔ جب لوگوں نے مجھ پر جنون و دیوانگی کے آوازے کسے تو میں ایک سنسان صحرا کی طرف چلا گیا۔ اور پھر خبر نہیں کہ میں نے کیا کیا لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں تجھی پکارتا پھرتا تھا کئی بار میری آواز نے مجھے دھوکا بھی دیا۔ اور میں نے بکمال شادمانی پیچھے پلٹ کر دیکھا کہ شاید تو آ گیا۔ مگر آہ کہ تو نہ تھا۔ پس کیا اس وقت کی تکلیف اور میری مایوسی کی تجھے بھی خبر ہے؟

او مصدر حسن۔ میں ممنون ہوں کہ تو نے وعدۂ دیدار کر لیا۔ مگر میں یہ نہیں چاہتا کہ تیرے حسن منور کی جلوہ بار رنگینیاں نمایاں ہو جائیں۔ پس تو اپنے جمال رنگین کو جلوہ فرما تو کر۔ مگر اس طرح کہ پہلے موجودات عالم کی ان تمام نشانیوں کو مٹا دے جس کے ذریعے رقیبان دہر کے عقل و ہوش تجھی پہچان جاتے ہیں۔ اس لئے پہلے تو اجرام سماوی کو نیست و نابود کر دے کہ ان سے بھی تیری ارفع اور مستور شہنشاہی کا پتہ ملتا ہے۔ تو لوح و قلم کو بھی توڑ دے کہ یہ بھی ایک ذریعہ ہیں تیری پردہ دری کا۔ تو اجساد انسانی کو روح کی قید سے آزاد کر دے کہ یہ بھی تیری دلربا رنگینیوں کے شاہد ہیں تو عالم ناسوت کی اس ششش گوشہ کرسی کو چکنا چور کر دے کہ اس سے بھی رقیبوں پر تیری دلربائیاں ظاہر ہوتی ہیں جو تیرے حسن غیور کے لئے زیبا نہیں۔ تو چاند اور ستاروں کو فرش زمین پر گرا دے کہ ان کا نورانی بدن ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ کیونکہ ان میں بھی تیرے حسن گلرنگ کی دلفریبیاں جلوہ گستر ہیں تو زحل و مشتری کو غرق آب کر دے۔ اور سیارگان فلک کی اس پُر نور انجمن کو بھی برہم کر دے۔ کہ جس کا ہر فرد تیری عالم تاب کرشمہ سازیوں کا مخبر ہے۔ تو لیل و نہار کے اس مفید نظام کو بھی برہم کر دے جس کے ہر لمحہ میں رقیبان بد باطن کو تیری تلاش جستجو کا موقع مل جاتا ہے۔ تو چرخ نادرہ فن کے اس سکوت و حرکت کو بھی فنا کر دے کہ اس میں بھی تیری پیاری پیاری شوخیاں نمایاں ہیں۔ اس آب و آتش اور خاک و باد کے حیرت فزا آئینہ کو چکنا چور کر دے جس میں تیرے عکس روشن کی لمعہ فروغیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور ان تیرہ دماغ افلاک شناسوں کے دفتر جلا دے جن میں تیری مستانہ ادائیوں کا پتہ چلتا ہے۔ تو ان خورشید پرستوں کو بے بصر کر دے۔ جو تیرے جسم نازنین کی ایک جھلک پر مرمٹنے کے لئے تیار ہیں۔ تو اپنے مہر و قہر کے جملہ انسانوں کو دریا برد کر دے کہ ان سے

بھی تیری عفت پناہ پاکدامانی پر حرف آتا ہے۔ تو زبانوں کو خشک کر دے۔ جو تیری جا و بے جا شکایتوں کو بیان کرتی ہیں ۔۔ باغ و بہار اور گل و نسرین کی ان رنگینیوں کو چھین لے جن سے تیرے حسن گل کار کا نکھار ظاہر ہے۔ ہاں مزا تو جب ہے کہ سارے جہان میں ایک ہو کا عالم ہو۔ اور میرا بے حس و حرکت دل ہو جس میں بکمال خاموشی تو سما جائے۔ اور بس +

توحیدی از بھوپال

جگنو

(از مولوی اقبال احمد صاحب سہیل۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی علیگڈھ)

اے شرار مضطرب۔ اے برق بیتاب زمین
شمع کنج گلستان، روشن دل صحرا نشین

سچ بتا اے شعلہ حساس کیوں ہے بیقرار
کس کی شمع حسن پر مرتا ہے تو پروانہ وار

منتظر کس کا ہے تو اے دیدۂ بے خواب کہہ
جستجو کس کی ہے تجھ کو کرمک شب تاب کہہ

کہہ تو اے الماس پرّاں کس لئے مضطر ہے تو
ہے حقیقت تری کیا، کس کان کا جوہر ہے تو

سچ بتا جگنو یہ ہیں تری ہی آتش باریاں
یا تصادم سے ہوا کے۔ اڑتی ہیں چنگاریاں

کہہ رہے ہیں اہل گردوں تیرا جلوہ دیکھ کر
گر پڑے ہیں خوشۂ پروین کے دانے خاک پر

جگمگا اٹھا ہے تاکستان یہ ترے نور سے
آتش مے شعلہ زن ہے یا رگ انگور سے

ابلق ایام کا بیشک تو نور العین ہے
نور و ظلمت روز و شب کا مجمع البحرین ہے

شعلہ بن کر آہ نکلی ہے درون خاک سے
یا سرشک افشاں ہے انجم دیدۂ نمناک سے

ہے حصار چرخ پر یہ شعلہ باری کس لئے
جنگ یہ فوج کواکب سے ہے جاری کس لئے

معارف جنوری ۱۹۲۰ء

شرارہائے عشق

(از آتش خانۂ علامہ شبلی نعمانی - نور اللہ مرقدہ)

:(سر و برمئے):

وقت سحر کہ عارض او بے نقاب بود ۔۔۔ در بزمش اول آں کہ رسید آفتاب بود

شب بود و صد ہزار تماشائے دلفریب ۔۔۔ صبح از کرانہ سرزد و دیدم کہ خواب بود

با چشم شرمگیں تو کارے نداشتیم ۔۔۔ مارا سخن بہ غمزۂ حاضر جواب بود

اندازہ دانِ حوصلۂ ہر کسی ست دوست ۔۔۔ با دیگراں بہ لطف و بہ ما در عتاب بود

نازِ غرورِ حسن نہ وادشش اجازتے ۔۔۔ ورنہ سوال بوسۂ مارا جواب بود

بیدار کردہ است بہر گوشہ فتنۂ ۔۔۔ باآں کہ چشم سحر طرازش بخواب بود

آخر از اں لبانِ مے آلود چارہ چیست ۔۔۔ گیرم کہ از شراب و میم اجتناب بود

شبلیؔ خراب کردۂ چشم خراب اوست
تو در گماں کہ مستیٔ او از شراب بود

:(خمارِ عشق):

آں شوخ بس کہ پایہ حسنش بلند بود ۔۔۔ ہر شیوہ اش بلائے دلِ دردمند بود

در شوق، پاس گرمی نازش بجا نماند ۔۔۔ باآں کہ کارہا صنمے خود پسند بود

سنجیدہ ایم فتنۂ محشر بہ قامتش ۔۔۔ یک نیزہ قدِ فتنہ طرازش بلند بود

ہرگز حدیثِ شوق بہ پایاں نیامدہ است ۔۔۔ یارب کدام جا سرایں رشتہ بند بود

می بینم ایں کہ قیمت دل تا کجا کشد ۔۔۔ پرسد ز من کہ نرخ متاع تو چند بود

تو یک نگاہِ ناز زیاں کردی و مرا ۔۔۔ سرمایۂ کہ بود دل مستمند بود

شبلیؔ ز ہجر اوست کہ ۔ ذوقِ سخن نماند
شکر فشانیم ہمہ زاں نوشخند بود

آزاد کی شاعری

یہ سعادت گورنمنٹ کالج لاہور ہی کے حصے میں تھی کہ آزاد جیسے جلیل القدر ادیب سے وابستگی کا فخر حاصل ہوا لیکن اپنی قدر شناسی ملاحظہ فرمائیے۔ کہ اگر آزاد کی تصانیف ورنیکلر لائبریری سے نکال کر دیکھی جائیں تو ان کا اچھوتا پن حوروں کے دامن کی قسم کھا رہا ہو گا۔

گو پروفیسر شمس العلما مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے نظم اور نثر دونوں کی دنیا میں ایک شاندار اور خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا۔ اور اظہار خیالات وجذبات کے لئے نئے سے نیا طرز بیان نکالا لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ مملکت نثر میں جس قبولیت نے آزاد کے ہاتھ چومے۔ بوستان نظم میں وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ لیکن خواہ آزاد۔ اس صنف ادب کو معراج کمال تک نہ پہنچا سکے ہوں لیکن بلاشبہ ہماری جدید شاعری کے آغاز کا سہرا ان ہی کے سر ہے۔

آزاد کے زمانے سے پیشتر جتنے بھی ہندوستانی شعرا ہوئے ان کا موضوع کلام حسن و عشق یا مدح وثنا کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ یا عاشق کے جذبات واحساسات ومعاملات کو نظم کرتے تھے۔ یا معشوق اور امرا کی شان میں قصائد تحریر کرتے تھے۔ ان کے کلام میں بجائے ہندوستانی کے زیادہ تر ایرانی عنصر موجود ہوتا تھا۔ اور تشبیہوں اور استعاروں کی وہ کثرت ہوتی تھی کہ بقول آزاد کے "اصل مطلب کو ڈھونڈو تو باریکی اور تاریکی الفاظ اور استعاروں کے اندھیرے میں وہ ایک جگنو ہے کہ کبھی چمکا اور کبھی غائب"۔ مسلسل مضامین کے لئے صرف مثنویاں لکھی جاتی تھیں۔ جن کی چند محدود بحر کی تنگی صرف قادر الکلام شعرا ہی سے داد سخن لے سکتی تھی۔

جدید شاعری کے شیدا، اور انتہا پسند نقاد عموماً تمام گزشتہ شاعری کو دفتر ہذلیات قرار دے دیتے ہیں لیکن اردو میں گو مناظر قدرت کی شاعری نے چنداں ترقی نہیں کی لیکن حسن و

عشق کی شاعری معراج کمال کو پہنچ چکی ہے۔ اور ہمارے ادب میں درد۔ غالب۔ مومن۔ اور داغ وغیرہم جیسے سرمایۂ ناز شاعروں کا کلام موجود ہے جسے ہم تمام دنیا کی عاشقانہ شاعری کے مقابلے میں بے تکلف پیش کر سکتے ہیں۔

آزاد بھی استادوں کے کلام کو سراہتے تھے لیکن ان کو اردو شاعری میں دو بڑی اصلاحیں مدنظر تھیں۔ ایک تو انھیں اس شاعری کا حسن و عشق میں محدود ہونا۔ اور اس کی قیود اور پابندیاں ناپسند تھیں۔ چنانچہ ایک موقع پر لکھتے ہیں "میرے اہل وطن آؤ۔ آؤ۔ اپنے ملک کی زبان پر رحم کرو۔ اٹھو۔ اٹھو وطن اور اہل وطن کی قدیمی ناموری کو بربادی سے بچاؤ تمھاری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے۔ اس کے آزاد کرنے میں کوشش کرو نہیں تو ایک زمانہ تمھاری اولاد پر ایسا آئے گا کہ ان کی زبان شاعری کے نام سے بے اطمینان ہوگی۔ اور اس فخر آبائی اور بزرگوں کی کمائی سے محروم ہونا بڑے افسوس کا مقام ہوگا۔"

دوسرے آزاد اردو شاعری میں سے فارسی کے اس عنصر کو خارج کرنا چاہتے تھے جو ملکی خیالات یا تاریخی واقعات ایران سے خصوصیت رکھتا تھا۔ ان کی تشبیہات یا تلمیحات ہندوستان اور اہل ہند کے مناسب حال نہ تھیں۔ وہ اس غیر ملکی عنصر کی بجائے اردو شاعری میں بھاشا کا عنصر داخل کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ اس میں تمدن حال کی آمیزش کو بھی ضروری خیال کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ایک لکچر میں کہا "ہمیں چاہیے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور اظہار خیالات بھاشا سے سیکھیں لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں۔ کیونکہ اب رنگ زمانے کا کچھ اور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے کہ فصاحت اور بلاغت کا عجائب خانہ کھلا ہے جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے ہار۔ طرے۔ ہاتھوں میں لئے حاضر ہیں۔ اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے۔ لیکن اب وہ بھی منتظر ہے کہ کوئی صاحب ہمت ہو جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے۔"

وہ صاحب ہمت اور باحوصلہ شخص خود آزاد ہی نکلے جنھوں نے قدامت پسند طبیعتوں کی

ملامتوں۔ رقیبوں کے طعن و تشنیع۔ اور تمام اعتراضات کی پروا نہ کرکے شاعری کی اصلاح کی جانب قدم بڑھایا۔ اور اپنی پہلی نظم "شب قدر" لکھ کر اردو شاعری کی تمام زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ آج کل انگریزی کا زور و شور ہے۔ خیالات وسیع ہو چکے ہیں اور مذاق میں تبدیلی آگئی ہے۔ یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ آزاد نے اپنی قدیم شاعری کو چھوڑ کر جدید شاعری کی بنیاد رکھنے میں کن کانٹوں میں پاؤں رکھا تھا۔

ان کی پہلی پہلی نظمیں عجیب انقلابی چیزیں تھیں جن کو ملک نے حیرت کی نگاہوں سے دیکھا۔ خیالات مختلف تھے۔ تشبیہ و استعارہ کی کثرت غائب تھی۔ مثنوی کی بحر نئی تھی۔ مگر ان تمام تبدیلیوں کے باوجود سادگی میں وہ اثر اور بیان میں وہ قوت تھی کہ جس چیز پر قلم اٹھاتا تھا۔ اس کی تصویر آنکھوں کے روبرو کھنچ جاتی تھی۔ اور جس جذبے کو بیان کرتے تھے۔ اسے پڑھنے والا محسوس کرنے لگتا تھا۔ اور یہی کمال شاعری ہے۔

مثنوی "شب قدر" میں رات کے وقت مختلف اشخاص کی حالتیں بیان فرما کر ایک مریض کی حالت ایسے موثر انداز میں بیان کی ہے کہ اس کی زندگی کے آخری لمحوں کا تصور آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

پر جائے حیف حال اسی جاں بلب کا ہے — سب کہہ رہے ہیں جس کو کہ مہمان شب کا ہے
دن بھر دوا غذا میں رہا غیر حال ہے — لیکن ہے اب یہ حال کہ ہلنا محال ہے
بتی چراغ عمر کی ہے جھلملا رہی — اور بے کسی سرہانے ہے آنسو بہا رہی
اے رات مجھ کو دھیان یہی بار بار ہے — اس کی تو زندگی کوئی دم کا شمار ہے
کون اس کا ساتھ دیوے گا ہو صبح جب تلک — روئے گا کوئی شام کے مردے کو کب تلک

ابر کرم کی نظم میں ساون کا ایسا پیارا بیان ہے۔ کہ ہندوستان کے اس شورش انگیز موسم کی دلچسپیاں نگاہ تصور کے روبرو آجاتی ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

املی کے اک درخت میں جھولا پڑا ہوا — اور ساتھ اس کے آم کا ٹپکا لگا ہوا
جھولوں میں نوجوان ہیں پینگیں چڑھا رہے — اور بچے آم کے ہیں پپیہے بجا رہے

ساون کے گیت اٹھا رہے طوفاں دلوں میں ہیں | پردیسیوں کی یاد وسیع ارماں دلوں میں ہیں
ہر تان میں ملہار کی بستی کا شور ہے | بادل گرج کے پردے میں دیتا ٹکور ہے

اسی نظم میں ساون کی کالی گھٹا ہی راتوں کا کس قدر صحیح بیان لکھا ہے کہ رات کی تاریکی۔ گھٹاؤں کا آنا۔ بجلی کا چمکنا۔ نمناک ہواؤں کا چلنا سب کچھ محسوس ہونے لگتا ہے ؎

سنسان رات اور وہ آئی ہوئی گھٹا | چاروں طرف جہاں میں چھائی ہوئی گھٹا
بجلی کبھی کبھی نگہہ فتنہ ساز سے | کرتی نقاب ابر میں چشمک ہے ناز سے
اور کوکنا پپیہے کا وہ دل کی ہوک سی | نالے کو اپنے تولنا کوئل کی کوک سے

کوٹھے پہ ٹھنڈے ٹھنڈے بچھونے وہ اوس میں | ہے گل کو فخر آئے اگر باس بوس میں
آ آ وہ بھیگی بھیگی ہوا کا کبھی کبھی | بول اٹھنا مرغ نغمہ سرا کا کبھی کبھی
آرام کہہ رہا ہے کہ بیرے ہی ہو رہو | قسمیں ہے دیتی نیند کہ بس اب تو سو رہو

آزاد کے کلام میں تشبیہ کا استعمال اتنا ہوتا ہے جیسے آٹے میں نمک یہی وجہ ہے۔ کہ موضوع کلام پر توجہ قائم رہتی ہے۔ اور تشبیہوں کے پیچ دار راستوں میں نہیں بھٹک جاتی۔ پھر تشبیہ جہاں ہوتی ہے نہایت جچی تلی۔ اور مطلوبہ اثر و تصور پیدا کرنے والی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک خشک دریا کے متعلق لکھتے ہیں ؎

ریتی پہ خشک لب تھا جو دریا پڑا ہوا | ہو جیسے کوئی سانپ سسکتا پڑا ہوا

یا موسم زمستاں کے ہلکے پھلکے بادلوں کا آنا بیان کرتے ہیں ؎

ہلکے ہلکے کبھی ٹکڑی کے ہیں جاتے اُڑتے | اور ہوا میں ہیں کبھی روئی کے گالے اڑتے

پروفیسر آزاد کی خصوصیات میں سے ایک یہ خصوصیت بھی ہے کہ آپ اکثر خیالی چیزوں کو مادیت کا کوئی مناسب جامہ پہنا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ مثلاً۔ موسم زمستاں میں صبح کی آمد کا بیان فرماتے ہوئے اسے ایک پیر مرد ظاہر کرتے ہیں ؎

اتنے میں ہوتی ہے افلاک پہ تنویر سحر | ٹیکتا آتا ہے مشرق سے عصا پیر سحر
سر پہ وہ اپنے بکھیرے ہوئے ہی موئے سفید | ریش پُر نور میں ہے جلوہ نما ردِ سفید
شجر طور کا عالم ہے بناتا آتا | ساتھ ہی کوہ ہمالہ کو اٹھاتا لاتا

یا ایک جگہ رات کو لیلائے فام قرار دے کر لکھتے ہیں ؎

وفعتاً سامنے لیلائے شب تار آئی کرتی ایک اک کو مئے شوق سے سرشار آئی

آزاد نے الفاظ کی موسیقی کو خوب سمجھا۔ وہ اپنے اشعار کا اثر لفظوں سے پیدا کرتے ہیں اور ہر جگہ موضوع کے مطابق الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً دربار کا بیان ہے تو الفاظ میں بھی سناٹا شکوہ موجود ہے ؎

بیٹھا ملک القدس یہ اورنگ عدالت چھایا ہوا آفاق میں تھا رنگ عدالت

شہنشاہ مشرق کے برآمد ہونے کا بیان ہے۔ تو شکوہ کے ساتھ شگفتگی اور چمک بھی شعر سے جھلک رہی ہے ؎

کھولے ہوئے شفق کا نشاں زرق برق سے رکھ کر کرن کا تاج نکلتا ہے شرق سے

مشہور انگریزی نظم (ESCCELSIA) کو اپنی زبان میں لانے میں آزاد بہت کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ نظم شروع سے آخر تک بے انتہا شگفتہ اور خوبیوں سے مزین ہے۔ اور یقیناً اس کا مطالعہ نوجوانوں کے دلوں میں ہمت اور حوصلہ پیدا کرنے والا ہے۔ اس میں انھوں نے ایک باہمت شخص کا حال لکھا ہے۔ جو اپنی دھن میں چلا جا رہا ہے۔ سردی کی یہ کیفیت ہے کہ:-

دامان کوہسار سے سورج بھی لپٹ کر وہ بکا لحاف ابر میں منہ کو لپیٹ کر

آرام ہر طرف سے اس کا دل لبھانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر وہ دُھن کا پکا کسی کی نہیں سنتا۔ رات کو اسے ایک پیر مرد ملتا ہے۔ جو کہتا ہے ؎

سنسان جنگل اور یہ درختوں کی سائیں سائیں چاروں طرف پہاڑ ہیں ہیں دوڑتی بلائیں
طوفان برف سر پہ کھڑا ہے تلا ہوا ہے یہ درہ کہ موت کا منہ ہے کھلا ہوا
ناداں کہ لطف عیش و طرب پر نظر نہیں جاتا کہاں ہے جان کا بھی تجھ کو ڈر نہیں
یہ سن کے نکلا شعلہ دلِ نوجوان سے گویا ستارہ ٹوٹ پڑا آسمان سے
اور اس نے دی کڑک کے صدا ہاں بڑھے چلو

یہاں تک کہ افق مشرق نور سحر سے روشن ہو گیا۔ صبح کا بیان ایسے شگفتہ اور رنگین الفاظ میں نظم فرمایا ہے کہ گویا پڑھنے والے کی انگلی پکڑ کر اسے پرستان میں لے گئے ہیں۔ اد

وہاں کے نوبہار و تر و تازگی اور شادابی کو جھوم جھوم کر بیان کر رہے ہیں ؎

ناگہ فلک پہ دامن شب چاک ہوگیا | لبریز نور سے طبق خاک ہوگیا
منہ رات کا جو صبح کے آنے سے فق ہوا | گلگونہ کے سامنے رنگ شفق ہوا
روئے سحر پہ شان تھی نور و ظہور کی | چاروں طرف وہ زمزمہ خوانی طیور کی
وہ گہری سبزیوں میں گل تر کی لالیاں | اور اوس سے بھری ہوئی پھولوں کی پیالیاں
وہ صبح کی ہوا سے درختوں کا جھومنا | اور جھوم جھوم کے وہ رخ گل کو چومنا
سبزی جو روئے خاک پہ مخمل بچھا گئی | شبنم بھی آکے رات کو موتی لٹا گئی
پانی وہ صاف صاف جو بل کھا کے جاتے تھے | پارے کے سانپ گھاس پہ لہرا کے جاتے تھے
سورج نے سر نکالا یکایک پہاڑ پر | بولا جوان شیر کی صورت دہاڑ کر

آرام کی نہیں ہے یہ جا ہاں بڑھے چلو

غرض کوئی دلچسپی بھی اس شخص کے عزم بالجزم کو مانع نہیں ہوتی۔ اور وہ یوں ہی ترقی کرتا جاتا ہے۔

آزاد نے اپنے انقلاب کی تکمیل میں کوئی بھی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اردو نظم جن جن اصناف بیان سے خالی تھی وہ سب انھوں نے ایک دفعہ تو ابنائے ملک کے سامنے پیش کر دئے چنانچہ نظم غیر مقفیٰ (بلینک ورس) کی بھی بنیاد رکھ دی۔ اس میں چونکہ بحر کے سوا اور کسی چیز کی پابندی نہیں ہوتی۔ اس لئے اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات اور فلسفیانہ مضامین بآسانی بیان ہوسکتے ہیں۔ اس طرز بیان میں انھوں نے ایک پہیلی لکھی ہے جس کے چند اشعار بطور نمونہ درج ہیں ؎

ہنگامہ ہستی کو | گر غور سے دیکھو تم
جو خاک کا ذرہ ہے | یا پانی کا قطرہ ہے
ہر خشک و تر عالم | صنعت کے تلاطم میں
حکمت کا مرقع ہے | جس پر قلم قدرت
انداز سے ہے جاری | اور کرتا ہے گلکاری

افسوس کہ آزاد کے بعد اور شعرا نے نظم غیر مقفیٰ کی طرف توجہ نہ کی۔ ورنہ جس طرح

آج فطرت کی شاعری ہماری زبان میں پھل پھول رہی ہے۔ اور اقبال۔ ناظر اور منشی درگا سہائے سرور مرحوم وغیرہ داد کلام لے رہے ہیں۔ اسی طرح نظم غیر مقفیٰ بھی بہت کچھ ترقی کر جاتی۔

لیکن ان تمام خوبیوں پر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پروفیسر آزاد کا کلام نقائص سے بالکل پاک ہے۔

شعر کہنے کے لئے محض شاعرانہ طبیعت پانا ہی کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ مشق کی بھی بہت کچھ ضرورت ہوتی ہے۔ آزاد کافی مشق بہم نہ پہنچا سکے۔ چنانچہ کم مشقی کے بعض عیوب ان کے کلام میں موجود ہیں۔ اکثر اوقات محض قافیہ نباہنے کے لئے انہیں کوئی ایسا لفظ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ جو ان کی مشق کا عجز ظاہر کرتا ہے۔ ایک شعر ہے

آدھی ڈھلی ہے۔ پر وہ ابھی ہے مکان میں ۔۔۔ اور وہ جو لکھ پتی ہے مہاجن جہان میں

اب جہان میں محض اس لئے استعمال کیا کہ وہ مکان میں کا قافیہ تھا۔ ورنہ مہاجن کے آسمان میں ہونے کا کسے شبہ ہو سکتا تھا؟

کہیں شعر کا وزن پورا کرنے کے لئے انہیں "ہے" کی جگہ "ہے گا" کا استعمال کرنا پڑتا ہے مثلاً ؎

گھوڑے پہ ہے گا اونگھتا جاتا سوار بھی ۔۔۔ اور سو گیا ہے راہزن نابکار بھی

غالباً اسی وقت سے عہدہ برآ ہونے کے لئے وہ بعض متروک الفاظ مثلاً "ہووے" "لیوے" وغیرہ بھی استعمال کر جاتے ہیں ؎

پھر لیوے یا نہ لیوے لیا ہی سمجھا سے ۔۔۔ جو کچھ یہاں لیا ہے۔ وہ ہووے گا سب بہیں

اکثر موقعوں پر کوئی حرف شعر میں سے گرتا ہے۔ مثلاً ؎

جو دن سے زیادہ رات کو مصروف کار ہیں ۔۔۔ بندے خدا کے ایسے بھی یاں بے شمار ہیں

شعر کا توازن قائم رکھنے کے لئے "اور" کا لفظ اکثر استعمال کرتے ہیں۔ جو محض حشو ہوتا ہے مثلاً اس شعر میں۔ کہ ؎

رومابہ کی جو فوج کشی اک غنیم نے ۔۔۔ اور ہے لکھا مورخ عہد قدیم نے

موسخ عہد قدیم نے لکھاہے کافی تھا ؎

تعقید کا نقص بھی بعض بعض موقعوں پر دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً ؎

اک حصہ طے نہ رسنہ حریفوں نے تھا کیا یہ تین حصہ بڑھ گئے اور ان کو جا لیا

اس فقرہ کو کہ حریفوں نے ایک حصہ راستہ طے نہ کیا تھا۔ ایسے گول مول طریقے سے ادا کرنے کی وجہ بھی بجز کم مشقی کے اور کیا سمجھی جائے۔

لیکن آزاد کے کارناموں اور ان کے کلام کی بے شمار خوبیوں کے مقابلے میں یہ اعتراضات کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ پڑھنے والا جب ان کا مجموعہ نظم پڑھ کر ہاتھ سے رکھتا ہے۔ تو آنکھوں کو ان کے کلام کے محاسن اس آب و تاب سے چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ عیوب خود بخود ان کی روشنی میں محو ہو جاتے ہیں۔

اگر آزاد کے زمانے کے مذاق کو اور طرز جدید کی بنیاد رکھنے کی مشکلات کو انصاف کی عینک سے دیکھا جائے تو قطعی کہنا پڑتا ہے کہ آزاد نے سادگی اور لطافت کے رنگا رنگ پھول برسائے ہیں۔ اردو کے گلستان نظم میں جہاں ایک ہی رنگ کے پھولوں کے پودے پھلا کرتے تھے۔ اب وہاں ایک خوش نما تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ کج بیں نقاد لفظ لفظ پر اعتراض کر سکتے ہیں لیکن یہ امر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ آزاد نے خشک مضامین کو بے انتہا دلفریب بنا کر ہمارے سامنے پیش کیا اور ہماری زبان میں ایک ایسا انداز پیدا کیا جس سے وہ قطعی بے بہرہ تھی۔ وہ نظم جدید کے بانی تھے اور جس قصر کی انھوں نے بنیاد رکھی۔ اب اہل وطن کا کام ہے کہ اسے بلندی کمال تک پہنچائیں آزاد خود انھیں الفاظ میں خطاب کرتے ہیں:-

میرے اہل وطن تمھاری جماعت دو فرقوں سے مرکب ہے۔ ایک ہندو۔ ایک مسلمان تم جانتے ہو ہندو کون ہیں؟ ہندو وہ ہیں کہ آج ہم جس بات کی آرزو کرتے ہیں وہ ان کی زبان کا اصل جوہر ہے۔ اگر بھاشا ہے تو وہ اصل حالتوں کے ادا کرنے میں سب پر فائق ہے سنسکرت کی قوت نظم خود حد بیان سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ مضامین شاعرانہ در کنار۔ اس نے تاریخ سے لے کر جغرافیہ۔ طب۔ منطق۔ فقہ تک جس علم کو لیا نظم کی جنتری میں کھینچ لیا۔ دوسرا جز مسلمان جن کی اصل عرب ہے۔ عربی وہ

زبان ہے کہ جس میں مرد تو بالائے طاق۔ گھروں کی عورتیں۔ بلکہ لونڈیاں۔ جب اپنے جوش تقریر پر آتی تھیں۔ تو ان کا کلام ایک پُر زور نظم ہو جاتا تھا۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں کہ ایسے بزرگوں کی اولاد اپنے بزرگوں کی میراثوں سے محروم ہو۔ کیا یہ حیف کی جگہ نہیں کہ اوروں کے سامنے ہماری زبان ضعیف بیان کے ساتھ۔ ہزاروں نقصوں کے ساتھ مطعون ہو۔ اے خاک ہندوستان۔ اگر تجھ میں امراء القیس۔ اور لبید نہیں تو پھر کوئی کالیداس نکال۔ اے ہندوستان کے صحرا و دشت۔ فردوسی اور سعدی نہیں تو پھر کوئی والمیک پیدا کر دے ٭

"محمود کہکشاں" از گورنمنٹ کالج لاہور

پھولوں کی مالا

ایسی محبت کا استحکام انسانی یا روحانی قوت سے بالاتر ہوتا ہے۔ جو حس ضبط سے مزین اور شعبۂ حیات کی مدد و معاون ہو۔

محبت کا صحیح جذبہ چھوٹے بڑے کے ادب کا حامی اور اپنے پرائے کے تعلقات اور حقوق کا نگہداشت ہے۔

محبت۔ محبوب کو اپنے مرکز وسطی میں قیام دے کر اپنی شیریں لطافت تمام کائنات میں منعکس تو کر دیتی ہے۔ مگر اس کا اظہار جائز نہیں رکھتی۔ لیکن جس جذبہ کا اظہار ایک تارک الدنیا۔ عزلت نشین کے مراقبے میں تلاطم اور ایک دنیا دار شخص کے فرائض معاشری میں انتشار کی صورت اختیار کر لینے پر مجبور ہو۔ وہ جہاں دوسروں کو ہلاک کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ وہیں خود اپنے آپ کو بھی پست و نابود کر دینے پر مجبور ہے طوفان۔ وہیں برپا ہوتا ہے جہاں غرفۂ عشق نیکی کے خلاف اشتعال دلا کر بغاوت پیدا کر دیتا ہے۔ ایسی حالت میں محبت سے اتفاقات مفقود ہو جاتی ہے اور حسن سے سکون۔

وجدانی سرور کا ایک لمحہ حیات عمر کا اہم سرمایہ ہے۔ "اخلاقی حسن صحیح اصولوں کی معیت میں افعال کی ہم آہنگی کا نام ہے۔ فلسفیوں کا مخاطب خیالات سے ہوتا ہے۔ واعظین کا نیکیوں سے۔ اور رہنمایان سیاست کا اغراض سے۔ لیکن انسان صرف صدائے جذبات پر ملتفت ہوتا ہے"۔

وقار و وقعت ہر کام میں پوشیدہ ہے اور نیکی محبت میں۔ عسل صداقت ہے۔ اور زندگی احساس اور موت تمام تکالیف اور درد کی خاتمہ۔

غلط ذریعوں سے صحیح نتائج کا حصول اسی قدر سہل ہے جتنا ہمالیہ کی چوٹیوں سے نیچے کود کر انجم فلک تک رسائی۔

ایک مقصد رفیع کی راہ میں مادی تمتع سے قطع نظر قربانی و ایثار کا اوج شہادت ہے۔

بدکار پر نظر ترحم بدی کی نفرت سے زیادہ انسانی زندگی کو بہتر بنانے میں معاون ہو سکتی ہے۔

انسان وہ ہے جو لوگوں کی غلطیوں کی جس قدر بھی چاہے۔ تضحیک کرے۔ ان کے جرائم اور عیوب پر اسکان بھر اشک ریزی جائز رکھے لیکن چند قطرات اشک ارادۃً تنفر اپنی ذاتی کمزوریوں کے لئے بھی محفوظ رکھے۔

علائق دنیوی کی غوطہ زنی انسان کو زندگی کی محویتوں سے بے بہرہ کر کے ان کے ناقابل بنا دیتی ہے۔

آراء میں ترمیم بعض اوقات کتب سے زیادہ اہم صحبتوں سے ہوتی ہے

تمام انسان کسی نہ کسی شعبۂ حیات میں ہنگامہ پیرا ہیں۔ جو لوگ کسی کام میں مصروف نہیں۔ وہ تمغۂ انسانیت کے نااہل ہیں۔

کم ظرفی کو اخلاقی جرم جان کر اجتناب ہنگامہ آرائی میں جادۂ استقلال کی نگہداشت اور ہنگام تکالیف میں خوشۂ صبر کا اعتصام طبیعت خیال کی لطیف ترین رعنائیاں ہیں

(ماخوذہ ٹیگور) مستطر

موپلا

(سید راحت حسین صاحب راحت ٹلہری کے قلم سے)
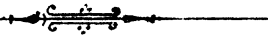
زمانہ قدیم کے دور ماضی میں جب ہندوستان اور غیر ملکوں کے درمیان سلسلۂ تجارت مرسوم و مربوط تھا۔ تو آمد و رفت کی مشکلات۔ اور سہولت معاملات کی مناسب وقت ضرورتوں کے وجہ سے بہت سی ایسی قومیں دور دراز سے آکر ہندوستان میں اقامت گزین ہو گئی تھیں کہ آج ان کے تاریخی حالات بھی روپوش امتداد ہیں۔ انھیں تجارت پیشہ قوموں میں سے ایک قوم "موپلا" کی ہے۔ جو اصل میں قدیم باشندۂ عرب ہے۔

عہد قدیم میں عربوں کے تجارتی جہاز اپنے ملک کی پیداوار اور صنعتی اشیاء لے کر سواحل ہند پر لنگر انداز ہوتے تھے۔ ان میں ساحل مالابار سب سے قدیم اور مہتم و ممتاز ہے۔ عرب اکثر اسی ساحل پر اترتے۔ اپنے ملک کی لائی ہوئی چیزیں یہاں فروخت کرتے۔ اور یہاں سے مختلف مصالحہ وغیرہ خرید کر جہازمیں بھر کے اپنے ملک کو لے جاتے تھے۔ ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں جب سرزمین عرب میں اسلام کا آفتاب طلوع ہوا۔ اور اس کی ایمان پاش شعاعیں پہنائے ہستی کے گوشہ گوشہ کو منور کرنے میں بہت سرعت سے کام لینے لگیں۔ تو اس کی ضوباریوں سے ہر ایسے مقامات بھی محروم نہ رہے۔ جہاں سے عربوں کا سلسلہ تجارت جاری تھا۔ چنانچہ پہلا عربی جہاز مسلمانوں کا سنہ ۶ھ میں ساحل مالابار پر آکر ٹھہرا۔

قرون اولی کے مسلمانوں کا نصب العین چونکہ مذہبی اشاعت تھا۔ لہذا وہ کسی موقع پر بھی اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کی کوشش سے غافل نہ ہوتے تھے۔ جہاں کہیں بھی ان کا گزر ہوتا وہ دنیاوی کاروبار کے ساتھ تبلیغ مذہب اسلام بھی ضرور کرتے۔ انھوں نے دین کو مقدم سمجھ کر دنیا کو اس کا متبع بنا لیا تھا۔ لہذا کچھ لوگ ساحل ملابار پر مقیم ہو کر تبلیغی اور تجارتی کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ اور انھوں نے ساحل پر آڑھت قائم کر لی۔ اور عربی و ہندی مال کی درآمد

برآمد اپنی ہی آڑھت کی معرفت شروع کر دی۔ تجار عربوں کا سلسلہ آمد و رفت تو جاری تھا ہی۔ ہر سال کچھ نہ کچھ عرب یہاں آکر رہ بس گئے۔ اس کے بعد اسلام کا ایک خاص تبلیغی وفد اس مقام کے حاکم راجہ کے پاس آیا۔ حکمران راجہ نے بڑے تپاک سے اس مشن کا خیر مقدم کیا۔ ان کے مذہبی اصولوں کو دلچسپی کے ساتھ سنا۔ اور ان سے اپنا حسن عقیدت ظاہر کیا۔ آخر واپسی میں وفد کے ہمراہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہو کر نور ایمان سے بہرہ اندوز ہوا لیکن اسکی مدت حیات چونکہ ختم ہو چکی تھی۔ اپنے ملک کو واپس نہ آسکا۔ اور راستہ ہی میں اس راجہ کی پاک روح جنت الفردوس کو منتقل کر دی گئی۔

زمانہ کی دستبرد نے گو ان سے ہم ایمان حاکم کو تو ان سے چھین لیا۔ مگر چونکہ ادھر تو مشن بہت کامیاب رہا تھا۔ اُدھر یہاں کی تجارت میں بلا زحمت سفر منافع کثیر نظر آئے۔ اس لئے اس تبلیغی مشن کے بھی بہت سے افراد مذہب کی توسیع و اشاعت کی غرض سے مستقل طور پر یہیں آباد ہو گئے۔ اور انھیں اپنے مقصد میں اس حد تک کامیابی ہوئی کہ عربوں کا تسلط روز افزوں ہونے لگا۔ چنانچہ اس وقت تک اس ساحل پر جو عرب آباد ہو چکے تھے۔ ان کی حالت دینی و دنیاوی دونوں اعتبار سے ایک امتیازی صورت اختیار کر چکی تھی جس سے دوسرے وارد عربوں کو بھی ساحلی سکونت کا شوق پیدا ہوا۔ اور ہر سال کچھ اور عرب یہاں آکر مقیم ہوتے گئے۔ اس طرح پر بتدریج مذہب اسلام کی ترویج اور ان عربوں کی تعداد میں ترقی ہوتی رہی۔ چنانچہ پہلی صدی ہجری کے آغاز میں ہی عربوں کا اقتدار جزائر سیلون سماٹرا۔ جاوہ اور چند دیگر ساحلی آبادبستیوں میں قائم ہو گیا تھا۔ ان مقامات کے قدیم باشندے بھی اکثر انھیں عربوں کے زیر تعلیم رہ کر مسلمان ہو گئے۔

۴۴ھ میں عبدالرحمن بن سمر۔ اور مہلب بن ابی صفرہ۔ براہ کابل فاتحانہ حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئے جس سے ان ساحلی عربوں کی ہمت و اقتدار میں ایک اور اضافہ ہو گیا مگر ۹۲ھ؁ میں جبکہ مسلمانوں کی امارت کا تاج ابوالعباس ولید کے سر پر تھا۔ تو راجہ داہر نے جس کی وسعت حکومت سندھ سے لے کر دریائے اٹک کے کنارے کالاباغ اور کشمیر تک تھی۔ عربوں کی اس روز افزوں مداخلت کو روکنے کی یہ تدبیر نکالی کہ ساحل ملابار پر مسلمان تاجروں کے چند جہاز لٹوا لئے۔ لیکن لٹے ہوئے عربوں کا قافلہ مستغیثانہ صورت سے دربار خلافت میں پہونچا تو عربوں کی رگ حمیت

جوش میں آئی - اور حجاج گورنر عراق کو اس قافلہ کی دادرسی کے واسطے فرمان شاہی دیکر روانہ کیا گیا۔ گورنر نے فوراً اپنے داماد محمد بن قاسم کو چھ ہزار فوج کا سالار بنا کر اس مہم کی سرکردگی پر مامور کیا۔ بہادر سپہ سالار نے کرمان کے راستے سے گزر کر فتوحات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور اس طرح حیدرآباد سندھ تک جا پہنچا۔ فتح و نصرت اس کے ہمرکاب تھی۔ لہذا حکومت و اقتدار کا پرچم اقبال مغربی ساحل ہند پر لہرانے لگا۔ اس نوجوان سردار لشکر نے ساحل پر ایک فوجی دستہ محافظت کے واسطے چھوڑ کر اسی راستے سے مراجعت کی۔ ملتان پہنچکر اپنا دارالحکومت قائم کیا۔ اور ۸ ۳ سال تک اپنے مفتوحہ مقامات ہند پر بطور ایک فاتح حاکم کے حکمرانی کرتا رہا۔ قاسم کی وفات کے بعد تمام ہندوستان سے راجپوتوں نے مسلمانوں کو نکال دیا۔ مگر ساحلی عربوں سے کوئی معترض نہ ہوا۔ قاسم کا فوجی دستہ بھی اتنے عرصے میں یہیں کا ساکن ہو گیا تھا۔ لہذا اب ساحل ملابار۔ اور اس کے گرد و نواح کے مقامات پر ان لوگوں کی کافی جماعت ہو گئی۔ جن میں تاجر۔ تبلیغی افراد۔ اور فوجی سپاہی تین گروہ شامل تھے۔ چنانچہ اب تک اس قوم میں یہی تین گروہ موجود ہیں۔

اس زمانے میں اس علاقے کے قدیم باشندے ہندو مذہب کے تھے۔ جن کی قوم کا نام نائر تھا۔ انھیں میں سے مسلمان ہوئے۔ اور ان عربوں نے انھیں لوگوں میں سلسلۂ ازدواج جاری کیا۔ چنانچہ ان کا نام موپلا اسی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ کیونکہ ملایا زبان میں موکے معنی ماں اور پلا کے معنی بیٹے کے ہیں یعنی ماں کا بیٹا جس سے مراد یہ ہو سکتی ہے کہ باپ عربی النسل اور ماں ہندوستانی یعنی ہندوستانی ماں کا بیٹا۔ چونکہ عرب سے کچھ لوگ ایسے بھی آئے تھے جن کی بیبیاں ساتھ تھیں۔ اور باقی بکثرت لوگوں نے انھیں ہندوستانی عورتوں سے نکاح کیا۔ لہذا ہندوستانی عورتیں اپنی اولاد کو اپنی طرف منسوب کر کے مخاطب کیا کرتی تھیں تاکہ امتیازی صورت پیدا ہو جائے۔ بالآخر امتداد زمانہ اور کثرت اولاد کے باعث عربی نام جاذب ہو کر اس پوری قوم ہی کا نام موپلا ہو گیا۔ بعض مؤرخین لفظ موپلا کا استخراج عربی لفظ **مفلح** کو یعنی (فلاح پایا ہوا) بیان کرتے ہیں کہ کثرت استعمال سے مفلح بگڑ کر موپلا ہو گیا۔ ممکن ہے کہ ایسا ہو لیکن واقعات کی کسوٹی پر یہ توجیہ خالص نہیں اترتی۔

اس وقت احاطۂ مدراس اور جزائر سیلون وغیرہ میں جو قوم موپلا کے نام سے مشہور ہے وہ

یہی دو غلے عرب ہیں۔ ابتدائی زمانہ میں کچھ عیسائی عرب بھی ان لوگوں کے ہمراہ بسلسلہ تجارت یہاں آکر آباد ہو گئے تھے جن کی نسلیں اب تک یہاں اپنے آبائی مذہب پر موجود ہیں۔ مذہبی امتیاز کے واسطے مسلمان موپلوں کو جوناکن موپلا کہا جاتا ہے۔ عربی خون ہونے کے باعث متعدد عورتیں کرنے کے یہ لوگ شائق ہیں۔ چنانچہ زمانہ موجودہ میں ۸۰ فیصدی وہ لوگ ہیں جن کی دو یا تین بیبیاں ہوں اور ۲۰ فیصدی کے تین یا چار عورتیں ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے اولاد بکثرت ہو کر اس قوم کی تعداد کافی ہو گئی۔ یہ لوگ ٹرانکور۔ کالی کٹ۔ کنار۔ مالابار اور دیگر بڑے بڑے ساحلی شہروں اور قریوں میں آباد ہیں۔ جزائر سیلان وغیرہ میں بھی ان کی کافی جماعت ہے۔ اور ریاست حیدرآباد کے سرحدی مقامات پر بھی انہیں عربوں کی کچھ نسلیں سکونت پذیر ہیں تیسری صدی ہجری میں بھی بعض قبائل عرب کے چند افراد یہاں آکر آباد ہو گئے تھے مسلمان بادشاہوں کے عہد حکومت میں انکو اشاعت مذہب اور دنیاوی فلاح کے ذرائع بہم پہنچانے میں کافی امداد ملی۔ گورنمنٹ برطانیہ کے عہد حکومت سے پہلے ان لوگوں نے خود مختارانہ زندگی بسر کی۔ یہ اپنے جذبات کو دبانے اور جوش کو رد کرنے کے عادی نہیں خواہ وہ سراسر جہالت اور سرکشی پر ہی کیوں نہ مبنی ہوں۔ مذہبی معاملات میں ان کا جوش بہت خطرناک جنون کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ اپنے مُلا یعنی مذہبی پیشوا کے حکم سے سرتابی نہیں کرتے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ غیر مسلم افراد کو نفرت و غصہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مگر بغیر چھیڑے خواہ مخواہ کسی کو ایذا بھی نہیں پہنچاتے۔ سرحدی افغانوں سے ان کے عادات و خصائل بہت ملتے جلتے ہیں۔ ان کی فطرت میں جنگجوئی۔ جہالت اور غصہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ یہ قوی الجثہ۔ تنومند۔ مضبوط اور بہادر لوگ ہیں۔ سنہ ۱۵۰۰ء سے سنہ ۱۸۸۵ء تک برابر ان میں جھگڑا، فساد اور کشت و خون کا دریا موجیں مارتا رہتا تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ بعض ہندو زمینداران نے اس قسم کی کارروائیاں شروع کی تھیں جس سے ان کے اسلامی جذبات کو ٹھیس لگتی تھی لہذا ان کا مادۂ تعصب ہیجان میں آیا اور ۳۸۵ سال تک عرب کا مادۂ انتقام ہندوستان میں کام کرتا رہا۔ گورنمنٹ ہند نے ان میں فوجی قابلیت دیکھ کر سنہ ۱۸۹۶ء میں موپلا رجمنٹ بھرتی کر کے ان کو سپاہیانہ تعلیم دینی شروع کی لیکن اس پلٹن کی کمانڈ میں بہت دشواریاں واقع ہوئیں۔ اور بالآخر دس سالہ تجربہ کے بعد اس کو توڑنا ہی پڑا۔ محکمۂ پولیس اور "سپیرز اینڈ مائنرز" کی خدمات کے واسطے یہ نہایت مفید ثابت

ہوئے ہیں۔ ان میں نصف سے زائد زراعت پیشہ۔ ان سے کم تجارتی اور سب سے تھوڑے نوکری کرنے والے لوگ ہیں بہیئت مجموعی ان کی مالی حالت اچھی ہے۔ لیکن زیور علم کی جھنکار تک اس علاقہ میں نہیں پہونچتی۔ اس دولت سے یہ قوم کی قوم محروم ہے۔

۱۸۷۳ء میں بلحاظ اعداد مردم شماری موپلا قوم پانچ لاکھ تھی۔ اور اب دس لاکھ سے کچھ زائد ہے۔ کل مدراس کی مردم شماری کا ۱/۱۴ حصہ مسلمان اور مسلمانوں میں ۱/۲ محض موپلا قوم ہے۔ انکی رسمیں اور طریقے بھی عام مسلمانان ہند سے کچھ مختلف ہیں۔ ان کی مساجد کی عمارت بھی نرالی ہوتی ہے۔ ان کی زبان ملایا۔ مدراسی۔ دکھنی اور عربی زبانوں سے مخلوط ہے۔ شمالی مالابار میں ۱۵ برس کا لڑکا اور ۱۴ برس کی لڑکی۔ مگر جنوبی علاقہ میں ۱۶ برس کا لڑکا اور ۱۰ برس کی لڑکی کا عقد کر دیا جاتا ہے۔

سید راحت حسین راحت
دٹرنری ڈاکٹر شاہجہانپور

مرقع شوق

(منشی فاضل جناب عبداللطیف صاحب تپشؔ)

عالم دل ہے نور دیدۂ شوق ۔۔۔ مری ہستی ہے آفریدۂ شوق
چشم پوشی کی ہے طلب یعنی ۔۔۔ پیرہن ہوں مگر دریدۂ شوق
غنچۂ دل سے باز پرس نہ کر ۔۔۔ اے نسیم وفا وزیدۂ شوق
مدعائے نظر ہے حسن نظر ۔۔۔ ہمہ تن بن گیا ہوں دیدۂ شوق

ہے غزل میں تپشؔ شباب کا جوش
لکھ رہا ہوں ابھی قصیدۂ شوق

تاریخ الاعراب

(از مولوی حبیب الرحمٰن صاحب شاہجہانپوری)

پہلے عربی خط نہ تو حرکات ثلثہ سے آراستہ ہوتا تھا۔ نہ ان کے علاوہ کوئی اور نشان زیر و زبر اور پیش کا کام دینے والے تھے۔ بلکہ ان نقطوں سے بھی خالی تھا جو حروف کی شکلیں متعین کر دینے کے لئے وضع کیے گئے ہیں۔ مثلاً لفظ حمل کو اعراب نہ ہونے کی حالت میں آج کل نہیں سمجھ سکتے کہ فعل ہے یا اسم۔ اگر فعل ہے تو معروف ہے یا مجہول۔ اور اسم ہے تو اس کے معنی بھیڑ کا بچہ ہیں یا بوجھ (بار فارسی) لیکن اس وقت کے لوگ کلام کی روانی۔ موقع محل کے تقاضے۔ اور اگلی پچھلی عبارت کی رہنمائی سے بے تکلف پڑھ لیتے تھے۔

نیز یہ وجہ بھی تھی کہ ضرورتیں محدود تھیں۔ تعلقات مختصر تھے۔ الفاظ بھی مقررہ استعمال ہوتے تھے جن پر عبور ہوتا تھا۔ اور اگر چند نامعلوم الفاظ آ بھی جاتے تھے۔ تو سیاق کلام۔ اقتضائے مقام عبارت کی مناسبت سے پڑھ لئے جاتے تھے۔ اور وہ ملکہ بھی مدد کرتا تھا جو اعراب نہ ہونے سے پیدا ہو گیا تھا۔ جیسے اردو میں عدالتی انداز تحریر کہ باوجود غلط رسم الخط کے عادت و مہارت سے پڑھ لی جاتی ہے۔

جب اسلام کا آفتاب چمکا۔ اور اس کی حرارت نے دلوں کو شبنم کی طرح اپنی طرف جذب کرنا شروع کیا تو یہ کشش عرب تک مخصوص نہ رہی۔ بلکہ عجم پر بھی اس کی شعاعیں پڑیں بادیہ نشین عرب آندھی کی طرح اٹھے اور ہدایت کا نور پھیلاتے ہوئے چاروں طرف چھا گئے صحرا گزینوں کو شہر سے اتنی نفرت نہ رہی۔ اخوت کی گرمی نے دلوں کو گرمایا۔ عربی عجمی سب آپس میں گھل مل گئے۔ آخر اس ارتباط باہمی سے نتیجہ یہ نکلا کہ نئی نسلوں نے جب ہستی کی دنیا میں قدم رکھا تو صحیح کے ساتھ غلط الفاظ بھی (جو عجمیوں کے اختلاط کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے) کانوں میں پڑے جن سے وہ ملکہ نوشت و خواند زائل ہونے لگا۔ اور اس مشق میں کمی آنی شروع ہو گئی۔ جو عبارت صحیح پڑھنے کی بڑی معاون تھی۔ مگر باریک بین نگاہیں اس نکتہ سے ناآشنا نہ رہیں اور انھوں نے اس کی اصلی

نہ کو پالیا۔ کہ اگر ان بچوں نے غوں غاں کر کے اپنی اور ضرورتیں پوری بھی کر لیں۔ تو کلام پاک کیونکر صحیح پڑھ سکیں گے۔ حالانکہ یہی دین کی حفاظت کا آلہ۔ اور ایمان کی آنکھوں کا اجالا ہے۔ لہٰذا صحیح دماغوں نے فکر کے دریا میں غواصی کی اور عقلوں نے غور و فکر کے ریگستان کو چھاننا شروع کر دیا اور دُرِ مقصود حاصل کر لیا۔

(۲)

ایک رات آسمان کھلا ہوا تھا۔ تارے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی نے سبزے کے صاف میدان پر بیلے کی کچی کلیاں بکھیر دی ہیں۔ کچھ کھل چکی ہیں۔ اور کچھ کھلا چاہتی ہیں۔ یہ دیکھ ابوالاسود کی لڑکی نے اپنے باپ سے کہا ما احسنُ السماءِ بضم النون (آسمان پر سب سے اچھا کیا ہے) ابوالاسود نے جواب دیا نجومہا (اس کے تارے) لڑکی نے کہا میں سوال نہیں کرتی۔ تعجب کر رہی ہوں۔ ابوالاسود نے کہا تو تجھے ما احسنَ السماءَ (بفتح نون) (آسمان کیا ہی اچھا معلوم ہوتا ہے) کہنا۔ اور ذرا منہ کھول دینا چاہیئے تھا تاکہ صورت بھی تیرے جذبے کی مصدری کر دیتی جب علی رضی اللہ عنہ سے یہ واقعہ عرض کیا گیا تو آپ نے ابواب نحو میں سے باب اِنّ۔ باب الاضافہ باب الامالہ تعلیم فرما کر علم نحو کی ترتیب کا حکم دیا۔ ابوالاسود نے تعمیل کی اور باب العطف۔ باب النعت باب التعجب۔ باب الاستفہام اور اضافہ کیا لیکن اس سیلاب کو جو طوفان کی طرح بڑھتا چلا آتا تھا تحریک تحت فرو نہ کر سکی۔ اور کلام پاک کی صحیح تلاوت کئے جانے کی بابت اطمینان نہ ہوا۔ لہٰذا زیاد بن سمیہ نے (جو اس وقت بصرہ کا والی تھا) ابوالاسود سے درخواست کی کہ وہ کوئی ایسا کُل اصل بتائیں جو حسب خواہش بصیرت کی آنکھیں کھولنے والا ہو۔ ابوالاسود نے چند وجوہ سے انکار کیا۔ زیاد نہایت ذکی اور عقلمند تھا۔ اس نے ایک برجستہ پہلو اختیار کیا۔ اور ایک شخص سے کہا۔ تم جا کر ابوالاسود کی گذرگاہ پر بیٹھ جاؤ۔ جب وہ قریب آ جائیں تو کلام پاک کی غلط تلاوت کرنا۔ مگر یہ ظاہر نہ ہو کہ تم ان کو سنانا چاہتے ہو۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ اور یہ آیت پڑھی۔ ان اللہ بری من المشرکین ورسولِہ رسول کے لام کو مکسور پڑھا تو معنی یہ ہو گئے (خدا مشرکین اور رسول سے بیزار ہے) حالانکہ تھا لام کو فتح یعنی "خدا اور رسول مشرکین سے بیزار ہے" یہ بات ابوالاسود پر بہت سخت گذری۔ فرمایا۔ خدا اس سے مبرا ہے کہ وہ اپنے رسول سے بیزار ہو۔ زیاد کی تدبیر کارگر ہوئی۔ ابوالاسود فوراً اس کے

پاس واپس آئے۔ اور رضامندی ظاہر کرکے چند کاتب طلب کئے۔ ان میں سے قبیلہ عبد قیس کا ایک شخص منتخب ہو گیا کہ وہ قواعد تجوید جس طرح ابو الاسود فرمائیں قلمبند کرتا رہے۔

اب ابو الاسود نے ایک جلد صحیفہ الٰہی کی اور چند رنگ منگائے۔ اور اس کاتب سے فرمایا جب میں تلاوت کروں تو جس حرف پر اپنے لبوں کو کھول دوں تو حرف کے اوپر اس رنگ سے ایک نقطہ لگا دینا۔ اور اگر میں لبوں کو نیچے کی جانب جھکا دوں۔ تو ایک نقطہ حرف کے نیچے دیدینا۔ لیکن جب میں ہونٹوں کو ملا کر غنچہ کی طرح بنالوں تو حرف کے بائیں جانب ایک نقطہ لگا دینا اور جس حرف کے بعد بھنبھناہٹ (نون غنہ کی آواز) محسوس ہو تو ایک کی جگہ دو نقطے لگانا۔ یہ اصول تعلیم فرما کر آپ نے آہستہ آہستہ تلاوت شروع کی اور کاتب نقطے لگانے لگا۔

اسی طرح روز آپ تلاوت فرماتے رہے۔ تھوڑے دنوں میں قرآن مجید معرب ہو گیا۔ اور اس طریقے نے رواج کی سند حاصل کر لی۔ اب لوگ فتحہ، کسرہ اور ضمہ کی جگہ ایک ایک نقطہ اوپر نیچے اور بائیں طرف لگاتے تھے۔ اور تنوین والے حرف پر دو نقطے۔ لیکن اس کے بعد اگر کوئی حرف حلقی (ح۔خ۔ع۔غ۔ ہ۔ ء) ہوتا تو دوسرے نقطے کو پہلے کے اوپر لگاتے اور یہ اظہار نون کی علامت تھی۔ ورنہ پہلے نقطے کی ایک جانب۔ تاکہ خفائے نون کا نشان ظاہر ہو۔ ان علامات سے خالی ہونا حرف ساکن کی پہچان تھی۔ مثال ملاحظہ ہو۔

سلا مفولا مں ب رحلیم

(۳)

ہمیشہ سے زمانہ ترقی کے پر لگائے ہوئے تہذیب و تمدن کی ہوا میں اڑنے کا عادی ہے آئے دن ایجاد و اختراع کے ستارے طلوع ہوتے ہیں۔ اور ان کو جدت پسندی کی نظریں خوش آمدید کہتی چلی آئی ہیں۔ اسی اصول کے مطابق ابو الاسود کے بعد ان نقطوں میں تفنن کے قلم نے ایک نیا رنگ بھرا۔ کسی نے ان کو مربع بنایا۔ کسی نے گول ٹھوس۔ اور کسی نے اندر سے خالی۔ اس طرح

▬ ● ○

اہل مدینہ نے جدت کا آفتاب یوں چمکایا۔ کہ حرف مشدد کے لئے ایک قوس ایجاد کی جو حرف مفتوح کے اوپر بنائی جاتی اور فتحی نقطہ اس کے اندر دیا جاتا تھا۔ اس طرح ۔ٚ۔ اور مکسور

حرف کے نیچے ۔ اور کسرہ کا نقطہ اس کے نیچے دیا جاتا ۔ اس طرح تَ حرف مضموم کے بائیں جانب اور ضمہ والا نقطہ قوس کی جنوبی طرف اس طرح بِ ۔ کچھ دنوں کے بعد نقطے لگانا بھی چھوڑ دیا گیا ۔ اور نقطوں کی جگہ قوس کی ہیئت بدل کر لکھنے لگے ۔ حرف مفتوح کے لئے تو بدستور سابق ۔ مگر مکسور و مضموم کے لئے معکوس ۔ اور سرنگون حرف مفتوح کے لئے اس طرح بَ مکسور کے لئے اس طرح بِ اور مضموم کے لئے اس طرح ۔ چنانچہ موجودہ تشدید کی صورت صاف بتاتی ہے کہ دائیں بائیں کے دندانے اسی قوس کی یادگار ہیں ۔ اور درمیانی دندانہ وہی فتحہ کا نقطہ ہے ۔ یہ ترقی کا اثر ہے کہ وہ ان دونوں سے ایک قدم آگے بڑھا ہوا ہے ۔

ابوالاسود کے متبعین نے ان علامات میں کچھ اور اضافہ کیا ۔ وہ تمام حروف ساکن کے اوپر اس سے کچھ دور ایک کشش سی بنا دیتے تھے ۔ اور صرف الف وصل سے وہ کشش متصل رکھتے تھے ۔ لیکن اگر الف وصل کا ماقبل مفتوح ہو ۔ تو اوپر ۔ اور کسرہ کی حالت میں نیچے ۔ مگر رفع (ضمہ) کی صورت میں درمیان میں یہ کشش کھینچتے تھے ۔ جیسے نقشہ ذیل سے ظاہر ہے ۔

مفتوح ا مکسور مضموم

(۴)

کلام پاک کی عبارت عموماً سیاہی سے لکھی جاتی تھی اور نشانہائے مذکورہ سرخی سے یعنی عبارت اور علامات میں اختلاف رنگ ضرور ہوتا تھا ۔ اہل مدینہ ہمزہ کو زرد رنگ سے لکھتے تھے اندلس والوں کے حسن نظر نے اس پر بھی اکتفا نہ کی ۔ اور ان کے مذاق رنگین نے قرآن مجید کی کتابت چار رنگوں میں دیدہ زیب کی ۔ حروف سیاہ ۔ اعراب سرخ ہمزہ زرد ۔ الف وصل سبز لیکن یہ تمام ایجادیں محض کلام پاک ہی تک محدود و مخصوص رہیں ۔ خطوط وغیرہ کی کتابت میں شاذ و نادر ہی ان کا پاس ملحوظ ہوتا تھا ۔ کیونکہ اس میں مکتوب الیہ کی ذکاوت پر حرف آنا محسوب تھا ۔ بعض آدمیوں کو تو معرب خط نہ صرف ناپسند ۔ بلکہ ان کی عزت خودداری ۔ اپنے کاتب مکتوب سے مطالبہ خواہ توہین ہوتی تھی ۔ چنانچہ ایک مرتبہ عبداللہ ابن طاہر کو کسی نے ایک خط دکھایا جو علاوہ خوشخطی کے معرب بھی تھا ۔ انھوں نے حسن رقم کی تو تعریف کی ۔ مگر آرائش اعرابی پر ناک بھوں چڑھا کر کہا مااحسن ھذا الخط لولا کثرۃ شونیزہ کیا اچھا خط تھا ۔ اگر اس پر کلونجی

نہ پھیلی ہوتی۔ نقطوں کو کلونجی سے تشبیہ دے کر اس رسم کی مخالفت کی ؎

حبیب الرحمٰن حبیب

السلطان ظل اللہ

بہنائے ہستی میں جس قدر یہ مقولہ اپنے استعمال کی کثرت سے ممنون شہرت ہے، اسی قدر اس کا مفہوم معنوی اپنی ظاہری آوازہ میں محجوب حقیقت بھی ہے۔ فطرت سلطانی کے مصوّر اور نقاش حضرت "شیخ سعدی علیہ الرحمۃ" نے شاہانہ خصائل کی محبوبانہ بے پروائیوں کا صحیح مرقع "گاہے بسلامے برنجند و گاہے بدشنامے خلعت دہند" پیش کر کے جہاں سلاطین کی طبیعت ثانیہ سے دنیا کو روشناس کیا، وہیں عرصۂ کائنات میں یہ راز بھی منکشف کر دیا کہ اس مقولہ کے اعماق میں عادت الٰہیہ کی ان پراسرار مضیون کا تنوع مخفی و مکنون ہے جس کی نوعیت ظہور نہ صرف اس کلیہ کی شان نزول ہے۔ بلکہ مظاہر عالم کی ہر مقتدر ہستی اسی شان علوی کا ایک ظہور ثانوی ہے۔

سلاطین دنیاوی کے طبعی جذبات اور انسانی فطرت کا مطالعہ بظاہر یہ طرز روش نظر کر دیتا ہے کہ شاہی عادات کا تنوع محض نشۂ دولت کی متلون ترنگیں ہیں۔ مگر ارباب معرفت کی نکتہ رس نگاہیں اس حقیقت سے بھی آشنا ہیں کہ درحقیقت یہ عفو و عتاب۔ اس قادر مطلق ہستی کے شیون طبیعت کا ظل اور پرتو ہیں جس کے نہ مراحم خسروی کسی عمل سعادت کی مزد و جزا ہیں اور نہ شاہانہ قہر و غضب ہی وقت و زمانہ کا موقوف ہے۔

کونین کے مالک بادشاہوں کے بادشاہ اللہ جل شانہ کی ذاتی خواہشیں تحریک غیر کے دخل و مزاحمت سے معرا و مبرا ہیں اس کی لاشریک سلطنت کا قانون۔ اس کی مطلق حکومت کی خود مختاری جہاں باوجود ہر قدرت کے انتقامی مطالبوں اور مواخذوں سے بے نیاز ہے۔ وہیں اس کا شاہانہ جود و کرم۔ مالکانہ بخشش و احسان عطائے انعام میں بھی تلاش سبب سے مستغنی ہے۔ وہ کبھی دشمنوں سے اس سلوک کو حسن عمل جانتا ہے جو دوستوں کے لئے باعث رشک ہوں۔ اور کبھی دوستوں کی خلوص سے وہ دامن افشانی شان معبودیت سمجھتا ہے۔ جو زمانہ کے لئے موجب حیرت ہو۔

عہد ماضی کے مشہور شاعر "عمر خیام" کے سوانح عمری میں جو واقعہ اس کے افسانۂ زندگی کا اہم ترین عنوان ہے وہ اسی شعبہ مشیت کی تفسیر و بیان ہے۔

ایک دن خیام اپنے ناکام تمنا جذبات اور مایوس آرزو ولولوں سے تنگ آ کر خاموش تھا۔ مگر فطرت انسانی کی کم ظرفیاں و نالشیں گلے شکووں کو اس صورت سے زبان پر لے آئیں ؎

ابریق مے مرا شکستی ربی   بر من در عیش را ببستی ربی
بر خاک بریختی مے ناب مرا   خاکم بدہن مگر تو مستی ربی

مشرب کی آزادی نے اگرچہ لہجۂ شکایت میں گستاخانہ اسلوب اختیار کیا۔ مگر نیاز عبدیت نے گلوں کو حد ادب سے باہر نہ ہونے دیا۔ مستی کا طعنہ بھی دیا تو خاکم بدہن کی معذرت کی ساتھ دیا۔ بجز و سوء احترام گوارا نہ ہوا۔ لیکن قدرت نے اس دریدہ دہنی میں بھی اپنے احترام و مراتب کی توہین محسوس کی۔ شاہی عتاب مشتعل ہوا۔ اور خیام کی صورت مسخ کر دی۔ اور اس وقت تک اس ظلمت زندگی کی تاب ماہیت گوارا نہ ہوئی جب تک اعتراف جرم کے ساتھ اسی جبین منحرف کو سنگ معذرت پر نہ رگڑ ڈالا۔ سنا ہے خیام کے ضمیر منفعل نے جب جواباً یہ کہہ لیا ؎

آں کس کہ گنہ نہ کرد چوں زیست بگو   ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی   پس فرق میان من و تو چیست بگو

تو رحمت الٰہی جوش میں آئی اور اس سیاہی کو نور ایمان سے تبدیل کر دیا۔ لیکن اس کے مقابل میں ہندوستان کے ایک مسیحائے آفتاب پر خاک اچھالی۔ اور بلا تقریب معذرت حملہ کیا ؎

یارب تو کجائی کہ بسا زر ندہی   بے درد خدائی کہ بسا زر نہ دہی
نے سفلہ تو غائبی نہ بے رحمی   بے مایہ چہ مائی کہ بسا زر نہ دہی

مگر اس عطا و بزرگانہ کا دل تک نہ میلا ہوا۔ یہ ہے شان استغنا اور بارگاہ بے نیازی ؎

بے نیازی کے کرشمے ہیں یہ سب رحم و غضب   نہ کوئی وقت ہے اس کا۔ نہ کوئی اس کا سبب

"مجذوب"

قابوس نامہ

(۶)

بسلسلہ سابق ستمبر ۱۹۲۱ء

جوانمردی ازکار ہا پیشہ کن ✻ جوانمردی و راستی پیشہ کن
از ین مرد دانندہ بشنو سخن ✻ ہمہ نیکوئی اندر اندیشہ کن

آخر میں قابوس نامہ کے آخری باب جوانمردپیشگی پر کچھ کہنا مناسب سمجھتا ہوں۔ جوانمردی ایک مجہول سی اصطلاح ہے جس کو ہم کبھی فیاضی کبھی بہادری کے مفہوم میں استعمال کرتے ہیں مصنف کے نزدیک جوانمردپیشگی کوئی صفات انسانی میں سے نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک پیشہ ہے تمہید میں وہ گویا ہے کہ تین صفات انسانی ایسے ہیں۔ جن کی نسبت ہر شخص اپنے زعم میں یہی دعویٰ کرتا ہے کہ مجھ میں وہ موجود ہیں۔ دانا۔ اور نادان سب خدا سے ان کے بارے میں خوشنود ہیں۔ اگرچہ مشکل سے وہ کسی میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں عقل۔ راستی۔ مردمی۔ اب ایک دراز فلسفیانہ مسئلہ کی تشریح کے بعد جس کا یہاں دہرانا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے مصنف کہتا ہے کہ جب فیض علوی کا منفذ روحانی مسدود ہو جاتا ہے۔ تو نتیجہ محض دعویٰ ہے اور معنی ہیچ۔ اس لئے دنیا میں کوئی شخص نہیں ہے۔ جو مردمی کا مدعی نہیں۔ اس لئے تم کوشش کرو کہ تعلیم و تفہیم کے ذریعے سے فیض علوی کا منفذ کشادہ رکھو تاکہ تمھارا دعویٰ بامعنی ہو۔ جوانمردی تن ہے۔ دانش حواس اور معانی صفا ہے۔ بعض مخلوق کو مبدء فیاض سے تن عطا ہوا ہے۔ اور کچھ نہیں ملا۔ ایک گروہ کو تن اور جان اور حواس۔ اور ایک گروہ کو تن۔ جان۔ حواس اور معانی جس قوم کو تن ملا ہے۔ وہ عیار اور سپاہی ہیں۔ جن کو تن اور جان ملے اصحاب معرفت ظاہری جن کو تن جان اور حواس ملے۔ ان میں حکما انبیاء اور اوصیاء ہیں۔ ان کی مردمی کا نام دانش ہے جس گروہ کو تن جان اور معانی ملے۔ وہ روحانی راہبر اور پیغامبر ہیں۔ پس جس شخص میں جس قسم کی جوانمردی ہو اسکی

اصل سے اس کو واقفیت پیدا کر لینا چاہیئے۔ جوانمردی کا اصل الاصول تین باتیں ہیں۔ پہلی جو کچھ کہو کرو۔ دوسری راستی کے خلاف کوئی کام نہ کرو۔ تیسری صبر و شکیب پر عمل کرو۔ اسی مقصد کو زیادہ واضح اور روشن کرنے کی غرض سے مصنف گویا ہے "جوانمردی سے یہ مفہوم مراد ہے کہ آدمی میں چند ہنر ہوں یعنی وہ دلیر اور مردانہ ہو۔ اور ہر کام میں شکیبا ہو۔ وعدے کا سچا۔ پاک طینت اور صاف دل ہو۔ اپنے نفع کی خاطر دوسروں کا نقصان نہ کرے۔ اپنا نقصان دوسروں کے نفع کے خیال سے منظور کر لے۔ اسیروں پر ہاتھ نہ اٹھائے۔ مظلوموں کی دستگیری کرے۔ بدوں کی بدی نیکوں سے دور کر دے۔ سچ بات سنے اور کہے جس دسترخوان پر کھائے اس کی برائی نہ کرے۔ نیکی کا بدلہ بدی نہ دے۔ زبان پاک رکھے اور مصیبت کو راحت جانے۔ اور حقیقت میں اگر دیکھا جائیگا تو یہ صفات ان ہی تینوں صفات کی آواز بازگشت ہیں" مندرجہ بالا سپاہیانہ جوانمردی ہے جس کو عیار پیشگی بھی کہا جاتا ہے۔ کرم۔ مہمانداری سخاوت۔ حق شناسی۔ پاک جالگی۔ اور مدارا سپاہی میں زیادہ ہونا چاہیئے۔ بہ نسبت زبان دوستی اور خویشتن دوستی کے۔ عجز و انکسار سپاہی میں ہنر ہے۔ لیکن عیاری میں عیب ہے۔

حکایت ایک روز قہستان میں کچھ عیار جمع تھے۔ ایک شخص ان کے پاس آیا۔ اور بولا کہ میں عیاروں کا قاصد ہوں۔ اور تم سے تین باتیں پوچھنے آیا ہوں۔ اگر جواب باصواب دیا تو ہماری جماعت کے عیار تمھاری بہتری کے قائل ہو جائیں گے۔ ورنہ تم کو ہماری افضلیت ماننی ہو گی۔ قہستانیوں نے پوچھا۔ وہ مسئلے کیا ہیں بیان کرو۔ اس نے کہا۔ پہلا سوال یہ ہے کہ جوانمردی کیا ہے۔ دوسرا۔ جوانمردی اور ناجوانمردی کے درمیان کیا ہے۔ تیسرا۔ اگر کوئی عیار رستہ پر بیٹھا ہو اور کوئی آدمی گزرے۔ اس کے کچھ دیر بعد اسی آدمی کے تعاقب میں ایک شخص شمشیر برہنہ لئے ہوئے اس کے قتل کے لئے آ رہا ہو۔ اور اس سے پوچھے کہ کیا فلاں آدمی ادھر سے گزرا ہے تو کیا جواب دیا جائے۔ اگر یہ کہا جاتا ہے کہ گزرا ہے تو ایک شخص کو رسوا کیا جاتا ہے اگر یہ کہا جاتا ہے نہیں گزرا دروغ گوئی ہوتی ہے۔ اور تم جانتے ہو۔ ان دونوں باتوں کی عیاری میں اجازت نہیں ہے۔

قہستانی عیار یہ سوال سن کر سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ان میں ایک شخص

فضل اللہ نامی ہمدانی تھا۔ اس نے کہا میں جواب دیتا ہوں پہلے سوال کا جواب ہے کہ جو کچھ کہو کرو۔ دوسرے کا جواب ہے۔ جوانمردی اور ناجوانمردی کے درمیان صبر ہے۔ تیسرے کا جواب یہ ہے کہ عیار اس مقام سے ہٹ کر کہے کہ جب سے میں یہاں بیٹھا ہوں ادھر سے کوئی نہیں گزرا۔ تاکہ سچ بولے۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ عیار و عیار پیشہ سے مصنف ایک خاص اصطلاح مراد لیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ایک جنگی فرقہ تھا۔ جو چند خاص اصول اور فرائض کا پابند تھا۔ ہمارے ادبیات میں اس فرقہ یا اخوت کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ افسانہ کی کتب مثلاً داستان امیر حمزہ وغیرہ میں عیاروں کے متعلق ایک بالکل غیر تاریخی اور مختلف بیان ملتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ جس طرح درویشوں اور صوفیوں کا ایک علیحدہ فرقہ ہے۔ اور جس کو ہم اپنے زمانے میں بھی دیکھتے ہیں۔ اسی طرح عیاروں کا فرقہ اپنے مرکز میں علیحدہ تھا۔ جو شاید خروج مغول کے دور میں یا اس کے بعد مفقود ہو گیا۔

یورپ کے قرون وسطیٰ کے جنگی طبقات (ملٹیری آرڈرس) اور مغربی (شولری) جوانمردی عیاروں کی جماعت سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ افسوس ہے کہ مصنف نے اس جماعت کے جو چند اور مختصر خط و خال دئے ہیں۔ اس کی پوری نوعیت کی تصویر نہیں اتارتے لیکن یورپین جوانمردی سے مقابلہ کے لئے کافی ہیں۔

جوانمردی کے ضروری صفات انگریزی مورخ گبن کے نزدیک یہ ہیں۔ خدا۔ اور عورات کا حامی ہونے کی حیثیت سے سچ بولنا۔ حق کی حمایت کرنا مظلوموں کی حفاظت کرنا خوش خلقی سے کام لینا۔ کافروں کا (مسلمانوں کا) تعاقب کرنا۔ عیش و آرام کی دلکشی کو حقارت سے دیکھنا۔ اور مہالک میں پڑکر اپنی وضعداری کی شان قائم رکھنا وغیرہ۔ ایک جوانمرد کا پیشہ ہے۔

ایک اور انگریزی مورخ ہیلم کے نزدیک۔ دلیر۔ صادق الوعدہ۔ خوش خلق اور فیاض ہونا جوانمردی کے لئے ضروری ہے۔ اس کے علاوہ انصاف کا علی درک۔ حق تلفی کے خلاف تندی غضب۔ جوش۔ دلاورانہ عزم۔ اس کے بہترین انجام کے لئے نقصان کا امتناع۔ یا اس کی تلافی۔ ان صفات پر اور اضافہ ہونا چاہئیں۔"

جوانمردی کی مشرقی اور مغربی تصویر علیحدہ علیحدہ دکھا دی گئی ہے۔ اس کے اکثر خط و خال دونوں میں عام ہیں۔ مثلاً دلیری۔ ایفائے عہد۔ مظلوموں کی حق رسی۔ راستی۔ فیاضی۔ آرام کی زندگی پر واقعہ طلبی کی زندگی کو ترجیح دینا۔ اب ظاہر ہے کہ ایک اصل ہو۔ اور دوسری نقل اور یہ کہ مشرق کے اتباع میں مغرب نے یہ پیشہ اختیار کیا۔ اس کا ثبوت بہم پہنچانا چنداں مشکل نہیں ہے۔ چنانچہ خود مورخ ہیلم کہتا ہے۔

"جوانمردی کی مخصوص صفات۔ ان اوصاف سے بہت کچھ مماثلت قریبہ رکھتی ہیں۔ جن کے ان زمانوں کے مشرقی مصنف بہت ثنا خواں معلوم ہوتے ہیں کہ میں کسی قدر یہ گمان کرنے کے لئے مائل ہوں کہ یورپ نے اس بارہ خاص میں ایشیا کی تقلید میں کچھ ترقی حاصل کی ہے۔ اگرچہ حروب صلیبی کا فروں (مسلمانوں) کی منافرت میں آغاز پائی ہیں لیکن ان کے اختتام سے پیشتر یہ جذبہ کسی حد تک مفقود ہو چلا تھا۔ اور باقاعدہ تجارتی معاملات اور بعض اوقات عیسائی فلسطین اور مسلمانوں میں اتحادی تعصب کو کسی قدر دور کر دیا ہوگا۔ جنگ میں ان کے دشمنوں کی بہادری اور فیاضی کا مشاہدہ ان بہادر سورماؤں کے دل سے باقیماندہ عصبیت دور کرنے میں کامیاب ہوا ہوگا باستثنائے تعشق عورات جو ان کے ہاں رسماً و عرفاً ممنوع ہے۔ اسلامی رؤسا مغربی جوانمردی کے فرائض ضرورت سے زیادہ انجام دہینے کے قابل تھے۔

عیارانہ جوانمردی سے افضل وہ صنف ہے جو طبقۂ علما و صلحا میں پائی جاتی ہو وہ کہا گیا کہ اس طبقہ کو جان اور تن دونوں ملتے ہیں۔ راستی جان ہے۔ اس لئے ان کے افعال اور اقوال پسندیدہ اور باورع ہونا ضروری ہیں۔ دین میں مضبوط اور ریا سے بری ہوں۔ دین کو سوکھی معاملہ میں غصہ کا اظہار نہ کریں۔ کسی کی پردہ دری نہ کریں۔ ایسے فتوے نہ دیں جو سوگند یا طلاق میں انجام پائیں۔ دین کو دنیا کے عوض فروخت نہ کریں۔ نمائش نہ کریں۔ مجمع میں فاسق کو بھی ملامت نہ کریں۔ کسی کے قتل کا فتویٰ نہ دیں۔ اگرچہ وہ مستوجب قتل ہو۔ مذہب میں بوجہ تعصب کسی کو کافر نہ کہیں۔ کیونکہ کفر دین کے خلاف ہے۔ مذہب کے خلاف نہیں۔ جدید علم یا کتاب سے انکار

نہ کریں۔ کیا یہ ضروری ہے۔ جو تم نہ جانو وہ کفر ہو خدا کے رحم سے مایوس اور گناہ پہ دلیر نہ ہو۔
اہل تصوف کی جوانمردی کے شرائط اور فرائض وہ علیحدہ بیان کرتا ہے۔ ضمناً وہ تصوف کے آغاز
پر بھی کچھ روشنی ڈالتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اس طریقہ کی بنیاد حضرت عزیز نے ڈالی تھی۔ رسول اللہ
صلعم کے زمانے میں بارہ مرقع پوش اشخاص تھے۔ رسولؐ ان سے محبت کرتے تھے۔ اور اکثر خلوت
میں ان سے مجالست رکھتے تھے۔ موجودہ صوفی گری کے لئے عنصر المعالی گویا ہے کہ وہ پارس
میں وجود میں آئے۔ تصوف کے اصول اکثر صوفیوں نے لکھے ہیں۔ ان میں ابو القاسم کے
رسالہ آداب التصوف۔ شیخ ابو الحسن القدسی کی بیان الصفا۔ ابو منصور دمشقی کی کتاب عظمت اللہ
اور علی واحدی کی کتاب العیان فی کشف العیان ما ذکر (کذا) کا ذکر کرتا ہے۔

پیشتر اس کے کہ میں قابوس نامہ کو ختم کروں۔ اس کی تاریخی حیثیت پر بھی چند الفاظ
اضافہ کرنا چاہتا ہوں مصنف حدیقۃ الاقالیم۔ اور مصنف شاہد صادق اور دولت شاہ
اس سے بخوبی واقف ہیں۔ ان لوگوں نے اس کتاب کے اکثر بیانات سے فائدہ اٹھایا ہے
فرشتہ حمد اللہ مستوفی اور صاحب نگارستان یا تو براہ راست قابوس نامہ سے مستفید ہوئے
ہیں۔ یا اس کے بعض بیانات کسی اور ذریعے سے ان تک پہنچے ہیں۔ کیونکہ کئی تاریخی روایات
کے لئے یہ کتاب اور صرف یہ کتاب سند ہے۔ یہاں میں بعض کا بالاجمال ذکر کرتا ہوں۔

(۱) قابوس کے آخری ایام اس کے قید اور قتل کے واقعہ سے تاریخ بالکل بے خبر تھی۔ تذکرہ دولت
شاہ اور حبیب السیر میں البتہ ہم یہ ذکر پڑھتے ہیں لیکن ان کی سند یہی قابوس نامہ ہے۔

(۲) سلطان محمود غزنوی کا تہدید آمیز خط خلیفہ قائم باللہ کے نام۔ اور خلیفہ کا جواب میں
"الم" لکھ بھیجنا۔ یہ قصہ جہاں کہیں گیا ہے۔ قابوس نامہ سے گیا ہوگا لیکن تاریخ میں اس قصہ کے متعلق
کئی گروہ ہیں۔ ایک گروہ کا بیان ہے کہ خلیفہ نے چونکہ فردوسی کو پناہ دی تھی اور سلطان کے پاس
بھیجنے سے انکار کیا تھا۔ اس لئے یہ خط لکھا گیا۔ اس میں تاریخ گزیدہ" دیباچہ مایستنفری اور نگارستان
شریک ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ وہ خط خلیفہ بغداد کے نام نہیں تھا۔ بلکہ اسپہبد شہریار
بن شیروین والی طبرستان کے نام تھا تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ خط اگرچہ خلیفہ بغداد ہی کے نام تھا
لیکن بنائے فساد ملک ترکستان تھا۔ سلطان اس ملک کو اپنے قلمرو میں شامل کرنا چاہتا تھا۔

اور خلیفہ نے اس کی مخالفت کی تھی۔ اس خیال کا مدعی ابوالقاسم فرشتہ ہے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ قابوس نامہ کے بیانات جو تاریخ گزیدہ سے قریباً ڈھائی سو برس پرانی ہیں۔ قول فیصل ٹھہرتے اور فرشتہ کے بیانات کی من وعن تائید کرتے ہیں۔

(۳) سیدہ مادر مجد الدولہ کا سلطان محمود غزنوی کے حملے سے ایک خط کے ذریعے سے اپنے ملک کو بچا لینا یہ قصہ نگارستان میں درج ہے لیکن اس کی سند اولین یہی قابوس نامہ ہے۔

(۴) امیر ابوالسوار شاہ۔ ابن الفضل اور اس کے بزرگ امیر فضلون والیان گنجہ کے ناموں تک سے آج ہم واقف نہ ہوتے۔ اگر مصنف اتفاقیہ ان کا ذکر نہ کر دیتا۔

(۵) سلطان مودود غزنوی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے میں آٹھ سال تک غزنیں میں سلطان مودود کا ندیم رہا لیکن ہمیشہ ان تین باتوں کا اس کو پابند پایا (۱) جب کبھی کسی کو وہ سو دینا اسے کم انعام دیتا۔ کبھی زبان پر نہ لاتا۔ بلکہ پرچہ کے ذریعے دلواتا (۲) کبھی اتنا نہ ہنستا کہ اس کے دانت نظر آجائیں۔ (۳) کتنا ہی غضب میں کیوں نہ ہو۔ گالی کے واسطے بے حمیت کے سوائے اور لفظ استعمال نہ کرتا۔ نمبر اول کا ذکر تاریخ شاہد صادق میں ہے لیکن محمد صادق اس کو سلطان محمود کے نام سے منسوب کرتا ہے۔

(۶) ابوالعباس روبانی قاضی طبرستان اور درخت کی شہادت پر اس کا فیصلہ شاہد صادق میں اس کا نام ایاس بن معاویہ قاضی ہے۔

(۷) سلطان محمود اور ابوالفرج سعی عاملان کا قصہ صاحب اسمٰعیل ابن عباد اور خاقانی کا شغر کے متعلق اس کی اندیشناکی صاحب اسمٰعیل اور ربیع بن منظر القصری وغیرہ یہ تمام قصے شاہد صادق میں ملتے ہیں لیکن یہی قابوس نامہ اس کی سند معلوم ہوتی ہے *

(منشی فاضل حافظ محمود خان شیرانی ٹونکی)

جوانمردی از کار ہا بہتر است	جوانمردی از خوئے پیغمبر است
دو گیتی شود بر جوانمرد راست	جوانمرد باش و دو گیتی تراست

داستان حقیقت

(چکیدۂ رقم خاتون محترم ن۔ خ۔ ش صاحبہ آف علی گڑھ)

ہوگیا ہستی کا روشن چہرہ گرد غم سے تار — جب ہوا دیو سیاہ شب کا قائم اقتدار
تیرگی کی گود میں سرشار خواب ناز تھے — قہقہہ۔ گانا۔ بجانا۔ چیخ۔ نالہ۔ غل۔ پکار
اک فلاکت گاہ تھا۔ اور ظلمت و بے رونقی — اک سخن پرواز تھی اور اضطراب و اضطرار
دل سے میں کہتی تھی نیند آئے تو جائے رنج و غم — دل پہ تھا خود ہی گراں خواب گراں کا انتظار
کثرت اوہام خلجانات سے پر تھا دماغ — نیند بیچاری کا پھر واں کس طرح ہوتا گزار
بے سکوں تکیہ پہ سر تھا ماہی تشنہ کی شکل — وقف گردش تھے جو اب صورت لیل و نہار
کھینچ گیا نقشہ تھا بیمار قریب المرگ کا — ہاتھ دے دے مارتی تھی پٹیوں پہ بار بار

آخر اٹھ کر جوش وحشت میں نگہ کی ہر طرف — بھر کے پھر اک آہ سوزاں چیخ اٹھی بے اختیار
کاش کرتا دفع افکار آ کے کوئی بذلہ سنج — کاش کرتا قصہ خوانی آ کے کوئی غمگسار
ناگہاں اک حور سے مسکن مرا جنت بنا — دیکھ کر جس کو ہوئی میں مدح سنج کردگار
مظہر شان تقدس تھی جبین تابناک — خندہ روئی سے مگر تھی خوش مزاجی آشکار
دیکھ کر اس کندنی رنگت کی آب و تاب کو — چاند۔ سورج۔ آئینہ۔ گل۔ شمع سب تھے شرمسار
قدرداں کو ڈھونڈتی تھی جسم کی موزونیت — نکتہ چیں پر ہنس رہے تھے بحیط نقش و نگار
نرگس فتاں میں تھی فہم و فراست کی چمک — کیوں نہ ہو۔ کم سن نہ تھی وہ پختہ مغز و پختہ کار
سحر زہد و اتقا سے یا طلسم حسن سے — اب بھی باغ عمر میں تھی نزہت فصل بہار
لمبے لمبے۔ کالے کالے۔ بال تھے بکھرے ہوئے — اس پہ پوشش بھی سیہ۔ قاتل کہوں یا سوگوار
گرچہ صوفی مشربی تھی مانع مشاطگی — غازۂ شرم و حیا تھا سو سنگھاروں کا سنگھار
گردن سیمیں کا زیور سبحہ و زنار تھے — مل رہے تھے یا گلے بچھڑے ہوئے دو دوستدار
ہاتھ میں پوجا کی تھالی تھی۔ بغل میں جانماز — تھا کبھی "بھگوان" لب پر اور کبھی "پروردگار"

شعلہ زن تھا۔شاید آتشخانۂ دل میں الم کھینچتی تھی ورنہ کیوں سینے سے آہ پُرشرار
کس لئے لب خشک تھے برگ خزاں رس کی طرح کس لئے رخسار زیبا زرد تھے مدقوق وار
دلنشین لہجے میں بولی رکھ کے میرے سر پہ ہاتھ کیوں ہے اتنی دل گرفتہ کیوں ہے اتنی بیقرار
تجھ کو یہ حاجت کہ کرتا کوئی ذکر درد دل مجھ کو یہ حسرت کہ سنتا کوئی شرح حال زار
بولی میں "کیا چاہئے اندھے کو آنکھوں کے سوا" "دُرفشاں ہو اے حسین! اے نیّر نصف النہار"
سن کے یہ الفاظ آہستہ سے نطق آرا ہوئی دھیمے دھیمے سُر میں جیسے سامعہ پرور ستار
شرم آتی ہے سناؤں حال کیونکر اے عزیز اپنی مداحی نہیں ارباب دانش کا شعار
میری حد ملک ہے تخئیل سے بڑھ کر وسیع میرے گنج وزر کا ہے اعداد سے افزوں شمار
نادرات دہر کی جامع ہے میری مملکت اس لئے میرا لقب ہے "انتخاب روزگار"
ٹوکیو۔نیویارک۔پیرس۔قاہرہ۔دارالسلام میرے طول وعرض میں محصور ہے سب کی بہار
کر رہے ہیں پارسی۔مسلم۔مسیحی۔سکھ۔ہنود اختلافات زبان و دین کا جلوہ آشکار
ایک خطے میں ہوا ہے خوشگوار و معتدل دوسرے میں آتش افشاں تیسرے میں برفبار
جمع ہیں اقسام حیوانی۔نباتی۔معدنی چہچہاتے مرغ وطائر۔لہلہاتے کشت زار
حسن قدرت ہے ہر اک پہلو سے مجھ میں جلوہ ریز غار۔دلدل۔کوہ۔صحرا۔جھیل۔دریا۔آبشار
خوشنما گل۔خوش مزہ پھل۔خوش ادا نخل و شجر ٹیکری۔جھاڑی۔ترائی۔جھنڈ۔میدان تنکار

آہ اک دن تھا کہ میں ناآشنائے عجز تھی آہ اک دن تھا کہ شہرت یاب تھا میرا وقار
آہ۔اک دن تھا کہ گردوں بوس تھا جھنڈا مرا میری پابوسی تھی شاہوں کا متاع افتخار
آہ۔اک دن تھا کہ بیگانوں کی تھی حاجت روا سرمۂ چشم جہاں تھا میرے دامن کا غبار
روم۔یونان۔مصر۔بابل۔سب تھے مجھ سے نورگیر تھا مرا جب نیّر تہذیب و دانش نوربار
کھیلتی تھی میں کبھی روحانیت کی گود میں اور کبھی تھا فلسفہ کے درس خانہ میں گزار
میں زمیں کا سب سے تاباں دُر تھی۔سب سے خوب گل دُر نہ تھا مظلوم سارق۔گل نہ تھا مجروح خار
شکوہ سنج دام انسان تھی ہزار نغمہ پاش درد مند سنگ طفلاں تھا درخت میوہ دار
آہ میرا سادہ دل سرتاج۔میرے لخت دل مجھ پہ کرتے تھے پرستارانہ جان و دل نثار

لیکن ان کے زور کا شیرازہ تھا بکھرا ہوا
خارجی طاقت کے حملوں کا بندھا رہتا تھا تار

جیسے ہیرا ٹکڑے ٹکڑے ہو چمک کے جرم میں
اپنی دولت کے بدولت یوں ہوئی غم کا شکار

آخر اک دن بیوگی نے چوڑیاں توڑیں مری
آہ دنیا! تجھ میں کمزوروں کا مشکل ہے قرار

ہوگیا سرتاج احکام مقدر کا غلام
ہوگیا صیاد قانون تغیر کا شکار

چل دیا اپنے پسر وہ زار و مضطر چھوڑ کر
اور یہ بدبخت لاوارث ہوئی بے غمگسار

تھی یہ لاوارثی اور پھر مری لاوارثی
مال جس کا طبع زا تھا حسن جس کا فتنہ بار

اف خدا ہی جانے کیا ہوتا۔ مرا دنیا میں حشر
گر نہ ہوتا اک شرافت کیش آ کر غمگسار

اس جری کے جسم میں تھا گرچہ مغلی خون گرم
وجہ ناز روح تھی اک اور ذات باوقار

ہوگیا باغ ارم گھر اس کے عدل و جود سے
دور تھا جس سے ہوائے قحط کا دارالبوار

شاکر احسان جاں بخشی تھا ہر فن لطیف
خاصکر بزم سخن میں شاعر معجز نگار

وہ عجائب "روح تعمیرات" کہتے ہیں جنھیں
حشر تک ہیں اس کی عظمت کا مجسم اشتہار

اس کے رشحات کرم نے یوں بجھائی دل کی آگ
جیسے کشت تشنہ کا ساقی ہو ابر دجلہ بار

یک بیک پھر میری قسمت پھر گئی نکبت کی سمت
پھر اتر آیا جفا پر آسمان دوں شعار

دیکھتے ہی دیکھتے پیری، عیش و کسل نے
جمع ہو کر کر دیا پیدا قویٰ میں انتشار

دانت ٹوٹے جس طرح آندھی سے جھڑتے ہیں ثمر
دست و پا و سر ہوئے جوں بید مجنوں رعشہ دار

صرف گیسو ہی نہ تھے مثل تن یوسف سپید
تھا بیاض چشم تک بھی نالہ کش یعقوب وار

اختلال ہوش ہادی تن آسانی ہوا
اور تن آسانی ہوئی ہادی آغوش مزار

اتنے میں آ کر مری املاک پر قابض ہوا
اک مہذب، علم پرور، مغربی، سرمایہ دار

انتظامی خوبیاں اعجاز دکھلانے لگیں
جب ہوئے مل جل کے عقل و علم و فن مصروف کار

ہوگئی ہر سو لطافت ریز تہذیب فرنگ
تھیٹر، کالج، کلب، پل، ریل، موٹر، ڈاک، تار

پر جو خاک غم سے اٹھنا میری قسمت میں نہ تھا
کیا ہوا گر ڈھل گیا ظاہر میں چہرے کا غبار

میرے پیارے طفل جیسے ناز کے پالے ہوئے
آنکھ میں ہے جن سے ٹھنڈک، گرم ہے جن سے کنار

ان کو راس آئی نہ مغرب کی شراب آتشیں
راس خاک آتی طبیعت حار تھیں۔ اور بخت حار

پرخطر تعلیم تھی اور مدو جزر زندگی　　　کشتی بشکستہ تھی اور بحر ناپیدا کنار
چھن گیا بچوں سے یوں سرمایہ فہم وخرد　　　جس طرح شاخ خزاں رس سے لباس برگ و بار
جیب لوٹی نا موافق اجنبی تہذیب نے　　　گنج باطن کا کیا تعلیم ناقص نے نثار

شائق تقلید ہیں سرمایہ دار اختراع　　　ڈھونڈھتا پھرتا ہے مشعل نیر نصف النہار
تشنہ ناداں ہے اور نظارۂ حسن سراب　　　پاس ہی غصہ سے بل کھاتی ہے موج جوئبار
تن ہی محروم نشان امتیاز دین نہیں　　　وضع میں بھی ہو گیا متروک ہر قومی شعار
رہن دکان تفلسف ہو گئی دستار دیں　　　تھی گل حسن عمل کی جس کے طرہ میں بہار
مسند آرائے شریعت؟ صرف امام سبحہ زیب　　　جادہ پیمائے سیاست؟ محض طفل نے سوار
صنعت وحرفت نے اٹھ کر فقر کو مدعو کیا　　　فقر نے سکھلائی عزت نفس کو رسم فرار
کھو دیا افسوس ان کو نوکری نے کھو دیا　　　ہو گئے ملت کُش و باطن فروش و بے وقار
کام ان کا مادر آزاری ہے اور میرا یہ کام　　　ان کا منہ دیکھا کروں بیٹھی ہوئی بے اختیار
مطلقاً مجنوں ہیں تدبیر دفاع ملک میں　　　اور فنون خانہ جنگی میں نہایت ہوشیار
میری شرح رفعت وپستی ہے اک مصرع میں بند　　　کل جو تھی سب سے معزز آج ہے وہ سب سے خوار
ہو گئی نذر گلۂ جام بلا کی درد تک　　　تا کجا صبر و تحمل۔ تا کجا صبر و قرار
ہائے میری عقل و حکمت ہائے میرا سیم و زر　　　ہائے میری شان و عظمت۔ ہائے میرا اقتدار
یا ہو پیدا اب مری عزت کا ساماں غیب سے　　　یا کرے ناپید دنیا سے مجھے پروردگار

نطق اس کا نالہ سے ٹکرا کے بیدم ہو گیا　　　گر پڑے جیسے یکایک کھا کے ٹھوکر شہسوار
جیسے ہو مہ کو چھپا کر درفشاں ابر سفید　　　ڈھانک کر منہ ہاتھ سے رونے لگی زار و قطار
اس کی شرح درد سن کر۔ اس کی حالت دیکھ کر　　　بن گیا تصویر کی تصویر میرا جسم زار
بعد تعطیل سطول جب ہوئے یکجا حواس　　　آہ بھر کر اس سے پوچھا اے سراپا اضطرار
کیا کسی صورت پلٹ سکتی ہے خوشحالی تری　　　کیا مجھے خدمت کا ہو سکتا ہے حاصل افتخار
تیری طرز قصہ خوانی ہے عجیب و لاجواب　　　ہاں ذرا سا نقص ہے "نام و نسب کا استتار"
شرمگیں انداز سے بولی نہ پوچھو میرا نام　　　"نام بتلا کر نہ ہونگی تم سے آنکھیں میری چار

آہ۔ اس بدبخت۔ اس بدنام۔ اس بدحال کو ... "ہند۔ بھارت۔ انڈیا" کہتے ہیں اہل روزگار

ہے بیانِ شادی و تزویج سے میری مراد ... اشتراک حال و قسمت۔ اتحاد رائے و کار

شوہر اول کو "ملکی سلطنت" کہتے ہیں سب ... سطوت اسلام تھا پچھلا رفیق نام دار

اک پسر کا "قوم ہندو"۔ اک کا "مسلم قوم" نام ... اور خطاب حاکم موجودہ "برٹش اقتدار"

میری خوشحالی نہیں منجملہ، ناممکنات ... گر کریں ہندوستانی دل سے عزم انتصار

بند ہے اس دم مری عظمت کا قفل ابجدی ... "میل" کے حرفوں کا ملنا ہے کشاد بخت و کار

تشنگی کا دور آخر ہو۔ اگر میل جول کے سب ... صنع و زرع و تاجری و علم کے ہوں رشحہ بار

باعث نکبت نہیں۔ جو ر قوانین کرخت ... باعث نکبت نہیں محصول ہائے بے شمار

باعث نکبت نہیں۔ حاکم کی بے پروائیاں ... باعث نکبت ہے آپس کی جدال و کارزار

اب بھی موقع ہے کہ ہو تنہا سے تنہا متحد ... اب بھی موقع ہے کہ ہو بھائی کا بھائی غمگسار

اب بھی موقع ہے کہ ہوں اپنے وطن پر وقف ناز ... اب بھی موقع ہے کہ ہوں اپنے کیے پر شرمسار

اب بھی موقع ہے کہ ان سے روح آبا شاد ہو ... اب بھی موقع ہے کہ کر دیں زندہ مادر کا وقار

اے اسیر رسم و پابند علائق شاعرہ ... ہے فقط اشعار تک محدود تیرا اختیار

گنج موسیقی سے دامانِ فضا معمور کر ... گلشن خاموش ہے مشتاق گلبانگ ہزار

ساز کے پردے میں محفل کو سنا سوز الم ... یعنی رنگ شعر میں بن ترجمان حال زار

بس مری افسانہ خوانی کا یہی انعام ہے

لے خدا حافظ۔ جدا ہوتی ہے تجھ سے خاکسار

ز۔ خ۔ ش۔ آف علی گڑھ

شاعر کی فطرت انہماک جہاں حوادث عالم سے طبعًا بے نیاز تاثر ہے۔ وہیں اس کی طبیعت حسیہ قبول اثر میں عام طبائع انسانی سے زیادہ زود کیف بھی ہے۔

انگلستان کے مشہور ادیب "گولڈ اسمتھ" کا مقولہ ہے کہ:۔

"شاعر در اصل وہ ہے جس کے اطمینان قلب کو ایک زبردست بھونچال (جو انسان کی پُر سکون زندگی کے ساکت سے ساکت سمندر میں قیامت کا طوفان متلاطم کر دے) متزلزل نہ کرسکے اور ایک نازک سے نازک شیشے۔ ایک چھوٹے سے چھوٹے چینی کے برتن کی صدائے شکست اس کے آبگینۂ دل کو چکنا چور کر دے"

"م"

سروجنی نائڈو

جب شاہان مغلیہ کی عظمت اور ان کا جلال رخصت ہوا جب ایشیائی تہذیب و شائستگی کے دلدادہ باقی نہ رہے۔ اور جب علوم و معارف مشرقیہ کے نازبردار اُٹھ گئے تو اہل مغرب کے تسلط کے ساتھ سرزمین ہند میں ایک نئے دور کی ابتدا ہوئی جس سے اس ملک کے طرز بود و باش اور تمدن و معاشرت پر نمایاں اثر پڑا۔

جب سیاسی مسائل کے روبراہ ہونے کی صورت نکل آئی۔ تو ارباب حل و عقد احیاء علوم و فنون کی طرف راغب ہوئے۔ لیکن اب سنسکرت میں اتنا دم نہ تھا کہ اس دور جدید کا ساتھ دے سکے۔ اور کہنے والے کہتے ہیں کہ عربی اور فارسی میں بھی یہ صلاحیت نہ تھی کہ اس اجنبیت کا بار سنبھال سکیں۔ چنانچہ لارڈ مکالے کی اسکیم نے فارسی زبان کی ہفت صد سالہ حکومت چھین کر ہندوستان کی علمی زندگی کی باگ انگریزی زبان کے سپرد کر دی۔

اس میں کلام نہیں کہ انگریزی زبان کی ترویج و اشاعت سے ہندوستان میں تحصیل علوم و معارف کے لئے اک نیا باب کھل گیا۔ اور تہذیب و شائستگی کے موجودہ مفہوم کے مطابق اک "نیم وحشی" ملک کو مدارج ترقی تک پہنچانے کے لئے یقیناً اس غیرملکی زبان نے جو کچھ کیا وہ دوسری طرح ممکن نہ تھا۔ آج انگریزی زبان ہی ہندوستان کی موجودہ لٹریری زندگی کی روح رواں ہے۔ اور اگر سچ پوچھئے تو ہماری ملکی زبانوں کو جو کچھ فروغ حاصل ہے وہ اسی کی بدولت ہے۔

ہندوستانیوں نے انگریزی زبان کے باغ کو صرف سیر و تفریح کرنے اور پھل۔ اور پھول حاصل کر کے اپنی مادری زبان کے اجڑے ہوئے چمن کو زیب و زینت دینے کا ذریعہ ہی نہیں بنایا۔ بلکہ ان میں سے اکثر خود اس باغ کی آبیاری میں مشغول ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ حقیقی جذبات و حسیات کا اظہار موثر طریقے پر اپنی مادری زبان ہی میں بہتر ہو سکتا ہے۔ اور یہ دلبستگی اور کیفیت کسی غیرملکی زبان سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن مغربی تہذیب کے ظہور سے مشرقی

زندگی میں چند کیفیات کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔ جو قدرتاً اپنے فطری لباس میں جلوہ افروز ہوتا ہے۔

سب سے پہلے بنگال نے مغربیت کا اثر اپنے ادب و لٹریچر پر محسوس کیا چنانچہ انیسویں صدی کی ابتدا ہی میں سرزمین بنگال نے۔ کاشی پرشاد گھوش۔ راج نرائن دت۔ مائیکل مدھوسودن دت۔ ہرچندر دت۔ اور گووند چندر دت جیسے شعرائے باکمال پیدا کئے۔ انھوں نے انگریزی زبان کو اپنے جذبات وحسیات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ آپ کو اگر ان میں سے کسی کا کلام دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ ان کے کلام میں اس درجہ سلاست اور روانی موجود ہے کہ انگلستان کی زبان مطلق ان بنگال کے باشندوں کی مادری زبان معلوم ہوتی ہے۔

اسی ضمن میں ایک خاص بات قابل غور یہ ہے کہ متذکرہ بالا شعرا نے صرف مغربی زبان اور مغربی طرز تحریر ہی پر قناعت نہیں کی۔ بلکہ مطلق مغربی تخئیل کو بھی اپنی شاعری کا رہنما بنا لیا۔ اور شیلے ورڈسورتھ۔ اور ٹینی سن کا تتبع کیا۔ یہ بجائے خود ایک نہایت اہم اور مشکل کام ہے چنانچہ ان کی مساعی ہندوستان اور انگلستان کے لئے کچھ زیادہ سود مند ثابت نہ ہوئیں۔ ان کا کلام محض اس حیثیت سے ہندوستانی ہے کہ وہ بنگال میں تصنیف ہوا۔ اور بس۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک مشرقی شاعر کے کلام میں مغربی نظر کسی ایسی چیز کو ڈھونڈتی ہے جس سے مغرب آشنا نہ ہو۔ اور جسے مغرب پیش نہ کر سکے۔ چنانچہ اکثر انگریز شعرا نے جن پر ایشیائی مذاق کا کچھ اثر پڑا اپنی بعض نظموں میں مشرق کی روح کو برقرار رکھنے کی بہت کوشش کی۔ مثلاً امرسن نے اپنی مختصر سی نظم "برہما" میں مشرقی مذاہب کی گہرائیوں سے واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ سر الفرڈ لائل کی نظم "شیو" میں ایک قدیم ایشیائی مذہب کے رعب وجلال کا حقیقی چربہ ہے۔ سر ایڈون آرنلڈ نے ایک نہایت ہی مختصر نظم "سپیرے کے گیت" میں ہو بہو مشرقی رنگ پیدا کر دیا ہے۔

یہ انگلستان کی زبان میں ہندوستانی شاعری کا دور قدیم تھا۔ دور جدید کی ابتدا گووند چندر دت کی یکتائے روزگار بیٹی نے کی۔ تارادت ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئی۔ اور ۱۳ سال کی عمر میں اپنے والدین کے ہمراہ یورپ چلی گئی۔ ۱۸۷۰ء میں لندن اور پیرس کی مختلف درسگاہوں سے

فیض حاصل کرنے کے بعد کلکتہ واپس آئی۔ اور چار ہی سال بعد تپ دق کا شکار ہو کر راہی ملک عدم ہوئی۔ تارا کی زندگی کا یہ المناک اختصار ادبی ولٹریری کمالات کا حیرت انگیز مجموعہ تھا شعراء دورِ قدیم کے خلاف تارا نے اپنے خیالات پر انگریزی اثر کا غلبہ نہ ہونے دیا۔ انگریزی زبان کے ہندوستانی شعرا میں یہ پہلی مثال تھی کہ اپنے وطن کی خصوصیات و روایات کا اثر کلام پر نمودار ہوا۔ اور سچ یہ ہے کہ تارا نے جس کمال کے ساتھ اس رنگ کو اپنی مختصر زندگی میں نبھایا۔ اس کی مثال ملنا محال ہے۔ نائڈو کے متعلق کچھ لکھنے سے پہلے تارا دت کا ذکر ضروری تھا۔ کہ

مسز سروجنی نائڈو کا ذکر زبان پر آتے ہی تارا خیال پر قبضہ کر لیتی ہے۔ تارا نے اس جنگل میں جو راستہ پیدا کیا۔ سروجنی آج اس پر خوش خرامیاں کر رہی ہے۔

سروجنی چٹو پادھیائے (چٹرجی) ۱۳ فروری ۱۸۷۹ء کو حیدر آباد (دکن) میں پیدا ہوئیں۔ آپ کے پدر نامدار۔ ڈاکٹر رگھوناتھ چٹو پادھیائے برہمن نگرم کے قدیم خانوادۂ چٹرجی کے ایک معزز رکن تھے۔ ڈاکٹر موصوف نے ۱۸۷۷ء میں اڈنبرا یونیورسٹی سے ڈاکٹر آف سائنس کی ڈگری حاصل کی۔ اور اس کے بعد کچھ مدت تک بون میں مطالعہ جاری رکھا۔ ہندوستان واپس آکر آپ نے حیدر آباد میں نظام کالج کی بنیاد رکھی۔ اور اس وقت سے برابر اپنے عزیز وطن میں اشاعت تعلیم کے لئے کوشاں ہیں۔

سروجنی نائڈو نے اپنے مقتدر باپ کی زیر نگرانی تعلیم و تربیت حاصل کی۔ ظاہر ہے کہ جس ہونہار پودے نے ایک کامل فن باغبان کی محبت آمیز توجہ سے فائدہ اٹھایا ہو۔ وہ کیسا کچھ نہ پھلے پھولے گا۔

مسز نائڈو۔ اپنے پدر بزرگوار کی نسبت ایک جگہ لکھتی ہیں:۔

"میرے آباؤ اجداد ہزار ہا سال سے جنگلوں اور پہاڑوں کے شیدائی رہے ہیں وہ بڑے خیال پرست۔ عالم اور زاہد لوگ تھے۔ خود میرے والد تخیل کے بندے اور متواتر خیالات کی وسیع گہرائیوں میں غرق رہتے ہیں۔ یہ ان مقتدر لوگوں میں سے ہیں جن کی زندگی شاندار ناکامیابی کا مکمل نمونہ ہے میرا خیال ہے کہ تمام ہندوستان میں بہت ہی کم لوگ ایسے ملیں گے جن کا علمی ذوق ان سے

بڑھا ہوا ہو۔ اور پھر ایسے لوگ بھی زیادہ نہ ملیں گے۔ جو ان کی طرح ہر دلعزیز رہے ہوں۔ ان کے چہرے پر ایک سفید لانبی داڑھی ہے۔ جو مرنا صورت ہے۔ اور ایسی بلند آواز کہ جب ہنستے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب چھت نیچے آرہے گی۔ انھوں نے اپنا تمام مال وزر دو اہم مقاصد کے لئے صرف کیا خلق خدا کی امداد اور کیمیا۔ ہر روز ان کے باغ میں تمام مذاہب کے مقتدر علماء کا مجمع رہتا ہے۔ امیر۔ فقیر۔ درویش۔ اور چھٹے ہوئے بدمعاش۔ سب کے سب ایک دوسرے کی صحبت سے لطف اندوز ہیں۔ اور یہاں سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جاتا ہے اور پھر کیمیا۔ اللہ اکبر! رات اور دن نئے نئے عمل جاری ہیں۔ اور جو شخص کوئی نیا نسخہ لاتا ہے۔ اسے اپنے بھائی کی طرح صحبت میں شریک کیا جاتا ہے۔ لیکن تم جانتے ہو یہ کیمیا کیا ہے محض حسن ازل کی شاعرانہ تلاش نے ایک صورت ظاہری اختیار کرلی ہے۔ سونا بنانے والے۔ اور شعر کہنے والے یہ دونوں اس چیز کے پیدا کرنے والے ہیں۔ جو اسرار کا علم حاصل کرنے کے لئے دنیا کی مخفی آرزو پر قدرت طلب ہے۔ میرے پدر بزرگوار کا وہ ادراک تجسس جسے روح روانِ طبعیات کہہ سکتے ہیں۔ میرے اندر آرزوئے تلاش حسن ہے "

ایک اور جگہ خود اپنی نسبت فرماتی ہیں:۔

مجھے جہاں تک یاد ہے بچپن میں مجھے شعر کہنے کا کچھ زیادہ شوق نہ تھا۔ اس میں شک نہیں۔ کہ میں اوّل ہی سے فطرتاً بہت ہی خیال پرست واقع ہوئی تھی۔ میری تعلیم و تربیت، باپ کی زیر نگرانی نہایت باصول طریقے پر ہوئی ہے۔ ان کا پختہ ارادہ تھا کہ مجھے ایک زبردست ریاضی داں یا سائنس داں بنائیں۔ لیکن فطری شعریت جو مجھے ان سے اور اپنی ماں سے ورثہ میں ملی تھی۔ غالب رہی جب میں گیارہ برس کی تھی تو ایک دن میں الجبرے کے ایک سوال میں سرکھپا رہی تھی بہتیری کوشش کی۔ مگر وہ صحیح نہ آیا۔ لیکن اس کے بجائے ایک پوری نظم فی البدیہہ موزوں ہوگئی۔ میں نے اسے لکھ لیا۔ بس اسی دن سے میری شاعری کا دور شروع

ہوا میں نے تیرہ برس کی عمر میں ایک بڑی سی نظم لکھی۔ ۱۳۰۰ اشعر چھ دن میں کہے۔ اس کے بعد دو ہزار شعر کا ایک ڈراما لکھا۔

اس زمانے میں میری صحت بہت خراب ہوگئی تھی۔ اور چونکہ صحت درست نہ رہنے کی وجہ سے باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا تھا۔ اور کافی فرصت ملی تھی میں ہمہ تن کتب بینی میں مشغول ہوگئی۔ میرے نزدیک جس قدر بھی میں نے پڑھا ہے۔ اس کا زیادہ حصہ میری چودہ اور سولہ سال کی عمر کا سرمایہ ہے"

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن ہی میں سروجنی نائیڈو کا میلان طبع کس قدر شاعری کی جانب تھا۔ اور تمام حقیقی شعراء کا یہی حال ہے کہ عموماً عمر کے پہلے حصہ میں اظہار جذبات کے لئے بیتاب رہتے ہیں۔ خود مجھ پر بھی یہی گزری ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ میری بعض نظمیں جو مجھے اپنے کلام میں سب سے زیادہ پسند ہیں۔ وہ اسی زمانے کے بے چین جذبات کی تصویر ہیں۔

سروجنی نے مدراس یونیورسٹی سے بارہ سال کی عمر میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا ۱۸۹۵ء میں انگلستان بھیجی گئیں۔ اور وہاں ۱۸۹۸ء تک قیام پذیر رہیں۔ پہلے تو کنگس کالج لندن میں تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد گرٹن میں رہیں۔ یہاں تک کہ آپ کی صحت نے جواب دے دیا۔ ۱۸۹۸ء سے پہلے کچھ عرصے تک آپ نے اٹلی میں سفر کیا۔ اٹلی ایسا مقام نہ تھا جو اپنی فطری خوبیوں اور قدیم صناعیوں کا سروجنی کے دل پر گہرا اثر نہ ڈالتا۔ آپ کہتی ہیں:۔

"یہ اٹلی تو تمامتر سونے کا بنا ہوا ہے۔ صبح کی روشنی میں سونے کی چمک ستاروں کے حسن میں سونے کی جھلک۔ مئی کے مہینے کی بھینی بھینی خوشبوؤں سے بسی ہوئی راتوں میں جگنو کی سنہری ہستی میں سونے کا رنگ۔ ہائے یہ سونے کے ہوائی تارے! میرا جی چاہتا ہے کہ ان کے رقص مستانہ میں جو ایک خاص موسیقیت ہے۔ اس پر قابو حاصل کرلوں۔ اور ایک نظم لکھوں جس کے ارکان ان کی بے تابی کی ہم حرکت ہوں۔ اور جس کی بحر ان کی بے ترتیب پرواز کی طرح ہم لرزش"

ستمبر ۱۸۹۸ء میں سروجنی حیدرآباد واپس آئیں اور دسمبر میں ڈاکٹر نائیڈو سے شادی کی۔ حالانکہ وہ آپ کے ہم ذات نہ تھے۔ اس موقع پر مختلف ذاتوں کے درمیان شادی بیاہ کی بحث

چھیڑنی اپنے موضوع سے ہٹ جانا ہوگا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ سروجنی کا اس قسم کی جرأت کرنا۔ ان کی آزاد طبعی۔ کشادہ دلی۔ اور فراخ حوصلگی کی پختہ دلیل ہے۔

مسز نائڈو نے اپنے بچوں کے نہایت معنی خیز اور شاعرانہ نام رکھے ہیں۔ مثلاً "جے سوریہ" یعنی "خورشید فتح" "رندھیر" - مولائے جنگ - اور "لیلامنی" جوہر نشاط۔

مسز سروجنی نائڈو ایک اعلیٰ پایہ کی خطیب ہیں۔ آپ کی تقریروں میں کچھ ایسا جادو ہوتا ہے کہ سننے والے محو حیرت ہو جاتے ہیں۔ دلفریب صورت۔ بلند اور پُرترنم آواز۔ اس پر لفظوں کی ترکیبیں ایسی پاکیزہ کہ گویا واضعان زبان نے یہ الفاظ محض اسی لئے بنائے تھے۔ کہ سروجنی کی پیاری زبان سے نکلیں۔ میں وہ دن کبھی نہ بھولوں گا۔ جب میں نے پہلے پہل میرٹھ میں مسز سروجنی نائڈو کی تقریر سنی ہے۔ شام کے آٹھ بجے تھے۔ صاف و شفاف چاندنی کھلی ہوئی تھی۔ "ٹاؤن ہال کے احاطے میں بچے ٹینس لان پر چھ سات ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ کہ روح القدس سے فیض حاصل کرنے والی۔ ایشیائی نازک خیالیوں اور معنی آفرینیوں کی جیتی جاگتی تصویر سامنے آئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فطرت کے ہرے بھرے گلزار میں شب ماہتاب کے حسن آفریں۔ اور دلفریب منظر سے متاثر ہو کر بلبل ہزار داستان بے اختیار نغمہ سرائی پر مجبور ہے۔ کاش یہ گیس کی روشنی بھی موجود نہ ہوتی۔ تو چاند کی شعاعیں اس فطرت کے چہکتے ہوئے بلبل کا پیام براہ راست فرشتوں تک لے جا کر انھیں بھی محظوظ اور مستفیض ہونے کا موقع دیتیں۔

تقریر کے دوران میں جب آپ مجمع کی طرف خطاب کر کے کہتی تھیں کہ اے میرٹھ کے باشندو! تو ہر شخص کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ براہ راست مجھے ہی مخاطب کر رہی ہیں۔ میں تو اس جادو کے اثر سے بندھے ہوئے چھ ہزار ساکت و سامت سامعین کے عظیم الشان مجمع میں بار بار کھویا جاتا تھا۔

تقریر کے موضوع اور مبحث کی نسبت مجھ سے کچھ نہ پوچھئے۔ یہ اخباروں کے رپورٹر بتائیں گے مجھے تو اس صنف نازک کے سحر طراز خطیب نے محو حیرت بنا دیا۔ اب میں آپ کو کیونکر بتاؤں کہ تقریر میں کیا خاص خاص مباحث قابل توجہ تھے۔ اس کا تو ایک ایک حرف قابل توجہ تھا۔

سروجنی نائڈو ایک پولٹیکل اور سوشل رہنما کی حیثیت سے بھی بہت بلند درجہ رکھتی ہیں۔ ان کی زندگی کے اس پہلو پر انشاء اللہ ایک علیحدہ مضمون میں کچھ عرض کروں گا۔ یہاں تو سروجنی کو

اس کے طبعی اور حقیقی رنگ میں دیکھئے۔

مسز سروجنی نائڈو کی نظموں کے اس وقت تک تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں "آستانۂ زریں" "طائرِ ایام" اور "شکستہ پر" طائرِ ایام اب تک سب سے آخری تصنیف ہے۔ اس کے دیباچہ میں انگلستان کے مشہور ادیب اور شاعر مسٹر اڈمنڈ گاس کہتے ہیں۔ کہ :-

سروجنی نائڈو اپنی ابتدائی نظموں میں جذبات اور تخیل کے لحاظ سے مطلقاً مغرب کا تتبع کرتی تھیں۔ اور ان کے کلام میں "ٹینیسن" اور "شیلی" کا رنگ بہت نمایاں تھا۔

آخر مسٹر گاس نے ان کی طبیعت اس طرف سے ہٹائی۔ آپ لکھتے ہیں :-

میں نے مسز سروجنی سے التجا کی کہ ایک نوجوان ہندی سے جو بغایت ذی حس ہو اور جسے نہ صرف مغرب کی زبان بلکہ اس زبان کے عروض پر کامل دسترس ہو۔ اس سے ہم جو کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ انگریزی زبان میں مغربی خیالات کا اظہار نہیں ہے۔ بلکہ ہندوستان کے فطری اور حقیقی جذبات وحسیات ہیں۔ ہندوستان کے قدیم مذاہب کے اصول اس طرح بیان کئے جائیں کہ ان میں وہی روح اور اثر باقی ہو جس نے مشرق کو اس وقت آسمان ترقی پر پہنچا دیا تھا جب مغرب غفلت کے تیرہ و تار غار میں پڑا ہوا کروٹیں بدل رہا تھا"

مسز سروجنی نائڈو نے مسٹر گاس کی نصیحت پر عمل کیا۔ چنانچہ آپ فرماتی ہیں۔ کہ :-

"مسٹر گاس ہی نے سب سے پہلے مجھے شاعری کے "آستانۂ زریں" کا رستہ بتایا"

مسز سروجنی کی شاعری پر مفصل تبصرہ کی تو اس مضمون میں گنجائش نہیں کہ بہت طویل ہو جائیگا اور میرے مکرم حضرت بیدل میرے مضامین سے گھبرانے لگیں گے لیکن بعض نظموں کے اقتباسات سے آپ کی شاعری کی چند امتیازی خصوصیات دکھانے کی کوشش کروں گا۔

مسز نائڈو کی نظمیں حسن کی تلاش اور امن وراحت کے تجسس کی تصویریں ہیں بعض نظموں سے موسم بہار کا بے تابانہ اثر ظاہر ہے بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مصنف روح القدس سے فیض پاتا ہے۔ اور روح القدس سے ہمکلام ہے بعض روحانی جوش اور وجد کا آئینہ ہیں۔ اس کے

علاوہ ایسی نظمیں ہیں جن سے حسن کا جلال برس رہا ہے۔ اور جن میں محبت کی آگ بھڑک رہی ہے۔ اور بھرپور ہیں۔ جو مادر وطن کے پُرشوکت و جلال ماضی کی یاد دلوں میں تازہ کرتی ہیں بعض سے وطن پرستی کے جذبات دلوں میں جوش زن ہوتے ہیں۔ اور اس طرح افراد میں اپنے قومی وجود کا احساس پیدا ہوتا ہے حسن و محبت کے لطیف جذبات ادا کرنے میں ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ انگلستان کی زبان میں مشرق کی نزاکت و لطافت پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ ذیل میں آپ کی چند نظموں کے اقتباسات درج کئے جاتے ہیں جن سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ یہ تمام باتیں سروجنی کی شاعری میں بوجوہ احسن موجود ہیں۔

اُٹھ مادر وطن! اُٹھ۔ تو کہ ایک غیر محدود زمانے تک شباب سے ہم آغوش رہی ہے۔ اُٹھ! . . . . تو میں جو تاریکی و ظلمت کی گہرائیوں میں بھٹک رہی ہیں۔ ان کی رہنمائی کر۔ اُٹھ! اس مقام تک لے چل جہاں نورانی صبح جلوہ افروز ہے۔

ہا۔ ماتا! تو ابھی تک کیوں سو رہی ہے؟ تو ابھی تک کیوں سو رہی ہے؟ اُٹھ کہ تیرے بچے تجھے پکارتے ہیں۔

شہزادی زیب النساء اپنے حسن کی تعریف میں کہتی ہے:۔

جب میں اپنے رُخ سے نقاب الٹتی ہوں تو گلاب کے پھول رشک و حسد سے زرد پڑ جاتے ہیں۔ ان کا دل اس تکلیف سے پھٹ جاتا ہے۔ اور ایک آہ کی طرح بے تابانہ خوشبو نکلتی ہے۔

اور جب میں خاموش باغ کے گنجان حصے میں سے گزرتی ہوں تو میرے حسن سے متاثر ہو کر بلبلیں حیرت سے چونک پڑتی ہیں۔ اور اپنی کانپتی ہوئی آواز سے سرور افزا گیت گاتی ہیں "

موسم بہار سے خطاب کر کے فرماتی ہیں:۔

بہار: اے خوش فضا بہار! تیرا جوہر کیا ہے؟ ایک بلبل کا نغمہ۔ ایک پھول کا تبسم چاند کی کرنوں پر شبنم کا رقص نسیم کی آواز جو چلتے ہوئے گاتی ہے۔ ایک وطن کی امید

ایک دوشیزہ کا خواب:۔

بہار! اے خوش اثر بہار! تیرا راز کیا ہے؟

تیرے سحر آور سرور کی پیدا کی ہوئی فرحت۔ جو صبح کے وقت کو دنیا کے عجائبات کا مجموعہ بنا دیتی ہے۔ اور ہر چیز میں حسن کے وجود پذیر ہونے کا باعث ہوتی ہے۔ آسمانوں پر قبضہ حاصل کر لیتی ہے۔ اور غنچوں پر فتحیاب ہوتی ہے۔ جو دنیا کے دل کی مسرت کا ذریعہ ہیں"

ایک لوری کا بہلاہٹ کیسا دلفریب ہے:۔

لونگ اور الائچی کے ہرے بھرے پودوں سے۔ چاولوں کے کھیت پر سے۔ کنول کے پھولوں سے پار ہو کر میں تیرے لئے ایک شبنم میں سرشار خواب لاتی ہوں"

ایک نظم میں جس کا عنوان "ستی" ہے فرماتی ہیں:۔

"اے میری زندگی کے چراغ! موت کے لبوں نے اپنے سانس سے تجھے یکایک گل کر دیا۔ تیرے بجھے ہوئے شعلے کو کوئی چیز پھر زندہ نہیں کر سکتی۔

اے میری زندگی کے پودے! ظالم موت نے تجھے پامال کر دیا۔ تیری برباد شدہ خوبی اور خوشنمائی کو اب کوئی چیز پھر مہیا نہیں کر سکتی۔ جب پودا ہی نہیں تو کلیاں کہاں سے قائم رہ سکیں گی"

محبت کے پُر اسرار جوش کا اظہار ذیل کی نظم میں کیسی خوبی سے کیا گیا ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے "ہمایوں کا خطاب زیب النساء سے"

"تو بیداری میں خواب کی طرح مجھ پر تسلط کئے ہوئے ہے۔ تو خواب میں چاند کی طرح نظر آتی ہے۔ مشک کی تیز خوشبو کی طرح میری رگ رگ میں بس رہی ہے۔ راگ کی تیز آواز کی طرح مجھ پر قابو پانا چاہتی ہے کیا کوئی نقاب میری محبت کو روک سکتا ہے۔ کیا کوئی پردہ تیرے حسن کو چھپا سکتا ہے؟ دوئی باقی نہ رہے من وتو کا قصہ مٹا دے۔ تاکہ میں بے باکانہ کہہ سکوں "نہ تو غیری نہ من غیرم"۔

حقیقت یہ ہے۔ ان نظموں کا لطف ترجمہ کے اندر آدھا بھی باقی نہیں رہا ہے جن اصحاب کو

اصل نظموں کے مطالعہ سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا ہے۔ ان پر مسز نائڈو کے کلام کا جو اثر ہوا ہے۔ وہ کسی طرح اردو ترجمہ سے حاصل نہیں ہوسکتا +

حامد اللہ افسر

نقشِ گم گشتگی

(مخمور شعریت سید احمد شاہ صاحب بخاری)

شدی تا باعث آرام جاں آرام جاں گم شد — حدیث نام تو تا بر زباں آمد زباں گم شد

مپرس از جستجو و نارسائی ہائے مجنونے — چو آواز جرس ہر سو دوید و ہر زماں گم شد

نشان سجدہ ام اہل نظر را آستاں باشد — کہ زیر سجدہ ہائے شوق من آں آستاں گم شد

مرا جز خامشی محرم نبود و وائے ناکامی — بہ اظہار سخن چوں لب کشودم رازداں گم شد

مگر آوارگی آرد سوئے منزل بخاری را

کہ از گمراہی خود ہم ز راہ گمرہاں گم شد

احمد شاہ بخاری

افسانۂ خونیں

اوائل دسمبر ۱۸۰۰ء میں جب فرانسیسی فوجیں وادی نیل میں بڑھ رہی تھیں اور افریقہ کا سب سے زیادہ زرخیز شہر (قاہرہ) فتح ہو چکا تھا۔ نپولین نے جمہوریت فرانس کی اظہار عظمت کے لئے مصنوعی جنگ کا حکم دیا۔

قاہرہ کے رہنے والے پہلے ہی نپولین اور اس کی فوجوں کے جلال و جبروت سے حیرت زدہ تھے لیکن مصنوعی جنگ کی گولہ باری کی آوازیں جب اس قدیمی شہر کے در و دیوار سے ٹکرا کر گونجیں تو سہمی ہوئی آبادی کے دل اور بھی دہل گئے لیکن فتح دنیا میں ہمیشہ نرمی اور انسانیت کی ہوتی آئی ہے۔

نپولین جو اس راز کو جانتا تھا اس نے فرانسیسی حکومت کی وسعت و استقلال کا اسی کو تنہا ذریعہ قرار دیا۔

مصر میں فوجی نمائش کے ساتھ اس کا حکم تھا کہ ہر گلی کوچہ میں فرانسیسی بیرقیں آویزاں کی جائیں عام گزرگاہوں اور شہر کی بڑی بڑی سڑکوں پر فتح و نصرت کی خوشی میں محراب دار دروازے تیار کئے جائیں۔ دروازوں اور بازاروں کی رونق اور اہل شہر کے اطمینان و مسرت کے لئے ایسے رایت و علم نصب کئے جائیں جو امتیاز وطن کا طرہ متصور ہوں۔ خاص خاص مقامات پر ہلالی پرچم بھی اڑایا جائے۔

نپولین نے مصریوں کے دل میں اپنی شان و شوکت اور دوستانہ محبت و الفت کا سکہ جمانے کے لئے ابتدا ہی سے جو زبردست طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ اگرچہ کھلا ہوا فریب تھا لیکن حقیقتاً تسخیر قلوب کا وہ ایک بے منتر جادو تھا۔

نپولین نے مصر میں فتح حاصل کر کے فاتحانہ درندگی سے اپنے دامن کو آلودہ نہ ہونے دیا۔ بلکہ اس تالیف قلوب سے کام لیا جو حساس نفوس کے لئے تلوار سے زیادہ قاطع ہے۔

وہ مصر میں آیا۔ قاہرہ میں مصنوعی جنگ کے احکام نافذ کئے۔ ازبکیہ میں جس سے زیادہ قاہرہ میں کوئی وسیع قطعہ زمین نہ تھا۔ اور جو شاید مجالس فتح و نصرت۔ بزم ہائے عیش و طرب ہی کی غرض سے بنایا گیا تھا۔ دربار کے لئے منتخب ہوا۔ اور ہر جگہ فرانس کے قومی علم کے ساتھ ساتھ مصر کے

اسلامی پرچم بھی نصب کئے گئے۔ ازبکیہ کا میدان جو فاتحانہ بزم آرائیوں کے لئے آراستہ تھا طلوع آفتاب سے پہلے تماشائیوں سے بھر گیا۔ سب سے پہلے سات بجے فوجی نغمہ سراؤں کا ایک دستہ نپولین کی قرارگاہ سے نکلا اور ایک گھنٹہ تک مسلسل قومی ترانے گاتا رہا اس ہنگامۂ طرب و مسرت کے جلو میں دنیا کا وہ زبردست اپنے خدم و حشم کے ساتھ دبدبہ افروز ہوا۔

نپولین کے منظر عام پر آنے سے پہلے فرانس کی بہترین سرباز فوج کا ایک معتد بہ حصہ میدان میں آ چکا تھا۔ اور عرصۂ جنگ میں آبدار سنگینوں کی جنبشیں شعاع مہر کو دلوں کے دہلانے اور آنکھوں میں چکاچوند ڈالنے کا ذریعہ بنا رہی تھیں۔

بونا پارٹ اس وقت جس لباس میں تھا۔ اور اس کی جو ہیئت تھی وہ چنداں قابل ذکر نہیں۔ لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ شجاعت اور بسالت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ شوکت و جلال اس کے ناصیۂ صبیح پر اقبال مندی کے ترانے گا رہے تھے اور حدقۂ چشم سے متانت و وقار نکل نکل کر اہل انتظار کی متحیر آنکھوں کے لئے ادب آموز احترام تھا۔

یہ حالت تھی نپولین کی جب وہ پہلی دفعہ اہل قاہرہ کے سامنے آیا۔ اور یہ تھی وہ متمدن ترین فتح جس نے اس کو مصر کا سلطان کبیر بنایا۔

آٹھ بج چکے تھے۔ آفتاب کی حکومت کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا۔ فوجی باجے کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں اور نپولین کے جلو میں ایک طرف اس کے ارکان حرب ایستادہ تھے۔ اور دوسری طرف امرار ممالیک کی جماعت تھی۔ انہی کے متصل پائین میں ایک چھوٹا سا راستہ بنایا گیا تھا جس سے فوجوں کے دستے حصار کرتے ہوئے گزرتے تھے اور نپولین کو سلامی دیتے تھے۔

تمام فوجیں گزر چکیں تو آخر میں وہ پیادہ فوج آئی جو اس جگہ صف بستہ تھی جہاں زیادہ تر تماشائی عورتیں کھڑی تھیں۔ فوج نے اپنی جگہ سے کوچ کیا۔ نظروں کے سامنے سے مسلح انسانوں کی دیواریں ہٹیں اور وہ بیتابانہ متحرک ہو گئیں۔

ازبکیہ کا میدان اب تک صرف اک رزمگاہ کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے لیکن وہ صرف عرصہ رزم ہی نہ تھا۔ وہاں صرف فوجیں ہی نقل و حرکت نہیں کرتی تھیں۔ بلکہ وہ ہنگامہ زار حسن و جمال

بھی تھا۔ اورنہیں کہا جاسکتا کہ حسن کی یہ فراوانی اور رعنائیوں کا یہ ہجوم ملک کے کس کس حصہ سے پہنچکر یہاں آیا تھا۔ اسی ہنگامۂ جمال و رعنائی میں ایک سیزدہ سالہ لڑکی (پلالو) بھی تھی۔

انزبکیہ کا میدان اس وقت جن فتنوں سے عبارت تھا۔ ان میں ہر فتنہ گو قیامت اٹھاتا تھا۔ لیکن پلالو جو حسن و رعنائی رکھتی تھی۔ وہ دوسری عورتوں میں نہ پایا جاتا تھا۔ وہ اپنے حسن و رعنائی کی قیامت زائیوں سے بے خبر۔ گرمی شوق میں اپنے دلیر شوہر کو دیکھ دیکھ کر مستانہ وار تالیاں بجا رہی تھی۔ اور وہ بھی اپنے جذبات محبت سے بے اختیار ہوکر انگلیوں کے سروں کو چومتا تھا۔ اور ہاتھوں کی جنبش سے اپنے بوسوں کو اس کی طرف بھیج رہا تھا۔

آفتاب جب طلوع ہوتا ہے تو اس کی روشنی تاریک سے تاریک مقامات کو بھی منور کردیتی ہے۔

بجلی جب تک نہیں چمکتی کان اس کی کڑک سے اور آنکھیں اس کی چمک سے ناآشنا ہوتی ہیں لیکن جب ایک بار وہ چمک اٹھتی ہے تو آنکھوں میں دیر تک خیرگی باقی رہتی ہے اور کانوں میں اس کی کڑک کی صدائے مہیب اترتی جاتی ہے۔

مشک جب نافہ سے نکال لیا جاتا ہے تو شامہ اس کے مشام سے مسرور ہوتا ہے۔ اور کوئی قوت نہیں ہوتی جو اس کی بو کو نکلنے سے اور شامہ کو سونگھنے سے روک سکے۔

پلالو۔ جو ایک دفعہ آفتاب بن کے طلوع ہوچکی تھی۔ جو ایک بار ازبکیہ کے میدان میں بجلی بن کر چمک چکی تھی۔ اور جس نے ایک مرتبہ اپنے نافہ سے باہر قدم نکالا تھا۔ ناممکن تھا کہ اب دنیا کی کوئی قوت اسکی پردہ داری کرسکتی۔ یا اس کا تباہ کردینے والا حسن اپنا کام نہ کرجاتا۔ وہ بجلی بن کر چمکی۔ آفتاب بن کر روشن ہوئی۔ اور نکہت بن کر شامہ تک پہنچی۔ دل پر اس کی ابرو کے خنجر چلے۔ روح نے اس کی پذیرائی کی۔ اور لبوں نے اس کے رخساروں کی شراب کو پیا۔ کانوں نے اس کی تالیوں کی موسیقی کو سنا۔ اور آنکھوں نے اس کی تصویر دلوں پر کھینچ دی۔

حسن جہاں جاتا ہے۔ حاکمانہ جاتا ہے۔ اس کے پاس فوجیں نہیں ہوتیں۔ مگر وہ دلوں کو محکوم بنا لیتا ہے۔ اور اس وقت بھی جبکہ جسم اسلحہ کی قوت سے متحرک ہوتے ہیں۔ دلوں کی دنیا بچی فتادگی کے ساتھ حسن کی محکوم ہوتی ہے۔

پلاآلو۔ فرانسیسی فوج کے لفٹنٹ (جان فوروس) کی بیوی تھی جس کے ساتھ نئی جوانی اس پر چڑھ رہی تھی۔ اور بازار مصر اسی کے خریداروں سے عبارت ہو رہا تھا۔ جو دیکھتا تھا۔ اس تک پہونچنے کے لئے بیتاب ہو جاتا تھا۔

کپتان مرلن نے دبی زبان سے ایک رفیق سے کہا۔
دیکھو! یہ نوجوان کس قدر خوش قسمت ہے۔۔۔۔۔۔"
معلوم ہوتا ہے کہ "یہ قیامت جان فوروس کی ہے"۔

جنرل لا فائٹ نے کہا۔ ہاں اندازسے تو یہی پایا جاتا ہے"
بورہارنہ۔ بولا۔ کیا تم نہیں جانتے کہ یہ جان فوروس کی بیوی ہے؟
اسی ہفتہ جب فوجیں مصر آرہی تھیں۔ اور جان فوروس دودن کے لئے تولن سے کارکسا میں گیا تھا۔ ان ہی دنوں اس نے شادی کی۔

گفتگو کا یہ شگفتہ موضوع ابھی جاری تھا کہ ایک بڑا غبارہ میدان کی فضا میں بلند ہوا اور تماشائیوں کی صدائے ابتہاج اورہمہمۂ حیرت کی بیقراریوں نے عاشق ومعشوق کے رشتۂ نظری کو قطع کرکے پلالو کو اس جگہ پہنچا دیا۔ جہاں پہنچنا اس کی زندگی کے دوسرے باب کی تمہید تھی۔

نپولین کی حسن پرست آنکھوں نے اس کو دیکھا۔ اور اپنے ایک عزیز سے کہا۔
"اس حسین عورت کو اب تک میں نے کیوں نہیں دیکھا؟ یہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ میں چاہتا ہوں۔ اس کے حالات معلوم کروں"

نپولین کی زبان سے یہ الفاظ باندازِ تحکم نکل رہے تھے۔ لیکن کیا اس کا دل بھی حاکم تھا؟
ہاں! اس ماہرو کی شکاری آنکھ کی ایک نظر نپولین کو صید بنانے کے لئے کافی تھی۔ بوناپارٹ کی حالت اسی وقت سے بدلنی شروع ہوگئی جس کا وار اگرچہ پہلا تھا لیکن بھرپور تھا۔ اور نپولین کی آنکھیں نہ صرف ان لوگوں کی طرف سے بند ہوگئی تھیں۔ جو سلام کی غرض سے حاضر ہوئے تھے۔ بلکہ اس کی آنکھیں اب افسران فوجی کے لوازم شکر و رحمت کو بھی نہیں دیکھ رہی تھیں۔ وہ ایک بت تھا۔ جو پلاآلو کو متحیرانہ دیکھ رہا تھا۔

بورہانہ نے جواباً عرض کیا۔

یہ جان فوروس کی بیوی ہے۔ اور چونکہ اپنے منزل سے بہت کم باہر نکلتی ہے۔ اس لئے جناب والا کی نظروں سے پوشیدہ رہی"

پردہ نشینی اور گوشہ گیری کی کیا وجہ ہے؟

مجھے اس کے متعلق کوئی علم نہیں۔ مگر ممکن ہے کہ شوہر کی محبت نے اس کو دنیا سے مستغنی کر دیا ہو!

سب سے پہلے مجھے یہ بتلاؤ کہ ان دونوں میں یہ تعلق کیونکر قائم ہوا؟

میں نہیں کہہ سکتا کہ تعلقات کی بنا کہاں پڑی۔ البتہ اس قدر جانتا ہوں کہ یہ فوج کے ساتھ ہی مصر آئی ہے"

بوبارنہ! کیا تم نہیں جانتے کہ میں نے تمام فوج کو کافی سے زیادہ تنبیہ و تاکید کر دی تھی کہ کوئی افسر اپنی بیوی کو ساتھ نہ لائے"

بیشک جناب کا یہ حکم تھا لیکن بعض عورتیں فرط محبت سے اپنے شوہروں کا ساتھ نہیں چھوڑتیں ایسے احکام کی اطاعت ان کے لئے وبال جان ہوتی ہے"

ہاں یہ سچ ہے لیکن فوجی احکام کی پابندی اس سے زیادہ ضروری ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ جنرل فریڈر کی بیوی ان کے ساتھ ہے لیکن وہ پوشیدہ نہیں لائے۔ فوروس کے متعلق مجھے بھی تعجب ہے کہ وہ بیوی کو ساتھ لایا اور مجھے اطلاع بھی نہ دی۔

نپولین تھوڑی خاموشی کے بعد پھر بولا۔ جب یہ ہو چکا ہے تو ناممکن ہے کہ جان فوروس سزا نہ پائے۔ یہ میدان جنگ ہے۔ یہاں ہم عیش و طرب کے لئے نہیں آئے۔ اس سے کہو کہ یہ باتیں چھوڑے ورنہ اس کی زندگی کا لہلہاتا باغ تاراج ہو جائے گا۔ میں تحقیق حال کرنا چاہتا ہوں۔

جان فوروس کو حکم دو کہ آج شام وہ اپنی بیوی کو شاہی نزہت گاہ میں بھیج دے۔

(باقی آیندہ)

رامز

بیں صبح دمید و دامن شب شد چاک	برخیز و صبوح کن چرائی غمناک
مے نوش دلا کہ صبح بسیار دمد	او روئے بما کردہ و ما روئے بخاک

وقت کا استعمال

اگر کثیر افراد انسانی کی زندگی بیس حصوں میں تقسیم کی جائے۔ تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ انہیں سے ایسے انیس حصے جن میں نہ تو کسی قسم کا شغل ہی ہوتا ہے۔ اور نہ کسی قسم کی مسرت۔ بالکل بیکاری کی نذر ہو جاتے ہیں۔ ایسی صف میں میں ان لوگوں کو شامل کرنا نہیں چاہتا جو مدامی عجلت کار کے عادی ہیں۔ بلکہ ان لوگوں کو شامل کرنا چاہتا ہوں جو صاحبان عمل کے اکھاڑے میں ہمیشہ مشغول نہیں رہتے اگر میں انہیں چند ایسے طریقے بتاؤں جو ان کی زندگی کے اوقات فرصت کو ضائع نہ جانے دیں تو مجھے امید ہے کہ میری خدمت ان احباب کے نزدیک ناقابل تسلیم نہ ہو گی۔ وہ طریقے جو ان کے لئے تجویز کرنا چاہتا ہوں یہ ہیں۔

پہلی بات زیادہ مقبول عام الفاظ میں بھلائی کرنے کی مشق ہے۔ وہ خاص تجویز جو تمدنی بھلائیوں پر مشتمل ہے۔ نہایت محنتی طبیعت کو کام کرنے کا موقع دے گی۔ اور ایک انسان کو مصروفیت بیحد کی اس منزل پر پہنچا دے گی جس کے مقابلہ میں زندگی کا بے نہایت کاروباری زمانہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔ جاہلوں کو ہدایت دینا۔ محتاجوں کی اعانت کرنا اور دل شکستوں کو تسلی دینا ہمارے لئے ایسے فرائض ہیں جو ہماری زندگی کی شاہراہ میں ہر روز ہم سے دوچار ہوتے ہیں۔ ایک انسان کسی جماعت کے جہل و وحشت میں تخفیف کرنے۔ کسی قابل فرد کے خصائل کے متعلق صحیح فیصلہ کرنے۔ آتش غیظ و غضب کو کم کرنے اور حاسدوں کو ہم آہنگ کر کے ان کی اصلاح کرنے کے متعدد مواقع رکھتا ہے لیکن یہ تمام فرائض ایسے ہیں جن کے انصرام کی ذمہ داری ایک معقول پسند طبیعت کے شایان شان ہو سکتی ہے۔ اور اس انسان کے لئے جو عقلمندی سے اپنے آپ کو ان امور کی طرف متوجہ کر سکتا ہے۔ بہت بڑی تشفی اور اطمینان کا باعث ہوتے ہیں۔

دوسری قسم کی نیکی ہمیں ان فرصت کے اوقات میں مشغول عمل رکھ سکتی ہے جن میں ہم احباب کے لطف صحبت اور ذوق تکلم سے محروم ہو کر عزلت و تنہائی سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس سے میری مراد

ذات خداوندی کی طرف لو لگانا۔ اور اس کی بارگاہ میں حاضر ہو کر منکشف ہونا ہے جس کی طرف ہر معقول پسند اور شائستہ فرد کی خواہش ہونی چاہیئے۔ وہ انسان جو خدا کو حاضر ناظر جاننے کے خوبذیر احساس کے تحت زندگی بسر کر رہا ہے۔ اپنے نفس کو مسرت دائمی سے معمور رکھتا ہے۔ اور اپنے خیالات کی تشفی سے اسی طرح محظوظ ہوتا ہے جس طرح کہ اپنے بہترین اور محبوب ترین احباب کی جماعت میں ممکن ہے۔ وقت کبھی اس پر گراں نہیں گزرتا۔ اور یہ ناممکن ہے کہ وہ کبھی تنہا رہے۔ اس کے خیالات اور اس کے جذبات ان گھنٹوں میں بے نہایت مشغول رہتے ہیں جبکہ دوسرے لوگ نہایت بے دردی سے ان واقعات کو رائگاں کر دیتے ہیں۔ جونہی کہ وہ علائق دنیوی سے آزاد ہوتا ہے۔ اس کا دل عبودیت کے نور سے روشن ہو جاتا ہے۔ امیدوں سے لبریز ہو جاتا ہے۔ اور خدا کو اس کے حاضر جاننے کے وفور شعور پر مسرت سے مچل جاتا ہے۔ جو ہر جگہ اس کو گھیر رکھا ہے۔ یا اس کے برخلاف وہ اپنے خوف اپنے آلام اور کھٹکوں کو رب العزت کے حضور میں عرض کرتا ہے۔

میں نے یہاں ایک انسان کے نیکوکار ہونے کی ضرورت پر خوب غور کیا ہے کہ اس کو دنیا میں کچھ کرنا چاہیئے۔ لیکن اگر ہم اس امر کو سمجھ لیں کہ بھلائی کرنے کی مشق صرف ہمارے اوقات کا مشغلہ نہیں بلکہ اس کا اثر ہماری زندگی کے ان حصوں تک پہنچنے والا ہے۔ جو اس مادی عالم سے آزاد ہونے کے بعد شروع ہونے والے ہیں۔ اور ہماری پوری بقائے زندگی ان اوقات کے اعمال کی رنگ آمیزیوں کو قبول کرنے والی ہے جن میں ہم بھلائی یا برائی کیا کرتے ہیں۔ تو صرف وقت کے اس طریقے کو عملاً رد کرنے کی قوی وجہ ہم پر ظاہر ہو جاتی ہے۔

ایک انسان ترقی کے لئے کس قدر سرمایہ رکھتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اس کو مفید کام میں استعمال کرنے کے بہت سے مواقع بھی رکھتا ہے لیکن ہم اس کی نسبت کیا خیال کریں اگر وہ اس سرمایہ کے انیس حصے بالکل رائگاں کر دے۔ اور ممکن ہے کہ بیسواں حصہ بھی تباہ و برباد ہو جاتا ہو، لیکن چونکہ انسان کا دل ہمیشہ کام کے لئے سرگرم نہیں رہتا۔ اور انتہائی نیکی کا دباؤ بھی اس پر نہیں پڑتا۔ اس لئے اس امر کی نہایت ضرورت ہے کہ بحالت فرصت اس پر خاص مشاغل عائد کئے جائیں۔

دوسرا طریقہ وقت کو صرف کرنے کے لئے جو میں تجویز کروں گا۔ وہ ایک مفید اور بے ضرر

تفنن ہو گا۔ میرا یہ خیال جس کو میں مانتا ہوں کہ اس قسم کے اشغال سے جو درحقیقت نقصان رساں نہیں ہیں۔ آگاہی رکھنا معقول پسند افراد کی شان کے خلاف ہے۔ میں ان اشغال کی سفارش تو نہیں کرتا۔ مگر ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان میں کچھ ضرر نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ کسی قسم کا تفنن۔ بذات خود اپنے حقوق کے مطالبہ میں آواز بلند کرے۔ میں تعیین تو نہیں کرتا لیکن یہ میرا خیال ہے کہ سلیم الطبع اشخاص اپنے بیسیوں قیمتی گھنٹے گنجفہ کے پتوں کے ملانے۔ اور ان کے تقسیم کرنے میں صرف کر دیتے ہیں جو حقیقتاً ایک تعجب خیز بات ہے۔ اس میں کھیل کے اصطلاحی جملوں کے سوائے کسی طرح کی گفتگو نہیں ہوتی۔ اور کسی قسم کے خیالات سوائے مختلف اشکال کے سرخ و سیاہ نشانات کے نہیں ہوتے۔ کیا کوئی انسان ان کی اس حکایت پر خندہ زن نہ ہو گا کہ انسانی پیمانۂ حیات چھوٹا ہے؟

اگر ہمارے اوقات خاص نظام کے تحت ہوتے تو مفید و شریف مشاغل کا ایک دائمی چشمہ تیار رہو جاتا۔

انسان کا رجحان اس قدر کسی چیز پر برضا و رغبت آمادہ نہیں جس قدر ایک بہتر منتخب دوست کی صحبت میں مذاکرہ کرنے پر ہوتا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ کسی چیز میں ایسی برکت و مسرت حاصل نہیں ہوتی جیسی کہ ایک باشعور اور نیک طینت دوست کی صحبت میں حاصل ہوتی ہے۔ ایسی صحبت دماغی بوجھ کو ہلکا کر کے اسے راحت پہنچاتی ہے۔ فہم کو پاک کر کے اس کو ترقی دیتی ہے۔ خیالات و معلومات میں جدت و اضافہ کرتی ہے۔ دل و دماغ میں بہترین تحریکات اور نیکیوں کی لہر دوڑاتی ہے۔ جذبات کو دلاسا دے کر اعتدال پر لاتی ہے۔ اور زندگی کے اوقات فرصت کو کام پر لگاتی ہے۔

اس ارتباط کے بعد کسی کا کسی خاص شخص سے عام مذاکرہ یا صحبت اٹھا کر اس امر کا اندازہ کر لینا کہ یہ شخص ترقی و دلچسپی پیدا کرنے کے قابل ہے۔ یا نہیں۔ ایسے خصوصیات سے ہے جو شاذونادر ہی شکست ہو جایا کرتے ہیں۔

زندگی کے بہت سے مفید مشاغل ایسے ہیں جنھیں انسان ترقی دینے کی کوشش کرتا ہے اسے چاہئے کہ تمام ایسے موقعوں کو مفید شغل میں لگائے۔ بہ نسبت اس کے کہ ایسے مواقع رائگاں جا کر اس کے دل و دماغ کو تکلیف پہنچاتے رہیں۔ یا کام کرنے والی خدمات کی لہر کبھی کبھی اس کے دل و دماغ میں

پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ ایسے وقت اس کی رفاقت بہتر مصرف کے لئے نہایت ضروری ہے۔

وہ آدمی جو فن موسیقی۔ نقاشی۔ یا تعمیر سے دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ ان لوگوں کے مقابلہ میں جو ان فنون سے مطلق دلچسپی نہیں رکھتے۔ ایک حسن زائد رکھتا ہے۔ فنون گل پروری۔ باغبانی و کسانی ایک صاحب دولت کے مشاغل ہونے کی حیثیت سے دیہاتی زندگی کے لئے نہایت ممد و معاون ہیں۔ اور اس قسم کے بیسیوں طریقے۔ ان لوگوں کے لئے جو ان طریقوں پر عامل ہیں صرف اوقات کے مفید و احسن ذریعے ہیں۔

ان تمام مشاغل کے علاوہ کوئی مشغلہ ہمارے اوقات فرصت کو کام پر لگانے میں ایسا مفید نہیں۔ جیسا کہ قابل مصنفین کے فائدہ رساں کتب کا مطالعہ کرنا لیکن یہ مضمون بعض حیثیتوں سے کسی تیسرے طریقے پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس لئے میں اس کو اپنے سست و مردہ اوقات کو برسرکار لانے کے لئے اپنے ایک مستقل مضمون میں بیان کروں گا جس میں عام طور پر علم کے مقصد اصلی سے بحث کی جائیگی

(ایڈیسن)

سید حکیم الدین احمد ممنون

خیالات کی کشت زار خود اپنی طبیعت کی پہنائیاں ہیں۔ ان کے بیج کو صرف اپنے ہی مختلف اور متعدد تاثرات نشوونما دیتے ہیں لیکن جس طرح بیج ایک عمدہ اور زرخیز زمین میں عمدہ عمدہ گل بوٹے اگاتا اور کھلاتا ہے اور بنجر زمین میں خود اپنی ہی ہستی کو مٹا دیتا ہے۔ اسی طرح خیالات بھی اہلیت کے محتاج ہیں۔

ایک نوخیز طالبعلم کارخانوں اور کانوں میں جاتا ہے۔ لوگوں کو اپنے کام میں مصروف پاتا ہے۔ وہاں کی ہر چیز سے متاثر ہوتا ہے۔ باغ کی سمت نکل جاتا ہے۔ قدرت کے مظاہر اور فطرت کی نیرنگیاں۔ اس کا دامن احساس پکڑ لیتی ہیں اور وہ ہر ایک چیز پر طالبعلمانہ نظر ڈال کر ان کے کنہ کو سمجھ لیتا ہے جنگل کے ریگ زار۔ ویرانیاں اس کے سامنے آتے ہیں۔ ریت کے چھوٹے چھوٹے ذروں کی حقیقت اس کی قدرت حسیہ کی دسترس بلا قصد چن لیتی ہے اور یہی نیرنگیاں اس کے دل میں جمع اور پختہ ہو کر مفردات کی ترکیب۔ مرکبات کی تحلیل کے لئے دلیل ہدایت بن جاتے ہیں۔ اسے اقتصاد اور اختراع کا طریقہ سکھا دیتی ہیں مگر ایک مردہ احساس آدمی ان سب کیفیات عالم سے کوئی سبق نہیں لیتا۔ اور ان سب کرشمۂ قدرت کے مفید مواد کو محض فضول سمجھتا ہے ۔

موسیو ٹامین

ابو نواس

دوسری صدی ہجری کے شعرائے عرب میں "ابو نواس" نہایت قادر الکلام اور معاملہ بند شاعر گذرا ہے۔ اس کے شوخ اور رنگین کلام میں شیرینی و ملاحت کے ساتھ لطیف ظرافت کا بھی عنصر ہوتا ہے۔ اس لئے اکثر متانت سنج ارباب ادب نے اسے یادہ گوئی سے متہم کر دیا ہے۔ اس میں شک نہیں اس کی شاعری اس عیب سے مطلقاً پاک تو نہیں ہے۔ جذبات عالیہ کا سرمایہ ادبی ہونے کے ساتھ فحش کے مذموم خیالات کا بھی خزینہ ہے لیکن تبحر فن اور قدرت سخن کو دیکھتے پھبتے۔ اس بدنامی میں اس کی شہرت اور مقبولیت بھی کچھ دخیل معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ

ابو نواس کو جب قسمت کی یاوری نے خلیفہ "ہارون رشید" والی بغداد کی انجمن علم و ادب کا شمع بنایا ہے۔ اس وقت اگرچہ زمانہ ماہران ادب سے خالی نہیں تھا۔ مگر چونکہ ادھر تو اس کا توسن فکر چوگان شعر و سخن میں اور اپنے ہمعصر اہل فن سے گوئے سبقت لے جا چکا تھا تمام پہنائے باغ داد میں طوطی بول رہا تھا۔ ملک کا کوئی متنفس نہ تھا جسے اس کی قادر الکلامی میں کلام ہو۔ ہم دور اساتذہ تک لوہا ماننے پر مجبور ہو گئے۔

اور ادھر دربار خلافت کی عشرت پرستیوں نے اس کی فطری مستیوں کو مشتعل کر دیا۔ ملک کی معاشرت عیش خانہ تعیش ہو گئی تھی۔ آزاد مشربی نے مخمور اور عریاں جذبات کو بھی بے تکلف نظم کر دینا حسن شعریت جان لیا۔ اس لئے جہاں اس کے سرود خمریات اپنے وقت کی ہر بزم نشاط میں سرود طرب سمجھے گئے۔ وہیں ابنائے زمانہ کے رشک و انفعال کا ہدف انتقام بھی بن گئے۔

ہم عصری اور ہم فنی کا رشک آفریں ہونا مسلم ہے۔ انسانی فطرت جب کسی ہم فن مقابل کی شخصیت سے متاثر خفت ہوتی ہے۔ تو اس کی خود دار سبکیاں عیب جوئی کو رفع ملال اور دفع انفعال کا معاون بنا لیتی ہیں اور اگر مقابل میں قبولیت اتہام اور جذب بہتان کی اہلیت بھی ہو تو یہ حریفانہ الزام کی بیل خوب منڈھے چڑھتی ہے۔ ابو نواس میں چونکہ یہ سقم تھا۔ اس لئے لوگوں نے

پوچ گوئی۔ یا وہ سرائی کا ملزم بنا کر حقیقت دری بھی کی اور جلے دل کے پھپھولے بھی خوب پھوڑے یہی وجہ ہے کہ اس کا کلام مطعون سو قیت ہو گیا۔

ابو نواس کو اگرچہ اپنے آباؤ اجداد کے دمشقی اور یمنی متوطن ہونے کی نسبت سے عجم و عرب دونوں کی آب و ہوا سے ہم نفسی تھی۔ کیونکہ اس کا باپ ابو علی الحسن بن ہانی۔ ابن عبد الاول بن الصباح الحکمی دمشق کا تھا۔ اور ماں اہواز (جو بامیان میں علاقہ خوزستان کا مشہور قصبہ ہے) کی تھی۔ مگر مساعدت قسمت نے ایام طفولیت ہی سے نغمہ سرایان عرب کے ہم صفیر ہونے سے مفتخر رکھا۔ اور اس کی حیات ادبی نے سب سے پہلے جس ریگ زار میں آنکھ کھولی وہ صحرائے عرب کے ذروں کا ہم ضو نہیں تو فروغ گیر ضرور تھا۔

"مولی طاش کبری زادہ" کا بیان ہے کہ اس کو ماں باپ تو بچپنے ہی سے اپنے دامن حیات کی گرد راہ کی طرح جھاڑ جھٹک کے راہی ملک عدم ہو چکے تھے۔ مگر مادر گیتی نے ایک مرد خدا کی آغوش شفقت کو ذریعہ پرورش بنا دیا تھا۔ یہ یتیم ہوتے ہی ایک گندھی (عطار) کی دوکان پر بٹھا دیا گیا۔ اور وہیں عرصہ تک تحصیل معاش کے حیلے سیکھتا رہا۔ چونکہ قدرت نے اس کی فطرت میں علمی مذاق ودیعت کیا تھا۔ اس لئے اسے علمی مجالس کے سوا اور صحبتوں میں لطف نہیں آتا تھا۔ "ابو الحسامتہ والبہ الحباب" اس عہد کا سربرآوردہ شاعر تھا۔ اس کے کان بھی آشنا ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس کو تمنا تھی کہ کسی طرح اس سے متعارف ہو۔ حسن اتفاق سے "والبہ" خود ایک دن اس کی دکان پر آنکلا۔ اسے اپنے فرائض منصبی میں چست و چالاک اور گفتگو میں خوش مذاق و خوش مغز پا کر بہت خوش ہوا۔ اور اس ہونہار جنس کو محض اپنی شہرت کی دولت دے کر خرید لیا۔ ابو نواس کو جب معلوم ہوا کہ میرا مشتری "والبہ" ہے تو اپنی خوش قسمتی پر ناز کرتا ہوا اٹھا۔ اور اپنے مستقبل کی کامیاب توقعات کو ساتھ لے کر بندۂ بے درہم کی طرح علم دوست آقا کے ہمرکاب ہو لیا۔

"ابو الحسامتہ" شاعر اور ذی علم ہونے کے علاوہ فلسفیانہ حقائق میں بھی اپنے وقت کا متبحر فاضل تھا۔ ابو نواس کو اس کے علمی و ادبی فیض صحبت نے سخن سنجی کی مشق و مہارت تخیل کی نزہت و لطافت سے آشنا کرنے کے ساتھ دنیا کی حقیقت کے مطالعہ سے بھی لطف اندوز کر دیا۔ مگر اس کی فطرت کی افتاد نے چونکہ ظرافت کی دنیا میں جنم لیا تھا۔ اور شوخیوں کی گود میں پرورش پائی تھی۔ اس لئے "والبہ" کی

ہتین صحبت زیادہ دنوں تک اس کے شوق کا جی نہ بہلا سکی۔ آخر اس نے اپنے وقت کے خدائے سخن "خلف احمر" کی درگاہ تبحر میں زانوئے ادب تہ کرکے فخر تلمذ حاصل کیا۔ مگر "والبہ" کے ادیبانہ احسانات اور سرپرستانہ الطاف کے احترام کو بھی مرتے دم تک اپنی عقیدت کا جزو سعادت سمجھتا رہا۔ چنانچہ "والبہ" کے مرنے پر جو مرثیہ لکھا ہے۔ اس میں اپنے سوگوار جذبات اور مغموم تعلقات کے پردے میں اس ارادت قلبی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ کہتا ہے :-

"ابو حسامتہ کی موت نے "بقا" کو "فنا" کی حقیقت سے آگاہ کیا۔ اور دنیا میں موت کو محترم بنا دیا"

یعنی زندگی اس سے پہلے موت سے قطعاً بے خبر اور لاعلم تھی۔ باوجودیکہ جب حسامتہ کی شمع حیات کو گل کیا۔ دنیا تاریک ہوگئی۔ زندگی کی بے حس آنکھوں پر موت کی نیند غالب آئی تو حیات کو پتہ چلا کہ اس دن کے پیچھے کوئی رات مخلوق ہے جسے موت کہتے ہیں۔ موت دراصل ایک بے حقیقت شے تھی مگر "والبہ" کی بارگاہ میں باریاب ہوکر محترم ہوگئی۔ ورنہ اس قابل بھی نہ تھی کہ اس کا ذکر بھی کیا جائے۔

ابو نواس شعر تو پہلے بھی خوب کہتا تھا۔ مگر خلف احمر کے فیاض فیض نے اس کے عروج خیال کو آسمان شہرت کا ہم کمال بنا دیا۔ اور یہی نام آوری مصر کے اعتراف اور بغداد آنے کا سبب ہوئی اعراب کے مستند مورخ "ملک الجن" نے اس کے (دوران قیام مصر) حالات سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "ابو نواس کے کلام میں جو جدتیں ہیں۔ اہل عراق اس سے بالکل آشنا نہیں ہیں" اس سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابو نواس کا کلام بغداد آنے سے پہلے ان فواحش سے پاک ہے جو آج باعث بدنامی اور موجب اتہام یاوہ گوئی ہیں۔

یہ مصر سے جب بغداد آیا ہے۔ تو اس وقت "ہارون رشید" کا زمانۂ خلافت تھا۔ اور بغداد علم و ادب کی نکہت بیزیوں اور گل باریوں سے گلستان رنگ و تعطر ہو رہا تھا۔ گھر گھر شعر و سخن کے چرچے تھے۔ یہ بھی بے مایہ نہیں آیا تھا۔ اساتذۂ مصر کی ہم نفسی کی شہرتیں ساتھ ساتھ جلو میں تھیں۔ یہاں کے علما و شعرا نے بھی بڑے شوق سے خیر مقدم کیا۔ اور قدر و منزلت سے دیکھنے لگے طبیعت تو رسا تھی ہی۔ ذہن کی فراست۔ مذاق کی سلامتی و صحت اور فن شعر کی قدرت و مہارت نے بہت جلد شہرۂ آفاق کر دیا۔ مساعدت نے جہاں اس کی شاعری کو بغداد کی ہر علمی و ادبی مجلس کا صدر نشین بنایا۔

وہیں شوخ طبیعت کی ظرافت بغیاں بھی ہر دلعزیز ہوگئیں۔ بغداد کے ہر کہ و مہ کی زبان پر اس کا نام تھا۔ اور خاص و عام دونوں میں یکساں مقبولیت اور عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔

اسی دوران میں اس نے کسی ہنگامی اثر سے متاثر ہو کر "عدنانیوں" کی ہجو اور "قحطانیوں" کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا۔ اس قصیدے نے نام و نمود اور قدرت سخن کے تسلیم و اعتراف میں تو چار چاند لگا دئیے۔ مگر عدنانیوں کی بے حرمتی کے ارتکاب گناہ کا کفارہ بھی دینا پڑا۔ عدنانیوں کو چونکہ اہل قریش سے اخلاف و اسلاف کی قدیمی نسبت ہے۔ اس لئے جونہی قصیدہ زبان زد خاص و عام ہوا۔ ملک میں اختلاف عقائد کی شورش برپا ہوگئی۔ ہارون رشید کے فرائض مذہبی نے رسول اللہ کے سوء احترام کی گستاخانہ جسارت محسوس کی۔ عادلانہ منصب کی دسترس دامنگیر مطالبہ و مواخذہ ہوئی۔ دربار میں بلا کر سزائے قید کا حکم دے دیا۔ لیکن بعد میں اعتراف جرم کی ضمانت لے کر رہا کر دیا۔ اور اپنے نورتن کا ایک ممتاز رکن بھی بنا لیا۔

ابو نواس کا کلام اگرچہ زیادہ تر میخانہ سکر و سرور کا سیلاب اور وصل و وصال کی عریانیوں کا آئینہ ہے۔ لیکن چشم بصیرت کی متجسس نگاہوں کو اس خرمن ہفوات میں برق و شرر کی ایسی جلوہ ریزیاں بھی ملتی ہیں جو کشت زار ادب کے حاصل کی بے بہا متاع متصور ہیں۔ مثلاً ایک جگہ وہ اپنے محبوب کے حسن و لباس کی برق باریوں سے متاثر ہو کر کہتا ہے ؎

کانّ ثیابہ اطلعن من ازرارہ قمرا
یزیدک وجھہ حسنا اذا ما زدتہ نظرا

اس کے لباس کی گھنڈیوں سے چاند طلوع ہو رہے ہیں۔ اور اس کے روئے منور کا حسن ساعت بہ ساعت بڑھ رہا ہے۔ رہ رہ کے نگاہیں دیکھتی ہیں اور ہر نظر ہر بار ایک نیا حسن محسوس کرتی ہے۔

کیا حسن بیان ہے۔ اگر خیال کو ذرا وسعت دے کر دیکھا جائے تو حسن و نور کا ایک عالم پیش نظر ہو جاتا ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک مہجور جمال عاشق ہے جس کا شوق دیدار برسوں سے وہ مبارک گھڑی ڈھونڈ رہا ہے۔ جو اسے جی بھر کے نظارۂ محبوب کا موقع دے اور یہ اپنے مشتاق آرزو اور نامراد تمنا دامن کو جلوؤں سے بھر لے حسن اتفاق سے آج وہ نازنین اختر بخت بن کر جلوہ افروز ہوتی ہے

رات کی حیا سوز پردہ داریاں حصول نظارہ کی گستاخانہ جسارتوں کی حاجب بھی ہیں۔ مگر روئے روشن شعاعوں کی کسب ضو۔ اور چاند کے عکس و پرتو سے لباس کی ٹھنڈی ٹھنڈی مطلع قمر ہو گئی ہے۔ دیدۂ حیرت کی نگاہیں۔ لمعات روئے حسن کے تعدد کی وجہ سے مصحف عارض کی تعیین و شناخت سے عاجز ہیں انتہائے شوق نظارہ کے انتشار سے معذور جمعیت ہے حصول مراد کی خوشی میں آنکھوں کی مضطرب تمنائیں بیتاب حسرت ہیں۔ مگر نور کی وفور بارش سے مطلع حسن خضرستان برق و شرار بن گیا ہے۔ آنکھیں چوندھیائی جاتی ہیں۔ نگاہیں بکھری جا رہی ہیں۔ اور دل کی حسرتیں دل ہی میں ناکام رہی جاتی ہیں۔

دوسرا شعر اس سے بھی زیادہ بلیغ اور وسیع المعنی ہے۔ عاشق جمال یار کی دید سے متمتع ہے مگر حسن کی ساعت بہ ساعت افزائش۔ جلوؤں کے لحظہ بلحظہ تنوع نے حقیقت نظارہ کو مختلف الشیون کر دیا ہے۔ ارتقائے شباب کی کرشمہ آفرینیوں۔ جوش نمو کی جدت طرازیوں نے حسن محبوب کو مظہر تلون بنا دیا ہے۔ ہر جلوہ اپنے ماقبل فروغ کا صورت نمائے ترقی ہے۔ اور ہر نظارہ کثرت افزائے وحدت حسن کی نیرنگیاں تشکیل صور کا مرقع عالم ہیں جس کی ہر صورت ذوق نظارگی کا فریب آسودگی ہے اور ہر شکل تمناکدۂ دل کے ازدیاد شوق کی ضامن اور کفیل ہے۔ جمال محبوب کی بوقلمونیوں سے چشم شوق کی ارمان زدہ نگاہیں آسودۂ نظارہ تو ہیں۔ مگر تارنظر کے سرشتۂ تصور و تصدیق تسلسل کو حد نظر کی ہر آنے۔ ہر شانے تقلب ماہیت رہ رہ کے منقطع کر دیتی ہے تخلیق حسن کے فرط و وفور سے جلوؤں کے تصادم و توارد کا یہ عالم ہے کہ ہر نظر ہر بار ایک نیا حسن پیش نظر پاتی ہے۔ اور حسن کی جدتیں ختم نہیں ہوتیں۔

یا یوں کہئے کہ حسن تو ایک ہی ہے۔ مگر ذوق نظر کا وفور شوق اس حریم نور کو مسلسل دیکھنے سے قاصر ہے۔ ہر نگاہ حدقۂ چشم سے نکل کر اور حسن تک پہنچ کر ایسی محو و بیخود ہو جاتی ہے کہ ہر ہوش ایک دوسرا جلوہ اور ہر جلوہ ایک نیا حسن سمجھ لیتی ہے۔ جو پہلے کا فراموش کن ہے اور نسیان آموز۔

یہی لطافت تخیل اور حسن بیان ہے جس نے ابونواس کو باوجود ہرزہ سرائی کے معانی آفرین شعرا میں ممتاز جگہ دی ہے۔

ہندوستان کے مایۂ ناز شاعر حضرت فصیح الملک داغ نے بھی اسی خیال کو اردو میں نظم کیا ہے ؎

گھڑیوں بڑھتا ہے حسینوں کا جمال اور سے اور ہوئے جاتے ہیں

اگرچہ حسن کی ترقی اور شباب کی تنوع آفرینی تو اس میں بھی حد درجہ کی ہے۔ مگر کلیہ کی عمومیت نے شعر کو ان محاسن شعری اور بلاغت بیان سے محروم کر دیا ہے۔ جو فروغ حسن کی کرشمہ افروز جدتوں کے ساتھ محبوب اور حسن محبوب کی یکتائی کی بھی مظہر ہیں۔ اور یہی ابو نواس کے شعر میں جان شعریت ہیں۔

ایک اور شاعر نے بھی اسی ندرت خیال کی ہم آہنگی کی ہے ؎

یہ روز روز ترقی پہ حسن ہے ان کا   کہ صورت ان کی مجھے بھول بھول جاتی ہے

اسمیں شک نہیں کہ یہ شعر بہمہ وجوہ پہلے شعر سے بدرجہا خوشنوا ہے حسن بیان۔ طرز ادا۔ ترتیب الفاظ۔ اور پھر کیف شعریت۔ بغرض ہر معنی سے نہایت بلیغ ہے۔ خصوصاً روز روز کی تکرار۔ بھول بھول جانے کا حسن عمل۔ ان نشہ آور بندشوں نے تو دنیائے شراب بنا دیا ہے۔ مگر پھر اعماق خیال کا صحیح مطالعہ کرنے والی نگاہوں میں ابو نواس کے اسلوب بیان کا ہم خیال نہیں۔ روز روز کی امتداد ساعت اگرچہ تغیر عالم کے لئے کم سے کم زمانہ ہے۔ مگر جوش نمو کی صورت پذیری کے لئے اس قدر کیف افزا اور لطف آفرین نہیں جس قدر کہ ایک ہی وقت اور ایک ہی حسن کے ساعت بہ ساعت قبول ارتقا میں افزائش حسن ہے۔ پھر نظر کا تجزیہ نگاہ۔ جلووں کا تنوع حسن نظر کا تلون۔ ایک ہی ظہور کے مختلف مظاہر۔ یہ سب محاسن اور کیفیتیں ارباب ذوق کے سطح نگاہ میں کس قدر مابہ الامتیاز فرق ہیں۔ انہیں کا وجدان جان سکتا ہے۔

ابو نواس کے "خمریات" بہت مشہور ہیں اور درحقیقت وہ اسی کے مستحق بھی ہیں کہ ہر ایک میخانہ علم و ادب کے جام و ساغر بنائے جائیں۔ اگرچہ ان میں مستی و شباب کے پر اضطراب شور و سکون عشق و محبت کی پر کیف لہروں میں بیخودی اور دیوانگی کی اعتدال سے مستغنی عریانیاں بھی ہیں۔ مگر غواصان ادب کا ذوق تلاش اپنے حسب مقصد جواہرات کی دستیابی سے مالامال ہے۔ چنانچہ ایک قطعہ میں وہ ایک خیال کو نظم کرتا ہے۔

اربعة یحیینی بها قلبٌ وروحٌ وبدان   الماء والبستان والخمرة والوجه الحسن

چار چیزیں ہیں جن پر قلب۔ روح اور بدن کی زندگی ہے۔ پانی۔ باغ۔ شراب۔ حسن۔

بظاہر یہ خیال بہت نیا اور عجیب نہیں ہے۔ بلکہ ماء و بستان سے روح شعر میں پژمردگی۔ اور حسن خیال میں پھیکا پن سا آگیا ہے۔ مگر فطرت شعر و شراب کو جان آفرینی میں ہم قدرت کہہ کر شعر کو سرچشمہ آب حیات بنا دیا ہے فلسفہ کیفیات کے ماہرین کی رائے ہے کہ حسن۔ موسیقی۔ شعر۔ شراب۔ یہ چاروں

چیزیں مرادف ہیں۔ اور یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے۔ مگر جمہوران ذوق و شوق اور حقیقت شناسان کیفیت کو اس میں کچھ اختلاف ہے۔ عارفان سکر و سرور کے نزدیک حسن کی ایک جھلک۔ موسیقی کی ایک سریلی تان شعر کی ایک موج خیال یکساں نشہ آور ہیں۔ مگر شراب کی دنیائے جام و سبو بھی ان کے ہم کیف نہیں۔ ان کے نشے خمار سے ناآشنا ہیں حسن کی ہر ترنگ وصال و فراق سے بے نیاز ہو کر بھی دل کو عمر بھر مسرور رکھتی ہے۔ موسیقی کے نغمہائے ترنم کا ارتعاش ابدی ہے۔ شعر ہر وقت شعر ہے لیکن شراب مجوب خمار ہے۔ اس کے کف ساغر اور درد ساغر میں اس کی ابتدا اور انتہا میں صرف ایک گھونٹ اور ایک گردش کا فاصلہ ہے۔ اس لئے ان کیفیات ازلی سے محروم ہے حسن و شعر و نغمہ کا تعلق روح سے ہے۔ اور شراب کا تاثر صرف دماغ تک محدود ہے۔ روح کو ابدی بقا ہے۔ اور دماغ کی فنا دوامی ہے۔ ابو نواس نے اسی اختلاف کو دیکھتے اور التباس کو بچاتے ہوئے شراب اور حسن کو محی حیات ہونے میں ہم اثر تو کہا لیکن ان مختلف ہستیوں کو ایک ہی وجود لطیف کا مظہر نہیں بتایا۔

ابو نواس کا طرز بیان۔ اس کی بلاغ نظری کی دلیل تو یقیناً ہے۔ مگر معراج خیال نہیں۔ فارسی کے ایک شاعر کے شکیف جذبات نے شراب کی حقیقت کو اس سے بھی زیادہ اہم کر دیا ہے۔ یہ حسن کو ذریعہ حیات اور مدد زندگی جانتا ہے۔ اور وہ شراب کو محض خالق حسن ہی نہیں سمجھتا بلکہ حسن کے سایہ سایہ کو پیغمبر عشق کا نقش قدم مانتا ہے۔ اور اس اعتراف کو اس انداز میں بیان کرتا ہے کہ اس سے زیادہ شراب کی حقیقت کی تعریف ممکن ہی نہیں۔ انتہائے خیال یہ ہے کہ خدا اور رسول سب کچھ کہدیا ہے اور پھر مرتکب کفر اور مستوجب سزا نہیں ہے ؎

چیست۔ دانی بادۂ گلگوں؟ مصفا جوہرے — حسن را پروردگارے عشق را پیغمبرے

ابو نواس کے اصلی نام سے تو دنیا کم واقف ہے۔ مگر اس کی اس معروف کنیت کی نسبت مورخین یہ بیان کرتے ہیں کہ جب اس کی شہرت عالمگیر ہو چکی تھی۔ اور ملک کا گوشہ گوشہ اس کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ تو اسی دوران میں یمن کے کسی سردار نے اسے مہمان ملک بنانے کی خواہش کی اور خود میزبان غربت بن کر داد فن دینے کو یمن میں طلب کر لیا تھا۔ یہ ایک دن حاضر دربار تھا۔ اور سردار سے ہم کلامی و ہم سخنی کے فخر و شکر میں مصروف تھا۔ اثنائے گفتگو میں سردار نے کہا کہ تمھاری اصل چونکہ یمن ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ تم بھی "حمیری" شاہان سلف کی تقلید و تتبع میں اپنے نام کو کنیت سے تبدیل کر کے "ذو" کی نسبت سے موسوم کر لو۔ اور خود ہی "ذو نواس" (جو ایک یمن کے گزشتہ سلطان کی کنیت تھی) منتخب کر دی۔ اس نے بھی اپنے

محسن قدر دان کی تجویز سے اتفاق کر لیا لیکن لوگوں نے کچھ عرصہ کے بعد ذو نواس سے "ابو نواس" کہنا شروع کر دیا۔

ابو نواس کی ولادت اور وفات میں تعیین سن وسال کا اختلاف ہے "الشہاب المجازی" صاحب روضتہ الادب کا بیان ہے کہ ۱۴۵ھ میں یہ پیدا ہوا۔ اور ۱۹۹ھ میں باون برس کی عمر پاکر مرا۔ لیکن "طاش کبری زادہ" کا قول ہے کہ اس کی پیدائش تو ۱۳۶ھ میں مسلم ہے۔ البتہ وفات ۱۹۵ھ سے لیکر ۱۹۹ھ تک مشتبہ اور غیر متیقن ہے۔ بہرحال اس رائے میں سب متفق ہیں کہ "سلطان منصور" کے عہد خلافت میں ظہور پذیر ہستی ہوا۔ اور "محمد الامین" کے قتل ہو چکنے کے بعد۔ ہارون رشید کے بھائی "خلیفہ ابراہیم" کے دور قضا و قدر میں جان بحق تسلیم ہو گیا۔

ابو نواس - نادر الکلام ہونے کے ساتھ صاحب سرمایہ بھی ہے۔ کثرت سے اس کا کلام ملتا ہے۔ اس نے اپنے خوارق ادب کو بارہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اور ہر باب اپنے موضوع کی خصوصیت اعجاز سے برق بار سوز و ساز ہے۔ اس کے کلام کا بہت سا حصہ گو اب تک محجوب تلاش اور روپوش گمنامی ہے۔ مگر ایک ہزار پانچ سو قطعات و قصائد۔ اور تیرہ ہزار ابیات اور متعدد مراثی وہ ہیں جو دنیائے شہرت میں روشناس خلق ہیں۔ اور چھپ چکے ہیں۔ انہی میں سے ایک وہ مشہور مرثیہ ہے جو اس نے اپنے معلم فن۔ ادیب شعر و سخن استاد شفیق "خلف احمر" کی موت پر لکھا ہے۔ یہ مرثیہ بے انتہا فصاحت اور بلاغت سے معمور ہونے کے ساتھ جہاں مرگ عزیز کے غم والم کا ماتم کدہ۔ اور سوز و گداز کا آتش خانہ ہے۔ وہیں بدویت کے نکھرے اور ستھرے جذبات کی اصلی شان کا قابل قدر ظہور و مظہر اور عرب کی ٹھیٹ زبان۔ ملک کے معاشری خیالات کی ہو بہو تصویر بھی ہے +

ابوالبیان **بیدل**

انسان خود اپنا معلم ہے۔ دنیا کہتی ہے کہ حوادث کے تھپیڑے انسان کو انسان کامل بنا دیتے ہیں۔ مگر دیکھا جائے تو زندگی کے پُر کیف واقعات بھی سبق آموز اصلاح ہیں۔ انگلستان کے خدائے ادب شکسپیئر کا قول ہے کہ

> ہر انسان کی زندگی میں واقعات کی ایک ایسی لہر آتی ہے جس کی رو کی مدد سے انسان معراج ترقی پر پہنچ سکتا ہے۔ اور اگر اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے تو انسان ہمیشہ تنزل کی حالت میں رہتا ہے۔"

؟

غزل

(جناب محمد یسین صاحب تسکین قریشی سورونی)

ان کے نصیب تھے نصیب، جن کا کہ دم نکل گیا
ہم تو ہیں ایسے بے نصیب وقت قضا بھی ٹل گیا

شکر ہے سوز و ساز کا - دل یہ ہمارا جل گیا
درد تھا ایک مٹ گیا - خار تھا اک نکل گیا

اُف رے شباب کی بہار - اس پہ وہ رات کا خمار
بکھرے جو رخ پہ زلف یار - سانچے میں حسن ڈھل گیا

کہہ کے یہ دل سے کاٹ لی ہم نے تو رات ہجر کی
پھر نہیں آئے گا یہ وقت - اب جو ٹلا تو ٹل گیا

کہنے کی بات یہ نہیں - قابل غور ہے مگر
آپ ہی سوچ لیں ذرا - اتنا میں کیوں بدل گیا

وعدہ کا کیا ہو اعتبار - ہو گئی حد انتظار
اب بھی نہ آیا وہ نگار حشر کا دن بھی ڈھل گیا

رنگ تلون آپ کا اس کی رگوں میں ہے بھرا
رو لئے خون جب کبھی - دل ہی تو ہے بہل گیا

دیکھ کے مجکو ہمصفیر - ہو گئے خود بخود اسیر
اوروں کی بات اور ہے مجکو تو دام چھل گیا

پھوٹ بہا جو زخم دل - آگ سی ایک بجھ گئی
ورنہ سمجھ رہا تھا میں - آج یہ جسم جل گیا

میرے غم فراق نے پردہ دری نہ کی مری
دن تو تمام کٹ گیا - رات کو دم نکل گیا

تسکین
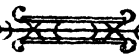
ہر ایک قطرے میں شبنم کے نہاں ہے بحر عرفاں کا
ظہور دفتر قدرت ہے ہر پتہ گلستاں کا

ہنسا کرتی ہے شب بھر دیکھ کر مجکو تہی داماں
الٰہی چاک ہو جائے گریبان صبح خنداں کا

ترے تلووں سے آنکھیں شوق سے ملتا مگر ڈر ہے
کف نازک میں چبھ جائے نہ کانٹا نوک مژگاں کا

بیاض چشم فتاں میں نہیں تحریر سرمہ کی
گریبان سحر میں شب کا دامن چرخ نے ٹانکا

خلش سے تیر کی بہلا ہوا ہے دل میں رہنے دو
کہیں ایسا نہ ہو دل چھوٹ جائے ضبط ارماں کا

مری حیرت پہ کیوں حیرت ہے دنیا کو - اسے دیکھے
کہ اس کا روئے روشن آئینہ ہے چشم حیراں کا

لٹا کر دل کی دولت ہو گئے محتاج حسرت کو
نہ تھا پہلو میں دل گویا خزانہ تھا یہ ارماں کا

محتاج

کسی کی تلاش

تاروں بھری رات کی ردا میں مہتاب کے ساغر ضیا میں
عاشق کی فغان بے نوا میں آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈھتی ہیں

بیتابی موج آب جو میں کوئل کے ترانہ ہائے کُو میں
غنچوں کی چٹک میں رنگ و بو میں آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈھتی ہیں

گیسوئے سیہ کے پیچ و خم میں برق رخ روشن صنم میں
جادوئے نگار پر ستم میں آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈھتی ہیں

بلبل کے بکائے بے اثر میں پروانۂ بے جگر کے پر میں
معصومی دامن سحر میں آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈھتی ہیں

فریاد دل حزین نے میں بیکس کی دعا دکھی کی لے میں
شوخی و سرور رنگ مے میں آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈھتی ہیں

انوار جبین نازنین میں دنبالۂ چشم سرمگین میں
پنہاں تہ مکان دل مکیں میں آنکھیں مری تجھ کو ڈھونڈھتی ہیں

حکیم احمد شجاع

رشحاتِ فکری

(جناب شریف صاحب فکری بھوپال)

جو کہا نہیں ہے کچھ بھی تجھے پاس دلنوازی ۔۔۔ تو ستم ظریف بولا ترا عشق ہے مجازی

یہ ہے خوف کھُل نہ جائے کہیں راز دلنوازی ۔۔۔ مری سمت دیکھتا ہے بنگاہ بے نیازی

ہیں حسین لاکھ لیکن کوئی لائے گا کہاں سے ۔۔۔ تری دلربا ادائیں تری شان بے نیازی

ترے عشق کا ہے دعوی جو مرے رقیب کو بھی ۔۔۔ تو مجھی پہ صرف کیوں ہو تری شانِ بے نیازی

ترے گیسوؤں کے قربان تری زلف کے میں صدقے ۔۔۔ نہ گھٹے گی تا قیامت شبِ ہجر کی درازی

اُسے لوگ کہہ رہے ہیں تری انتہائے نخوت ۔۔۔ تو سمجھ رہا ہے اب تک جسے شانِ بے نیازی

جو حرم میں عکس ڈالے بت ماہوش کا جلوہ ۔۔۔ تو یقین ہے کہ نیت ابھی توڑ دے نمازی

وہی دردمند فکری ترے در پہ آ پڑا ہے
کبھی دیکھ لے تو اس کو بنگاہ چارہ سازی

نوائے بے نوائی

(از مولانا آزاد سبحانی کانپوری)

پیام عشق ہے تجھ کو برہنہ پائی کا ۔۔۔ کہ اک نشان ہے یہ ترک خودنمائی کا

قرار آ نہیں سکتا طلسم ہستی میں ۔۔۔ ہے اس غبار میں اک ذرہ خودنمائی کا

گیا میں لے کے دل اور الٹے پاؤں پھر آیا ۔۔۔ بتوں میں ذکر تھا کعبہ کی دلربائی کا

رسن نے دار کی پہنچا دیا ہے مقصد تک ۔۔۔ یہ زینہ خوب مجھے مل گیا رسائی کا

فنا سے پہلے وہاں کون آج تک پہنچا ۔۔۔ ہے عذر خام ترا۔ عذر نارسائی کا

وہ خود نہیں نہ سہی یادگار گونج تو ہے ۔۔۔ چمن میں شور ہے بلبل کی خوشنوائی کا

ہے انتہا بہت آسان کہ جذب ہمسر ہے ۔۔۔ ہے سخت مرحلہ بس عشق ابتدائی کا

وفا کو عیب جفا کو ہنر جو کہتا ہو ۔۔۔ ہے حرف طرفہ گلہ اس سے بیوفائی کا

ڈراتے خنجر خونریز سے ہیں کیا مجھ کو　　پلا ہوا ہوں کسی پنجۂ حنائی کا
جو کانٹے پاؤں میں تھے دل میں ہیں ہنی نشتر　　یہ زور دیکھنا کانٹوں کی تیز پائی کا
دماغ عشق بر انگیختہ نہ کر ناحق　　نتیجہ بوالہوس ہے اس تری ڈراژخوائی کا
حباب آب میں جو غیریت کا قائل ہو　　ہلاک ہی وہ رہے ورطۂ جدائی کا
میں مر کے تم کو بھی ناشاد کردوں اسکے سوا　　کوئی جواب نہیں اور اس رکھائی کا

قدم رکھا تو ہے آزاد کوئے الفت میں
ڈبو نہ دینا کہیں نام آشنائی کا

غزل

(ادیب سحر نگار مولانا سید امتیاز علی صاحب تاج اڈیٹر کہکشاں)

پھر لطف دیکھیو عشق کے راز و نیاز کا　　پردہ جو درمیاں سے اٹھے احتراز کا
اک بار مجھ سے مل کے وہ سو بار پھر ملے　　دھڑکا انھیں لگا تھا جو افشائے راز کا
تاریک سا نشہ مری آنکھوں میں چھا گیا　　آیا خیال جب تری زلف دراز کا
افشائے راز دوست پہ کرکے ہوا یہ علم　　وجہ زیان عشق تھا اظہار راز کا
مضراب التفات نے چھیڑا جو ساز عشق　　نغمہ فلک رسا ہوا ہستی کے ساز کا
دنیا دکھائی دیتی تھی مخمور سی مجھے　　وہ دیکھنا تری نگہ نیم باز کا
عالم میں اک مجھی کو کیا زخمی نظر　　قائل ہوں میں تری نگہ امتیاز کا
دل کو مرے جو خوگر ناز بتاں کیا　　یہ بھی ہے ایک فضل میرے بے نیاز کا
کہتے ہیں نزد بان حقیقت اسے حکیم　　رتبہ بہت بلند ہے عشق مجاز کا

انسان کچھ نہیں تپش عشق کے بغیر
اے تاج مجھ کو شوق ہے سوز و گداز کا

تاج

کلامِ تاجور

(شاعر شیریں گفتار مولانا احسان اللہ خاں صاحب تاجور نجیب آبادی پروفیسر دیال سنگھ کالج لاہور)

سچ ہے کہ دلفریبی رنگِ رخ بہار کیا
وقت پہ اعتماد کیوں؟ حسن کا اعتبار کیا؟

کھوئے گئے جو عشق میں ان کا نشاں نہ پائیگی
ان کو تلاش کرتی ہے گردشِ روزگار کیا

لے غمِ مرگِ بیکسی جان ترے سپرد ہے
دوست بہانہ ساز کا کیجیئے انتظار کیا

دیکھ رہا ہوں جلوۂ دوست ہر اک حجاب میں
کس کا چمن۔کہاں کا دشت کیسی خزاں۔بہار کیا؟

اپنی نظر میں بھی مجھے وقفِ جنوں بنائے گی
یہ مری بات بات پر آپ کی "بار بار" کیا"

مان لیا کہ تاجور! وہ نہیں اختیار میں
کہیئے تو اپنے دل پہ ہے آپ کو اختیار کیا؟

کیفیاتِ رمز

(از جادو نگار مولانا سید وجاہت حسین صاحب رمز شاہجہانپوری)

کیا چیز کہوں واعظ خوش گو کی زبان کو
جنت نظر آئی مری چشم نگران کو

رکھا نہ کہیں کا دلِ بیتاب و تو ان کو
کیا یاد کر دل دیدۂ خوننابہ فشان کو

میں ضبط نہ کرتا غمِ فرقت میں فغان کو
اے دوست ترے راز نے روکا ہے زبان کو

تم اور محبت کی نگاہوں کا تماشا
میں دل میں نہ رکھ لوں کہیں چشم نگران کو

کس رخ پہ رہے گا دلِ بیتاب الٰہی
میں شش جہتِ حسن میں پاتا ہوں گمان کو

دنیا ہے نگاہوں میں مری خون کا دریا
بس دیکھ لیا دیدۂ خوننابہ فشان کو

موجوں کا تلاطم وہ تلاطم کی ترقی
ساحل نہ ملا کشتی طوفان زدگان کو

بجلی نے جلایا کبھی گلچین نے نشیمن
ہم قید ہیں روتے رہے صیاد کی جان کو

بند آنکھ ہوئی تھی تو نہ محشر میں بھی کھلتی
اللہ یہ کس رنگ میں پاتا ہوں جہان کو

عالم ہے نظر میں مری جام مے گلگوں
کیا بند کروں دیدۂ خونابہ فشاں کو

سجدہ بھی ترے در کا ہے دربان کی رضا پر
پھر کہہ تو یہیں نذر نہ دیدوں دل و جاں کو

یہ صید ہے خود اپنے ہی صیاد پہ عاشق
ٹھہرے دل ابھی کھینچ تو دیکھیں وہ کماں کو

بے رنگ یہ تھی تیری نظر میں مری تصویر
خون ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہے دل و جاں کو

اُجڑے ہوئے گلزار میں رہتا تو نشیمن
یوں فصل بہار آئی کہ روتے ہیں خزاں کو

تھی دامن قاتل میں شہید دل کی امانت
ہر داغ نے محشر میں پکارا رگ جاں کو

تا زیست تو تسکین نہ ہوگی کبھی اے رمزؔ
زنداں میں کہاں ڈھونڈھنے آئے ہو اماں کو

جذباتِ ندرت

(شاعر خوش مقال مولانا سید ندرت میرٹھی)

دل سے دعائیں کیوں نہ دیں عشق کرشمہ ساز کو
زینت دل بنا دیا حسرت دل نواز کو

حد سے بڑھا نہ دے کہیں اس غم دلگداز کو
یاس مٹا نہ دے یونہی لذت سوز و ساز کو

دل کی طرف اڑا سکے تیر نگاہ ناز کو
پوچھئے زخم دل سے پھر حسرت دل کے راز کو

شمع کے دل سے پوچھئے عشق کے سوز و ساز کو
محو سکوت کر دیا کیسی زبان دراز کو

جائیں گے بندگان عشق اور کہاں نیاز کو
در پہ ترے جھکائیں گے اپنے سر نیاز کو

تیرے مریض ہجر کی چارہ گری تو ہو چکی
اب تو دعائے خیر کی فکر ہے چارہ ساز کو

مد نظر ہے امتحاں میری نگاہ شوق کا
دیکھ رہا ہوں خواب میں تیرے حجاب ناز کو

جس کے لئے تھی یہ بلا اب وہ جہاں سے اٹھ گیا
رکھئے لپیٹ کر فلک غم کی شب دراز کو

تیغ گلے پہ پھیرئے سینہ نہ چاک کیجئے
پردے میں رہنے دیجئے اپنی حریم ناز کو

سنئے خوشی سے آپ بھی نوحۂ مرگ آرزو
لیجئے دل میں چٹکیاں چھیڑئے غم کے ساز کو

دل کی رگوں سے کھینچ کے دم آئے لبوں پہ لاکھ بار
ہم نہ زباں پہ لائیں گے دل سے کسی کے راز کو

ہوگی چسک میں کیا کمی سوزش دل مٹے گی کیا
چاٹیں گے رکھ کے زخم دل مرہم چارہ ساز کو

ندرت نامراد سے کہتی ہے ان کی چشم شوخ
دیکھ نگاہ یاس سے عشوۂ بے نیاز کو

افکارِ ہادی

(از سید محمد ہادی مچھلی شہری۔ بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی۔ علی گڈھ)

دل تڑپتا ہے کہ پہلو سے جدا ہو جائے
شوق کی خواہش ہے اس سے بھی سوا ہو جائے

اپنے سینے سے لگا کر قلب محزون کو مرے
آپ بھی کچھ دیر کو درد آشنا ہو جائے

چھوٹ جانا قید ہستی سے تو کچھ مشکل نہیں
دامِ الفت سے بھلا کیونکر رہا ہو جائے

دل تو کہتا ہے کہ ہے ضبط محبت کے خلاف
درد کہتا ہے کہ مصروف دعا ہو جائے

کس طرح کر دیجئے ترکِ رسوم اتحاد
آشنا سے کس طرح نا آشنا ہو جائے

دل کا پہلو سے جدا کرنا اگر دشوار ہے
یہ بھی پھر ممکن نہیں ہے مدعا ہو جائے

اب یہی خواہش ہے رنگ آمیزی تقدیر کی
مٹتے مٹتے عشق میں نقشِ وفا ہو جائے

اس کے کوچے میں بسر کر دیجئے عمر رواں
اس طرح جمیے کہ گویا نقشِ پا ہو جائے

کیا یہی انصاف الفت ہے کہ مجھ کو اس طرح
کر کے مجبور وفا خود بے وفا ہو جائے

کیا تسلی دل کو میرے وعدۂ فردا سے ہو
آپ کیا معلوم کل تک کیا سے کیا ہو جائے

کیجئے کیا دل کی حالت کا محبت میں علاج
کس طرح نا آشنائے مدعا ہو جائے

کم نگاہی دیکھ کر ساقی کی بزم شوق میں
اب یہی دل چاہتا ہے پارسا ہو جائے

میں تو کہتا ہوں حشر میں کہہ دوں کہ ہے دل کا قصور
آپ اگر دنیا کے آگے بے خطا ہو جائے

پھر دکھا دیجے نگاہ لطف کی بے باکیاں
پھر ذرا بیگانۂ شرم و حیا ہو جائے

ترک کر سکتے نہیں ہادی جو وہ خوئے جفا
آپ بھی پابند تسلیم و رضا ہو جائے

کتب خانہ
کلیہ جامعہ عثمانیہ

میں کیا ہوں؟

کیا کہوں غم کدۂ دہر میں آخر کیا ہوں　　میرا ہونا ہی ہے دنیا میں نہ ہونے میں شمار
ہوں بھی گو ہستیٔ موہوم میں تو خواب و خیال　　نہ جگہ چشم عدو میں نہ دل دوست میں بار
گرد ویرانۂ غربت ہوں نہ صحرائے وطن　　دردِ پیمانۂ عشرت ہوں نہ مینائے خمار
زندگی کیا ہے کہ اک محشر بے تابی ہے　　نہ سکوں دن کو میسر ہے نہ ہے شب کو قرار
معرض کشمکش نفی ہے ہر وہم ثبات　　ہے حدوث اور قدم دہر میں جوں برق و شرار
خیر و شر دونوں سے ہم ضد ہے مری فطرت بخت　　غم سے نفرت ہے خوشی کو خوشی غم سے بیزار
ننگ ہوں نقش وجود اور عدم کا اپنے　　موت کو زیست سے اور زیست کو ہے موت سے عار
نہ بقا موجد غم ہے۔ نہ فنا حد خوشی　　نہ برے سے کوئی مطلب نہ بھلے سے سروکار
عصمت غنچہ سے ہم رشتہ ہے دل کا دامن　　اک تبسم پہ ہے دنیا کا میرے دار و مدار
خندۂ گل ہوں کہ ہوں دود چراغ سر رہ　　ذرہ ذرہ میں نہاں ہے میرے اک مشت غبار
نہ کہیں دل کا ٹھکانہ۔ نہ کہیں جان کو سفر　　تنگ دامن ہے مجھے وسعت دشت و کہسار
الغرض لوح مقدر کا ہوں وہ حرف فضول　　نہ سخن گویوں میں محسوب۔ نہ گونگوں میں شمار
خار ہے دیدۂ دنیا میں مری قید حیات　　بار ہے حلقۂ زنجیر میں پائے تن زار

جیتے جی تو نہ ملا چین جہان غم میں　　مر کے بھی جسم لحد میں ہے پشیمان فشار
نوحہ گر ہے نکوئی فاتحہ خوان ہے پس مرگ　　شمع بالیں بھی ہے خاموش بعذر گفتار
بیکسی شہر خموشاں میں ہے محجوب تلاش　　ہم سخن ہی کوئی ملتا ہے نہ کوئی غمخوار
دستکش تہہ بہ عطرت ہر موج نسیم　　روکش نخل خزاں۔ خندۂ گل کا ایثار
نہ کرے گریۂ شبنم کبھی چادر کا سلوک　　آ کے تربت پہ نہ روئے کہیں ابر گہر بار
آ گیا باد حوادث کا جو کوئی جھونکا　　خاک اڑا اڑ کے بتاتی ہے مرا نقش مزار
رو بداماں ہے مری قبر پہ ہر شورش حشر　　سن کے یہ شعر لب گور سے با آہ نزار
گرد ہوں گرد حقیقت میں نہیں کچھ بھی میری　　ہوں ابھی اور ابھی جنبش داماں میں نہیں

(بیدل شاہجہانپوری)